بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وما أوتيتم من العلم إلا قليلا
معرکہ مذہب و سائنس
www.KitaboSunnat.com
مولانا ظفر علی خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

A HISTORY OF

THE CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE

کا اردو ترجمہ

از

مولانا ظفر علی خاں

انتساب

عالی جناب نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں صاحب مرحوم و مغفور جن کا نام مسلمانان ہند کی علمی تاریخ میں آبِ زر سے لکھا جا چکا ہے سب سے پہلے شخص تھے جن کی تحریک پر میں نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ اس لئے میں اس کتاب کو جو اب نظرثانی کے بعد حواشی کے ساتھ مکمل ہو کر شائع ہوتی ہے عالی جناب ممدوح کی پاک یاد کے ساتھ نسبت دینے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

ظفر علی خاں

حرفِ چند

ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر (۱۸۱۱- ۱۸۸۲) کی تصنیف

A History of the Conflict between Religion and Science.

ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے- یہ ایک لحاظ سے یورپ کی ذہنی ترقی کی تاریخ کا خلاصہ ہے- مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳- ۱۹۵۶) نے نواب محسن الملک (۱۸۳۷- ۱۹۰۷) کی خواہش پر ۱۸۹۵ء میں اس کا بامحاورہ اردو ترجمہ کیا- نظرثانی کے بعد ۱۹۱۰ء میں انجمن اُردو حیدر آباد دکن نے رفاہِ عام سٹیم پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا-

پنجاب یونیورسٹی نے اس کامیاب ترجمے پر مولانا ظفر علی خان کو پانچ سو روپے کا انعام دیا- مولانا حالی کے مطابق معرکہ مذہب و سائنس کی نسبت بلحاظ ترجمہ کی خوبی کے جو کچھ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے وہ مبالغے سے بالکل پاک ہے- مولانا ظفر علی خان نے ڈریپر کی بعض آرا سے اختلاف کرتے ہوئے اور بعض مسائل کی اپنے نقطۂ نظر سے وضاحت کرتے ہوئے حواشی بھی لکھے ہیں- مولانا شبلی کے بقول اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی نظر آتے ہیں-

یہ کتاب ایک عرصہ سے نایاب تھی- اس کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر ہم نے اسے از سر نو کمپوز کروا کر اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے- پہلی اشاعت میں حواشی صفحہ کے ساتھ ساتھ تھے لیکن موجودہ اشاعت میں انہیں ابواب کے آخر میں دیا گیا ہے-

معرکۂ مذہب و سائنس

فہرست مضامین

دُوسرا باب

عیسائیت کی ابتدا

132

شاہی اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس کی قلبِ ماہیت۔ اس کا تعلق سائنس کے ساتھ۔ روما کی جمہوری حکومت کی مذہبی حالت۔ جمہوریت کے مبدّل بہ حکومت شخصی ہونے سے لوگوں کا میلان توحد کی طرف ہو جاتا ہے۔ سلطنتِ روما میں مذہب عیسوی کی اشاعت۔ عیسائیت کو حکومت جس طریقہ سے ہاتھ آتی ہے اس کے سیاسی مقتضیات ۔ت اور بت پرستی کے باہمی اتحاد کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ عیسائیت کے عقاید اور رسوم ے متعلق ٹرٹلین کا بیان۔ قسطنطین کی حکومت عملی کا مخرب اثر۔ عیسائیت کا اتحاد حکمراں جماعت کے ساتھ۔ عیسائیت اور سائنس کا تناقض باہمی۔ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی اور تحصیل فلسفہ کی ممانعت۔ آگسٹائن کے فلسفہ اور پادریوں کے علوم کی حقیقت۔ کتب مقدس کو سائنس کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

تیسرا باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ' مسئلہ توحید۔

پہلی یعنی جنوبی اصلاح

166

اہل مصر اصرار کرتے ہیں کہ مریم عذرا کی پرستش کو رواج عام دیا جائے۔ قسطنطنیہ کا بطریق نسطوراُن کی مخالفت کرتا ہے لیکن انجام کار بوجہ اس رسوخ کے جو مصریوں کو دربارِ قیصر میں حاصل ہے وہ نسطور کو جلا وطن کرا دیتے ہیں اور نسطور کے پیرو منتشر ہو جاتے ہیں۔

اصلاح جنوبی (یعنی اسلام) کا آغاز۔ حملہ ایران۔ اس کے اخلاقی نتائج۔

اصلاح عرب۔ حضرت محمدؐ نسطوری فرقے کے راہبوں سے ملتے ہیں۔ اور ان کے اصول اختیار کر کے ان اصول پر اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مریم عذرا کی پرستش۔ مسئلہ تثلیث اور اس عقیدے سے جو توحید باری سے توافق نہیں رکھتا وہ ابا کرتے ہیں۔ عرب کی بت پرستی کو بہ جبر مٹا دیتے ہیں اور دولتِ روما پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے جانشین شام' مصر' ایشیائے کوچک' شمالی افریقہ اور

ہسپانیہ کو مسخر اور فرانس پر حملہ کرتے ہیں۔
اس کشمکش سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وحدت واجب الوجود کا اصول دولت روما کے اکثر حصہ میں رائج ہو جاتا ہے۔ سائنس از سرِ نَو زندہ ہوتا ہے اور مسیحی دنیا کے بہت سے مشہور مراکزِ حکومت مثلاً "اسکندریہ" کارتھیج یہاں تک کہ بیت المقدس تک عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔

چوتھا باب

جنوب میں سائنس کا احیاء

214

نسطوریوں اور یہودیوں کے اثر کی وجہ سے عرب اکتساب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قضا و قدر اور سرنوشت ازلی کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کائنات کی ہیئت ترکیبی کا ان کو صحیح صحیح علم ہو جاتا ہے۔ وہ زمین کی جسامت اور شکل کی تحقیق کرتے ہیں۔ ان کے خلفا عظیم الشان کتب خانوں کی بنا ڈالتے ہیں۔ علوم و فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور رصدگاہیں قائم کرتے ہیں۔ وہ فن ریاضی کو ترقی دیتے ہیں۔ الجبرا ایجاد کرتے ہیں اور فن ہندسہ و مثلث پر بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ فنون ریاضی و ہیئت کے متعلق قدیم یونانی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں اور ان کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ارسطو کے طریقہ استقرائے تام پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بہت سے دارالعلم قائم کرتے ہیں اور نسطوریوں کی مدد سے موجودہ وضع کے مدارس کھولتے ہیں۔ عربی سیاق و اعداد اور فن حساب کو رواج دیتے ہیں اور ستاروں کی فہرستیں مرتب کر کے ان کے نام رکھتے ہیں۔ موجودہ فنون ہیئت و کیمیا و طبیعیات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فلاحت و صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دیتے ہیں۔

پانچواں باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیئت روح۔

مسئلہ انفصال و انجذاب

230

روح کی ماہیئت کے متعلق قدیم اہل یورپ کے خیالات۔ یعنی روح جسم کے مشابہ

ہے۔ اہلِ مشرق کے فلسفیانہ خیالات۔ ہندومذہب اور بدھ مذہب مسئلہ انفصال و انجذاب کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی مذہب ارسطو کا بھی ہے جس کی تقلید پیروانِ فلسفہ اسکندریہ اور بعد میں یہودی اور عرب کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ ابن سینا کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا تعلق مسئلہ بقا و تناسب قوت کے ساتھ جسم اور روح کے آغاز و انجام کی باہمی مماثلت۔ روح انسانی کا قیاس روح حیوانی پر۔

فلسفہ ابن رشد جو انہیں واقعات پر مبنی ہے۔ اسپین اور سسلی ہوتا ہوا مسیحی دنیا میں پہنچتا ہے۔

فلسفہ ابن رشد کے استیصال کی تاریخ۔ اسلام کا اس سے ابا کرنا۔ یہودیوں کے مذہبی طبقہ کی مخالفت۔ پاپائے روما کا اس فلسفہ کے مٹا دینے پر کمر باندھنا۔ "انکویزیشن"۔ (محکمہ احتساب مذہبی) کا اسپین میں قائم ہونا۔ اس محکمہ کے وحشیانہ مظالم اور ان کے نتائج۔ یہودیوں اور عربوں کا اخراج۔ یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی پائمالی۔ "و-ٹیکن کونسل" کا فیصلہ۔

چھٹا باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت عالم 263

ماہیت عالم کی نسبت مذہبی خیال یعنی زمین چپٹی ہے۔ بہشت اور دوزخ۔

اہل سائنس کا خیال یعنی زمین گول ہے۔ زمین کی جسامت کی دریافت۔ نظام شمسی میں اس کا درجہ اور نظام شمسی کے دوسرے اعضا کے ساتھ اس کے تعلقات۔ کولمبس۔ ڈی گاما اور میگلن کے تین بڑے بحری سفر۔ سیاحت گرد زمین۔ ایک درجہ کی پیمائش اور رقاص ساعت کے ذریعہ سے کرویت زمین کی تعیین۔

کوپرنیکس کے اکتشافات۔ دوربین کی ایجاد۔ گلیلیو۔ "انکویزیشن" کے اجلاس میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اس کی سزایابی۔ سائنس کی فتح کلیسا پر۔

جسامت نظام شمسی کی تحقیق کی کوشش۔ سیارہ زہرہ کے مرور منطقۃ البروج کی بنا پر آفتاب کے زاویہ اختلاف منظر کی تعیین۔ کرہ زمین اور انسان کی ہیچ میرزی۔

خیالات دربارہ جسامت کائنات۔ زوایائے اختلاف۔ مناظر کواکب۔ برونو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیائیں موجود ہیں۔ محکمہ "انکویزیشن" اسے گرفتار کر کے قتل کر دیتا ہے۔

ساتواں باب

نزاع درباره عمر زمین

294

بائبل کی رو سے زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہونا اور اس کا ایک ہفتہ کی مدت میں بنایا جانا۔ پادریوں کے علم التاریخ کا انبیاء سلف کی عمروں پر مبنی ہونا۔ بائبل کے مختلف نسخوں میں مختلف تخمینوں کی وجہ سے تناقض۔

قصہ طوفان نوح۔ روئے زمین کا از سرنو آباد ہونا۔ مینارہ بابل۔ اختلاف السنہ۔ انسان کی قدیمی زبان۔

کیسینی کا یہ انکشاف کہ سیارہ مشتری مسطح الطرفین ہے۔ نیوٹن کا یہ انکشاف کہ کرہ ارض مسطح الطرفین ہے۔ اس انکشاف سے اس نتیجہ کا استخراج کہ زمین نے حرکات و خیل کے سانچے میں ڈھل کر موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ احجار آبی کی طبقات الارضی تحقیقات سے اس نتیجہ کی تصدیق۔ آثار اجسام ذوی الاعضا سے اس نتیجہ کی مزید توثیق۔ زمین کی عمر کا اندازہ کرنے میں مدت ہائے مدید کے تسلیم کرنے کی ضرورت۔ مسئلہ پیدائش کی جگہ مسئلہ ارتقا لے لیتا ہے۔ انکشافات درباره قدامت انسان۔

کائنات کے پیمانہ زمان و مکان کا غیر محدود ہونا۔ زمین کی عمر کی بحث میں افراط و تفریط سے احتراز۔

آٹھواں باب

نزاع درباره معیارِ حق

314

فلسفہ قدیمہ کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کے پاس احقاق حق کا کوئی ذریعہ نہیں۔

قدیم مسیحیوں میں عقائد کے اختلافات۔ کلیسائی کونسلیں ان اختلافات کے مٹانے کی بے سود کوششیں کرتی ہیں۔ حجت معجزہ و حجت ابتلا کی ترویج۔

پاپائے روما طریقہ اعتراف سری کو جاری کرتا ہے۔ محکمہ احتساب عقائد کو اپنا آلۂ اقتدار بناتا ہے۔ اور اختلافات عقائد کے رفع کرنے کے لئے وحشیانہ مظالم پر اتر آتا ہے۔

قیصر جسٹینین کے مجلۃ القوانین کی دریافت اور قانون دینیہ کے نشوونما کا اثر نوعیت و ماہیت شہادت پر۔ قانون شہادت میں درایت کی شان نمودار ہونے لگتی ہے۔

"اصلاح کنیسہ" کی بدولت ہر انسان کو اپنی عقل اور سمجھ کے لحاظ سے رائے قائم

کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ کلیسائے رومن کیتھولک دعوی کرتا ہے کہ حق و صدق کا معیار خود کلیسا ہے۔ فہرست کتب محرمہ کے اجرا سے وہ کتابوں کے مطالعہ کی ممانعت کرتا ہے اور حکمِ امتناعی کی خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع و قمع سینٹ برتھالو میو کے قتل عام کے سے ذرائع سے کرتا ہے۔

پراٹسٹنٹ مذہب تورات کو معیار حق تسلیم کرتا ہے۔ تورات کی موثوقیت پر نظر انتقاد ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محرف ہے۔

سائنس کی رو سے معیار حق انکشافات فطرت ہیں۔ پراٹسٹنٹ کے نزدیک یہ معیار کتب مقدسہ میں موجود ہے اور رومن کیتھولک کی رائے میں پاپائے معصوم اس کا مورد و مہبط ہے۔

نواں باب

نزاع درباره انتظام عالم

342

انتظام عالم کے تصور کی دو حیثیتیں ہیں۔ اول بذریعہ توفیق ربانی دوم بذریعہ قانون۔ شق اول کا تعلق پیشوایان مذہب سے ہے۔ شق ثانی کی ترویج کا مختصر بیان۔

کپلو وہ قوانین دریافت کرتا ہے جو نظام شمسی پر محتوی ہیں۔ پاپائے روما اس کی تصانیف کی تکفیر کرتا ہے۔ ڈاونسی فلسفہ حرکات و حیل کی بنا ڈالتا ہے۔

گلیلیو علم تحریک الاجرام کے اصول قوانین دریافت کرتا ہے۔ نیوٹن اجرام سماوی کی حرکات کو ان قوانین کے حیز اطلاق میں لا کر ثابت کرتا ہے کہ نظام شمسی کی عنان نظم و نسق مہندسانہ جبر کے ہاتھ میں ہے۔ ہرشل ثابت کرتا ہے کہ کل کائنات اسی قانون کی تابع فرمان ہے۔ مسئلہ نسابتہ النجوم۔ اس پر متالہین کے اعتراضات۔

اس امر کا ثبوت کہ ترکیب ارضی و نشوونمائے سلسلہ نباتی و حیوانی تابع قانون ہے۔ نباتات و حیوانات کا ظہور بذریعہ پیدائش نہیں ہوا بلکہ بذریعہ اِرتقا ہوا ہے۔

حکومت قانون کا ثبوت انسانی جماعتوں کے تاریخی حالات اور نیز افراد انسانی سے بہم پہنچتا ہے۔

اصلاح یافتہ کلیساؤں میں سے بعض اس خیال کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ تسلیم کر لیتے ہیں۔

دسواں باب

لاطینی مسیحیت اور تمدّنِ جدید کا تعلّق 371

ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک لاطینی مسیحیت نے یورپ کے عقل و ادراک پر قبضہ کئے رکھا جس کے نتائج کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے۔

ان نتائج نے جو شکل اختیار کی وہ اصلاح کنیسہ کے وقت شہر روما کی حالت اور خانگی و عمرانی زندگی میں یورپ کی حالت سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقوام یورپ کے کندھوں پر دہری حکومت کا جوا رکھا ہوا تھا یعنی ایک طرف انہیں حکام دنیوی کی متابعت کرنی پڑتی تھی۔ دوسری طرف حکام دینی کی۔ اہل یورپ جہالت' اوہام پرستی اور تکالیف مدنیہ میں مبتلا تھے۔ رومن کیتھولک مذہب کی ناکامیابی کی وجوہ۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ۔ دینی و روحانی حکومت سے ترقی کر کے یہ مطلق العنان شخصی حکومت کی شکل میں بدل گئی۔ کردینالوں کی انجمن اور کیوریا کی کارروائی۔ پاپائی خزانہ کے لئے بیش قرار محاصل کی ضرورت بداخلاقی کی محرک ہوتی ہے۔

جو فائدے یورپ کو کیتھولک عہد حکومت میں پہنچے ان میں حکومت کے منشا کو کچھ دخل نہ تھا بلکہ وہ محض اتفاقی یا ضمنی تھے۔

عام نتیجہ یہ ہے کہ پاپائیت کا سیاسی اثر موجودہ زمانہ کے تمدن کے حق میں مضر تھا۔

گیارھواں باب

سائنس کا تعلق تمدّنِ جدیدہ کے ساتھ 403

سائنس کے عام اثرات کی مثال تاریخ امریکہ سے۔

سائنس کا یورپ میں داخل ہونا۔ اسلامی اسپین سے چل کر سائنس کا گزر شمالی اٹلی میں ہوا۔ جہاں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا مستقر اوینان میں منتقل ہو گیا تھا اس نے خاطر خواہ نشوونما پائی۔ چھاپہ۔ بحری اسفار اور اصلاح کنیسہ کا اثر۔ اطالوی مجالس علمی کا قیام۔

سائنس کا عقلی اثر۔ اس نے یورپ میں ادراک کی طرز و روش بدل ڈالی۔ لندن کی رائل سوسائٹی اور دوسری علمی مجلسوں کے کارناموں سے اس کی تصدیق و توضیح۔

سائنس کا اقتصادی اثر ان بیشمار ایجادات متعلقہ فن جر ثقیل و فن طبیعیات سے ظاہر

ہوتا ہے جو چودھویں صدی کے آغاز سے کی گئی ہیں۔ ان ایجادات کا اثر صحت بدنی اور خانگی زندگی اور نیز فنون رزم و بزم پر۔

اس سوال کا جواب کہ سائنس نے بنی نوع انسان کو کیا نفع پہنچایا ہے۔ صفحہ

بارھواں باب

خطرہ کی آمد آمد

441

مذہب کے مبتلائے خطرہ ہونے کی قریب الوقوع علامات۔ کلیسائے روما جو نصرانیت کا رکن رکین ہے ان علامات کو پہچان کر آنے والے خطرہ سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے۔ پاپائے پائس تاسع مجلس عمومیہ مسیحیہ منعقد کرتا ہے۔ مختلف دول یورپ کے تعلقات پاپائیت کے ساتھ۔ کلیسا کے تعلقات سائنس کے ساتھ حسب تصریح مندرجہ مکتوب عمومی و تلخیص پاپائیہ۔

ویٹکن کونسل کے فتوے عصمتِ پاپا کے متعلق اور نیز دربارہ سائنس۔ کونسل کے فاصلہ کا خلاصہ۔ حکومت پروشیا اور پاپائیت کی مٹ بھیڑ۔ یہ مقابلہ تفوق اور غلبہ کے حصول کے لئے دراصل سلطنت اور کلیسا کا مقابلہ ہے۔ یورپ میں دو عملی حکومت کا اثر۔ ویٹیکن کونسل کا اعلان اس امر کے متعلق کہ پاپائیت سائنس کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ رومن کیتھولک مذہب کی تحکمانہ ساخت۔ خدا۔ الہام ایمان اور عقل کے متعلق اس کی تعریفات۔ اس کا سب و شتم۔ تمدن جدید پر اس کی لے دے۔

جماعت اتحاد انجیلیہ فرقہ پراٹسٹنٹ اور اس کے فیصلہ جات۔

سابق الذکر فیصلہ جات و فتاویٰ پر ایک عام نظر۔ مسئلہ زیر بحث کی موجودہ و آئندہ صورت۔

مقدمہ

کتاب معرکہ مذہب و سائنس

رقم زن جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ)
سیکرٹری انجمن اردو حیدر آباد دکن

----۱-----

جن لوگوں نے فردوسی کی زندہ کتاب شاہنامہ کو پڑھا ہے انہیں جنگ سہراب و رستم کی دلکش داستان یاد ہو گی۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف اور فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ دونوں آمادہ جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ پرالم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی۔

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب و سائنس کی رزم دکھائی ہے۔ مصنف کا زور قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں فاضل مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور انسانی فطرت پر ایسی غائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یونہی ٹھنی رہے گی؟ کیا انسان ہمیشہ اسی دھکڑ پکڑ اور دگدا میں رہے گا؟ کیا وہ یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اور نور ہدایت کبھی بھی نہ پہنچے گا؟ رستم و سہراب کے حال سے تین شخص واقف تھے ایک سہراب کا ماموں زندہ رزم جسے اس کی ماں نے اسی

غرض سے ساتھ کر دیا تھا- دوسرا بجیر- تیسرا کیکاوس- لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے- پہلا درحقیقت نیک نیت ہے اور اسی کام کے لئے آیا ہے لیکن قبل اس کے کہ کچھ کہے رستم کے ہاتھ سے مارا گیا- دوسرا طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہو گیا اور اس نے جان بوجھ کر اس راز کو چھپایا- تیسرے نے محض نفسانیت سے کام لیا- اسی طرح کی تین قوتیں مذہب و علم کی مصالحت میں بھی کھنڈت ڈالنے والی ہیں یعنی جہالت مخالفت حق اور نفسانیت لیکن توہمات اور نفسانیت ایک دن مٹ کر رہے گی- حق کا بول بالا ہو گا- دونوں مخالف ایک دوسرے کو جانیں اور پہچانیں گے- ظلمت کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے گا- دوستی دشمنی سے رنج راحت سے-اور ٹریجڈی کاڈی سے مبدل ہو جائے گی- اور انسان کی کشمکش اور الجھن کا خاتمہ ہو جائے گا- کیونکر اسے ہم آگے بیان کریں گے-

------ ۲ ------

بچے کو دیکھو اس کی ساری حرکات حیوانی اور اضطراری ہیں- اس کا ہاتھ پاؤں مارنا- غوں غاں کرنا- ڈر سے سہم جانا- پیار کرنے سے ہمک کر آنا- ماں کی محبت- غیروں سے وحشت غرض یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حیوانی قوی کا غلبہ ہوتا ہے اور دماغی قوی ادنے حالت میں ہوتے ہیں- جب بڑا ہو کر سیانا ہو جاتا ہے تو احساس اور خواہش کا زور شروع ہوتا ہے- اور اعلٰی دماغی قوی کے نشوونما سے نظام جسمانی کی قوت دھیمی پڑ جاتی ہے- احساس کی قوت بڑھ جاتی ہے اور حسی غدود اعصابی ساخت اور توسیع میں ترقی ہونے لگتی ہے- یہ حالت جوانی دیوانی کی ہے- جب شباب کامل ہو جاتا ہے تو تمیز حیوانی- احساس اور خواہشات عقل کی تابع ہو جاتی ہیں اور دماغی قوی اپنا رنگ دکھاتے ہیں-

لہٰذا انسان کی نشوونما کی تین صورتیں ہوئیں- حیوانی- احساسی اور عقلی-

قوۃ الحیوانیہ کے ذریعہ سے انسان اپنے جسم میں قوت جذب کرتا ہے- اور پھر اسے اپنے افعال- جذبات و خیالات اور ارادے میں صرف کرتا ہے- مثلاً" جسمانی ورزش یعنی اعصابی حرکت سے بھوک لگتی ہے- سخت رنج و الم یا غصہ یا دیگر جذبات کی وجہ سے آدمی نڈھال ہو کر کام سے رہ جاتا ہے- بات یہ ہے کہ حیات قائم رکھنے کے لئے ہمیں غذا کی ایسی ہی ضرورت ہوتی ہے جیسے انجن کو ایندھن کی- یہی ایندھن یا غذا عضلات یا اعصابی ریشہ میں بدل جاتی ہے- جب ہماری قوت صرف ہوتی ہے تو ہمارا اندرونی انجن حساب پورا

کرنے کے لیے ایندھن طلب کرتا ہے۔ اگر غذا نہ پہنچے گی تو حساب میں فرق آجائے گا۔ اور ضعف اس قدر بڑھ جائے گا کہ رشتہ حیات ٹوٹ جائے گا۔

قوۃ الحیونیہ قوت جمع کر لینے کے بعد اُسے حیوانی حسی یا عقلی حصے میں صرف کر سکتی ہے۔ تمام حیوانات سوائے انسان کے اس قوت کو اپنی نشوونما اور اس کے انتقال سے اپنی نسل کے نمو میں صرف کرتے ہیں۔ ان میں جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ غذا کی تلاش گھر کی ساخت اور زوج کی جستجو میں کام آتی ہے۔ انسان اس قوت کو جو وہ غذا سے حاصل کرتا ہے چاہے تو اپنے جسمانی حصے کی تکمیل پر صرف کر سکتا ہے۔ اور چاہے تو دماغی تکمیل میں ایک گنوار کو دیکھو اس کی زندگی بہت کچھ جانوروں سے ملتی جلتی ہے۔ وہ بہت بڑی مقدار قوت کی حاصل کرتا ہے اور اُسے وہ عضلات' گوشت اور خون کے بنانے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ اپنی زندگی کو قائم رکھے اور اپنی نسل کو بڑھائے۔ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ وہ اس قوت کو دماغ کی طرف رجوع کر دیتی ہے اور وہ یہ خون کی لہر تمام سطح پر پہنچاتی ہے۔ جس سے خاکستری رنگ کے عروقی مادہ میں اکساد پیدا ہوتا ہے اور یہ تغیر خیال کے پیدا ہونے کی علامت ہے۔ دن میں جو کمی ہو جاتی ہے رات میں نیند اس کی تلافی کر دیتی ہے اور دماغی ذرات میں اضافہ اور دماغی تلفیف گہری ہوجاتی ہے۔ اور اکساد کے لیے زیادہ گنجائش نکل آتی ہے۔ جس طرح بہت سی چیزیں خون کو بناتی اور بڑھاتی ہیں اسی طرح وہ بعض چیزوں کو بطور فضلے کے خارج بھی کرتا رہتا ہے جو پیشاب پسینہ وغیرہ کے ذریعہ سے نکل جاتی ہیں لیکن جس قدر قوت کہ جذب کی جاتی ہے وہ سب کی سب پیشاب وغیرہ کی راستہ سے خارج نہیں ہو جاتی۔ بلکہ دماغی ورزش سے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ دماغ میں رہتے ہیں۔ اور ان خیالات کو دماغ میں قائم رکھنے کے لیے بہت سا حصہ قوت کا صرف ہوتا ہے یہ قوت اس طرح مستشر رہتی ہے۔

صرف غذا کے ذریعہ سے ہی قوت دماغ میں داخل نہیں ہوتی بلکہ ہر حس کے ذریعہ سے کچھ نہ کچھ قوت پہنچتی رہتی ہے اور ہر عضلہ قوت کا توازن قائم رکھتا ہے۔ باصرہ' سامعہ' ذائقہ حرکت کی مختلف صورتیں ہیں۔ جس طرح برف آس پاس کی اشیا سے ایک مقدار حرارت کی جذب کر لیتی ہے۔ یہ حرارت قوت کی ایک صورت ہے۔ اور جب برف پانی کی شکل میں مبدل ہو جاتی ہے تو یہ قوت اس میں مستتر رہتی ہے۔ پانی جب بخار کی صورت اختیار کرتا ہے تو زیادہ قوت جذب کرتا ہے۔ اس طرح انجماد۔ سیلان اور تبخیر قوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح روشنی ایک قسم کی قوت ہے۔ جو روشن جسم کے

اجزائے صغیر کی کپکپاتی ہوئی حرکت پر مشتمل ہے۔ اس کی لہریں آنکھ کی پتلی میں پہنچتی ہیں اور پیچھے کی طرف ریٹنا (شبکہ) پر جا کر لگتی ہیں۔ اور اپنی حرکت دماغی اعصاب تک پہنچاتی ہیں جہاں وہ روشنی کے علم سے خیال کو پیدا کرتی ہیں۔ آواز بھی ہوا کی حرکت ہے۔ جب ہم اپنی انگلی سے ستار کے تار پر ضرب لگاتے ہیں تو ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس کی لہریں کان تک پہنچتی ہیں جو وہاں سے ڈرم (جوف طبل) میں تموج پیدا کرتی ہوئی اعصاب باصرہ میں جا گونجتی ہیں اور وہاں وہ موسیقی کے خیال سے مبدل ہو جاتی ہیں۔

غرض یہ کہ اعصابی فعل قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم اس صدمے کی قوت کو جو سرخی کی شعاعوں سے مشبکہ پر لگ کر دماغ پر پہنچتی ہے بتا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قوت کہاں صرف ہوتی ہے۔ لہٰذا وہاں پہنچ کر یہ مستتر رہتی ہے۔ جس طرح کہ سورج کی قوت کوئلے کی تہوں میں مستتر ہوتی ہے۔ اور اس وقت صرف ہوتی ہے جب وہ جلتا ہے اسی طرح سرخ روشنی کی موجوں کے صدمے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ دماغ میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں جا کر خیال میں مبدل ہو جاتی ہے۔ اور حالت منفعلہ میں رہتی ہے۔

جہاں ادراک نہیں ہوتا وہاں کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ مادر زاد اندھے کے دماغ میں سرخی کا کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنے کے اعصاب میں وہ قوت نہیں پہنچی جس سے سرخی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ نفی سے نفی پیدا ہوتی ہے۔ اور عام خیال اور عالم مادی دونوں میں یہ حالت یکساں ہے۔

پس جس چیز کو ہم نے دیکھا سنا سونگھا یا چکھا نہیں اس کی نسبت ہم خیال بھی قائم نہیں کر سکتے۔

عالم خیال یادداشتوں کے مجموعے یا اس کے صرف کا نام ہے۔ یہ یادداشتیں ادراکات کے آثار باقیہ ہیں۔ اگر خیال صرف نہ کیا جائے تو وہ باقی رہے گا۔ مثلاً فرض کرو حسن کا خیال ہے۔ جب ایک مصور کوئی تصویر بنا رہا ہے اور اس خیال کو کام میں لانا چاہتا ہے تو یہ مستتر قوت اس کے دماغ میں سے فوراً نکل آتی ہے۔

جانور کا فعل اضطراری ہوتا ہے۔ جسے تمیز حیوانی کہتے ہیں وہ احساس ظاہری کے تابع ہوتی ہے تعقل سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ انسان میں احساس کا اثر اعصاب دماغی تک جاتا ہے جہاں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ خیال شامل مسل رہتا ہے۔ ادراک عقل کا دروازہ ہے۔ احساس علم ہے بیرونی اشیاء کا جو جسمانی اثر سے حاصل ہوتا ہے۔ ادراک میں یہ

اعصابی اثر ایک مرحلہ اور طے کرتا ہے اور بوجہ اس توافق کے جو دماغ اور بیرونی دنیا میں ہے یہ ذہنی صورت اختیار کرتا ہے اور عقلی یا دماغی مظہر بن جاتا ہے۔ بعض اوقات آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں مگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لیے کہ ہماری توجہ دوسری طرف ہے۔ یا بعض اوقات ہم آوازیں سنتے یا کتاب پڑھتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن جونہی کہ رکاوٹ رفع ہو جاتی ہے۔ احساس دماغی اعصاب تک پہنچ جاتا ہے اکساد واقع ہوتا ہے اور ان الفاظ کے مطابق جو ہمارے کان تک پہنچے تھے خیال کی صورت قائم ہو جاتی ہے۔

وہ اعصاب دماغی احساس سے متاثر ہوتے ہیں مقام جذبات لطیف انسانی ہیں۔ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ خیال کو جذبات لطیفہ کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے مثلاً" میں نے ایک شے دیکھی۔ اس کا ادراک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خوف کے جذبہ کو تحریک ہوئی دل سکڑنا اور دم گھٹنا شروع ہوا۔

انسان میں دماغ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عقل کا دارالخلافہ ہے اور اسی کی وجہ سے انسان و حیوان اور شائستہ اور غیر شائستہ انسانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ شائستہ اور مہذب اقوام کے لوگوں میں دماغ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ بہ نسبت حبشیوں یا اور جنگلی لوگوں کے بھیل یا گونڈ کی زندگی جن کا انحصار اس کے جسم کی چستی اور چالاکی پر ہے اس لیے اس کی قوۃ حیوانیہ بہ نسبت دماغ کے جسم پر زیادہ صرف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے افراد کا انحصار زندگی عقل پر ہے اور اس لئے اس کی قوۃ الحیوانیہ دماغ کو بڑھاتی اور جسم کو کمزور کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عضلات کی ورزش سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوۃ الحیوانیہ کی توجہ زیادہ عضلاتی ریشوں کے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے فہم تیز ہو جاتا ہے۔ یعنی قوۃ الحیوانیہ دماغی مادہ کی پرورش میں لگ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر ہم اپنی قوت عضلاتی ورزش میں صرف کرتے ہیں اسی قدر عقلی فعل کمزور ہو جاتا ہے اور جس قدر دماغی کام پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر عضلاتی قوت ضعیف ہو جاتی ہے۔

دماغ کی فضیلت کے تو سب قائل ہیں۔ لیکن جذبات انسانی کچھ ایسے قابل وقعت نہیں سمجھے جاتے حالانکہ یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ لہٰذا اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جذبات عقلی تحریک کے بہت بڑے محرک ہوتے ہیں اور ہمارے رنج و راحت کا حساب

انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ بعض چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہیں یا بعض آوازیں ہم ایسی سنتے ہیں جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے جذبات ہماری عقل کو ابھارتے ہیں کہ ایسا ڈھنگ نکال کہ ان خوشگوار اثرات کا پھر اعادہ ہو سکے لیکن بخلاف اس کے جب ہم بعض چیزیں ایسی دیکھتے ہیں یا بعض آوازیں ایسی سنتے ہیں کہ وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں تو ہمارے جذبات عقل کو ایسے ڈھنگ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کا نام نہ آنے پائے۔

مطالعہ میں اگر لطف نہ آئے تو انسان کی دماغی ترقی کا خاتمہ ہو جائے۔ بال بچوں عزیزوں اور دوستوں سے محبت نہ ہو تو نہ کوئی خاندان ہو نہ لطف محبت ہو۔ شکل رنگ اور آواز کے تناسب سے اگر خوشی نہ ہو تو فنون لطیفہ بھی نہ ہوں۔ یہ سب جذبات کا کھیل ہے۔

جذبات درحقیقت عقل اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشوونما انسان کی بہبود اور ترقی کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسے قوائے عقلی کی نشوونما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً" ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان میں ان بن ہو جاتی ہے۔ مثلاً" خواہش کا رجحان ایک خاص طرف ہے۔ مگر عقل کہتی ہے کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ اور یہی بنائے مخاصمت ہوتی ہے۔

جذبات کا اثر جسم پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ غصہ کرنے سے دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مارے شرم کے تمام سطح جسم پر خون دوڑ جاتا ہے۔ شدید جذبات کے اثر سے دماغی ریشوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے اور دماغی امراض سے عقل میں فتور آجاتا ہے۔ ایک خبیث بدباطن کے چہرے کو دیکھئے کیسی پھٹکار برستی ہے بخلاف اس کے ایک نیک نفس زندہ دل کے چہرے کو ملاحظہ کیجئے جیسے پھول کھلا ہو۔

اسی طرح جسمانی حالت کا اثر جذبات اور جذبات کے ذریعہ سے دماغ پر پڑتا ہے۔ بیمار آدمی کیسے چڑچڑے اور غصہ ور ہو جاتے ہیں۔ قوی آدمی کے جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور ضعیف کے ضعیف۔ جب طبیعت نڈھال ہوتی ہے تو خواہشیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔

غرض جذبات اور عقل دماغ کی دو حالتیں ہیں ایک زنانہ ہے دوسری مردانہ۔ اگر صرف عقل ہی کی نشوونما اور ترقی زیادہ ہو گی تو جذبات محدود اور کمزور ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر عقل کی طرف سے غفلت کی گئی اور جذبات کی پرورش زیادہ ہوئی تو انسان ذکی الحس اور ہردلعزیز اور کم عقل ہو جاتا ہے۔

جذبات کا کام عقل کو تحریک دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال پر لانا ہے۔ وہ ایک

دوسرے کی امداد کے لیے ہیں نہ کہ زائل کرنے کے لیے

عقل انسان میں تشخص اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور جذباتی مدنیت اور انس بحیثیت عقل کے وہ ایک اور اکیلا ہے۔ اور بحیثیت جذبات کے وہ منجملہ اوروں کے ایک ہے۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی اپنے ابنائے جنس سے بھاگتا اور صحبت سے نفرت کرتا ہے۔ اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔ لیکن پرزور جذبات والے آدمی کے لیے تنہائی موت ہے۔ وہ دوسروں میں ایسا گھل مل جاتا ہے کہ اس میں سے رفتہ رفتہ رنگ تشخص غائب ہو جاتا ہے۔ اور خیالات کو باقاعدہ ترتیب دینے کی قوت نہیں رہتی۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی خود مختار اور آزاد سا ہو جاتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ جہاں عقل ہی عقل ہوتی ہے۔ اور جذبات نہیں ہوتے وہاں صرف اپنی حفاظت اور اپنا ہی خیال ہوتا ہے جو خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے۔ جذبات اسمیں صرف اپنی ایک ذات تک نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کی طرف بھی مائل کرتے ہیں اور دوسرے انسانوں اور اشیائے قدرت سے محبت ہوتی ہے اوروں کے درد کو ہم اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے دماغی قوی اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔

عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا۔ ظاہر اور باطن میں موافقت قائم رکھنا۔ ایک دوسرے کو حد اعتدال سے نہ بڑھنے دینا جسم کے افعال کو عقل و جذبات کے زیر حکومت رکھنا مذہب کا کام ہے۔

فلسفہ و منطق اور علوم نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ تمدن، پالیٹکس اور اتحاد مقاصد انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے ہیں لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل و جذبات کو ساتھ ساتھ اور برابر بڑھائے۔ باہم اعتدال قائم رکھے۔ اور قوت حیوانی کو دماغی اور احساسی حصہ جسم کی پرورش اور نشوونما میں یکساں صرف کرے۔

—— ۳ ——

حیات کے دو مقصد ہیں ایک ذاتی ترقی دوسرا افزائش نسل۔

قوت کے انجذاب کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اندفاع بھی کیا جائے اور اس غرض سے کہ وہ مادہ اور قوت کا انجذاب اور اندفاع کر سکے حیات کے لیے ضروری ہے کہ اس میں معرفت طبعی ہو۔ جہاں ساخت اعضاء ادنے درجہ کی ہے وہاں یہ کم ہوتی ہے۔ اور

جہاں ساخت پیچیدہ ہوتی وہاں زیادہ ہوتی ہے۔

بقول لب نٹز کے حیات تجربات میں سوتی ہے۔ پھولوں میں خواب دیکھتی ہے اور انسان میں جاگتی ہے۔

اس معرفت طبعی میں ارادہ ہونا چاہئے زندہ رہنے' بڑھنے اور نسل کے بڑھانے کا۔ نیز طبعی تمیز ہونی چاہئے جس کے ذریعہ سے وہ سمجھے کہ کیونکہ زندہ رہنا بڑھنا اور نسل بڑھانی چاہئے۔ بغیر اس تمیز کے ترقی حیات کے لیے مناسب اور غیر مناسب اشیاء کا انتخاب کرنا ممکن ہے۔ اور بغیر اس ارادہ کے کہ زندہ رہنا چاہئے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

تمیز طبعی افزائش اور نشوونما کا پیمانہ ہے۔ اس کا تعلق ہر وجود کی ضروریات سے اس طور پر ہے کہ حیات کے ان دو مقاصد کے لیے کافی ہو۔ کیونکہ اگر یہ تعلق اس طرح قائم نہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کی قوت ایسی شے کے حاصل کرنے میں صرف ہو جائے جو حاصل نہیں ہو سکتی اور قوت کی تولید ضائع اور بیکار ہو جائے۔ پودے کو نشوونما کے لئے روشنی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ پودا کسی اندھیرے اور گرم حجرے میں لگا دیا جائے تو جو قوت اس نے زمین سے حاصل کی ہے وہ اس شے کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جائے گی جو وہاں نہیں مل سکتی۔ جب یہ قوت اس کوشش میں صرف ہو جائے گی تو وہ مرجھانا شروع ہو گا اور مر جائے گا۔

پودے کی نشوونما کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پانچ چھ ہیں۔ وہ اسے کچھ تو اس زمین سے حاصل ہو جاتی ہیں جس میں وہ لگا ہوا ہے اور کچھ ہوا اور روشنی سے۔

حیوانی زندگی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ ایک جگہ نہیں۔ بلکہ دور پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کے جمع کرنے لیے اسے حرکت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ اسے دی گئی ہے۔

حیوانات کو ایک اور محرک شے عطا ہوتی ہے جو پودوں میں نہیں۔ یعنی خوشی کا احساس یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ایسا فعل کرتا ہے جو اس کی کامل نشوونما کا باعث ہوتا ہے اور ایک احساس تکلیف کا ہے جو اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس سے ایسا فعل صادر ہو جو اس کی ترقی کو روکے۔ اگر اسے تکلیف محسوس نہ ہو تو وہ کھانے کی بھی کوشش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی حیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حواس ارادہ کو اکساتے اور تمیز طبعی کو سبق دیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ ایک دوسرے سے مقدم ہیں اور نہ ایک دوسرے کا پیدا کرنے والا ہے۔ چھوٹا پرندہ انڈے کے اندر نہ صرف

خیال کرتا ہے بلکہ اس سے فعل بھی صادر ہوتا ہے کیونکہ وہ نکلنے کے لئے خول توڑتا ہے۔ اور باہر نکلتے ہی دانہ چننے کے لئے چونچ کھولتا ہے۔ قید کی حس نے اس کے ارادے کو ابھارا جس سے اس کے عضلات حرکت میں آئے اور خول ٹوٹ گیا۔ لیکن یہ تمیز طبعی کا کام تھا۔ تجربہ سے کچھ علاقہ نہیں۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ کونسے ایس مجبس توڑ کر باہر نکلا تھا۔ اسی تمیز نے اس کی چونچ کھلوائی۔ یہ ننھا سا جانور زندہ ہے اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے اسے زندگی دی گئی ہے اور زندگی کے ساتھ زندگی کی محبت بھی عطا ہوئی ہے۔ چھوٹا بچہ دنیا میں ارادے تمیز طبعی اور احساسات کے ساتھ آتا ہے۔ زندہ رہنا اس کے لیے لطف ہے۔ خواہش اس کا پہلا احساس ہے۔ اس خواہش کا پورا ہونا اس کی پہلی خوشی ہے۔ خواہش کا پورا نہ ہونا اس کی پہلی تکلیف ہے اور اس کی طلب اس کی پہلی کوشش ہے۔ کس تجربہ نے اسے یہ بتایا ہے کہ منہ اور گلے کے ذریعے دودھ کا پینا اس کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ یہ تمیز طبعی ہے جس نے اسے اس فعل پر آمادہ کیا۔ جس سے اس کی بھوک کا احساس رفع ہوا۔

حیوانات کو خوشی اور تکلیف کے ایسے احساسات ہوتے ہیں جو اس کی حیوانی نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر چیز جو حیوان کے اردگرد پائی جاتی ہے جہاں تک کہ اس کی ذاتی نشوونما یا اس کی نسل کی افزائش کا تعلق ہے یا تو اسے خوشی دیتی ہے یا تکلیف۔

نظام اعصابی ایک بڑا قوی آلہ قوت پہنچانے کا ہے۔ تاہم جسم پر حسی اعصاب پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب اعصابی مرکز سے پھوٹتے ہیں جس میں باریک باریک اعصابی جڑیں ہوتی ہیں اور آپس میں خوب ملی ہوتی ہیں سب سے بیرونی عصبہ جو اثر حاصل کرتا ہے وہ اسے دماغ تک پہنچاتی ہیں۔ اور وہاں یہ اثرات یا خیالات جمع رہتے ہیں اور ان خیالات پر سے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ دوسرے حیوانات خیالات سے کام نہیں کرتے ہیں سوائے اس حالت کے جب وہ ان دو مقاصد کے مفید ہوں۔ یعنی ذاتی فلاح اور افزائش نسل۔

انسان اور بھی کئی باتوں میں دوسرے حیوانات سے مختلف ہے۔ دوسرے حیوانات کو جو گرمی سردی محسوس کر سکتے ہیں۔ فطرت نے لباس اور پناہ دے رکھی ہے۔ مثلاً ان کے بال یا پر یا خول ہوتے ہیں یا زمین کے اندر کھوؤں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ جہاں گرمی سردی کا گزر نہیں۔ لیکن جسم انسان کی اعصابی سطح بہ نسبت دوسرے حیوانات کے احساس کرنے میں بہت تیز ہے اور تاہم وہ دنیا میں بے بال و پر کے ننگا منگا آتا ہے لہٰذا اسے مصنوعی لباس کی ضرورت ہوئی لیکن لباس کے تیار کرنے کے لئے اسے ایسی قوت عطا کی گئی

ہے جو دیگر حیوانات کی تمیز طبعی سے اعلے ہے۔

اسی طرح عقل انسان کی حیوانی فطرت کے لیے ضروری ہے۔ ہر حیوان کو ایسی قوت عطا ہوئی ہے جو اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور یہ قوت اس ضرورت کی مناسبت سے ہوتی ہے۔

بھیڑ مادہ اور قوت کو غذا سے اپنے میں جذب کرتی ہے اور وہ قوت اون کی شکل میں مادہ کو پیدا کرتی ہے۔ انسان میں یہی مادہ اور قوت ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے اور دماغ پیدا کرتا ہے۔ جو اسے مصنوعی طور سے سردی سے بچانے میں مدد دیتا ہے۔

اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ان کی وسعت محض شہوانی زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو۔ مگر کثرت سے اقوام انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان کی آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو ہماری زندگی کے اس حصے کو منور کرتی ہے جسے حیوانی یا مادی زندگی سے کچھ تعلق نہیں، ہمیں رنگوں کے تناسب۔ حسن صورت اور آوازوں کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے۔ حیوانی زندگی کو ان کی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس میں حیوانی احساس کے علاوہ ایک اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطرتی تمیزوں۔ احساسات اور قوت ارادی کا محض بیکار جاتا ہے۔ انسان ایسی اشیاء سے بے حد مسرت اور لطف حاصل کرتا ہے۔ جنہیں اس کے حیوانی احساس سے کچھ تعلق نہیں۔ آسمان پر خوشنما اور خوش رنگ دھنک کو دیکھ کر کتے یا گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ انسان اس سے لطف اٹھاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دیکھنے سے اس کی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ جو اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے یہاں تک کہ بچے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں۔ لوری یا گانا سننے سے انہیں مزہ ملتا ہے۔ خوبصورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں۔

انسان کی ساخت میں حصہ اسفل میں حیوانی آلات ہیں اور حصہ اعلے میں روحانی آلات۔ حصہ اسفل کو ہاضمہ اور توالد سے متعلق ہے۔ اور حصہ اعلے قوت حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ جسے حصہ اسفل توالد و تناسل میں صرف کر دیتا ہے۔ حصہ اعلے میں دماغ یعنی مقام عقل ہے۔ قوت حیوانی ارادے کے زور سے ہر طرف پہنچ سکتی ہے۔ جذبات گویا اس طرح واقع ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے فطرت حیوانی یا فطرت روحانی کی طرف مائل ہو سکتے

ہیں۔

وحشی اقوام میں قوت حیات شہوانی زندگی میں صرف ہوتی ہے اور دماغ بیکار رہتا ہے لیکن تعلیم یافتہ اقوام میں قوت حیات زیادہ تر دماغ کی طرف مائل ہوتی ہے اور شہوانی زندگی کمزور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سخت دماغی محنت سے اعصابی ریشے زیادہ بیکار ہوتے ہیں اور ان کی درستی کے لئے دوسرا اعصابی مادہ صرف ہوتا ہے۔ اور وہ ذات جو توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں بننے بند ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جس قدر دماغی محنت کی جائے گی اسی مناسبت سے وہ توالد و تناسل کے مزاحم ہو گی۔ کیونکہ دماغی محنت میں وہ تمام قوت صرف ہو جاتی ہے جو بصورت دیگر ان ذرات کے بنانے میں صرف ہوتی جو توالد و تناسل کا باعث ہوتے ہیں۔

جب توجہ فطرت حیوانی کی طرف ہوتی ہے اور جذبات و عقل کو اس کے تابع کر دیا جاتا ہے تو دماغ صرف اسی قدر کام دیتا ہے جیسے دوسرے حیوانات میں تمیز طبعی اس وقت وہ مسرت جو حصول علم ورزش عقل' احساس حسن وغیرہ سے ہو سکتی ہے۔ زائل ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جب عقل پر بجید زور دیا جاتا ہے تو رنج و راحت کا وہ احساس جو ان چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جو حیوانی فطرت سے بہت پرے ہیں تیز ہو جاتا ہے۔ اور فطرت حیوانی کمزور ہو جاتی ہے۔

رنج راحت کا ادراک کیا ہے؟ یہ درحقیقت قوت کی تحلیل کا نام ہے چنانچہ دوسرے حیوانات کی زندگی دیکھو کہ انسان کو جن چیزوں سے لطف آتا یا صدمہ ہوتا ہے اسے نہیں ہوتا۔ ایک گنوار کو عمدہ تصویر یا خوشخط کتاب دکھاؤ اسے کچھ لطف نہ آئے گا۔ کیونکہ اس کے دماغ میں کوئی شے اسے گرفت یا تحلیل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کی حالت صاف شیشے کی چادر کی سی ہے جس میں شعاعیں آئیں اور نکل گئیں۔

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی قوت ہے ایک روحانی قوت بھی ہے اور روحانی توالد و تناسل کا سلسلہ عالم خیال میں جاری ہے مگر اس طرح نہیں جیسے ہم عالم مادی میں پاتے ہیں۔

پانسو برس ہوئے ایک بڑے دانشمند نے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے خیالات ننھے ننھے بیج تھے جو ڈال دیئے گئے۔ میں نے اس کتاب کو کھولا اور پڑھا۔ ان بیجوں نے میرے دماغ میں جڑ پکڑی۔ بڑے ہوئے اور پھولے پھلے۔ میں نے ان خیالات کو بات چیت یا تحریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچایا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی خیالات وہی باتیں وہی

تخیل نسلاً بعد نسل پیدا ہوا اور بڑھا اور زمانہ کی مناسبت سے اس میں تغیر تبدل بھی ہوتا رہا۔ گویا یہ سب ان اصلی خیالات کی زندہ اولاد ہیں جو اس وقت وجود میں آئے تھے جب تاریخ کا نام و نشان بھی تھا۔

قطع نظر اس قیاس کے ہم مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ قوت میں کیسی کیسی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً قوت ہی کے تغیر و تبدل سے روشنی و حرارت اور برق جیسی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دماغ میں بھی تغیر و تبدل سے قوت افعال ارادہ ادراک اور خیالات و جذبات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حیوانی زندگی میں رنج و راحت سے قوت کی تحلیل کا پتہ لگتا ہے اور ہم اس قوت کا اندازہ جو بڑھتی اور نشوونما پاتی ہے اس قوت سے کر سکتے ہیں جو جذب یا داخل ہوئی تھی روحانی زندگی میں بھی رنج و راحت قوت کی تحلیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو قوت کہ جذب ہوئی ہے وہ خیالات کے سلسلہ سے نشوونما پاتی ہے۔

مقصد حیات جس کے کارکن رنج و راحت ہیں حیوان کی نشوونما اور اس کی نسل کی افزائش ہے۔ روحانی احساس کا مقصد روحانی زندگی کی نشوونما ہے۔ جسم میں قوت کا انجذاب ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندفاع ہوتا ہے۔ اب جو باقی رہی اس سے نشوونما ہوتی ہے۔ حیاتی کے ذریعہ سے روحانی زندگی بڑھ سکتی اور نشوونما پا سکتی ہے۔ ہر درخت اور حیوان کی نشوونما کی ایک حد ہے۔ تو روحانی زندگی کی حد کیا ہے؟

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایسی مسرتوں کا احساس ہوتا ہے جنہیں مادی فلاح سے کچھ تعلق نہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی ایسی قوت ہے جو ہمیں کسی خاص سمت لئے جا رہی ہے۔ وہ سمت کیا ہے؟

دنیا نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی غایت تمدنی اور پولیٹیکل ترقی ہے اور اسی پر اسے ساری ہمت اور قوت صرف کر دینی چاہئے اس خیال کی بنا پر بنی نوع انسان کل ایک ہیں جن کا مقصد موجودہ کی تکمیل اور آئندہ کا کمال ہے۔ گزشتہ تجربہ اور علم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اور آئندہ زمانہ موجودہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہو گا۔ غرض تمام توجہ اور خیال انسان کی آئندہ ترقی پر ہونا چاہئے۔ اور نیکی اور برائی اس میں ہے کہ جس سے عام بنی نوع انسان کی بہبودی یا مضرت مقصود ہو۔

لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عقلی ترقی جسمانی انحطاط کا باعث ہوتی ہے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی جائے اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو وحشی اقوام

میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک وحشی قوم کے بدتر اور ضعیف اور مریض افراد بچپن ہی میں مر جاتے ہیں۔ مہذب ممالک میں امراض اور جسمانی نقائص بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ کیونکہ سائنس ان خرابیوں کی حفاظت کرتا انہیں پھیلاتا اور آئندہ نسلوں تک پہنچاتا ہے۔ وحشی اقوام میں ازروئے انتخاب فطرت ضعیف اور مریض خود بخود مر جاتے ہیں۔ مہذب اقوام میں اس قانون پر عمل نہیں ہونے پاتا۔ اور اس لیے قوم میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

سب سے ادنے جان داروں میں سب سے زیادہ افزائش نسل ہوتی ہے۔ بعض چھوٹے جان دار ایسے پائے گئے ہیں کہ چند گھنٹوں میں اس قدر بچے پیدا کر دیتے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں بلوغ تک پہنچنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور بچے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن جانوروں میں عقل کا درجہ بڑا ہے ان میں اولاد بھی کم ہوتی ہے۔ انسان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے۔ غریب لوگ جنہیں جسمانی ورزش زیادہ کرنی پڑتی ہے اور عقل سے کام کم لینا پڑتا ہے۔ ان کے کثرت سے بچے ہوتے ہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جنہیں دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کے اولاد کم ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے تمدنی ترقی تقسیم کار میں ہے۔ غیر متمدن حالت میں جو کام ایک شخص کرتا تھا۔ وہ اب بیس شخص کرتے ہیں۔ پہلے ایک ہی شخص لوہار' بڑھئی' درزی' موچی' معمار ہوتا تھا۔ تھوڑی ترقی کے بعد لوہار کا کام ایک کرنے لگا۔ بڑھئی کا دوسرا۔ درزی کا تیسرا۔ موچی کا چوتھا۔ معمار کا پانچواں۔ اسی طرح ایک ایک پیشہ ایک ایک شخص کو مل گیا۔ اب جو اور ترقی ہوئی تو ایک ہی پیشے کی کئی شاخیں ہو گئیں۔ اور ہر شاخ کا کام علیحدہ علیحدہ شخص کرنے لگا۔ اور روز بروز کام کی تقسیم کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بولتا جاتا ہے۔ دوسرا لکھتا ہے۔ تیسرا صاف کرتا ہے۔ چوتھا اسے صحیح کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخص کا کام ہے۔ کیا درحقیقت یہ تقسیم کار ترقی کی علامت ہے۔

انسان یہاں کچھ ایسے بکھیڑوں اور مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کی خوشی کا دارو مدار زیادہ تر اس کی ذات پر ہے۔ اسے یہ خیال ہرگز تسلی نہیں دے سکتا کہ آئندہ دو ہزار یا تین ہزار سال کے بعد انسان کی تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ اس خیال سے اس کی تکلیف یا درد میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ایک ایسی قوم میں جو اعلے درجہ کی مہذب نہیں خوشی کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ بہ نسبت ایک ایسی قوم کے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ اور

مہذب ہے۔ ایک گنوار یا کھیت کے مزدور کو دیکھو کیسا خوش اور مگن ہے۔ برخلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاؤ مثلاً" لندن پیرس۔ شکاگو۔ نیویارک میں جو چشم و چراغ عالم کہلاتے ہیں۔ وہاں امرا خوشی کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں' دولت صرف کرتے ہیں لیکن پھر بھی خوش نہیں رہ سکتے اور غریب ہیں کہ قعر مذلت و افلاس میں پڑے ہیں۔ لہٰذا محض تمدنی و پولیٹیکل ترقی اور محض یہ خیال کہ آئندہ کسی بعید زمانے میں یہ تکلیف اور رکاوٹیں رفع ہو جائیں گی انسان کے دل کو تسلی نہیں دے سکتا۔

اب دوسرا جواب مذہبی عقیدہ میں ہے۔ مذہبی خیال میں حیوانی فطرت کو دخل نہیں۔ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور ابھارتا ہے۔ بہ نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلق عام بہبودی سے ہو۔ اور انسان میں ایک ایسی خواہش موجود ہے۔ اس میں کچھ شبہ ہو نہیں سکتا۔ عام بہبودی یا ایثار کا خیال ذاتی بہبودی کے خیال کو روک دے گا۔ اور تمدنی اور سیاسی ترقی کی طرف لے جائے گا۔ انفرادی بہبودی کا خیال انفرادی ترقی کا باعث ہو گا۔ ان قوی اور امتیازات کا وجود ہر انسان کو دیگر حیوانات سے ممیز کرتے ہیں قطعی ہے۔ دوسرے حیوانات اس وقت تک نہ کوئی خیال سوچتے ہیں اور نہ کسی خیال کو اپنی خواہش کا مصداق قرار دیتے ہیں جب تک کہ وہ ان کی ذاتی نشوونما یا ترقی کا باعث نہ ہو۔ گھوڑا کبھی گوشت کھانے کا خیال نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی ذاتی نشوونما کے لئے ضروری نہیں پس وہ چیزیں جن کی طرف انسان کی دماغی اور جذباتی فطرت دوڑتی ہے ان کا بھی ضرور کوئی وجود ہے۔ تمیز طبعی ایک قسم کی خواہش ہے جو ہمارے وجود کے قانون کا اتباع کرتی ہے۔ اور ہر قانون کا مقصد مخلوق کی خوشی اور تکمیل ہے۔

انسان کی مذہبی تمیز کا سراغ لگانا اس کی بہبودی کے قانون کا سراغ لگانا ہے۔ جب مذہبی تمیز ہم میں نمودار ہوتی ہے تو وہ ہماری روحانی فطرت کی آواز ہے جو اس غذا کو طلب کرتی ہے جو اس کی حیات و تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ جب کبھی مذہبی تمیز ہمیں غلطی کی طرف لے جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مذہبی تمیز غلط ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس نے اسی قسم کی دوسری تمیزوں کو دبا دیا ہے۔ مثلاً" ہر طریقہ گورنمنٹ صحیح اصول پر قائم ہوتا ہے لیکن جب وہ دوسرے صحیح اصولوں کو پامال کر دیتا ہے تو اس طریقہ گورنمنٹ میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں غلطی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ مجموعہ توہمات ہو جاتا ہے تو اس کے نظام میں خرابی واقع ہو جاتی ہے کسی ایک صداقت میں مبالغہ

کیا جاتا ہے اور اسے آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے اور دوسری صداقتوں سے بالکل روگردانی اختیار کرلی جاتی ہے۔ اس وقت مذہب کو زوال شروع ہوتا ہے۔

انسان میں دو طبعی تمیزیں ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی تمدنی زندگی پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ہر واقعہ کے سبب دریافت کرنے کی چونپ ہے۔ دوسرے منتہائے کمال کا تصور۔ اب ہم ان دونوں پر الگ الگ غور کریں گے۔

انسان کے دماغ پر وہ دو قسم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک بیرونی اشیاء کا اثر حواس کے ذریعہ سے یعنی حس ایک ذریعہ ہے جس سے بیرونی اشیاء اور دماغ میں تعلق قائم ہوتا ہے اگر کسی میں کوئی حس نہیں تو اس حس کی وجہ سے جو خیال قائم ہوتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً" ایک مادر زاد اندھے کو سرخی کا کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اندرونی اثرات جو دماغ خود اپنے تعلق سے جس سے انسان کی شخصیت قائم ہے حاصل کرتا ہے۔ یہ مسرت۔ غصہ۔ اور خواہش کے ادراک ہیں۔

یہ ادراکات مفرد اور غیر منقسم ہیں اور تعریف کی حدود میں نہیں آ سکتے گویا معرفت طبعی کے انتہائی سالمات ہیں جن کے ملنے اور ترکیب پانے سے بے شمار مختلف صورتیں قائم ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں ادراکات پر بعض ایسے ابتدائی عقائد کی بنیاد ہے جو بہت عام ہیں اور انسان بہت ابتدا میں انہیں حاصل کرتا ہے۔

علت و معلول کا عقیدہ بھی اسی قسم کا ہے۔ تمیز طبعی انسان کو علت و معلول کی تلاش پر ابھارتی ہے۔ کیونکہ اس کی صداقت کا اسے پورا یقین ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی ترقی ناممکن ہے۔ اور دنیا محض اتفاقی نتائج کا مجموعہ نظر آئے گی۔ اور حکمت و سائنس اور علم و اخلاق کا مطالعہ بیکار ہو گا۔

علت کے معنی کیا ہیں؟ جس کی وجہ سے کوئی شے وجود میں آتی ہے علت اولے کہلاتی ہے۔ اور بعد ازاں جو اس میں تغیر و تبدل کرتی ہے اسے علت ثانیہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی جسم جو حرکت میں ہے کسی دوسرے جسم سے جو ساکن ہے ٹکرائے اور اسے حرکت دے تو اس کی علت ثانیہ پہلے جسم کی قوت متحرکہ ہے لیکن ساتھ ہی خیال اس طرف بھی جاتا ہے کہ پہلے جسم کی حرکت کی بھی کوئی علت ہے۔ علل ثانیہ ایک سلسلہ علل کا ہے جو علت اولے پر جاکر ختم ہوتا ہے اور انسان فطرتاً" علل ثانیہ کے سلسلہ میں اس مصدر حرکت کو ٹٹولتا ہے۔ جو خودبخود پیدا ہوئی اور جسے وہ علت اولیٰ کہتا ہے۔

علت کا خیال مفرد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک تو خیال وجود کا ہے اور دوسرے اس

تعلق کا جو عدم سے وجود میں آتا ہے۔ صرف وجود کا ہونا علت کے خیال کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ تصور ممکن نہیں ہے کہ وہ سلسلہ علت و معلول سے بالکل الگ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شے ہے تو اگرچہ ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان سے کیا مطلب ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہم اسے پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں۔ اب اگر ہم ان تمام اشیاء کو جو نہیں ہیں الگ کر دیں۔ نیز ہم یہ فرض کر لیں کہ کوئی اور ایسی شے نہیں ہے۔ جو ان کے پیدا کرنے والی ہو یا ان کے پیدا کرنے میں اس نے حصہ لیا ہو۔ تو عدم سے وجود میں آنے کی حالت ہمارے لئے بالکل ناقابل تصور ہو گی ہم دیکھتے ہیں کہ عدم سے وجود میں آنے کی حالت کا خیال بالکل ناممکن ہے۔

جو عدم کی حالت سے وجود میں آتا ہے تو اسے اس حالت کے پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو اس سے بالکل الگ ہو۔ یہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہے۔ جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فلسفی سلسلہ علت و معلول سے انکار کرتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں ہر وقت اور ہر آن اسی پر عمل کرتے ہیں۔

کیا یہ عقیدہ قابل اعتماد ہے یا محض دھوکا ہے؟

اگر یہ دھوکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان علت کا خیال اس واقعہ سے متعلق کرتا ہی۔ جو دوسرے واقعہ سے وقت میں مطابق یا اس سے قبل ہے۔ چاند کی تبدیلی اور موج کی مد ایک ہی وقت میں پائی گئی۔ انسان نے چاند کی تبدیلی کو موج کی مد کا باعث قرار دیا لیکن یہ کیوں نہیں خیال کیا کہ چاند کی کمی بیشی موج کی مدوجزر کی تابع ہے۔

ایک کے بعد دوسرے واقعہ کا ہونا ہمیشہ یکساں پایا گیا ہے۔ اس میں بھی تغیر و تبدل نہیں پایا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یکسانی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور تاہم علت کا خیال ان میں سے کسی پر عائد نہیں کیا گیا۔ دن رات کے بعد آتا ہے مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ رات دن کی علت یا سبب ہے۔

علت و معلول کا نتیجہ تجربہ سے اور پختہ ہو جاتا ہے۔ تجربہ یقین کا معلم ہے جس طرح احساس تمیز طبعی حیوانی کا۔ اگر تجربہ نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ سمجھتے کہ کسی علت کا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ وجود کے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ قوت کا خیال بھی ہو۔ قوت کا تصور ہو سکتا ہے لیکن یہ ہم نہیں جان سکتے کہ کوئی چیز حقیقت میں ویسی ہے۔ اس طرح قوت کا خیال توہم میں ہے مگر مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

علت و معلول کا عقیدہ نہ صرف ہماری نشوونما بلکہ ہماری اعلےٰ ہستی کی ترقی کے لئے

بھی ضروری ہے حیوان کو علت کا کوئی خیال نہیں وہ صرف علل ثانیہ کو دیکھتا ہے۔ کوا تجربہ سے بندوق دیکھ کر ڈرنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نالی میں سے گولی نکلی تو مجھے چوٹ لگے گی یا میں مر جاؤں گا۔ لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور اس لیے حیوان کبھی بارود کی ترکیب نہ معلوم کر سکے گا۔ اگر یہ دھوکا ہوتا تو تعجب ہے کہ کیوں لاکھوں آدمیوں کے تجربہ نے اسے غلط ثابت نہ کر دیا؟ اور پھر کیوں انسان اس کی وجہ سے وحشت و جہالت سے نکل کر تہذیب و شائستگی تک پہنچ گیا۔ جس شوق و ذوق سے انسان اسباب کے دریافت کی تحقیق کرے گا' اسی قدر اسے ترقی ہو گی۔ حیوان جو علل ثانیہ تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اسی حالت میں ہے۔

ادنےٰ سے ادنےٰ دماغ بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں قوت ہے اور اس قوت کا مقام ارادہ ہے اور یہیں سے انسان کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں۔ گو انسان ارادے کی تمام حرکات پر غور نہ کرے لیکن وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ہر قدم اسی پر منحصر ہے۔ جہاں ارادہ رکا ہم چلنے سے رک جاتے ہیں۔ انسان کا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے اور اس کے تمام افعال اس مختار قوت پر مبنی ہیں اس کا یہ خیال کہ اس کے افعال ارادی بعید اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ سخت منطقی دلائل سے پیدا کرتا ہے اور ایک مدت کی مشق کے بعد اپنے آپ کو اس خیال کے تابع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

عالم مادی میں انسان ایسی اشیاء میں تغیرات دیکھتا ہے جو عقل سے عاری ہیں۔ وہ ایسی حرکات دیکھتا ہے جس کا باعث وہ نہیں ہے اور ایسے نتائج دیکھتا ہے جن میں اس کا دخل نہیں ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسی قوت کے وجود کے اقرار کرنے پر مجبور ہے۔ جس پر اسے کوئی قدرت نہیں۔ جو اس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور جو اس سے زیادہ قوی ہے۔

انسان میں قوائے دماغی مادہ پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں مادہ بلا توسط انسان حرکت میں آتا ہے انسان اس کے سبب دریافت کرنے کی ٹوہ میں رہتا ہے اور اسے وہ ایک ایسی قوت میں معلوم کرنے کی توقع رکھتا ہے جو اس سے باہر ہے اور اسی قسم کی ہے جیسی اس میں ہے۔ ایک ادنے عقل یا غیر صحیح مشاہدہ چھوٹے چھوٹے اسباب (علل) میں پھنس کے رہ جائے گا۔ لیکن جوں جوں عقل روشن اور وسیع ہوتی ہے مشاہدہ زیادہ قوی اور تیز ہوتا ہے سمجھ قریبی اور درمیانی سلسلہ اسباب سے ہوتے ہوئے خودرا سرچشمہ حرکت تک پہنچ جاتی ہے۔

باصرہ ایسی حس ہے جو قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو عطا کی ہے۔ لیکن سب میں ایک سی قوت بصارت نہیں ہوتی۔ صحیح طور سے دیکھنا آنکھ کی قوت یا خوبی پر منحصر

نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یہی حالت چشم بصیرت کی ہے۔ بعض معلومات کے ذریعہ سے علل کو زیادہ تیزی اور خوبی سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ادنے اسباب یا علل کے خول سے نکل کر قوت ادنے کے مغز تک پہنچنا تربیت یا تعلیم یافتہ عقل کا کام ہے۔

انسان معلوم سے غیر معلوم کو دریافت کرتا ہے۔ اس لئے اس نے جو اس قوت کو جو نیچر میں پائی جاتی ہے اپنی قوت ارادہ کی مثل سمجھا تو اس کا ایسا سمجھنا جائز ہے۔ جب اس نے ایسے معلولات دیکھے جن کی علل کو وہ نہیں بتا سکا تو انہیں ایک ایسی قوت مختار سے منسوب کرنا جو مادہ کے اندر اور باہر ہے بالکل جائز ہے۔ یہی خدا کے خیال کی اصل ہے۔ اب خواہ خدا بہت سے ہوں۔ اور درختوں' دریاؤں' پہاڑوں' بادلوں اور ہواؤں میں ہوں خواہ ایک علت اعلیٰ ہو جو کائنات کا خالق قائم رکھنے والا ہے۔

اس مسئلہ میں بنی نوع انسان کے عام اتفاق کو گزشتہ زمانے کے الہام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اکثر اقوام ایک ہی صغری کبری سے ایک ہی نتیجہ پر پہنچی ہیں۔ الہام انسان کی ذات اور اصول و علت و معلول کی صداقت کے یقین میں ہے اور یہ الہام ہر ذی عقل پر ہوتا ہے۔

اب ہم انسان کی دوسری تمیز طبعی پر توجہ کرتے ہیں جو انسان کو منتہائے کمال کی طرف لے جاتی ہے۔

حجریات و نباتات و حیوانات سب میں قوت انتخاب پائی جاتی ہے۔ ہر شے دوسری اشیاء میں سے اسی سے ملتی یا اسے جذب کرتی ہے جو اس کے لئے مفید ہے۔ حجریات اور معدنیات کو دیکھا جائے تو وہ اپنے ارد و گرد کی اشیاء میں سے وہی چیزیں اسی قدر اپنے میں لیتی ہیں جو ان میں مل سکتی اور ان کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ ادویہ کی کیمیائی ترکیب کو دیکھیے۔ ہر دوا دوسری سے گھل مل نہیں جاتی۔ اسی طرح نباتات کا حال ہے۔ پودا زمین سے ہوا اور دوسری اشیاء سے وہی اجزاء اور اسی قدر حصہ جذب کرتا ہے جو اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ یہی حال دیگر حیوانات اور انسان کا ہے۔ لیکن انسان میں دو حصے ہیں مادی اور غیرمادی۔ کبھی تو وہ ان چیزوں کو انتخاب کرتا ہے جو اس کی مادی خوشی اور نشوونما کے لئے مفید ہوں۔ اور کبھی وہ اشیا جو قوائے حصہ غیرمادی کی نشوونما اور مسرت کے لئے ضروری ہیں۔ اور چونکہ اس میں یہ دو حصے پائے جاتے ہیں اس لئے اس کی قوت انتخاب ڈانواں ڈول رہتی ہے۔ کبھی تو وہ ان چیزوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جو مادی خوشی کو بڑھاتی ہیں۔ اور کبھی ان اشیاء کی طرف جو اس کی غیر مادی مسرت میں اضافہ کرتی ہیں۔ غرض

انسان ان دو کششوں کے درمیان واقع ہے۔ جدھر زیادہ زور ہوتا ہے ادھر ہی کھچ جاتا ہے۔ ایک طعمہ مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہے۔

انسان میں یہ تخالف عجیب و غریب ہے۔ حیوانی زندگی کا مقصد خاص اور محدود ہے لہٰذا تمام تمیزات حیوانی اس مقصد کے پورا کرنے میں کوشش کرتی ہیں۔ لیکن اس میں جو دوسری قوت ہے وہ اسے بعض اوقات اس دائرہ سے نکال کر ایک دوسرے عالم میں لے جاتی ہے۔ جہاں اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوتا ہے۔

جس طرح تمیزات طبعی مادی زندگی کی فلاح کے لئے انتخاب کرتی ہیں اسی طرح اور اک غیرمادی حصہ کی فلاح میں بذریعہ انتخاب مدد دیتا ہے۔ اور یہ انتخاب ایک تمیز کرتی ہے جو روحانی زندگی کی فلاح کا خیال رکھتی ہے۔

یہ انتخاب اس طرح سے ہوتا ہے کہ چشم بصیرت کے سامنے بہت سی اشیا یا احساسات آتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشیا انتخاب کی جاتی ہیں جنہیں تجربہ اور تمیز طبعی اعلے خیال کرتی ہے تخیل پھر ان سب کو ملاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ باعث مسرت ہیں۔ اور اس مجموعہ سے ایک منتہائے کمال قائم کرتا ہے جو جذبات کے سامنے پیش ہوتا ہے اور پھر انہیں اس طرح متوجہ کرکے ارادے کو اس کے حصول کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

دیگر حیوانات میں تخیل بہت ادنے درجہ میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے سامنے حیوانی خوشی یا خطرہ کو پیش کرتا ہے اور انہیں دونوں کے حالات میں ذرا سا تغیر کرکے ان کی مختلف صورتیں ان کو دکھاتا ہے۔ لیکن انسان کی حالت بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ بھی شہوانی زندگی تک محدود رہتا تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ حافظہ سمجھ کے سامنے حقیقی واقعات پیش کرتا ہے لیکن تخیل اس سے کہیں آگے نکل جاتا اور نتائج تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک حد تک حواس کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ اور چاہے تو سامعہ اور باصرہ کا کام دے سکتی ہے۔ اور اس کی مدد سے غیرمادی حصہ اپنی ساعت اور اجازت کو بلا قید مکان وزماں ان غیرمادی صور تک پہنچا سکتا ہے جنہیں یہ خیالی وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس پر زور قوت کو نہ کوئی محدود کر سکتا ہے نہ کوئی روک سکتا ہے۔ یہ حقیقت اور واقعیت کے سامنے اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ہاتھ میں اس کے مشعل ہوتی ہے جس سے راستے پر روشنی پڑتی جاتی ہے اور ارادہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے۔ تخیل امید پیدا کرتا ہے لیکن اسے سیر نہیں کرتا۔ یہ تحقیق پر ابھارتا اور قیاس کو تیز کرتا ہے۔ لیکن اپنی پرواز سے نیچے نہیں گرتا۔ اور دوسرے حیوانات میں بھی یہ قوت ہوتی تو وہ کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ لیکن

چونکہ وہ کسی **منتہا** کا خیال نہیں کر سکتے لہٰذا اپنی حالت پر قائم ہیں۔

انسان میں یہ عجیب بات ہے کہ کسی خواہش کے پورا ہونے پر وہ چپکا نہیں بیٹھتا بلکہ اور آگے اور آگے بڑھتا ہے۔ واہمہ اس کے سامنے **منتہائے** کمال کی ایک تصویر کھینچ دیتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا چلا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم کا **منتہا** وہی نہ ہو جو دوسرے انسان یا دوسری قوم کا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ متضاد ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ جزوی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیلان ایک ایسے کمال کی طرف ہے جو ان سب کو ایک کر سکتا ہے۔ مثلاً" ایک شخص سرخ رنگ کو بہت پسند کرتا ہے۔ دوسرا نیلے کو تیسرا زرد کو۔ ہر ایک ایک جزو کی طرف مائل ہے اور اس کمال کا ایک رخ دیکھتا ہے۔ جو ان تینوں کو ملا کر ایک ایسی خوبصورت شے پیدا کر سکتا ہے جو قوس قزح کے حسن سے کم نہ ہو۔

منتہائے کمال خواہ وہ عقل کا ہو یا حسن کا، نیکی کا ہو یا عدل کا ہمیشہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے خیال علت و معلول نے اس کی سمجھ یا عقل کو علت انتہائی کی راہ سجھائی ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ اور اس علت انتہائی میں وہ اپنے تمام ادراکات کمال کو جمع کرتا ہے اور اس طرح خدا کو قوی و قادر علیم و بصیر اور کمال عدل و خیر و حسن سمجھتا ہے۔

کیا تخیل دھوکا ہی دھوکا ہے؟ کیا عدل و حسن و خیر کی حس جو ہم میں پائی جاتی ہے وہ کچھ بھی نہیں؟

اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قسمت بہت بری ہوتی۔ اسے اس کا پختہ یقین ہے کہ جس طرح اس کا جسم بڑھتا اور نشوونما پاتا ہے اسی طرح اس میں ایک روح ہے جو نشوونما پاتی اور ترقی کرتی ہے اور تجربہ سے اسے اس بات کا یقین حاصل ہوا ہے کہ ترقی کے ہر مرحلہ پر اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوا ہے۔ اگر انسان کے سامنے کوئی **منتہائے** کمال نہ ہوتا تو نہ یہ شاعر ہوتے نہ مصور ہوتے نہ مفتی۔

انسان کو فطرتاً" دو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم کی، دوسری محبت کی۔ علم کا تعلق عقل سے ہے اور محبت کا جذبات سے۔ عقل چاہتی ہے کہ سب میری تابع ہوں اور میرے اشارے پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور من مانی حکومت کریں۔ مذہب کا تعلق ان دونوں سے ہے۔ وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب درحقیقت ایک خیال کا اظہار ہے۔ انسان ایک علت اعلےٰ کا خیال کرتا ہے۔ جذبات کی ہدایت اور قوت انتخاب کی مدد سے وہ ایک منتہائے خیال کا تصور کرتا ہے اور یہ منتہائے خیال اس کی محبت و پرستش کا مرکز بن جاتا ہے۔

جہاں عقل اور جذبات میں اتحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا اور کچھ ہے۔

جو مذہب محض استدلالی اور قیاسی ہے وہ کوئی مذہب نہیں وہ فلسفہ ہے اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں وہ اکثر توہمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک ناواجب خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں مضر ہیں۔ ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانا ٹھیک نہیں۔ دلی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہئے اور عقلی پرواز کی اصلاح جذبات سے۔ علت العلل کی تلاش میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وحدانیت یعنی ایک خدا کی پرستش دوسرے کئی خداؤں کی پرستش۔ سامی قوموں نے ایک قوت کو مانا جو تمام معلولات کی علت ہے۔ اور آریا قوم نے ان قوموں کو الوہیت کا درجہ دیا۔ جن کا ظہور نیچر میں ہوتا ہے۔ بعض نے اس جھگڑے کو ہار کے چھوڑ دیا اور دنیاوی بکھیڑوں میں پڑ گئے۔

——— ۵ ———

مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اس کی فطرت میں ہے۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزین ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی۔ جدوجہد قائم رہے گی۔ اس کے محدود حالات اس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے۔ لیکن آخر فتح مذہب کی ہو گی۔ تحقیق میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا لیکن قدیم مذہب کسی نہ کسی صورت میں اس کے اندر ضرور رہے گا۔ ممکن ہے کہ سائنس نیچر کے متعلق نئے خیالات پیدا کرے اور خدا کے متعلق پرانے خیالات کو بدل دے۔ لیکن وہ عقیدہ جو ان مٹ ہے خدا کے متعلق نیا خیال پیدا کرے گا کیونکہ سائنس کا قابو یہاں نہیں چل سکتا۔ وہ اسے نہیں جانتا۔ یہ اس کی حدود سے باہر ہے۔ مذہب کی حالت قفس کی سی ہے۔ پیر فرتوت ہو کر وہ اپنے گھونسلے میں آگ لگاتا ہے۔ مگر انہیں شعلوں میں

سے پھر زندگی پاتا ہے۔ جس طرح انسان کی گزشتہ نسلوں نے نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں اور بہت سے رنگ بدلے مگر اپنا پرانا مذہب خواہ وہ کیسی ہی بے ڈھنگی صورت میں تھا نئی نسلوں کے سپرد کیا جو پھر نئے رنگ میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح ہمارا زمانہ اس میں اور صفائی پیدا کرتا ہے اسے اور اعلیٰ کرے گا اور آئندہ نسلوں کے حوالہ کر جائے گا۔ قرن در قرن اور صدی در صدی یہ کام یونہیں جاری رہے گا حتیٰ کہ کسی بعید زمانے میں وہ وقت آئے گا کہ سائنس اور مذہب کا تخالف جاتا رہے گا اور نیچر اور انسانی فطرت کا علم کی معرفت پر منتہی ہو جائے گا۔

اب ہم انسان کی تاریخ پر ابتدا سے نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا مذہب ابتدائے آفرینش سے اس میں ودیعت ہے یا نہیں۔

ایک انگریز لڑکے ایک جاہل مسلمان' ایک معمولی ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی مذہب کے عالم یا فقیہ سے پوچھئے کہ مذہب کیا ہے اور پھر ان کے جوابات کو غور سے دیکھئے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی ایک ذات کی پرستش خواہ وہ کسی صورت اور کسی ڈھنگ سے ہو۔ مسٹر میکڈانلڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی اقوام میں رہے ہیں اپنی کتاب افریکینا میں لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ "کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور جسے وہ روح کہتے ہیں۔ اور موت کے بعد وہ روح جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔" اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے۔ اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اسے اپنے سایہ یا دوستوں اور بزرگوں کی موت یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے اور زندگی کے درمیانی مرحلوں میں اس نے پتھروں۔ درختوں جانوروں اور دیگر مظاہر قدرت کے سامنے سر جھکایا ہے لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا؟ وہ کیا تھا جس نے اس کا سر پر زور بہتے دریاؤں یا سر بفلک پہاڑوں کے سامنے جھکایا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو بھاگ جاتے چھپ جاتے۔ لیکن بجائے اس کے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو سب سے قوی اور ابدی اور ازلی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو مرنے سے ڈرتے رہتے لیکن کیوں انہیں روح کا خیال پیدا ہوا؟ اور اس سے پھر وہ اور آگے پہنچے۔ یہ خیال ان کے بچوں تک میں پایا گیا ہے جو الگ رکھے گئے جنہیں کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی۔ اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی بلا امداد غیرے صرف اپنے خیال اور اپنے تجربہ

سے یہاں تک رسائی کی ہے اور ان میں خدا کا خیال اور روح و جسم کا امتیاز پایا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات انسان میں فطرتاً" موجود ہے اور ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے۔

یہ کہنا کہ انسان کو خوف سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال سایہ بھوت پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا لہٰذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے صحیح نہیں۔ کیونکہ مختلف مرحلے طے کرکے کسی شے تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے بے اصل ہے۔ دنیا کے تمام اعلےٰ خیال فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول ایجادات و اختراعات کو اگر بنظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انہیں وحشیوں تک پہنچے گی جہاں سے ہم نے خدا کے خیال کا سراغ لگایا ہے۔ یہ چیزیں انسان کو ارثاً" ملی ہیں۔ اور اسی طرح ایک سے دوسرے کو پہنچتی رہیں گی۔

۔۔۔۔۔۔ ۶ ۔۔۔۔۔۔

علمائے طبیعیات و بعض دیگر فلاسفہ حال و قدیم کا دعوے ہے کہ صرف استقرا ہی علم کی مستحکم بنیاد ہے۔ مگر استقرا کیا ہے؟ تجربہ کے ذریعہ سے نتائج تک پہنچنا۔ لیکن ہمیں کیا حق اس امر کے ماننے کا ہے کہ چونکہ ایک ہی سے حالات میں پانچ ہزار یا دس ہزار سال سے برابر ایک ہی چیز واقع ہوتی آئی ہے تو آئندہ بھی انہیں حالات میں وہی واقع ہو گا۔ یہ مانا کہ لاکھوں کروڑوں پدموں آدمی مرتے آئے ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہم بھی مر جائیں گے۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیچر میں اصول یکسانی عالمگیر طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے اصول ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں خلل نہیں آتا۔ یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوا؟ تجربہ سے تو گویا یہ استدلال یوں قائم ہو گا۔

ہم کیوں کسی عام یا خاص اصول یا صداقت کو مانتے ہیں؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمارا یقین کیوں ہے؟

اس لئے کہ نیچر ہمیشہ ایک ہی نقش قدم پر چلتی ہے اور اس کے اصول میں یکسانی پائی جاتی ہے!

یہ ہم کس لئے مانتے ہیں کہ اصول نیچر میں یکسانی پائی جاتی ہے؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمیں کیوں یقین ہے؟

اس لئے کہ نیچر میں اصول یکسانی پایا جاتا ہے۔

اسی طرح استدلال کرتے جایئے اور پھر پھر کے وہی وجوہ آتی جائیں گی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور شے بھی ہے کہ جس پر انتہائی حالت میں تمام انسانی علوم کا دارومدار ہے۔ وہ شے سب سے نیچی تہ میں ہے اور وہ تمیز فطری ہے۔ بین کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس شے کی مشابہت جو ہمارے تجربہ میں آچکی ہے اس شے سے جو تجربہ میں نہیں آئی ہماری نیچر(طبیعت) کے قانون پر مبنی ہے اور وہ قانون اس خیال کے زور سے حاصل ہوا جبکہ تجربہ نے ابھی اسے ثابت نہیں کیا تھا۔

لہٰذا جس طرح مذہب کا خیال طبعی ہے سائنس بھی اس سے نہیں بچ سکتا کیونکہ آخری بنیاد اس کی بھی تمیز فطری پر ہے جو تجربہ سے مقدم ہے۔

صرف ایک قوت ہے جو بلاواسطہ مجھے دی گئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے وہ قوت ارادی ہے۔ باقی جتنی قوتیں ہیں وہ بالواسطہ ہیں اور منطقی استدلال سے دریافت ہوتی ہیں۔

میری قوت ارادی دوسری قوتوں کے دریافت کرنے والی ہے۔ ہر ایک استدلال کسی ایسی قوت یا قوتوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو کائنات میں عمل کر رہی ہیں۔ اصل مسئلہ جس سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس پر ان کے یقینی ہونے کا دارومدار ہے وہ یہ ہے کہ میں عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں۔

مجھے اپنی ہستی کے متعلق کسی منطقی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو تمام یقینوں سے بالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں وہی ہوں جو مختلف حالات اور مختلف اوقات میں سے گزر چکا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں خیال کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کر رہا ہوں۔ یہ تمام امور معرفت طبعی سے متعلق ہیں۔ میں اپنی ہستی کا ثبوت اپنے خیالات یا ارادے سے پیدا نہیں کرتا۔ ڈیکارٹ کا یہ کہنا کہ میں خیال کرتا ہوں لہٰذا میں ہوں۔ اس منطق سے باہر ہے۔ کیونکہ جب میں خیال نہیں کرتا اس وقت بھی تو میں ہوں۔ میں ہوں اس لئے کہ میں ہوں۔ یہ شبہ کرنا کہ آیا میں خیال کر رہا ہوں یا نہیں ارادہ کر رہا ہوں یا نہیں کوئی عقلی دلیل نہیں بلکہ بے عقلی کی بات ہے۔ یہ فلسفہ نہیں بلکہ حق ہے۔ میری ہستی کا کوئی ثبوت میری معرفت طبعی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ معرفت طبعی میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لئے کافی نہیں تو دنیا کا کوئی منطقی استدلال کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے شکوک کرنے سے عقل کو بے دست و پا کرنا ہے اور یہی شکوک ہیں جو روح کے متعلق کئے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی شے غیرمادی نہیں۔ ہمارا اولین اور یقینی علم وہ ہے جو حواس کی رپورٹ

سے قبل ہے اور حواس کے تابع نہیں۔ لیکن جب حواس کی رپورٹ وصول ہوتی ہے تو عقل اس کی خبر دیتی ہے۔ حواس اور عقل مل کر اور ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ مادئین کہیں کہ یہ عقل مادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا جبکہ یہی نہیں معلوم کہ مادہ کیا ہے؟

یہ یقینی امر ہے کہ میں ہوں اور جب میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر میں کیسے یہاں آیا؟ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے پہلے اور اسباب تھے اور ان سے پہلے اور۔ ان کے بعد آیا جو میرا سبب نہیں تو میں بے سبب ہوں۔ مگر تمام نوع انسان ایسی ہی ہے۔ تمام ہستی تمام کائنات ایسی ہی ہے یعنی یا تو تمام ہستی اور کائنات ایسے ماسبق اسباب کے بعد ظہور میں آئی جن میں قوت تخلیق نہیں یا خود اپنا سبب آپ ہے۔ میں اپنی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ خیال نہیں کر سکتا کہ میں ہوں میں خیال کرتا ہوں میں ارادہ کرتا ہوں۔ میں اپنے گرد اوروں میں بھی انہیں تین چیزوں کو پاتا ہوں۔ لیکن میں ان میں سے کوئی یا سب مل بھی میرے یہاں ہونے کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ میں یقیناً غیر فانی ہوں۔ میں بے سبب نہیں ہوں نہ اپنا آپ سبب ہوں۔ لہٰذا میرا سبب کوئی اور ہے۔ جو ان سب سے بالا ہے۔ سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

ہم جو کارگاہ عالم میں مختلف قوتیں دیکھتے ہیں اور جن کا ہمیں اس قدر یقین ہے کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ ہم عقل اور خیال سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم حواس سے ان کا یقین نہیں کر سکتے آخر ان کا اصلی علم ہمیں کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف ایک طریقہ ہے۔ اپنی قوت ارادہ سے یا ہم اپنے میں ایک قوت دیکھتے ہیں اور اس سے ان قوتوں کو سمجھتے اندازہ کرتے اور یقین کرتے ہیں۔ اور یہ تمام قوتیں ظہور میں اس قوت ارادی کا جو خدا میں ہے جس سے ہماری ہستی ہمارا ارادہ اور ہماری زندگی ہے۔

------ ۷ ------

عالم میں ہر آن تغیر ہے۔ ہر شے بدلتا ہے اور بدلنے پر مجبور ہے۔ اسی قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہوتی ہے۔ انسان بھی اس کا تابع ہے۔ اس میں بھی ہر لحظہ اور ہر آن تغیر رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ اور ایک ذرہ بھی پہلے کا نہیں رہتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پھر وہی ہے اور سمجھتا ہے۔ کہ میں وہی ہوں اور باوجود اس کے وہ غور کرتا اور خیال کرتا ہے۔ ہر عضو کے فعل سے اس

عضو میں تحلیل واقع ہوتی ہے اور اس تحلیل کے ساتھ ترکیب بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ مادہ کے کون سے سالمہ (جزو مقراطیسی) میں مسلسل غور و فکر ہے۔ اس میں جو ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے یا اس میں جو آتا ہے؟ کیا آکسیجن یا ہیڈروجن کا سالمہ معرفت طبعی (کا شس نس) حاصل کرتے ہی چل دیتا ہے؟ اور کیا آنے والا (جزو مقراطیسی) آتے ہی معرفت طبعی حاصل کر لیتا ہے؟ ضرور کوئی شے مستقل ہونی چاہئے جس میں یہ معرفت ہے اور جو غور و فکر کرتی ہے اور جس کا ان مسالمات کی مسلسل آمدورفت پر عمل ہے اور ادراک جس کا آلہ ہے۔ اور جو غیر مادی ہے۔ اور جو روح کہلاتی ہے۔ تمام حیات اس معرفت کے حاصل کرنے سے قبل صرف حرکت اور تبدیل ہیئت ہے۔ لیکن ہم اس معرفت کو دماغ کے ذرات میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم اعصاب اور دیگر مادی ریشوں سے خاص خاص احساسات منسوب کر سکتے ہیں۔ مگر ان اعصاب اور ریشوں سے معرفت طبعی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ الگ مستقل شے ہے اور یہی ہے جو ہمیں اپنی ہستی کی خبر دیتی ہے اور غیر فانی ہے۔ علاوہ اس کے دماغ کے مختلف حصوں کے مختلف کام ہیں۔ جس طرح مختلف اعصاب کے کام مختلف ہیں لہٰذا اس معرفت طبعی کا یکساں حالت پر رہنا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اعصاب اور دماغی اعضا ادراک کے تابع اور کارکن ہوں جو سب کا صدر نشین ہے اور سب پر حاوی ہے۔ علم فرینالوجی (علم کا سہ سر) جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مادیت اور دہریت کی طرف مائل کرتا ہے اس پر اگر اس پہلو سے نظر ڈالی جائے تو وہ ہماری اعانت کرے گا۔

مشہور سائنس دان مسٹر پراکٹر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص جو تھوڑی دیر کے لئے بوجہ ضرب کے بیہوش ہو جاتا ہے اور اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی تو وہ ہوش میں آکر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ غور کرنے والی شے وہ روح کہاں تھی؟ اور یہ خیال خواہ مخواہ اس کے دل میں آتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مر گیا تھا۔ تھوڑی سی ضرب سے ایک آدمی بیہوش ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ زور سے لگے تو مر جاتا ہے۔ کیا اس وقت بھی اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی؟ اگر ایسا ہے تو کب اور کس طرح وہ معرفت طبعی (کا شس نس) حاصل کرتا ہے؟ تھوڑی سی ضرب سے وہ بیہوش ہو کر پھر ہوش میں آجاتا ہے۔ زیادہ ضرب لگنے سے تمام دماغی نظام بگڑ جاتا ہے اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ سائنس اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ فی الحال یہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس سے بڑھ کر میں ایک ایسے شخص کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے سرتاج علمائے سائنس کہا جاتا ہے اور جو عین اسی زمانہ میں جبکہ ڈارون اپنی مشہور آفاق کتاب (آرجن

آف پی ٹیز) لکھ رہا تھا۔ اپنی ذاتی تحقیقات سے انہیں نتائج پر پہنچا جو ڈارون نے قائم کئے تھے اور جب اس نے اپنا رسالہ ڈارون کے پاس رائل سوسائٹی میں پڑھنے کے لئے بھیجا تو ڈارون دنگ رہ گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں روحانی قوت اور علم پر بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "ہمیں کبھی واقعات سے صرف اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ انسانی علم کی ترقی کی تمام تاریخ اور خصوصاً" وہ علم ہے جسے ہم روحانی کہتے ہیں۔ یہ یقین دلاتا ہے کہ جب کبھی اہل سائنس یا کسی زمانہ کے عام معلمین نے ایسے واقعات سے جو بہت سے اوسط درجہ کے ایماندار اور ذہین محققین نے خود دیکھے اور بیان کئے ہیں محض اس وجہ سے انکار کر دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں یا وہ قانون قدرت کے خلاف ہیں تو یہ منکرین ہمیشہ غلطی پر ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس فاضل عصر نے خود اس بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کیں اور بعد کامل غور اور چھان بین کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بیشک روحانی قوت موجود ہے اور جو مظاہر روحانی طرح طرح سے ظہور میں آتے ہیں بالکل صحیح ہیں۔ اور نہ صرف اس نے بلکہ مشہور و معروف ڈاکٹر نوبل سرجان فوربس اور ڈاکٹر کارنبڑ اور دیگر علما نے بعد تحقیق کے اس اصلیت کو تسلیم کیا۔ فاضل موصوف کا خیال ہے کہ وہ بڑے لوگ جنہوں نے اس کا انکار کیا غلطی پر تھے اور اگرچہ علمائے سائنس ان شہادتوں کی پروا نہیں کرتے اور ہنسی اڑاتے ہیں لیکن اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ اسی صدی میں تمام منصف مزاج تعلیم یافتہ لوگوں کو ان باتوں کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اسی فاضل نے اس کمیشن کا بھی مفصل حال لکھا ہے جو اس امر کی تحقیق کے لئے بیٹھا تھا اور جسے تسلیم کرنا پڑا تھا کہ روحانی قوت بے شک ایک ایسی قوت ہے جو مادہ سے الگ اور بالا ہے۔ اس کمیشن کے ممبر تمام مشہور سائنس دان تھے۔

—— ۸ ——

انسان جو اپنے تئیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارا عالم یہ ساری کائنات میرے ہی لئے ہے۔ جس نے اپنی بساط سے زیادہ قدم مارا ہے اور اسرار عالم کے دریافت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وہ اگر اپنی آس پاس کی اشیاء پر غور سے نظر ڈالے تو ہر چیز نئی اور پراسرار معلوم ہو گی اور ایک ذرے تک کی حقیقت سے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی بے خبر پائے گا جیسے اس کائنات کی حقیقت ہے۔ جب ہم اس کرہ پر نظر ڈالتے ہیں جس پر ہم آباد ہیں تو بے شک یہ بہت وسیع نظر آتا ہے اور اس قدر وسیع کہ باوجود اس

ترقی اور تحقیقات کے ابھی تک ہم اس کے علم پر حاوی نہیں ہوئے لیکن نظام شمسی کے مقابلہ میں یہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے اور نظام موجود ہیں اور یہ عالم سیارگان کے مقابلے میں ایک نقطہ کے برابر ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اسی طرح وقت پر نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ زمین کی نشوونما میں جو وقت صرف ہوا وہ بے انتہا زیادہ ہے۔ اس وقت سے جو ایک درخت کے بڑھنے سے اور بننے میں صرف ہوا۔ لیکن اگر اس وقت کا مقابلہ نظام شمسی کے زمانہ نشوونما سے کیا جائے تو بہت ہی لم ہے اور بمقابلہ عالم سیارگان ایک لحظہ کے برابر ہے اور ابدالاباد کے مقابلہ میں ہیچ۔ زمین کی ساخت کو دیکھ کر بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہیں جن سے اس کی گزشتہ حالت پر ایک گونہ صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں یہ بے انتہا گرم تھی۔ اور مختلف زمینوں کے سرو ہونے کے متعلق جو تجربے اور تحقیقات کی گئی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس آتشیں مزاج کرہ کے ٹھنڈا کرنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگے ہوں گے۔ جب نظام شمسی کے ایک بہت چھوٹے کرہ کی حالت درست ہونے میں اس قد عرصہ دراز لگا تو خیال کرنا چاہئے کہ ان کروں کے لئے جو اس سے سیکڑوں درجے بڑے ہیں کس قدر عرصہ درکار ہوا ہو گا۔ جب انسان یہ سوچتا ہے کہ سورج سے بھی بڑے سیارے موجود ہیں اور نظام شمسی جیسے دوسرے نظام بھی ہیں اور اس سے پرے اور نظام ہیں اور اس کے آگے اور ان کے بعد اور اور یہ سلسلہ نامتناہی یونہیں چلا جاتا ہے تو خلائے بسیط کا خیال حد وھم سے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ زمانہ کا خیال کرتا ہے ایک ادنے اور حقیر کرے کے درست ہونے میں لاکھوں کروڑوں برس لگ گئے ہیں تو اس کل نظام اور دیگر نظامات میں کتنا وقت صرف ہوا ہو گا تو انسان مارے حیرت کے حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ عجیب و غریب حیرت انگیز کارخانہ کس ترتیب اور قاعدہ سے برابر چل رہا ہے اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اپنی حد سے تجاوز کریں تو اس حکیم مطلق کی حکمت و قوت کی عظمت عقل و دہم میں نہیں سما سکتی جو اس کارخانہ کا چلانے والا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک سائنس دان یہ کہے کہ یہ سب وہم ہے۔ کائنات میں سوائے مادہ اور سالمات کی حرکت اور کشش کے کچھ نہیں ہے۔ تمام عالم اور آسمانی خلا میں مادہ ہی مادہ منتشر ہے جس کی ابتدائی حالت ٹھوس ذرات کی ہے جو مختلف جسامت کے ہیں جن کی آپس کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں گاس نکلتی ہے۔ جو نیولا (ضابہ) کی شکل پکڑ لیتی ہے۔ یہ ضابہ نظام شمسی کے احاطہ کشش کے اندر آکر سورج کی مدور راہ میں داخل ہو

جاتے ہیں۔ اگر بعض ان میں سے ہمارے کرہ کے پاس سے گزرتے اور اس میں آ داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور ان سے شہاب پیدا ہوتے ہیں جو اکثر زمین پر گرتے ہیں۔ یہی اجسام بے انتہا اصلی سیارے اور شموس ہیں۔ ان کی ترکیب انہیں عناصر سے ہوتی ہے جو منجمد ہو کر بڑے بڑے ثوابت کو بناتے ہیں۔ ان شہابوں سے جو بعض اوقات ہماری زمین پر گرتے ہیں ہمیں اس مادہ کا نمونہ ملتا ہے جو تمام خلائے عالم سیارگان میں منتشر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بے انتہا اور کثیر شہابی مادہ جس کی وسعت خیال سے باہر ہے کہاں سے آیا؟ اس کی حالت ماسبق کیا تھی؟ یہ مادہ جو ابتدا میں بالکل سادہ اور اجزائے لاتجزے کی حالت میں تھا۔ اس صورت میں کیسے آگیا جسے ہم عناصر سے تعبیر کرتے ہیں؟ اگر ہماری رسائی ابتدائی جزا کے عالم تک ہو بھی جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ کیونکہ پھر ہمیں ان قوتوں کی اصلیت پر غور کرنا ہو جن کے زور سے یہ اجزائے لاتجیر مادے اور عوالم کی صورت میں ہویدا ہوئے اس سادہ سے سادہ قوت میں کہاں سے اتصال پیدا ہوا؟ یہ کیمیائی قوتیں کدھر سے آئیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ پراسرار قوت ثقل کہاں سے آئی جو غیر محدود اور غیر متبدل اور تمام عالم کی رونق کی اصل ہے؟ ان مسائل سے بھی بڑھ کر اہم اور لانیحل مسائل اثیر ہیں۔ کپکپاہٹ پیدا کرتی ہیں اور جو حرارت۔ روشنی الکٹرسٹی کی مختلف صورتوں میں تمام تبدیل ہیئت۔ حرکات سالمات اور مادہ کی ان بے انتہا تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں جو حیات کی نشوونما کا اصل باعث ہیں؟ ان تمام سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں اور غالباً" نہ کبھی ہو۔

قدیم سے قدیم نظریہ مادہ سے لے کر جدید سے جدید نظریہ پر غور کرو۔ ہر ایک میں یہی لانیحل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی اس کائنات کی علت العلل کے قریب نہیں پہنچاتا۔ اور زیادہ سے زیادہ بقول ہربرٹ سپنسر تمام مظاہر میں ایک نامعلوم اور ناقابل دریافت قوت کے ظہور کا ادراک ہوتا ہے یا جیسا کہ اسی علامہ دہر نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا "ہستی کی یہ خالی صورت جسے خیال نے ہر طرف اپنی بساط کے موافق تحقیق کیا ہے اور پھر اس سے پرے جہاں وہم و خیال کے پر جلتے ہیں۔ جب اس معلوم کا اس نامعلوم اور غیر محقق وسعت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو خیال کی یہ ساری تحقیقی ہیچ و بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ یہ خیال اور پھر اس خلائے بسیط کا خیال جس کے مقابلے میں ہمارے بے انتہا نظامات کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کچھ عرصے سے یہ طبعی ادراک کہ یہ غیر محدود خلا بغیر کسی اصل اور سبب کے موجود ہے اور موجود رہے گا۔ میرے دل میں ایسا خیال پیدا کرتا ہے کہ اس کے سامنے میں سہا جاتا ہوں۔

-----۹-----

مادیین کا یہ خیال ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے اور مظاہر عالم کی گتھی سلجھانے کے لئے کافی ہے۔ روحانی یا الٰہی اثر سب فسانہ ہے ۔ ویماقریطس سے لے کر اس وقت تک اس کے ماننے والے موجود ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے اس مذہب کو اور بھی قوی کر دیا ہے۔ ہر زمانہ میں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلاسفر اور علمائے علوم طبیعیات کو اس کا شوق رہا ہے کہ کوئی نظریہ ایسا قائم کریں کہ جس سے تمام اشیا اور مظاہر کی کنہ دریافت ہو جائے اور اس خیال نے لوگوں کو مادیت کی طرف مائل کیا ہے۔ کیمیاوی تحلیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ خواہ کسی صورت میں ہو اور کیسے ہی مختلف حالات اختیار کر لے وہ نہ تو فنا ہو سکتا ہے اور نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر علم کیمیا کی رو سے ایسے مرکبات ترتیب دیئے گئے جو اب تک بغیر قوت حیوانیہ کے دشوار سمجھے جاتے تھے اور آخر بڑھتے بڑھتے اول مادہ کے متعلق نظریہ اجزائے ومقراطیسی قائم ہوا اور سب سے آخر نظریہ اجزائے لا تتجزی۔ ان سب تحقیقوں اور نظریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان دہریت اور مادیت کی طرف ڈھلتا ہوا چلا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر عالم کا باعث ہے؟ اور کیا اس کے ساتھ کوئی اور شے ایسی نہیں ہے جو اس سے مختلف ہے۔

اب ہمیں تحقیق یہ کرنا ہے کہ جب ہم کسی مظہر کو دیکھتے ہیں تو مادہ کا اس میں کہاں تک دخل ہوتا ہے اور ان کا کیا باہمی تعلق ہے؟ دوسرے اگر کوئی مظہر ایسا ہے جو مادے سے بالکل آزاد ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ مادہ اس کا باعث نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اگر ہم کسی مظہر کو بغیر مادے کے نہیں پاتے تو کیا صرف مادہ ہی اس کا کافی اور وافی باعث ہے؟ فرض کرو کوئی مظہر معلوم ہے۔ اس کے ہم چند اسباب قرار دیتے ہیں لیکن یہ یقین نہیں کہ آیا یہ اس کے لئے کافی باعث ہیں یا نہیں۔ تو ہم ان اسباب کے نتائج پر غور کریں گے۔ اگر یہ نتائج پورے اترے تو ہم سمجھیں گے وہ اسباب کافی ہیں اور اگر نہیں تو ہم اس شے کو تلاش کریں گے جو ان نتائج کا تکملہ کرتی ہے جو اب تک سبب نامعلوم تھا۔ مثلاً" جب سیارہ یوری نس دریافت ہوا۔ تو بعض مہندسوں نے یہ دیکھا کہ جس طور پر وہ سورج کے گرد گردش کرتا ہے اور جو دائرہ وہ بناتا ہے اس کے لئے صرف سورج کی اور بعض اور چھوٹے سیاروں کی کشش جو یوری نس سے چھوٹے ہیں اور اس کے اور سورج کے درمیان واقع ہیں اس گردش اور دائرہ کی کافی باعث نہیں۔ اگر صرف یہ کشش ہوتی تو وہ ایسا دائرہ نہ بناتا بلکہ اس کی صورت اور ہوتی۔

ان مہندسوں نے محض ریاضی اور ہندسہ کے زور سے یہ قیاس قائم کیا کہ ہو نہ ہو فلاں مقام کا کوئی ستارہ یوری نس سے پرے واقع ہے جس کی کشش کا اثر اس پر پڑتا ہے۔ چنانچہ بعد میں اس مقام پر دوربین کے ذریعہ سے وہ سیارہ دریافت ہوا جسے اب نیپچون کہتے ہیں۔ اسی طور پر اس عالم کو لیتے ہیں اور مادہ کو جہاں تک اس کا دخل اور صفات و اثرات ہیں پورے طور آزادی دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ اس کا کافی باعث ہے یا کوئی اور شے بھی ہے جو اس کا تکملہ کرتی ہے اور مادہ سے خارج ہے؟ پس اگر کوئی ایسی شے ہے تو یہ نتیجہ نکالیں گے کہ مادہ اس عالم کا کافی باعث نہیں ہے کہ اور اس کے بعد ہم مادہ کی حقیقت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا وہ بذات خود قائم اور کافی ہے۔

مظاہر کائنات میں جن پر ہم بحث کریں گے ان کی تقسیم سرسری طور پر یہ ہو گی۔

۱۔ قوت : جو حرکت' اتصال اجزائے لاتیخبرے اور کشش کیمیاوی سے ظاہر ہوتی ہے

۲۔ حیات : حیوانی یا نباتی۔

۳۔ قوت : مدرکہ۔

۴۔ ادارک طبعی (کانشس نس)۔

۵۔ جذبات اخلاقی مثلاً" محبت رحم وغیرہ۔

ہماری سب سے اول تحقیق یہ ہے کہ کیا ہم کسی ایسے مظہر یا مظاہر کو بھی دیکھتے ہیں جو مادہ سے اس قدر الگ ہوں کہ مادہ ان کا باعث نہ ہو یا باعث جزوی ہو؟ قوت اور حیات کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم انہیں سوائے مادہ کی تحقیق کے کسی اور طرح نہیں جانتے اب رہی قوت مدرکہ اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ بعض کا یہ مذہب ہے کہ وہ مادہ سے آزاد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ دماغ کا نتیجہ ہے۔ اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ نظام اعصابی قوت مدرکہ کا آلہ ہے اور وہ اس طور پر کہ تمام افعال ادراکی کا تعلق اس نظام کی ساخت اجزائے لاتیجزے کی حرکت سے ہے۔ اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس کا باعث کافی ہے۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ قوت بلاشرکت مادہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔

مگر اس میں شک نہیں کہ ادراک طبعی (کانشس نس) یعنی خالص قوت مدرکہ کا قوت مدرکہ پر غور کرنے کا فعل مادہ سے بالکل بے تعلق ہے۔ اور بلاشبہ وہ جذبات جن میں غرض کا مطلق لگاؤ نہیں ہوتا مثلاً" محبت یا رحم بھی مادی تعلقات سے بری معلوی ہوتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں مادہ سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ادراک طبعی (کانشس نس) کو ان دیگر ادراکی افعال

سے الگ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جن کا تعلق دماغ کے تغیرات اجزائے لاتیجزے سے ہے
اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے جذبات سے ہمارے جسم اور دماغ پر کس قدر اثر پڑتا
ہے مثلاً" دفعتاً" سر میں درد ہونا۔ چہرہ کا سرخ ہو جانا۔ نبض اور سانس کا تیز ہو چلنا۔ تو
ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم مادہ کی شرکت سے بری نہیں ہو سکتے اور اسی اعتراف
سے مادیین کی بن آتی ہے۔ کیونکہ مظاہر عالم کہیں بلا تعلق مادہ نہیں پائے جاتے۔ اس کا
لگاؤ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ضرور نہیں کہ
صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر کا باعث کافی و وافی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے
تو کون سی شے ہے جو اس کا تکملہ کرتی ہے۔

شائد یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن بہرحال یہ باور کرنا چاہئے کہ مادہ کے وجود کی شہادت
سوائے قوت مدرکہ کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہے۔ یعنی مادہ کا وجود خود قوت مدرکہ کا
نتیجہ ہے جو وہ بعض واقعات سے اخذ کرتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف حواس
کا یقین کرنا چاہیے اور قوت مدرکہ کے نتائج کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے انہیں یاد رکھنا چاہئے
کہ مادہ جس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق قوت مدرکہ سے ہے جو اس کے واقعات
سے نتیجہ نکالتی ہے۔ اس امر کو مشہور فلسفی بشپ بارکلی نے نہایت خوبی کے ساتھ ثابت کیا
ہے۔ میں یہاں اس فلسفہ کو بالتفصیل بیان نہیں کرتا بلکہ اسی قدر اشارہ پر کفایت کرتا
ہوں۔

مادہ کی تین حالتیں ہیں جو قدیم سے اب تک تسلیم کی گئی ہیں ٹھوس جیسے برف سیال
جیسے پانی اور دخانی جیسے آکسیجن یا ہائیڈروجن۔ بعض اہل سائنس نے ایک اور حالت بھی
اضافہ کی ہے جو گیس سے بھی زیادہ لطیف ہے اور وہ شعاعی کہلاتی ہے۔

مادہ کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہے کہ وہ اجزائے لاتیجزے سے بنا ہے۔ یہ وہ چھوٹے
چھوٹے اجسام ہیں جن میں مادہ کے تمام خواص موجود ہیں اور ان کے باہمی تعلق کو قوت
اجزائے لاتیجزے کہتے ہیں۔ اور ہر جزو دمقراطیسی کسی نہ کسی کیمیاوی عنصر کے ایک یا
ایک سے زائد اجزائے لاتیجزے سے بنا ہے اور ان مختلف عناصر کے دمقراطیسی میں جو
تناسب پایا جاتا ہے وہ کیمیاوی اتصال کے قوانین کی رو سے عمل میں آتا ہے۔

یہ اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمقراطیسی کیا ہیں؟ انسان کی آنکھ نے ان میں سے
کسی کو نہیں دیکھا ہے اور ان کے وجود کا علم ہمیں اسی طرح استدلال اور قیاس سے حاصل
ہوا ہے جیسے روح کا ہے۔ جزو لاتیجزے میں چند خواص و صفات مانی گئی ہیں۔

اول قوت اتصال یا کشش اجزائے لاتیجزے۔ یہ وہ قوت ہے جو ہر شے کو جو جزو

لا تیجزے سے بڑی ہے مجتمع رکھتی ہے۔ یہ قوت ٹھوس حالت میں زیادہ۔ حالت سیال میں کم اور حالت دخانی میں بالکل نہیں ہوتی۔

دوم یہ خیال کیا گیا ہے کہ ہر جزو لاتیجزے ایک ارتعاشی حرکت سے بے چین رہتا ہے اور وہ اس حرکت کے مختلف نتائج سے مادہ کی ٹھوس سیال دخانی اور شعاعی حالتوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں۔

سوم۔ ہر جزو لاتیجزے میں نہ صرف بیرونی حرکت ہوتی ہے بلکہ ایک حرکت اندرونی بھی ہوتی ہے۔ بیرونی حرکت کل جسم یا نظام کی ہے اور اندرونی حرکت ایک حصہ جزو لاتیجزے کی دوسرے حصے پر ہے۔ مگر اس حرکت سے اس کی اجتماعی حالت زائل نہیں ہوتی یعنی یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر حصہ الگ ہو جائے۔ اس حرکت میں کپکپاہٹ پائی جاتی ہے۔

چہارم ہر شے کے اجزائے تیجزے ایک ہی جسامت کے خیال کئے گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک شے کا ہر حصہ ایک سا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک گیس کی دو قسمیں پیدا کرنا جو مختلف اجسام کے اجزائے لاتیجزے سے بنی ہوں ناممکن ہے۔

اس سے مفصلہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ ایک شے کا اجزائے لاتیجزے بالکل ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ مگر وہ دوسری اشیاء کے اجزاء سے مختلف ہوتے ہیں۔

۲۔ مختلف اشیا کے اجزائے لاتیجزے جسامت میں مختلف ہوتے ہیں اور ان میں کامل تدریجی ترقی نہیں ہوتی۔

۳۔ ایک شے کے اجزائے لاتیجزے اپنی اندرونی حرکت میں توافق رکھتے ہیں اور اس لئے اس روشنی میں بھی جو ان سے نکلتی ہے۔

۴۔ کسی جزو لاتیجزے میں کسی عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

مادہ کی صحیح تعریف کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ طبیعیات کی کسی کتاب سے اس تعریف کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن نظریہ اجزائے لاتیجزے کا (جو مادہ کے متعلق جدید نظریہ ہے) صحیح بیان مختصر طور پر کر دیا گیا ہے۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ان میں سے ایک جزو لاتیجزے لیتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو مادہ ہے جس میں تمام صفات و خواص مادہ کے موجود ہیں۔ یا تو وہ سادہ یعنی مفرد ہے جیسے آکسیجن کا جزو لاتیجزے یا مرکب جیسے پانی کا جس میں دو اجزائے دمقراطیسی ہائیڈروجن کے ہیں اور ایک آکسیجن کا۔ اس صورت میں جزو دمقراطیسی ایک مرکب شے ہے کیونکہ ازروئے علم کیمیا اس زمین پر تخمیناً"

ستر اشیاء ایسی ہیں جو مفرد یا سادہ حالت میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دوسرے سے ترکیب پانے کی (بشرطیکہ وہ ترتیب پا سکے) مختلف مقدار کا لحاظ ہوتا ہے۔ وہ بعض کو بعض شرائط پر اپنے ساتھ ملاتی ہے اور بعض کو رد کر دیتی ہے۔ غرض ہر ایک دوسرے سے بوجہ کیمیاوی کشش و اندفاع الگ اور مختلف ہے۔ ہم نے اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمقراطیسی دونوں کو دیکھ لیا۔ ان میں کائنات کی ساخت کا اصل مسالا نہیں پایا جاتا بلکہ ساٹھ ستر اشیا ایسی ہیں۔ جو اپنی صفات کے لحاظ سے الگ الگ ہیں اور جن کی ترکیب سے بیشمار ایسا مواد تیار ہو سکتاہے جو اجزائے لاتیجزے کے گدام کے لائق ہے۔ جزو لاتیجزے کیمیاوی ساخت کے لحاظ سے اکثر مرکب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طبیعیات کی رو سے بھی مرکب ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں ایک اندرونی حرکت بھی ہوتی ہے یعنی اس کے ایک حصہ کی حرکت دوسرے حصے پر جس سے کہ آس پاس کے ایثر میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور یہ حرکت مختلف قسم کے اجزائے لاتیجزے میں مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا اجزائے لاتیجزے اصل مسالا نہیں ہیں بلکہ بذات خود ایک کامل اور عجیب شے بنائی گئی ہے۔ جسے آنکھ نے نہیں دیکھا بلکہ قیاس نے سوچ کر نکالا ہے۔

اب ایک طرف تو ہم اجزائے لاتیجزے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف سادہ اور مفرد عناصر جن سے اجزائے لاتیجزے بنے ہیں۔ لیکن کہیں اصل مسالا جو تمام اشیا کی اصل ہے نہیں ملا، مگر باوجود اس کے ہر طرف ہر انتظام و تربیت عقل و حکمت کی بین شہادتیں دیکھتے ہیں بلکہ ہر ہر قدم پر وہ اور قوی ہوتی جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ مادہ جسے علوم طبیعیات و کیمیا کے تمام مظاہر کا باعث بتاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبعی اجزائے لاتیجزے سے وہ صفات منسوب کرتا ہے۔ جن کا موجود ہونا تو وہ پاتا ہے لیکن اجزائے لاتیجزے میں نہیں کیونکہ اس نے اسے کبھی نہیں دیکھا بلکہ بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا ہے اور اس لئے اس کا خیال ہے کہ یہ صفات اجزائے لاتیجزے ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک عالم علم کیمیا اجزائے دمقراطیسی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا ہونا تو اسے معلوم ہے لیکن اجزائے دمقراطیسی میں نہیں۔ کیونکہ اس نے کبھی ایک جزو لادمقراطیسی کا تجربہ نہیں کیا بلکہ انہیں بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا۔ وہ ہائیڈروجن کے جزو دمقراطیسی میں آکسیجن سے دو اور ایک کی نسبت سے ملنے کی قوت دیکھتا ہے جسے وہ درحقیقت ہائیڈروجن کے بڑے بڑے مجموعوں میں پاتا ہے۔ طبیعیات و کیمیا کے واقعات اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمقراطیسی میں ادا ہوتے .

ہیں اور اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمقراطیسی ازروے تعریف کافی سبب ہیں ان نتائج کے جن سے کہ درحقیقت یہ اسباب استخراج کئے گئے تھے۔

ان کے علاوہ دوسرے علوم بھی ہیں جو واقعات سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن وہ اصطلاحات اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمقراطیسی میں ادا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس لئے وہ اس نظریہ پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی ان واقعات پر جن سے وہ بحث کرتا ہے کچھ روشنی ڈالتا ہے یا نہیں۔

کیا نظریہ اجزائے لاتیجزے اس اہم اور عظیم واقعہ یعنی حیات پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے؟ جدید تحقیق کی رو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ حیات کو خواہ نباتی ہو یا حیوانی کتلۃ الاولے پروٹوپلازم سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ بغیر اس کے وہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ کتلۃ الاولے کے کیمیاوی اجزاء بخوبی معلوم ہیں اور انسان انہیں اپنے ہاتھ سے ایک جگہ جمع کر سکتا ہے لیکن نہ تو کتلۃ الاولے پیدا کر سکتا ہے اور نہ حیات جب تک کہ پہلے سے حیات موجود نہ ہو۔ اگر ہم ان صفات کو لیں جو ازروائے جدید سائنس اجزائے لاتیجزے میں پائی جاتی ہیں اور ان کو ہزار ملائیں ہزار الٹ پلٹ کریں کبھی حیات تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کشش اجزائے لاتیجزے کی حرکت مدامی اور ان اجزا کی کپکپاتی ہوئی حرکت' یہ سب مل کر بھی اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے جسے حیات کہتے ہیں اور جو خیال کی اصل بنا اور ساخت کائنات کی جزو اعظم ہے۔ سائنس نے جہاں تک تجربہ کیا ہے یہ امر بالتحقیق ثابت ہوا ہے کہ محض مردہ مادہ سے کوئی زندہ شے نہیں پیدا ہو سکتی۔

جب حیات صرف اجزائے لاتیجزے یا مردہ مادہ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ تو پھر قوت مدرکہ تو کہاں ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اکثر اہل سائنس کا یہ قیاس ہے کہ قوت مدرکہ مادہ کا نتیجہ ہے لیکن اب تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ جب قوت مدرکہ کا یہ حال ہے تو کاشس نس یعنی معرفت طبعی تو اس سے بھی کہیں پرے ہے۔ کیونکہ معرفت طبعی کے معنی ہیں قوت مدرکہ کا اپنے باطن پر غور کرنا۔ اور یہ اجزائے دمقراطیسی کے ترتیب دینے ملانے اور الٹ پلٹ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ایثار و محبت و ہمدردی کے جذبات ہیں۔

ممکن ہے کہ مادیین میں سے کوئی یہ کہے۔ کہ یہ سب کچھ سہی لیکن سائنس ترقی پذیر ہے۔ اور جوں جوں اسے ترقی ہو گی مادہ کی تعریف میں وسعت ہوتی جائے گی یہاں تک کہ کسی روز وہ ان تمام مظاہر کو بیان کر سکے گا جو اس وقت مافوق فطرت معلوم ہوتے ہیں۔

اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر مادہ کی تعریف میں وسعت ہو جائے گی تو اس کے ساتھ ہی یہ دلیل بھی کہ خود مادہ اس امر کی شہادت ہے کہ قوت مدرکہ اس سے قبل موجود تھی اور زیادہ قوی ہو جائے گی۔ جس قدر اجزائے لاتیجزے کی تحقیق میں زیادہ تہہ کے اندر جاؤ گے' اسی قدر اجزائے لاتیجزے کے پیدا کرنے کے لئے قوت مدرکہ کی زیادہ ضرورت معلوم ہو گی۔ اگر نباتات اجزائے لاتیجزے کا نتیجہ ہیں تو اجزائے لاتیجزے کے وجود کے لئے بے شک قوت مدرکہ کی ضرورت ہوئی ہو گی۔ غرض اس مشکل کو جس طرح چاہو حل کرنے کی کوشش کرو ایک چیز ایسی ماننی پڑے گی جو مادہ نہیں ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہم اس چیز کو مادہ سے الگ نہیں پاتے۔ کیونکہ جس عالم کا ہمیں تجربہ ہے اس میں یہ سنگت ضروری ہے۔ لیکن یہ تجربہ محض یک طرفہ ہے۔ کائنات میں اور خود ہم میں اس امر کے اشارات اور شہادتیں موجود ہیں کہ یہ شے جو مادہ نہیں ہے عقل اور قوت مدرکہ سے تعلق رکھتی ہے اور اسے اپنے ساتھی مادہ پر فضیلت ہے۔

یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ روح جسم کی قید سے الگ ہو کر بھی قائم رہ سکتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ مادہ کا جو نظریہ اجزائے لاتیجزے اور اجزائے ومقراطیسی کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے وہ خود ایک ایسے خالق اور منتظم قوت مدرکہ کی شہادت دیتا ہے جس کی ہستی اس سے قبل ہے اور اس سے افضل ہے۔

—— ۱۰ ——
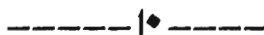
نظام کائنات پر نظر ڈالنے اور اپنے باطن پر غور کرنے سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں کہ کوئی ایسی شے ضرور ہے کہ مادہ سے بالا ہے جسے ہم روح کہتے ہیں اور کوئی ایسی قوت ابھی اور ہے جو اس سے بھی بالا اور افضل ہے۔ اور ساری کائنات پر حاوی اور ساری ہے۔ مذہب کی اصل یہیں سے پیدا ہوتی ہے جس سے سائنس بے خبر ہے اور اس بے خبری میں اس پر حملے کرتا اور مضحکہ اڑاتا ہے۔ پچھلی صدی میں جب کہ سائنس کی ترقی معراج کمال پر نظر آتی تھی۔ اکثر مذہب پر حملے کرنا' اس کی ہنسی اڑانا اور اس سے نفرت اور حقارت ظاہر کرنا اہل سائنس و فلاسفہ و حکما اور اکثر بڑے بڑے مصنفین کا عام دستور ہو گیا تھا اور اب یہ دستور رفتہ رفتہ فیشن ہو گیا۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اکثر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب بڑھیوں کی کہانی اور بچوں کا کھیل ہے۔ یا ایک بیجا ہے جس کا ڈر زمانہ طفلی سے بیٹھا

ہوا ہے۔ یا بھوت پریت کا سایہ ہے جو اب تک اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سائنس کے پرزور اور بیجا حملوں اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے یہ یقین ہو چلا تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان ہے۔ دنیا پر اب حکومت سائنس کی ہو گی وہ ان پیچیدہ مسائل اور گتھیوں کو سلجھائے گا جو اب تک لاینحل سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن خود اسی کے زور نے اسے کمزور کر دیا۔ اور وہ نشہ جس سے اہل سائنس مخمور تھے اترنے لگا اور باوجود حیرت انگیز ترقی اور عروج کے معلوم ہوا کہ وہ بے بس ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں چل سکتا۔ انگر سال اور بریڈلا جیسے اعدائے مذہب بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور اس کی ہفوات پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ فرقہ ایگ ناسٹک (لادریہ) کے بانی پروفیسر ہکسلی کے پرزور دلائل میں اب وہ قوت نہیں رہی اور ان کے پیرو بھی دھیمے پڑ چکے ہیں۔ وہ نظام جو ابتدا سے انسان کے ساتھ ہے جوں جوں انسان بڑھا وہ بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اس نے دنیا میں بڑے بڑے تغیرات اور عظیم الشان انقلابات پیدا کئے اور اس کی ترقی میں پیش پیش رہا۔ اور یہ اب بھی انسان کی معاشرت اور تمدن کے پہلو اور پرورش پر نظر آتا ہے۔ اس کی حکومت انسان کے دل پر اب بھی ویسی ہے جیسی پہلی تھی اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ اہل سائنس نے اس کی طرف سے نہ صرف بے توجہی کی بلکہ حقارت کا اظہار کیا۔ بجائے اس کہ کہ وہ اس مہتم بالشان اور عجیب و غریب نظام پر جس کی قوت ابتدا سے اب تک برابر چلی آرہی ہے اور جس کی حکومت سے باوجود انکار کے بھی انسان نہیں بچ سکتا غور کرتے اور دوسرے پہلو سے نظر ڈالتے انہوں نے سائنس کے بھرے میں اس سے منہ موڑ لیا۔ صرف ایک پہلو دیکھ کر سمجھ لیا کہ دوسری طرف کچھ نہیں۔ حالانکہ اگر مذہب کے پہلو سے انسانی ترقی پر نظر ڈالی جاتی تو منظر زیادہ وسیع اور کامل ہو جاتا۔ لیکن یہ اہل سائنس کی کوتہ نظری ہے کہ انہوں نے انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا انحصار محض سائنس پر رکھا۔ حیات کی ہر حرکت اور روش کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں۔ جب کوئی چیز دنیا میں اتفاق سے نہیں آئی۔ تو کیا مذاہب جنہیں انسان کی تاریخ و معاشرت میں اس قدر دخل تصرف اور قوت ہے مہمل اور لغو ہیں؟ کیا انہیں انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن میں کچھ بھی دخل نہیں؟ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جس پر اہل سائنس اور فلسفہ کو غور کرنا چاہئے تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی تنگ نظری اور ہٹ نے انہیں کبھی اس طرف متوجہ نہ کیا۔ سائنس کی نظر ہمیشہ مذہب کی طرف سے پھری رہی۔ اور ابتدا سے جو اس نے مذہب کی مخالفت میں کمر باندھی تو اب تک وہی مخالفت چلی آتی ہے لیکن کبھی اس نے یہ غور نہ

کیا کہ آخر یہ مخالفت کیوں ہے- بلکہ بجائے تحقیق کے جو اس کا شیوہ ہے اس نے جلتی آگ میں اور تیل ڈالا-

ہم دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان ابتدا سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے اور ایک زینہ سے دوسرے زینہ پر چڑھتا چلا جاتا ہے- اور جب ہم اس ترقی پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی عجیب و غریب اور عظیم الشان حقیقت نظر آتی ہے کہ خود انسانی خیال بھی اس کے سامنے جھک کے رہ جاتا ہے- سب سے اول اسے حیوانات اور وحشی جانوروں سے سابقہ پڑا- اور ان پر غالب آکر وہ آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتا رہا مگر اس رستہ میں اسے بڑی بڑی مصیبتیں اور افتیں جھیلنی پڑیں- بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا ہوا اور اب تک ترقی کے میدان میں اسے وہی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں- اور اسے اپنے بنی نوع کے ساتھ ہر دفعہ اور ہر لحظ وہی لڑائی لڑنی پڑتی ہے جو وہ اب تک لڑتا آیا ہے- یہی لڑائی مقابلہ منافسہ اور جدوجہد ترقی اور تہذیب و تمدن کی جان ہے- ہر شے جس میں حیات ہے اور تمام امور اور خیالات میں جن کا حیات سے تعلق ہے یہی جدوجہد پائی جاتی ہے- تمام افعال و حرکات میں تمام ارادوں اور نیتوں میں- اندرونی اور بیرونی زندگی میں ہماری زندگی کے اعلے اور نازک موقعوں پر ہمارا بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ کامیابی حاصل کریں اور ناکامی سے بچیں- ہماری ساری طاقت اور دانش مندی اسی میں صرف ہوتی ہے-

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ کہ انسان میں دو ایسی خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں اور اس لئے اس کا ارتقا دوسرے حیوانات کے ارتقا سے مختلف ہے- ایک تو عقل ہے اور اس ترقی میں اس کا بڑا حصہ ہے لیکن انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے ایک تو یہ کہ اس کا ذاتی فائدہ سب سے ضروری اور سب سے مقدم ہے دوسرے موجودہ وقت بڑی چیز ہے ہمارا سارا فائدہ اسی سے وابستہ ہے اور اسی میں ہونا چاہیے- دوسری خصوصیت انسان میں مدنیت کی ہے یعنی وہ قابلیت کے اثر سے وہ اپنے بنی نوع سے مل جل کر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے- یہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی- عقل کا کام تفرد' انفعال اور فنا ہے- تمدن کی ترقی کے لیے ایثار اور سوسائٹی کے فائدہ کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا اپنے اغراض و فوائد کو دوسروں کے لئے اور خصوصاً" ان نسلوں کے لئے جو اب تک وجود میں نہیں آئیں' قربانی کرنا ہے- یہ ایثار و قربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا

سکتی- اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے بالا ہے اور یہ ہدایت مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے انسانی تمدن و ترقی مذہب پر مبنی ہے- ارتقا کا مقصد جدوجہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالا ہے عقل اس کی مخالف ہے- اور اس لئے ضروری ہے کہ عقل مذہب کے تابع رہ کر جدوجہد کرے- ورنہ اگر وہ غالب آجائے گی تو شیرازہ نظام تمدن بکھر جائے گا- ارتقائے عالم میں افراد سوسائٹی کے لئے قربان کر دیئے جاتے ہیں- عقل افراد کو اپنے فوائد کے لئے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے- مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور ایثار سکھاتا ہے- نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ زمانے میں آئیں گے اور ابھی وجود میں بھی نہیں آئے- حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے- غرض انسانی تمدن میں دو مخالف رجحانات کی نشوونما ہوتی ہے- ایک تو وہ ہے جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہے اور دوسرا رجحان عقل ہے جسے اس اتباع میں جس میں اس کا مطلق فائدہ نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائدہ ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئے تامل اور عذر ہے- لیکن ترقی وہی قوم کر سکتی ہے- جس میں دوسرا رجحان پہلے رجحان کے تابع ہے- مگر اس اتباع کے لئے عقل یا سائنس کی کتاب میں کوئی فتویٰ نہیں ملتا- اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر ناپائدار اور کس قدر بے بنیاد ہے تو عقل صرف ایک فرض پر بہت زیادہ زور دیتی ہے جس کے سامنے باقی خیالات ہیچ ہیں- اس کی ہدایت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتی الوسعی ان سے فائدہ اٹھایا جائے- انسان تکلیف سے بچے راحت حاصل کرے اور یہ چند دم جو ہمیں مستعار ملے ہیں آرام سے بسر ہو جائیں- اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہے شہرت اور قوت حاصل کرتا ہے اور طرح طرح کے ایسے کام کرتا ہے، جن سے عیش و راحت اور لطف نصیب ہو- اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی حرمتی رک جائے- اس لئے اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں- دنیا میں جہاں کہیں اصل ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اس کے تابع رہی- عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے لیکن اس کا احاطہ محدود اور اس کی نظر تنگ ہے- اور اس لئے ضرور ہے ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے ہمیں لے جائے- اور یہ کمی مذہب سے پوری ہوتی ہے- اکثر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مذہبی اور اخلاقی نظام کے بالکل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیت اور

مخیر اور نیک چلن ہوتے ہیں- لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے- انسانی تمدن یا انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک آدھ نسل کا کام نہیں ہے- قرنوں اور نسلوں کی جدوجہد کے بعد حالت درست ہوتی ہے- جو شخص کسی اصول اخلاق و مذہب کا قائل نہیں ہے وہ بھی اسی سلسلہ تمدن کی پیداوار ہے- اس کی نشست و برخاست بات چیت- طرز خیال غرض کل حرکات و افعال اسی سانچے میں ڈھلے ہیں اور اسی سوسائٹی سے ارثاً" تعلیماً" سبجاً" ملے ہیں- وہ ہزار زبان سے انکار کیا کرے مگر جو روش و رحجان طبیعت اس میں پیدا ہو گیا ہے وہ اسے زائل نہیں کر سکتا- یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا- اور بات بات میں اسی نظام اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس سے وہ انکار کرتا اور جس کی وہ تضحیک کرتا ہے-

یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے- اور بڑے بڑے اہل آرا کی رائے ہے کہ باوجود زمانہ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی تک اس درجہ کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط افلاطون و ارسطو و فیڈاس جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکے- لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا نیست و نابود ہوا کہ گویا کبھی پتا ہی نہیں تھا- یہ اس لئے کہ اس ترقی میں عقل غالب آگئی تھی اور اخلاقی و مذہبی اصول تابع عقل کر دیئے گئے تھے- اسی بداخلاقی اور بدمذہبی نے روما کو تباہ و برباد کر دیا- لیکن یہودی اور ہندو باوجودیکہ وہ صدیوں سے محکوم اور غلام ہیں اب تک باقی ہیں اور ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے- روما و یونان کے زوال کی تاریخیں پڑھنے سے حیرت و عبرت ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا سبق ہے ان اقوام کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہیں-

انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک حالت پر قانع نہیں رہتا- ایک چیز کے حاصل ہونے پر دوسری اور دوسری سے تیسری کی طرف لپکتا ہے- جب بھوک لگی تو کھانے کی تلاش ہوئی رفتہ رفتہ جب روٹی پیٹ بھر کے ملنے لگی تو بھوک ایک طرف رہ گئی کھانے کا مدار ذائقہ پر آٹھہرا- اور اس چاٹ میں اس نے وہ ترکیبیں اور نزاکتیں پیدا کیں کہ کچھ انتہا نہیں- کپڑا بدن کی حفاظت اور راحت کے لئے تھا اسے اس نے وجہ زیبائش و آرائش بنا لیا- وہ حقیر جھونپڑا جو سر چھپانے کے لئے بنایا تھا وہ ایک شاندار محل بن گیا ہے- جس میں تمام سامان آرائش و حسن جمع ہیں- اسی طرح اس نے دولت حکومت قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس کے دل کا مدعا حاصل ہوتا گیا اس کی ہوس

اور بڑھتی گئی۔ اور اس کے خیال کی جولانی میں اور وسعت ہوتی گئی۔ اور ہر شے میں نئی نئی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا ہوتی گئیں اور ان میں ایسا محو ہوا کہ بالآخر یہی اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اصل یہ ہے کہ انسانی ترقی باطن سے شروع ہوتی ہے۔ اور انسانی تنزل بھی باطن ہی کی طرف سے ہوا ہے۔ جو لوگ جسمانی آرام اور مادی راحتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی کو اصل ترقی سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ درجہ اسفل میں رہتے ہیں اور کبھی درجہ اعلے کو نہیں پہنچتے جو ہمیشہ باطن کی ترقی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جسم عارضی اور فانی ہے اور اس کے ساتھ اس کی ساری خواہشیں اور راحتیں اس کی ساری حکومت اور قوت بھی فنا ہونے والی ہے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد روح رہ جائے گی اور وہ ہمیشہ رہے گی جس نے اپنی نفسانیت اور خود غرضی کو دبا کر ایثار کو ترجیح نہیں دی۔ جس نے اس ہدایت کے نور سے جو مذہب کے ذریعہ سے ہوتی ہے اپنے آپ کو منور نہیں کیا اور اپنے باطن اور روح کی صفائی کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی روح عالم ارواح میں بھی ادنے حالت میں رہے گی۔ ڈارون کا اصول ارتقا صرف جسم اور اس کے علائق تک ہے جب جسم کا خاتمہ ہوگیا تو اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس اصول کے ماننے والوں کو اور ذرا دوسری طرف بھی توجہ کرنی چاہیے جو اصل ترقی ہے اور جس کا سلسلہ ابدلاباد تک رہنے والا ہے۔ جسم کو چھوڑنے کے بعد روح جس حالت میں یہاں تھی اسی حالت میں عالم ارواح میں پہنچتی ہے۔ اگر وہ یہاں ادنے حالت میں تھی تو وہاں ادنے حالت میں رہ کر پھر ترقی کرے گی اور یہاں کی جسمانی خواہشات غالباً اس کی تکلیف کا باعث ہوں گی۔ اگر اس نے یہاں ترقی کی ہے تو ترقی یافتہ حالت میں پہنچے گی اور وہاں سے ترقی کرکے اپنے اسے اعلے دوسرے عالم ارواح میں جائے گی اور اسی طرح ترقی کرکر کے اس سے بھی اعلے عوالم میں پہنچے گی۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ جس طرح سیاروں کے نظام لاتعداد ولا تحصے ہیں اسی طرح نظامات روح بھی بے حد و بیشمار ہیں۔ یہ ہے اصل اور صحیح اصول ارتقا جس کا سلسلہ نامتناہی ہے اور لازوال ہے۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ ادنے خیالات کو چھوڑ کر درجہ اسفل سے اعلے کی طرف ترقی کرے جس کی ہدایت ہمیں مذہب کرتا ہے۔

——— ۱۱ ———

غرض سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ

مذہب کرتا ہے- کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے- اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ہے- لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے- وہ مادی اور غیرمادی دونوں مملکتوں پر حاوی ہے اور اس کے اصول دور دور تک پہنچتے ہیں- جہاں سائنس کے پر جلتے ہیں- مذہب نہ صرف ان فرائض کو ادا کرتا ہے جو متعلق انسان کے نفس سے ہیں یا جو دوسروں سے متعلق ہیں- بلکہ وہ ان فرائض کا بھی خیال رکھتا ہے جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئے تو نہ صرف یہی بلکہ وہ اس عالم سے بھی متعلق ہے جہاں ہمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ہے سائنس انسان کی روح اور روحانی عالم اور عقبے کا انکار کیا کرے کیونکہ وہ کوتہ نظر ہے- لیکن اس کے انکار سے کسی شے کی ہستی زائل نہیں ہو سکتی- اہل سائنس اپنے بھورے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھتے ہیں- اور چند قانون قدرت جو انہیں معلوم ہوئے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے یہ خلاف قانون قدرت ہے- گویا یہ کائنات کے تمام قوانین قدرت پر حاوی ہیں- جو ذرا ہوشیار ہیں انہوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ہے ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے یا ہمیں اس کا علم نہیں لیکن یہ جواب خود ان سائنٹیفک ہے- سائنس جستجو تلاش اور تحقیق سکھاتا ہے تحقیق سے اعراض کرنا سائنس کی ذات کے خلاف ہے- لیکن اہل سائنس کی یہی ہمیشہ کی عادت رہی ہے- جو امور ان کی تحقیق اور ان کی حدود سے باہر ہیں ان کے تو منکر ہی ہیں لیکن سائینٹفک تحقیقات کو بھی انہوں نے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے- ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب میں اہل مذاہب پر تو جا بجا طعن و تشنیع کی ہے کہ انہوں نے سائنس کی مخالفت کی لیکن انہیں یہ بھی ضرور معلوم ہو گا کہ خود اہل سائنس نے تمام سائیٹفک تحقیقات کی ابتداء میں کس قدر مخالفت کی ہے- اور جب کبھی اور جہاں سائنس میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اول اس کی مخالفت میں اہل سائنس آستینیں چڑھا کر آئے- کوپر نیکس' گلی لیو اور ہاروے کے نام سے کون واقف نہیں' انہوں نے سائنس میں ایسے ایسے انکشافات کئے جو تاقیامت یادگار رہیں گے- لیکن ان کی مخالفت سب سے اول نہایت شدومد کے ساتھ ان کے ہم عصر اہل سائنس نے کی جب بنجمن فرینکلن نے رائل سوسائٹی کے سامنے براقہ کی بحث کی تو تمام اہل سائنس نے اسے بے وقعت بتایا اور رسالہ فلاسو فیکل ٹرنیز ایکشن نے اس

مضمون کو درج کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ وہی چیز آج کل کس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی ہے اور اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ جب ینگ نے روشنی کے نظری انتعاشیہ کے عجیب و غریب ثبوت پیش کئے تو سائنس دانوں نے اس کی خوب ہنسی اڑائی۔ سر ہمفری ڈیوی نے جب یہ خیال ظاہر کیا کہ لندن میں گیس کی روشنی ہو سکتی ہے تو اہل سائنس نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ اسٹیون نے جب یہ تجویز کی کہ لور پول اور مانچسٹر کے ریلوے روڈ پر انجن گاڑی چلائی جائے تو اس کے وقت کے بڑے بڑے اہل سائنس نے شہادت میں بیان کیا کہ یہ ناممکن ہے کہ اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ بھی ہو سکے۔ جب نامور اور مشہور منجم ارے گو نے برقی ٹیلی گراف کے متعلق بحث کرنی چاہی تو فرنچ اکاڈیمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اڑائی اور اسے بحث نہ کرنے دی۔ یہ چند عام اور معمولی نظیر پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی نے کوئی نئی تحقیقات کی تو سب سے اول اہل سائنس نے اس کی مخالفت کی۔ جب سائنس کے متعلق اہل سائنس کا یہ حال ہے تو روحانیات کے متعلق وہ جس قدر شد و مد کے ساتھ مخالفت کریں کم ہے لیکن وہ امور جن کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جن کے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں ایک روز مسلم ہو جائیں گے اور انہیں اپنی مخالفت پر خود افسوس کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہوں نے دیدہ دانستہ اپنے ہاتھوں اپنے علم کو محدود رکھا۔ اہل سائنس اہل مذاہب کو تعصب کا الزام دیتے ہیں لیکن ان کی ضد اور ان کے انکار کا تعصب ان سے کچھ کم نہیں۔ ان کے ذرا سے علم نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔ تحقیق و تجسّس جس پر انہیں ناز ہے وہ صرف ایک نہایت تنگ دائرہ تک محدود رکھتے ہیں۔ اس کے آگے دیکھنے سے وہ صاف انکار کرتے ہیں اور محض تعصب کی وجہ سے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ وقت آتا ہے جب انہیں مجبوراً اس خول کو توڑ کر باہر نکلنا پڑے گا۔

غرض اگر ہم روح کی ہستی اور اس کی قوت سے جس کے متعلق بے انتہا واقعات اور بہت قوی دلائل موجود ہیں انکار کر دیں اور مذہب کو جس کے اصول کی زیادہ تر بنیاد اسی پر ہے انسانی تمدن سے خارج کر دیں تو انسان کی زندگی محض بے سود و بیکار اور بے برگ و ثمر رہ جاتی ہے۔ اگر انسان صرف اسی مادی دنیا کو اور اس چند روزہ زندگی کو اپنا منتہا سمجھ لے تو کیا ان انسانی تمناؤں کے لئے جو اس کے دل میں موجیں مار رہی ہیں۔ یہ دنیا کافی ہو سکتی

ہے؟ کیا انسانی حیات کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ یہاں آئے اور چند روز بری بھلی طرح کاٹ کر چل دے؟ کیا علوم طبیعیات سچے اخلاق اور سچے ایثار کی ہدایت دے سکتے ہیں؟ اگر صرف مادہ ہی اصل حقیقت ہے اور طبیعیات و ریاضیات کے قانون اس کے فرمانروا ہیں تو انسان محض ایک چلتی پھرتی کل ہے۔ اور اس کے بعد دنیا میں کوئی قوت ہے تو ایک وحشیانہ قوت ہے جو سب پر غالب آجائے گی۔ خیر و شر یا برائی بھلائی صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے ذاتی یا تمدنی ذلیل و حقیر اغراض کے مطابق یا غیر مطابق ہے۔ بلکہ اس کا تطابق یا غیر تطابق اس قانون سے ضروری اور لازمی ہے جو ہم سے بالا اور الٰہی قانون ہے۔ انسان کے دل سے اس قانون کے خیال کو مٹا دو۔ اور خدا حیات جاوید انصاف و عصمت اور عذاب و ثواب کے خیالات نکال دو تو انسان کیا رہ جاتا ہے۔ صرف ایک وحشی جانور بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس میں سے ترقی کا مادہ سب زائل ہو جائے گا اور مادیت کے زہر سے سچے اور پاکیزہ اخلاق مرجھا جائیں گے۔ افسوس کہ ان بیچاروں پر جو ہوش سنبھالتے ہی محنت و مشقت میں جت جاتے جفائیں سہتے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ چند غافل ناکسوں کی عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ افسوس ان پر جن کی ساری عمر اس فکر و تردد میں کٹ گئی کہ کسی طرح دولت ملی جو اصل مسرت ہے۔ دولت۔ اس وقت جب کہ افتیں سہتے سہتے اور بلائیں جھیلتے جھیلتے کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہو گئی۔ نہ پہلے سی سکت رہی نہ پہلا سا جوش۔ قوے میں اضمحلال اور عناصر میں اختلال آگیا۔ اب معلوم ہوا کہ صرف دولت مسرت کا باعث نہیں۔ یا اس وقت بے مانگے بلا محنت مشقت کے ملی جب کہ جوانی کا بھوت سر پر سوار تھا اور بجائے مسرت کے زحمت اور آفت کا باعث ہوئی۔ کاش ضبط نفس ہوتا۔ تھوڑی سی قناعت اور اعتدال پر نظر ہوتی۔ دولت اور دولت سے جسمانی عیش انتہائے مسرت کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن حصول دولت و عیش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا۔ خود اس میں اس قدر بلائیں اور افتیں بھری ہیں کہ خوشی مفقود ہو جاتی ہے۔ اصل خوشی اعتدال' قناعت اور ضبط نفس میں ہے۔ بشرطیکہ انسان کسی مقصد اعلے کے حصول میں مشغول ہو۔ اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ باطن کی روشنی کی جھلک سے بیرونی حالات پر اثر پڑے۔ بیرونی حالات کے موافق کر لینے اور مادی سامان کے حصول سے جو لوگ دل کو مطمئن اور بامسرت بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ دل کی خواہشات کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اس کی گہرائی کی کوئی تھاہ ہے۔

بلکہ کام دوسری طرف سے شروع کرنا چاہیے۔ اپنے ارادے میں قوت نفس پر جبر اور ضبط حاصل کرنا اور خواہشات انسانی کو اس کے تابع بنانا چاہیئے تاکہ قلب کا اثر مادی حالات و خواہشات پر پڑے اور وہ اس کے لطف و مسرت کا باعث ہوں۔ اسی وقت اعتدال و قناعت نصیب ہوگی اور کام میں سہولت و استقلال پیدا ہو گا۔ لیکن اس سے بھی اعلی مسرت انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بے نفسی اور بے غرضی سے کام لیتا ہے۔ حیات انسان کی تہ میں رنج و الم ہے۔ انسان ہر طرف سے خطرے اور بے اطمینانی سے گھرا ہے۔ اور زیادہ تر جو وہ کھیل اور تفریح اور دیگر اشغال میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے آپ کو بھلائے رکھے اور دلی کاوشوں کی طرف اس کا خیال نہ جائے۔ انسانی فطرت کا ایک یہ بھی اصول ہے کہ انسان خوشی کی تلاش اور حصول سے نہیں بلکہ اپنی مصروفیت سے آلام زندگی کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہ عام مصروفیت ادنے درجہ کی ہے۔ اعلے درجہ اس کا اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ وہ بے غرض اور بے نفس ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرت اور خوشی پہنچانے کے لئے وہ ایک تنگ دائرہ سے نکل کر انسانی ہمدردی اور اخلاق کے اعلے طبقہ میں جا پہنچتا ہے اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے خیال میں وہ اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ سچے مذہب کی تعلیم یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائدار اور مستقل اور بے غل و غش ہوتی ہے اور اسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آئندہ کی توقع رکھتا ہے۔ بخلاف اس بوالہوس دولت کے بندے کے جو گزشتہ پر پچھتاتا اور حال میں مذبذب اور بے اطمینان رہتا ہے اور آئندہ زمانہ اسے تاریک نظر آتا ہے۔

۱۲

ہم نے جو گزشتہ اوراق میں انسان کی مذہبی اور روحانی قوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے تو اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ عقل یا سائنس و فلسفہ بیکار یا گمراہ کرنے والے ہیں۔ بلکہ اس رخ پر زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ آج کل سائنس کی چکا چوند سے لوگوں کی

نگاہ اس قدر خیرہ ہو گئی ہے کہ وہ دوسرے رخ پر نظر نہیں ڈالتے۔ ورنہ سائنس و فلسفہ کے کارآمد ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے اور مادی ترقی سے اس نے انسانی تمدن کو جو مدد دی ہے وہ ظاہر ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ محض سائنس کی ترقی انسانی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اسے اس رتبہ پر پہنچا سکتی ہے جو اس کا اصل منشاء منتہا ہے۔

پھر سائنس اور مذہب میں اختلاف و مخالفت کیوں ہے؟ غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ اس اختلاف و مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے اور سائنس کی بنیاد عقل پر۔ اہل مذہب سائنس سے اس لئے ڈرتے ہیں۔ کہ سائنس کے اصول اور ان کے انکشافات مذہب کو کمزور اور زائل کر دیں گے حالانکہ یہ خیال محض باطل ہے۔ سائنس صدہا سال سے برابر ترقی کرتا چلا آیا ہے لیکن وہ مذہب کی بنیاد کبھی نہ ہلا سکا۔ مذہب کی قوت ابھی تک ویسے ہی قائم ہے اور قائم رہے گی۔ اس لئے کہ جس شے پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ خیال مافوق العادۃ عقل سے باہر ہے' اس لئے کہ اس کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ اور یہ ایک ایسا وجدان قلب ہے جس میں غیر محدود کے محسوس کرنے کی قوت ہے۔ حالانکہ عقل بذاتہا محدود ہے۔ غیر محدود یعنی خدا کا دیکھنے اور پہچاننے والا دل ہے عقل کی استدلال سے اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ادلہ و براہین اسی کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہیں جس میں پہلے سے یہ وجدان ہے اور خدا کو مانتا ہے۔ جو نہیں مانتا اس کے لئے تمام دلائل بے کار ہیں۔ لہٰذا اہل مذہب کو سائنس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر زمین گردش کرتی ہے اور آسمان پھرتا ہے تو مذہب کو اس سے کیا تعلق؟ اگر کوئی نیا ستارہ دریافت ہوا تو مذہب پر اس کا کیا اثر؟ اگر زمین کے اندر سے نئے نئے آثار متحجرہ نکلیں اور ان سے انسان کی قدامت پر روشنی پڑے تو مذہب کو اس سے ڈرنے کی وجہ؟ اگر کشش ثقل نے سائنس میں انقلاب پیدا کیا اور بہت سے مسائل عالم کو حل کیا تو بہت مبارک۔ مذہب اس سے کیوں خائف ہے؟ اور نظریہ ارتقا انسان کی ترقی کے اصول کو بتاتا

ہے تو بتائیے مذہب کیوں اس سے گھبرائے؟

جب مذہب کی حالت ایسی مستحکم اور قوی ہے تو پھر اہل مذاہب کیوں اہل سائنس سے لڑتے اور جھگڑتے اور ان پر ارتداد و کفر کے فتوے لگاتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک

معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ چونکہ مذہب انسان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب سے اس نے ہوش سنبھالا اور جب کہ سائنس کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لئے مذہب کو علاوہ روحانیات و معاشریات کے وہ کام بھی کرنا پڑا جو سائنس سے مخصوص تھا۔ غرض ابتدا میں مذہب روحانی' اخلاقی' معاشرتی' سیاسی اور سائنٹفک تمام انسانی شعبوں پر حکومت کرتا رہا اور مذہب کا ہادی معلم بھی تھا فلاسفر بھی تھا اور حاکم بھی تھا۔ لیکن مذہب و اخلاق کو چھوڑ کر باقی امور ضمنی تھے اور وہ مجبورا مذہب میں داخل کر لئے گئے تھے۔ انسان نے جب ترقی کی اور اس کا تجربہ اور تمدن وسیع ہوا تو ہر ہر شعبہ الگ ہونا شروع ہوا۔ اور ان میں نئی نئی باتیں اور نئے انکشافات شروع ہوئے۔ اہل مذاہب نے جب یہ دیکھا تو انہیں یہ امر ناگوار گزرا اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی یہ ترقی ہماری مخالفت میں ہے۔ جو امور ابدان و حفظان صحت کے متعلق تھے وہ علم طب نے سنبھال لئے۔ جو ملکی تھے وہ علم سیاست نے لے لئے۔ اور جو نجوم و شموس و اقمار کے متعلق تھے وہ فلکیات کے تحت آگئے۔ مگر اہل مذاہب ایک مدت تک انہی باتوں پر جمے رہے جو ابتدا میں ان علوم کے متعلق مذہب کی ذیل میں آگئی تھیں اور علمی ترقی سے انکار کرتے رہے اور اس ترقی کو مذہب کی مخالفت اور استیصال کا باعث سمجھتے رہے۔ لیکن درحقیقت ان امور کو نہ پہلے مذہب سے تعلق تھا اور نہ اب ہے اور نہ ان کی ترقیاں مذہب کے رستے میں حائل ہو سکتی ہیں۔ اور نہ اسے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ کیونکہ سائنس مذہب پر کسی طرح نہ حملہ کر سکتا اور نہ اسے نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے کہ جس پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس اور رسائی سے باہر ہے۔

اب رہی سائنس کی مخالفت مذہب سے۔ سو یہ بالکل بیجا اور محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ سائنس مذہب کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سائنس استدلال عقلی پر مبنی ہے اور سب چیزوں کو اسی سے پرکھتا ہے۔ جو چیزیں اس کے اصول پر پوری نہیں اترتیں اس کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں بلکہ اس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاق حق میں صرف عقل ہی پر دارومدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً" حسن کی دریافت کے لئے ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل۔ احقاق حق میں عقل وہیں تک کام دیتی ہے جہاں تک سلسلہ علت و معلول کا تعلق ہے لیکن جہاں اس کے سوا کچھ اور بھی ہے تو وہاں روحانی عمل شروع ہو جاتا

ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں عقل حالات و عادات و اغراض سے بھٹک جاتی ہے تو ان معاملات میں اس کی کیا پیش جا سکتی ہے جن کا زیادہ تر تعلق تمیز وجدانی پر ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے جو عقل سے بالا ہے اس لئے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی اور نافہمی سے اس پر حملے کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک بات اسے اور ہاتھ لگ گئی ہے۔ جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف کہہ اٹھتا ہے کہ یہ خلاف قانون فطرت ہیں۔ گویا تمام قوانین فطرت اس کے دیکھے بھالے ہیں اور وہ ان سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اول تو اس کرہ کی جس پر ہم آباد ہیں بساط ہی کیا ہے دوسرے جو چند قانون فطرت ہمیں معلوم ہیں بالکل محدود ہیں اور وہ صرف مادی حالت سے متعلق ہیں۔ عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنیاد اس پر ہے اور بھی محدود ہے۔ اسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ مادی سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اگرچہ اس کے متعلق بھی اس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر اس محدود علم اور یک طرفہ علم پر اس کے یہ دعوے ہیچ ہیں۔ اور بغیر اس کوچہ میں قدم رکھے جو مادہ سے بالا ہے اور بغیر اس تحقیق و معرفت کے جو اس دائرہ میں داخل ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس کا انکار ناقابل سماعت ہے۔ ایسی صورت میں سائنس کا مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و نافہمی ہے۔ اہل سائنس کو زیادہ عالی ظرفی زیادہ وسیع النظری زیادہ حوصلہ و تحمل اور زیادہ تحقیق و تجسس سے کام لینا چاہئے۔ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ کہہ دینا کہ آفتاب کا وجود ہی نہیں اور جب دوسرے اس کے ہونے کی شہادت دیں تو انہیں جھٹلانا سائنس اور فلسفہ کے اصول کے خلاف ہے۔ مگر باوجود کثرت واقعات و دلائل وہ اپنے انکار پر مصر ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعصب اور ان کی ہٹ دھرمی مذہبی تعصب اور ضد سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔

جس طرح علمائے طبیعیات و مریدان ارتقا کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ چادر دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھیلائیں اور اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ اسی طرح اہل مذاہب کو بھی چاہئے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایک حد ہے جہاں مذہب کو رک جانا چاہئے۔ اور ایک حد ہے جہاں سائنس کو ٹھہر جانا چاہئے اور یہاں پہنچ کر سائنس اور مذہب نہ صرف اپنے پرانے قصے قضیئے اور عداوتوں کو بھلا دیں بلکہ دو روٹھے ہوئے

بھائیوں کی طرح من جائیں۔ عالم طبیعیات کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے قبل اس کے کہ وہ کائنات کے مسئلہ کو حل کرے اور اسی طرح اہل مذاہب کو بھی۔ ان کا منشا ایک ہے یعنی انسان کی ترقی ارر بہبودی۔ لیکن ایک کا مقصد مادی اور ظاہری ترقی کا ہے اور دوسرے کا مقصود باطنی اور روحانی ترقی۔ ایک استدلال عقلی اور استقرا کے رستہ اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے اور دوسرا جذبات اور تخیل کی راہ سے۔ لیکن کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو خارج کر دے۔ کائنات کی انتہائی صداقت کا معلوم کرنا کوئی بری بات نہیں اور جو کوئی اس میں کوشش کرتا اور مدد دیتا ہے تو نیچر اسے نکال نہیں سکتی۔ روح اسے ضرور یہیں پائے گی۔ اور جو شخص اس کوشش میں ہے کہ اس خیال کو نکال دے اور خدا کو کائنات سے خارج کر دے وہ بڑا ظلم کرتا ہے۔

جھگڑے تنازع اور جدوجہد سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ صداقت اختلاف کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ اہل مذاہب کا ضعف اس میں ہے کہ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ اس سے مدد لینا اور اسے معاون بنا کے رکھنا چاہئے۔ اگر اس کے کہیں دشمن ہیں تو ان سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ بھاگنے سے شکست بہتر ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ شکست سے فتح ہو جائے۔ مگر بھاگنے سے گمنامی کا احتمال ہے۔ اور گمنامی سے موت کا ڈر ہے۔ اور یاد رکھنا چاہئے کہ اگر مذہب میں ہم زیادہ ترقی اور روشن خیالی کو دخل دیں گے اور اسے توہمات باطلہ اور تمام غیر ضروری کثافتوں سے پاک کر دیں گے تو اس کی فتح ہی فتح ہے۔ اسی طرح سائنس کا ضعف اس میں ہے کہ اپنے محدود علم پر تکیہ کرکے بے سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے اصول مذہب پر حملہ کرتا اور اس کے خیالات سے انکار کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انسان کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالتے ہیں جس سے مذہب بحث کرتا ہے تو اس کی نظر اور وسیع ہو گی اور وہ زیادہ مفید ثابت ہو گا۔ لیکن اگر وہ اپنی آنکھیں بند کرے گا اور اپنے دل و دماغ میں روشنی نہیں پہنچنے دے گا تو بلاشبہ اس کی قسمت میں ہے۔ یہ وقت ہے اس کی ہمت آزمائی کا۔ تحقیق و تجسّس اس کے اصل اصول ہیں۔ اسے چاہئے کہ وہ انہیں اپنے محدود دائرے سے اور آگے بڑھائے اور قدرت حق کا تماشا دیکھے۔ اسے اب صداقت کے ماننے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ اور زیادہ عالی ظرفی اور روشن خیالی سے کام لینا چاہئے اور ضد اور نفسانیت سے دست بردار ہونا چاہئے۔

بقول پروفیسر ٹیٹ و بالفور اسٹیورٹ جو اس زمانہ میں سائنس کے بہت بڑے عالم ہیں اس کائنات میں ایک قانون توال یا عدم انقطاع موجود ہے۔ اور یہ ہستی محض بیکار اور

مہمل ہو جائے گی۔ یہ مادی عالم صرف مادی ہی سے نہیں بنا بلکہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جس پر اس کا دارومدار ہے۔ اور وہ قوت ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ قوت اسی وقت کارآمد ہے جب کہ یہ تبدیلی ہیئت کرتی ہے۔ لیکن تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ قوت کی تبدیلی اسے کمزور کر دیتی ہے۔ یہ بیشک ممکن ہے کہ قوت کو ہم حرارت میں تبدیل کر لیں اور اس سے کام لیں۔ لیکن ہر ایسی تبدیلی قوت حرارت کو کمزور کر دے گی اور رفتہ رفتہ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سورج ہمارے نظام کا منبع حرارت اعلی ہے اور وہ قوت جس پر ہماری حیات کا دارومدار ہے اس حرارت سے اخذ کی جا سکتی ہے جو سورج سے نکلتی ہے۔ جب کہ سورج ہمارے لئے قوت مہیا کرتا رہتا ہے تو خود وہ سرد ہوتا جاتا ہے اور آخر کار اس طرح خلائے بسیط میں حرارت نکالتے نکالتے اس میں وہ حیات قائم رکھنے والی قوت زائل ہو جائے گی جو اس وقت اس میں موجود ہے علاوہ سورج کے سرد ہونے کے ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایڑی رگڑ کی وجہ سے ہماری زمین اور ہمارے نظام کے دوسرے کرے بالتقاف سورج کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ ہر ایسی حالت میں تصادم سے حرارت پیدا ہو گی اور عارضی طور پر سورج کی بجھی ہوئی قوت پھر بحال ہو جائے گی۔ اور آخر ایک روز یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور وہ بجھ بجھا کے رہ جائے گا۔ یہاں تک کہ ازمنہ بیشمار کے بعد اس کی پھر کسی پڑوسی سے مڈ بھیڑ ہو۔ اور اس کی جان میں جان آئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حرارت کا یہ ازالہ ایک روز ہمارے نظام کو ختم کر دے گا۔ تو پھر اس سے وہ قانون جسے قانون توال یا عدم انقطاع سے تعبیر کیا گیا ہے نہیں ٹوٹ جائے گا ایسی حالت میں وہ تسلسل جو برابر جاری رہنا چاہئے کہاں رہا؟ لیکن اگر صرف یہ عالم ظاہر ہی سب کچھ ہوتا تو بیشک یہی صورت واقع ہوتی۔ لیکن اب سائنس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کے اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک ایسے عالم کو بھی محسوس کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ان قوانین کی تکمیل کے لئے جو اس نے دریافت کئے ہیں ایک غیر مرئی روحانی دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ اسی قانون توال سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ غیر مرئی عالم سے قبل ہو گا۔ کیونکہ مرئی عالم کی کوئی ابتدا ہونی چاہئے۔ اب یہاں مذہب یا الہام اور سائنس کی سرگوشیاں شروع ہوتی ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ عالم ایک وقت میں خلق کیا گیا تھا۔ سائنس کہتا ہے کہ جس طرح یہ عالم اس وقت ہے ہمیشہ سے یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مذہب کہتا ہے کہ دنیا اور اس کی کائنات سب مل کے خاک ہو جائے گی۔ سائنس ان قوانین کی رو سے جن کی حکومت اس دنیا پر ہے یہ

استدلال کرتا ہے کہ موجودہ نظام کا انجام یہی ہونے والا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ ایک روحانی دنیا بھی ہے جس کا اس دنیا سے گہرا تعلق ہے اور ہماری حالت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ سائنس بھی اب دبی زبان سے کہنے لگا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسانی قانون ملیامٹ ہو جائیں گے اور اپنے ہاتھوں آپ اپنی قبر بنائیں گے۔ کیونکہ قانون توال یا عدم انقطاع کا مقتضی یہ ہے کہ اگر یہ موجودہ کائنات برباد و تباہ ہو گی تو اس غرض سے کہ وہ دوسری جگہ ایک جدا سلسلہ قوانین کے تحت میں اپنی ہستی حاصل کرے اور نئے قانون نشوونما میں پھولے پھلے۔ اور یہی اصول افراد پر بھی صادق آتا ہے اور اس لئے بلا کسی مذہبی خیال کے روح کے غیر فانی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے۔ تو موت انسانی ترقی کی حائل اور مانع نہیں ہو سکتی۔ اور یہی آخرت یا عقبےٰ ہے۔

یہاں سائنس و مذہب کا وہ عناد و مخالفت جس کا اس قدر شور و غلغلہ مچا ہوا ہے اور جس پر ڈاکٹر ڈریپر نے فصاحت کے دریا بہا دیے ہیں۔ کافور ہو جاتی ہے۔ سائنس اب تک ایک گنبد بے در میں چکر لگا رہا تھا۔ اب ادھر کی تھوڑی سی جھلک پہنچنی شروع ہوئی ہے۔ وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہا ہے کہ یہ نئی شے کیا ہے۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کی بصارت روشن اور اس کی بصیرت منور ہو جائے اور مذہب سے آکر بیعت کرے۔

غور سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب کی مخالفت محض غلطی اور غلط فہمی پر ہے اور طرفین نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ بجائے سلجھانے کے اور الجھن پیدا کر دی ہے۔ سائنس کے جدید اور عجیب انکشافات اور انوکھے قیاسات اور نظریات سے جن پر اہل سائنس کو بڑا فخر ہے۔ اہل مذاہب گھبرا گئے کہ سائنس ہمارا جانی دشمن ہے کیونکہ وجہ یہ ہے کہ سائنس کے ہر جدید انکشاف کا یہ ناگزیر نتیجہ ہوا کہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے۔ اور ان جدید انکشافات سے اس حالات میں تزلزل پیدا ہو گیا جس پر پہلے سے ایمان لائے بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ اس حالت کو مذہب سے تعلق نہ ہو۔ لیکن چونکہ اسے قطعی اور یقینی سمجھ چکے تھے لہٰذا مذہب اور الہام کو بھی اسی پر ڈھال لیا تھا اور جب اسے ٹھیس لگی تو شور و غل مچانا شروع کیا اور مخالفت کی ایک نئی بنیاد قائم ہو گئی اور یہ سمجھ لیا کہ یہ مذہب کی عین مخالفت ہے۔ حالانکہ اسے مذہب سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ اہل مذاہب کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور الہام ربانی کو ہمیشہ گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ اور جہاں ان کی رائے پر بھی حملہ ہوا تو اسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب پر حملہ ہے۔

لیکن صرف اہل مذاہب ہی غلطی پر نہیں ہیں بلکہ اہل سائنس بھی اسی غلطی میں پھنسے

ہوئے ہیں۔ اہل سائنس اہل مذاہب کے اجتہادات اور آرا کو الہام ربانی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے ان آراء کی غلطی ثابت کر دینے سے وہ سمجھتے ہیں کہ الہام ربانی کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ زیادہ تر خطرہ "نیم حکیم" اہل سائنس سے ہے جنھوں نے کبھی آنکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھا۔ اور جو سائنس کے قیاسات کو بھی یقینیات سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا اور ان میں یہ ہمیشہ مخالفت رہے گی۔ اگر بعض اہل سائنس جنہیں خدا نے اعلے دماغ عطا کیا ہے یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ مذہب و سائنس میں کوئی مخالفت نہیں اور وہ اس مادی عالم کے پرے ایک اور عالم کے بھی قائل ہوتے جاتے ہیں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

ڈاکٹر ڈریپر کی یہ کتاب "کان فلکٹ بٹوین سائنس اینڈ ریلیجن" (معرکہ مذہب و سائنس) درحقیقت سائنس کی پرزور حمایت ہے۔ لیکن فاضل ڈاکٹر نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ وہ یہ کہ جسے وہ مذہب کہتے ہیں وہ درحقیقت مذہب نہیں بلکہ رومن ازم ہے اور جتنے حملے بھی انہوں نے مذہب پر کئے ہیں۔ وہ بلاشبہ رومن ازم پر ہیں مذہب پر نہیں ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ عام مذہب تو کیا خود مسیح کے مذہب پر بھی ان حملوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب یہ بنیاد ہی غلط ہے تو وہ شاندار عمارت جو انہوں نے اس بنیاد پر قائم کی متزلزل ہو کر دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

سائنس و مذہب کا یہ اختلاف اور ان کی باہمی بدظنی و بدگمانی ابھی مدت تک رہے گی۔ اور اسے سہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس کی بنیاد غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر ہے۔ اہل مذاہب کو سائنس کی صداقت پر اور سائنس کو مذہب کی صداقت پر ایمان لانا چاہئے۔ اور ایک روز آنے والا ہے کہ یہ ایک، دوسرے کے خون کے پیاسے اپنے نادانی پر پچھتائیں گے اور اپنی حرکات سے شرما کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیں گے پھر سائنس کو مذہب سے اور مذہب کو سائنس سے کچھ عناد نہ ہو گا۔ اور یہ توام بھائی یک جان دو قالب ہو جائیں گے۔

------ ۱۳ ------

لیکن ایک مشکل اور ہے۔ سائنس کے اصول میں تو کیا فروع میں بھی بہت کم اختلاف ہے۔ سوائے ان امور کے جو قیاسی ہیں۔ کیونکہ وہ مشاہدے تجربے اور استقرا پر مبنی

ہیں- حالانکہ مذاہب کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے- ان بے حد اور بیشمار اختلافات میں یہ مشکل آپڑی کہ سچا کسے سمجھا جائے- اور صداقت کا پتہ کہاں ہے-

پروفیسر میکس مولر نے ایک جگہ دنیا کی زبانوں کے متعلق بڑی اچھی بات کہی ہے- وہ کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لیکن تاہم انسان کی تاریخ میں کوئی زبان اب تک نئی نہیں بنی- قدیم سے جو الفاظ چلے آتے ہیں وہی اب تک چلے آتے ہیں- انہیں میں کچھ ہیر پھیر اور رد و بدل کر لیا جاتا ہے- بعینہ یہی حال مذاہب کا ہے- ہمیشہ نئے نئے بنتے رہتے ہیں- نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن غور سے دیکھو تو اصل وہی ہے جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے- البتہ کچھ ردوبدل کر لیا گیا ہے- اختلافات صرف ان ممالک اور ان اقوام کی وجہ سے ہیں- جن میں مذاہب رائج ہوئے یا اس زمانہ کی وجہ سے جب کہ مذاہب کی اشاعت ہوئی- اگر ابتدا سے لے کر تمام مذاہب کو سلسلہ وار جمایا جائے تو یہ اختلاف کا مسئلہ صاف طور سے سمجھ میں آجائے گا- ملک اور قوم اور زمانہ کی وجہ سے جو خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں وہ اگر نکال دی جائیں تو پھر مشکل سے کوئی اختلاف باقی رہتا ہے اور اگر اختلافات ہیں بھی تو وہ انسانی خیال کی ترقی کے مراحل کو ظاہر کرتے ہیں- اور اس لئے وہ رد کرنے یا خارج کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک منتظم سلسلہ میں آنے کے قابل ہیں-

اس وقت کسی جدید مذہب کے قائم کرنے یا جدید صداقتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل حق ظاہر کرنے کے لئے صداقت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب کی ضرورت ہے- ہماری رائے میں اس کام کو اسلام نے خاطر خواہ انجام دیا ہے-

مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت مبالغہ ہے- ایک مذہب نے کسی ایک خوبی کو لیا اور اسے آسمان پر چڑھا دیا اور دوسری خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا دوسرے نے کسی دوسری خوبی پر اس قدر زور دیا کہ باقی خوبیوں کی کچھ حقیقت نہ رہی- یہودی مذہب نے ظاہری ارکان کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کیا کہ باطنی صفائی پس پشت جا پڑی- اس کے خلاف عیسائی مذہب نے باطنی صفائی پر اس قدر زور دیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور دنیاوی تعلقات سب ہیچ رہ جاتے ہیں- غرض مختلف مذاہب نے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو خاص نظر سے دیکھا اور باقی پہلو یونہیں رہ گئے- اس مبالغہ سے مذاہب میں انحطاط اور تنزل پیدا ہوا- حالانکہ وہ بات جو باعث انحطاط ہوئی بڑی خوبی کی تھی- لیکن اس [illegible] مبالغہ اس قدر کیا کہ وہ خود تو عیب ہو گئی- اور دوسری خوبیاں اس مبالغہ کی وجہ

سے کمزور ہو گئیں جس طرح کسی خاص عضو کی ورزش کرنے سے دوسرے اعضا کمزور ہو جاتے ہیں اسی طرح اخلاقی اور روحانی قوتوں کا بھی حال ہے ایک پر زور دینے سے دوسری کمزور ہو جاتی ہیں۔ مذہب کی کامل صداقت اور اصل کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ سب میں اعتدال قائم رکھے۔

انسان کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حیوانی دوسری روحانی۔ اور ان دونوں میں آپس میں اختلاف اور عناد ہے۔

پھر روحانی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عقل دوسری جذبات۔ اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

اخلاق و تمدن کا تنہا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ یہاں دونوں (یعنی عقل و جذبات) گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بھی دو صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کی ذاتی ضرورتیں' دوسرے سوسائٹی کی ضرورتیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ اور باہم ایک دوسرے سے جدوجہد رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسان شخصی حیثیت سے حقوق رکھتا ہے۔ اور بحیثیت رکن سوسائٹی اس پر فرائض عاید ہیں۔ بحیثیت انسان ناطق کے وہ کامل آزادی چاہتا ہے۔ سوسائٹی اس آزادی کی مانع ہے۔ شخصی ترقی کے لئے کامل آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن تمدنی ترقی کے لئے حکومت کی ضرورت ہے جو اس قسم کی آزادی کو روکتی ہے۔ اس لئے آزادی اور حکومت میں ہمیشہ جنگ و جدل رہتی ہے۔

غرض انسان اپنے تمام خیالات و تعلقات میں اختلافات سے گھرا ہوا ہے اور یہ اختلافات رفتہ رفتہ عناد و عداوت تک پہنچ جاتے ہیں جو مذہب و تمدن کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں اور اس لئے انسان اور انسانی تمدن کی بہبودی کے لئے ضرور ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مختلف زمانوں میں مختلف نبی آئے اور اپنے اپنے عہد میں انہوں نے اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن نقص یہ رہا کہ وہ اصلاح صرف اسی زمانہ کے متعلق تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مبالغہ مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ ایک زمانہ میں کسی ایک صداقت یا نیکی میں مبالغہ تھا۔ نبی نے اسے توڑنا چاہا۔ اور اس کے مقابلے میں کسی دوسری صداقت یا نیکی میں مبالغہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کامل اصلاح نہ ہو سکی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ صداقت کے تمام پہلوؤں کا کامل طور سے اظہار ہو۔ لہٰذا اس کی کامل اصلاح کے لئے ایک انسان کامل کی ضرورت تھی جو ملک عرب میں مبعوث ہوا۔ اس نے انسان کی مختلف حیثیتوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جو اختلافات اب تک

چلے آرہے تھے مٹ گئے۔ اور ایک ایسے مذہب کا سلسلہ قائم ہو گیا جو انسان کی دینوی اور دینی نجات کا باعث ہوا۔ پیغمبر خدا صلعم ان اختلافات کی لم اور اصلاح کے اصلی راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے مبالغہ سے احتراز کیا اور اعتدال کو مدنظر رکھا۔ اور ان اختلاف میں ہمیشہ کے لئے مصالحت پیدا کر دی۔ یہ وہ رستہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ پیغمبر خدا نے اس معمے کو حل کیا۔ اور انسان کی کامل بہبودی اور اصلاح کی بنیاد ڈالی جس کا احسان اس عالم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح مبالغہ انحطاط و زوال کی علامت اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح اعتدال تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ انسان کی حالت ایسی کش مکش میں ہے کہ وہ مبالغہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف سے محروم رہا جاتا ہے۔ اس لئے ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو اعتدال پر رکھے اور اس کی کسی قوت میں زوال نہ آنے پائے۔ اعتدال نہ صرف انسانی معاملات اور اس دنیا کے امور کی اصلاح کے لئے ضروری ہے۔ بلکہ تمام اخلاق و نیکی اور کل کائنات کا دارومدار اسی پر ہے۔ یہ زمین' یہ سیارے یہ نظامات جو گردش میں ہیں اگر بال برابر اپنی حد اعتدال سے تجاوز کریں تو ایک عالم میں قیامت برپا ہو جائے اور یہ سارا کارخانہ خاک میں مل جائے۔ یہی حال کائنات کی ہر شے میں ہے۔ نیکی و بدی کیا ہے؟ اخلاق کیا ہے؟ صحت کسے کہتے ہیں؟ ذوق کس چیز کا نام ہے؟ اگر ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان سب کا مدار اعتدال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں وہاں قیام اور استحکام کی صورت نہیں۔ اسی عالم گیر اور پر معنی اصول پر پیغمبر اسلام کی تعلیم مبنی ہے اور اسی اصول پر نظر نہ رکھنے سے قدیم مذاہب میں انحطاط و زوال پیدا ہوا۔ اسلام نے اس کمی کو پورا کیا اور اپنی تعلیم سے ہمیشہ کے لئے ایسی بنیاد قائم کر دی جس میں انحطاط و زوال نہیں آسکتا۔

اگرچہ رہبانیت کو اسلام نے خارج کیا ہے اور حسن معاشرت کے متعلق احکام دیے ہیں۔ لیکن تاہم یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بالکل دنیا ہی میں منہمک نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹٹی ہے۔ نماز روزے حج کی تاکید کی ہے۔ ظاہری ارکان پر بھی ایک حد تک نظر رکھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا کہ نیکی کے یہی معنی نہیں کہ نماز کے لئے پورب پچھم کو منہ پھیر دیا بلکہ اللہ کی محبت میں عزیز و اقارب یتیموں محتاجوں مسافروں کو اپنا مال دینا' غلاموں کو آزاد کرنا' زکوٰۃ دینا' نماز پڑھنا' اپنے عہد کو پورا کرنا' سختی اور تکلیف میں ثابت قدم رہنا۔ اس سے بڑھ کر نیکی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ اس کا مدار محض

ظاہری ارکان پر ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی سچی محبت اور انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی اور ایثار میں ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دنیا و آخرت۔ مادی اور روحانی عالم دونوں کی رعایت رکھتا ہے۔ اور جب انسان ظاہری ارکان اور اصول کا پابند ہو گیا تو پھر نیکی کے معنی اس کے لئے وسیع ہو جاتے ہیں اور وہ آگے قدم رکھتا ہے۔ اور اس کا روحانی احساس قوی ہونے لگتا ہے۔ خود آنحضرت صلعم کی زندگی اس کی سچی مثال ہے۔ حبابؓ صحابی آنحضرت صلعم کہتے ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر کے نیچے کملی رکھے ہوئے کعبہ کے سائے میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے مشرکوں سے بہت کچھ ایذا اور تکلیف پائی تھی۔ میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کفار پر بددعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ اٹھ بیٹھے اور آپ کا چہرہ سرخ ہو گیااور فرمانے لگے۔ اگلے لوگوں میں ایسے ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ بے دین لوگ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیتے تھے اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اسے دو ٹکڑے کر ڈالتے تھے لیکن اس قدر تکلیف بھی اس بندے کو دین سے نہ پھیرتی تھی اور کسی پر لوہے کی کنگھی اس سختی سے کھینچتے تھے کہ وہ اس کے گوشت کو طے کر کے پٹھے اور ہڈی تک پہنچتی تھی مگر یہ سختی اسے دین سے نہ پھیرتی تھی۔ سچ پر ثابت قدم رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اسلام نے تمام تعلیم میں اعتدال کو مدِ نظر رکھا ہے خواہ عبادات میں ہو یا اخلاق میں۔ مثلاً" یہ فرمایا ہے کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ بدلا لو تو اس کے بدلے میں اسی قدر تکلیف دو جتنی تمہیں پہنچتی تھی۔ لیکن اگر صبر کرو درگزر کرو معاف کرو اور بخش دو تو اللہ تمہیں دوہرا اجر دے گا اور اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور اس کو بار بار مختلف مقامات میں تاکید سے بیان کیا ہے اور بدلے کے مقابلہ میں عفو کا درجہ بڑا بتایا ہے۔ آخر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تم گنہگاروں' خطا کاروں' دشمنوں اور مخالفوں سے شیوہ عفو و غفران اختیار کرو گے' تو خدا بھی تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے گا۔ یعنی بدلہ لینا اگرچہ انسان کی عادت میں داخل ہے اور مقتضائے عدالت ہے لیکن اخلاق کریمانہ کا یہی مقتضا ہے کہ برائی کے عوض بھلائی کرو اور مخالفوں کی خطاؤں اور برائیوں کو معاف کرو اور عموماً" درگزر کرو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ بری بات کا جواب ایسا کہو جو سب سے بہتر ہو۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو کہ وہ بہت ہی اچھا ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم دیکھ لو گے کہ تم میں اور کسی شخص میں عداوت تھی تو اب ایک دم سے گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے۔ اور حسن مدارات کی

توفیق انہیں لوگوں کو دی جاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ انہیں کو دی جاتی ہے جن کے بڑے نصیب ہیں[7]۔ پھر یہ بھی سمجھایا ہے کہ کہ کسی قسم کی عداوت تم کو عدل کرنے سے باز نہ رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم کو انصاف کرنے سے نہ روکے۔ تم اپنے دشمن اور دوست سب سے عدل و و احسان و انصاف کا برتاؤ کرو۔ چنانچہ فرمایا ہے اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے لئے گواہی دینے کو انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑو۔ تقویٰ کی بات یہی ہے کہ تم عدل کرو[8]۔ اس سے بڑھ کر حسن معاشرت اور نیکی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طور پر روپے پیسے کمانے اور اس کے صرف میں اعتدال کی ہدایت ہے۔ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو[9]۔ اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا[10]۔ خرچ کرنے والے فضول خرچی نہ کریں۔ اور نہ بہت تنگ دستی کریں۔ ان کا خرچ دونوں کے بین بین ہو[11]۔ رشتہ دار غریب اور مسافر کے حقوق دیتے رہو۔ اور دولت کو بیجا نہ اڑاؤ۔ دولت کے بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرگزار ہے۔ اگر تم اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہے ان سے منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے ان کو سمجھا دو۔ اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل اسے پھیلا ہی دو کہ لوگوں کی ملامت سننے بیٹھو۔

پھر اسلام نے ایک دوسری اعلیٰ تعلیم دی ہے جو تمدن کی جان اور ترقی عالم کی روح رواں ہے۔ فرمایا ہے کہ **انما المومنون اخوۃ** یعنی مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہے کہ ایک ادنے غلام اور ایک شہنشاہ برابر ہے۔ اور صرف یہ قول ہی قول نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے اب تک اس پر عمل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے غلام بھی بڑے بڑے شہنشاہ ہو گزرے ہیں۔ اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی غیر شخص برادری کا بھائی ہو جاتا ہے اور اس کے حقوق سب کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم جادو کا اثر رکھتی ہے اور اس نے اشاعت اسلام میں بہت مدد دی ہے۔ دنیا میں جتنی اقوام ہیں ان کی تقسیم محض حدود جغرافیہ کی رو سے ہے۔ لیکن مسلمانوں کی قوم اس تنگ اور ادنے امتیاز سے بالا ہے۔ مسلمانوں کی راہ میں ملکی حدود آب و ہوا، رنگ اور نسل حائل نہیں۔ وہ سب ایک ہیں خواہ کہیں ہوں۔ افریقہ کا حبشی عرب کا بدو۔ ہندوستان کا برہمن، یورپ کا فرنگی، مصر کا فلاح غرض دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی یہ سب کمزور اور عارضی امتیازات اٹھ جاتے ہیں اور وہ ایک ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کہیں ہو

اور کوئی ہو مسلمان ہے۔ اس کا وطن سارا عالم اور اس کی برادری سب مسلمان ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ سب مل کر مضبوطی سے اللہ کا ذریعہ پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے[1]۔

اس سے بھی بڑھ کر اعلے اور افضل ایک اور تعلیم اسلام ہے۔ جو درحقیقت تمام عالم کے لئے صلائے عام ہے۔ یعنی پیغمبر نے فرمایا ہے **من قال لا الہ الا اللہ فدخل الجنتہ** اس سے بڑھ کر کامل وسیع اور عالمگیر اصول کسی دین و مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام نے اپنا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ وسیع ہونا ممکن نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ہمیشہ بول بالا رہے گا اور دنیا میں اس کی حکومت ہو گی۔ گویا اسلام نے مذہب کی تکمیل کر دی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر' اس کے اخلاق اس قدر پاکیزہ اور اس کی تعلیم اس قدر اعتدال پر مبنی اور انسانی طبائع کے مناسب اور انسان کی ترقی کی ممد ہے کہ دنیا کی مادی اور روحانی ترقی کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

یہ محض اقوال نہیں ہیں بلکہ خود پیغمبر اور پاک باطن خلفاء اور تابعین نے اپنے عمل سے اخوۃ اسلامی اور مسالمت اور ایثار کا سچا سبق دیا ہے جس کی شہادت میں تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

خود ڈاکٹر ڈریپر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پولیٹیکل حیثیت سے عالم پر چھا گئے۔ اسی طرح انہوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مردہ علوم کو زندہ کیا بلکہ اپنے علمی انکشافات و ایجادات اور اپنے انوکھے بے بہا خیالات سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ اور صلح جوئی آزادی بے تعصبی اور مسالمت میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ غرض اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مادی اور روحانی ترقی' دنیاوی تمدن اور اخروی راحت' عقل اور جذبات مذہب و سائنس میں توافق اور توازن قائم رکھنے والا ہے۔ اب تک قدیم مذاہب میں سے کسی نے صداقت کے ایک پہلو پر بھی زور دیا تھا اور کسی نے کسی دوسرے پہلو پر۔ مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی کے ساتھ ترتیب دیا کہ اس کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ خاتم المذاہب اور اکمل الادیان ہے۔ اور انسان کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے۔

؎
میں اس موقع پر اس امر کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا۔ جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلا علمی ترجمہ ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہٖ قائم رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث۔ دوسری زبان کی خوبی و فصاحت۔ اردو سی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا۔ مگر مولوی ظفر علی خان صاحب نے جو درحقیقت قابل مبارکباد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے لیکن یہ اسی سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسی فاضل مترجم کو حاصل ہے۔

۱؎ لا رھبانیۃ فی الاسلام

۲؎ وما الحیوۃ الا متاع الغرور

۳؎ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلَائِکَۃِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عَاھَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

۴؎ وَیَدْرَءُوْنَ بالحسنۃ السیئۃ اولئک لھم عقبی الدار (رعد - ۲۰)

وجزاء سیئۃ سیئۃ فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ (شوریٰ - ۳۸)

وان عاقبتم فعاقبوا مثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصبرین (نحل)

فاعف عنھم واصفح ان اللہ یحب المحسنین (مائدہ)

۵؎ ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم (نور - ۶۳)

۶؎ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (مومنون - ۴۸)

۷؎ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم ○ وما یلقھا الا ذو حظ عظیم (حم سجدہ - ۳۵)

۸؎ یایھا الذین امنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔

۹؎ کلوا واشربوا ولا تسرفوا

۱۰؎ اِنّہ لا یحب المسرفین (سورہ انعام - رکوع ۱۷)

لہ والذین اذا انفقوا لم یسرفوا وکان بین ذلک قواما" (سورہ فرقان - رکوع ٦)
واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمتہ اللہ علیکم اذ کنتم اعدا فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا"۔

۲لہ وَاعتَصِمُوا بِحَبلِ اللّٰہِ جَمِیعًا وَلَا تَفَرَّقُوا واذکروا نعمتہ اللہ علیکم اذ کنتم اعدا فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا"۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعلم
ثبت ہست برجرین عالم دوام او

ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر ایم ڈی ایل ایل ڈی

ڈاکٹر ڈریپر مصنف کتاب معرکہ مذہب و سائنس مغربی دنیا کے ان مشاہیر میں سے ہیں جو نام بوجہ ان کے علمی کارناموں کے لوح روزگار پر سنہرے حرفوں میں ابد تک لکھا رہے گا۔ ان کی ذات انگلستان کے لئے جو ان کا جنم بھوم تھا اور امریکہ کے لئے بھی جہاں وہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ سرمایہ افتخار و نازش ہے۔ اور ان کا نام دنیائے علوم و فنون میں ہر جگہ ادب و احترام سے لیا جائے گا۔

جان ولیم ڈریپر ۱۸۱۱ء میں بمقام سینٹ ہیلن پیدا ہوئے جو لور پول کے نواح میں واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے لور پول ہی میں پائی۔ اور جب لندن یونیورسٹی کا افتتاح ہوا تو آپ فن کیمیا کی تحصیل کی غرض سے یونیورسٹی میں بھیج دیئے گئے۔ ۱۸۳۲ء میں آپ نے امریکہ کا عزم کیا۔ اور پنسلونیا کی یونیورسٹی میں بغرض اکتساب فن طب داخل ہو کر ۱۸۳۶ء میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ دنوں کے بعد اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے آپ ورجینا کے ہمپڈن سڈنی کالج میں کیمسٹری کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور ۱۸۳۵ء میں نیویارک کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر ڈریپر کی سب سے پہلی علمی تصانیف کا موضوع یہ مسئلہ تھا کہ روشنی کا موالید ثلاثہ پر کیمیاوی اثر کیا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر آپ کی تقریباً ۴۰ تصنیفات موجود ہیں۔ روشنی کے کیمیاوی اثرات میں سب سے زیادہ مہتمم بالشان اثر کاربالک ایسڈ کی وہ تحلیل ہے جو درختوں کے پتوں پر دھوپ کی شعاعوں کے پڑنے سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اسی واقعہ پر نباتات کی نشوونما کا انحصار ہے۔ اور اس کی بدولت حیوانات کو بالواسطہ یا بلاواسطہ غذا ملتی ہے۔ اس تحلیل کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ بالفاظ دیگر اسے نشر اکساد یعنی آکسیجن کے اجزا کی علیحدگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ روشنی کا جب بذریعہ مقیاس الوان نور منشور تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات رنگ کی شعاعوں کا مرکب ہے یعنی (۱) بنفشی (۲) سرمئی) (۳) ارزقی (۴) اخضری (۵) اصفری (۶) نارنجی (۷) احمری۔ ۱۸۴۰ء تک علمائے سائنس کا یہ خیال تھا کہ عمل نشر اکساد بنفشی شعاع کی وجہ سے

واقع ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا نام شعاع نشراکساو رکھ دیا گیا تھا لیکن یہ محض قیاسی نظریہ تھا۔ جو کسی تجربہ سے قطعی طور پر ثابت نہ کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر ڈریپر کو خیال ہوا کہ اس مسئلہ کے قطعی تصفیہ کی صرف ایک شکل ہے۔ اور وہ یہ کہ تحلیل خود لوان نور منشور کے ذریعہ سے کی جائے یعنی نباتاتی مادہ کو ہر رنگ کی شعاع کے زیر عمل لا کر دیکھا جائے۔ کہ نشراکساو کس شعاع سے ہوتا ہے۔ اس لطیف و دلکش تجربہ میں ڈاکٹر ڈریپر کو پوری کامیابی ہوئی۔ اور انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ عمل تحلیل میں شعاع بنفشی مطلق حصہ نہیں لیتی بلکہ یہ کام شعاع اصفری سے متعلق ہے۔ اس نتیجہ کا تمام علمی دنیا میں نہایت دلچسپی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور علمائے کیمیا کی معلومات میں اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر ڈریپر نے نور کی قوت کیمیائی کے اندازہ کرنے کا ایک آلہ بھی ایجاد کیا جس سے آگے چل کر علمائے کیمسٹری نے بہت کچھ مدد لی۔ چنانچہ بنسن اور راسکو نے جب ۱۸۵۶ء میں اپنے کیمیائی تجربوں کے متعلق ایک مضمون رائل سوسائٹی لندن کے اجلاس میں پڑھا تو اس میں اعتراف کیا کہ ڈریپر کو اس آلہ کی مدد سے نور کے عمل کیمیاوی کے بعض نہایت ہی اہم نکات کے حل میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ۱۸۴۷ء میں ڈاکٹر ڈریپر نے ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ حرارت سے نور کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان الوان نور منشور کا تجربہ زیادہ کامل و مکمل ہو گیا۔ یہ دریافت کرنا ممکن ہو گیا کہ آفتاب ستارے اور نبایتہ النجوم ٹھوس حالت میں ہیں یا سیال حالت میں۔ اس رسالہ میں ڈاکٹر ڈریپر نے تجربتہ" ثابت کر دیا کہ تمام ٹھوس اجسام اور تمام مائع اجسام غالباً" ایک ہی درجہ حرارت پر پہنچ کر منور ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ڈریپر پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۳۹ء میں انسانی چہرہ کی عکسی تصویر کامیابی کے ساتھ اتاری اور نیز قمر کا عکس لیا۔

یہ چند مثالیں علمی تحقیقات و انکشافات کی اس طویل فہرست سے اخذ کی گئی ہیں۔ جس کی ترتیب و تدوین کے لئے ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی نمایاں قابلیتوں کو مرتے دم تک وقف کئے رکھا اور جب یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ آپ نے اپنے انکشافات علمیہ کو جو بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہو سکتے تھے کبھی آلہ جلب و منفعت نہ بنایا۔ بلکہ سچا ذوق علمی اور ہمدردی بنی نوع انسان ان کی محرک ہوئی تو آپ کی جلالت قدر کا بے اختیار اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ کا نایاب رسالہ "پاپولر سائنس منتھلی" جس کے جنوری ۱۸۷۴ء کے نمبر سے ان حالات کا اقتباس کیا گیا ہے لکھتا ہے کہ یہ علمی انکشافات جو ڈاکٹر ڈریپر کی سالہا سال کی عرقریزی اور

دماغ سوزی کے نتائج ہیں۔ اپنے گر انبار مصارف کے تکفل کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی جیب خاص کے رہین منت ہیں۔ اگرچہ بعض علمی تجربوں پر انہیں ایک رقم خطیر صرف کرنی پڑی۔ لیکن ان کی اولوالعزمی کبھی کسی غیر کی مالی سرپرستی کی روادار نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی کسی ایجاد کو کبھی پیٹنٹ نہ کرایا۔ بلکہ جو علمی نکتہ دریافت کیا۔ اور جو ایجاد کی اس کا ثمر ازراہ غایت ایثار نفس خلق اللہ کی نذر کر دیا۔

ان تصانیف سے جن میں ادق علمی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ قطع نظر کر کے اگر ڈاکٹر ڈریپر کی دوسری تصانیف کو جن کا موضوع تاریخی اور نظری مباحث ہیں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ آپ ایک مسلم الثبوت ادیب اور انشا پرواز بھی ہیں۔ ۱۸۶۰ء سے لے کر ۱۸۷۲ء تک کا زمانہ آپ نے اسی قسم کی دلچسپ و کتابوں کے تصنیف کرنے میں گزارا چنانچہ یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ خانہ جنگی امریکہ اور "معرکہ مذہب و سائنس" اسی دور کی تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر ڈریپر کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ آپ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں بقید حیات موجود ہیں۔ بیٹے علم و فضل میں اپنے نامور باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر ہنری ڈریپر نیویارک کے کالج میں علم خواص الاشیاء کا پروفیسر ہے۔ دوسرا بیٹا ڈاکٹر جان ڈریپر نیویارک کی یونیورسٹی میں علم حیات حیوانی کا پروفیسر ہے۔ تیسرا ڈاکٹر ڈ-نیل ڈریپر نیوریاک کی رصد گاہ متعلقہ حوادث الجو کا ناظم ہے۔

پروفیسر رچرڈ پراکٹر اپنی تالیف لیثرر ریڈنگس (مطالعہ بوقت فرصت) میں جو لطیف و دلکشا مضامین کا ایک نفیس مجموعہ ہے۔ "کانفلکٹ بوٹین ریلیجن اینڈ سائنس" یعنی کتاب ہذا کی نسبت حسب ذیل خیال ظاہر کرتے ہیں۔ یہ کتاب ایک اعتبار سے یورپ کی دماغی ترقی کا خلاصہ ہے۔ مذہبی تعصب اور عدم مسالت پر اس میں سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی ہے اور ان وجوہ پر نظر انصاف نہیں ڈالی گئی جو بسا اوقات مذہب جبر و تشدد کی محرک ہوئیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ کتاب ایک صحیح الدماغ اور صاحب الرائے شخص کے قلم کا ماحصل ہے۔ اور اگر ان چند مقامات سے قطع نظر کیا جائے جن میں بیجا سختی پائی جاتی ہے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب پڑھنے والوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا چکی ہے اور پہنچا سکتی ہے۔

بحیثیت ایک مسیحی ہونے کے پروفیسر پراکٹر کو "معرکہ مذہب و سائنس" کی نسبت یہی رائے ظاہر کرنی چاہئے تھی اور اگر ہم (خدانخواستہ) مسیحی ہوتے تو اس تعریف میں جس کی

یہ کتاب دوست دشمن سب کے نزدیک مستحق ہے منقصت کے شاید اس سے بھی زیادہ شاخسانے نکالتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے مقابلہ میں نصرانیت پر جو فرد قرارداد اور جرم ڈریپر نے لگایا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ نصرانیت کا بڑے سے بڑا وکیل اس کے چھوٹے سے چھوٹے نکتہ کا تخطیہ کر سکے اور اگر چشم انصاف کھلی رکھ کہ ان واقعات پر نظر ڈالی جائے جو سائنس اور نصرانیت کی ہزار سالہ جنگ کے محرک ہو کر اس شکست فاش پر منتہی ہوئے جو نصرانیت کو اپنے حریف کے مقابلہ میں اٹھانی پڑی اور جنہوں نے نصرانیت کی روحانی و اخلاقی قوتوں کا شیرازہ بکھیر کر اسے محض پولیٹیکل اغراض کی تکمیل کا ایک مادی آلہ بنا دیا ہے تو خواہی نخواہی اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو فتح سائنس کو بمقابلہ نصرانیت حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ حق اور قوت دونوں اس کی جانب تھے اور ڈاکٹر ڈریپر نے کوئی بات ان دونوں حریفوں کے کارناموں اور ان کی جدوجہد کے متعلق ایسی نہیں بیان کی جس کی تغلیط و تردید ہو سکے البتہ ایک لغزش ڈاکٹر ڈریپر سے یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے مذہب پر اس حیثیت سے نظر ڈالی ہے کہ اس کا الہامی حصہ غیر متحرک اور غیر ترقی پذیر ہونے کے لحاظ سے گویا جہلا کے اوہام باطلہ کا ایک لایعنی مجموعہ ہے جس کی ظلمت آفتاب سائنس کی درخشاں شعاعوں کے آگے ایک پل نہیں ٹھہر سکتی۔ انہوں نے مذہب کے فلسفہ پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی اور فطرت انسانی کے اس زبردست اقتضا کا حکیمانہ تجزیہ نہیں کیا جو مذہبی تخیل کی شکل میں بیسیویں صدی عیسوی کے انسان کو باایں ہمہ دانش و حکمت انسان اولین سے نسلاً" بعد نسل ترکہ میں پہنچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مقام پر مصنف نے انسان کی دماغی ساخت پر علم حیات حیوانی کے اصول سے بحث کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مذہبی خیالات فکر انسان کے اجزائے لاینفک ہیں اور ان سے کسی انسان کو خواہ وہ کیسا ہی تہذیب یافتہ اور روشن دماغ کیوں نہ ہو مفر نہیں لیکن یہ بحث بیچ میں بر سبیل استطراد آجاتی ہے اور اس سے وہ کوئی اہم نکتہ جسے انسان کے معاد سے تعلق ہو اخذ نہیں کرتے جس کی وجہ غالباً" یہ ہے کہ ان کے پیش نظر رومن کیتھولک نصرانیت کے مزخرفات لاطائل و شطحیات لایعنی ہیں اور انہوں نے اپنی تمام قوت انہیں کے لئے اہمال و ابطال میں صرف کر دی ہے۔

رومن کیتھولک مذہب کے پیشواؤں نے کچھ تو اس تحریف کی وجہ سے دھوکا کھا کر جس نے تورات و انجیل کی سماوی اصلیت کا پایہ اعتبار سے ساقط کر دیا کچھ اس جہالت کے اقتضا سے جو قرنہا قرن تک پادریوں کا سرمایہ امتیاز بنی رہی اور کچھ ان سیاسی ضرورتوں سے

مجبور ہو کر جنہوں نے ان کے دین کو مبدل بہ دنیا کر دیا ان باتوں میں بھی دخل دینا شروع کر دیا تھا جن سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا یعنی وہ انسان کو اخلاق حسنہ سکھاتے سکھاتے اور نجات اخروی کی راہ دکھاتے دکھاتے علم و حکمت کے بھی سبق آموز بن گئے اور سائنس کے مسائل پر بھی ملہم من اللہی کی حیثیت سے رائے زنی کرنے لگے۔ اس غلط بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقائق فطرت کے متعلق جب انسان کو صحیح صحیح علم ہوا تو ان کے دعاوی جنہیں الہام سے کوئی لگاؤ نہ تھا باطل ہو گئے اور ان کے پیرو ان کو جھوٹا سمجھ کر کفر و الحاد کی طرف جھک پڑے اور مغربی دنیا ایک بڑی حد تک مذہب کی قید سے آزاد ہو گئی۔ ڈاکٹر ڈریپر کو رومن کیتھولک پادریوں کے اس طرز عمل نے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کیا کہ وہ مذہب جو سائنس کے مطابق نہ ہو۔ جھوٹا ہے اور وہ صحائف آسمانی جو حقائق فطرت کے مخالف، ہوں ایمان پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ یہ عام نتیجہ بالکل صحیح ہے اس لئے کہ بقول سرسید احمد خان رحمت اللہ علیہ کے سائنس کی ہر حقیقت خدا کا کام ہے اور صحیفہ آسمانی خدا کا کلام ہے۔ دونوں میں اگر ضد ہو تو ممکن نہیں کہ دونوں سچے ہوں پس جس کی سچائی حق سلیم کے نزدیک جو معیار یقین ہے مسلم نہ ہو گی وہ باطل ہو گا۔ لیکن ہم کو ڈاکٹر ڈریپر کی بالغ نظری اور نصفت پروری سے اس امر کی توقع تھی کہ وہ صرف یہی نتیجہ نکال کر نہ رہ جائیں گے، چونکہ فرقہ رومن کیتھولک کے لوگ مسئلہ عصمت پاپا کے قائل ہیں۔ اور اس کو نائب [illegible] سمجھ کر اس کی ہر بات کو برحق سمجھتے ہیں اس لئے رومن کیتھولک مذہب جھوٹا ہے [illegible] سائنس کے ساتھ توافق نہیں رکھ سکتا اور چونکہ پراٹسٹنٹ مذہب سچائی تلاش بائبل کے اوراق میں کرتا ہے اور اصلی سچائی صحیفہ فطرت کے اوراق میں مضمر ہے لہٰذا وہ عقلی بحران جس میں یورپ مبتلا ہوا چاہتا ہے منجر بہ ہلاکت مذہب ہو گا۔ ہم کو امید تھی کہ ڈاکٹر ڈریپر مذہب اور سائنس کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ کر اور ایک کو معاد اور دوسرے کو معاش کا مظہر قرار دے کر اس مسئلہ پر بحث کریں گے کہ اگرچہ ان کا موضوع جدا جدا ہے۔ لیکن انسان کو اس جسمانی دماغی اور روحانی منزل پر پہنچنے کے لیے جس کی طرف انگشت ارتقا اشارہ کر رہی ہے دونوں کی یکساں ضرورت ہے اور تاوقتیکہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مد و معاون نہ ہوں گے انسان کے قوائے ذہنی و روحانی منتہائے بلوغ کو نہ پہنچ سکیں گے۔ ہمیں خیال تھا کہ ڈاکٹر ڈریپر موجودہ مذاہب کا مقابلہ کرکے ایک ثالث کی حیثیت سے یہ فیصلہ کریں گے کہ ان میں سے کون سا مذہب سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور اس لحاظ سے سائنس کے دوش بدوش چلنے کے قابل ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری یہ تمنائیں

اور توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر ڈریپر نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یک طرفہ ہونے کی حیثیت سے بھی بالکل ادھورا ہے۔ انہوں نے اول تو سائنس کے مد مقابل کی شخصیت کی تعیم کو تخصیص سے بدل دیا ہے یعنی علوم کا حریف نصرانیت کو قرار دیا ہے کسی دوسرے مذہب سے سروکار نہیں رکھا اور نصرانیت سے بھی رومائی نصرانیت مراد لی ہے۔ غالباً" اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ رومائی نصرانیت ہی نے اپنے آپ کو علوم و فنون کا سب سے بڑا دشمن ثابت کیا ہے۔ دنیا میں بجز رومائی نصرانیت کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے کہ جو قدیم الایام سے ہر علمی تحریک کے ساتھ اس درجہ معاندانہ برتاؤ کرتا چلا آیا ہو اور جس کے ہاتھوں اہل علم کو اتنی سخت ایذائیں پہنچی ہوں اور غالباً" اسی لیے مذہب کو سائنس کا حریف قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب سے مراد رومن کیتھولک نصرانیت لی ہے اور اپنی کتاب کا نام بجائے نصرانیت اور سائنس کے معرکہ کے "معرکہ مذہب و سائنس" رکھا ہے پراٹسٹنٹ نصرانیت کے متعلق اگرچہ انہوں نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ اس کا اور سائنس کا میل ممکن ہے لیکن جب انہیں کے قول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ سائنس پر پراٹسٹنٹ مذہب کا ذرا سا بھی احسان نہیں ہے اور اس کی ترقی میں مارٹن لوتھر کی اصلاح نے ذرا بھی حصہ نہیں لیا اور نیز جب یہ امر پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ زمانہ حال کی فلسفیانہ تنقید نے اناجیل مقدسہ کو جو پراٹسٹنٹوں کا منہاج ایمان ہیں تحریف و تدریس سے مملو ثابت کر دیا ہے اور ان میں ایسے ایسے تاریخی نواقض کا موجود ہونا بدلائل قاطع پایہ ثبوت کو پہنچا دیا ہے جن سے ان کی تنزیل ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے اور جن کا جواب کسی پادری سے بن نہ پڑا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر یہ دونوں ایک دوسرے کے دلی دوست ہو سکتے ہیں۔

رومائی اور پراٹسٹنٹ نصرانیت میں سب سے بڑا مابہ الافتراق یہ ہے کہ رومن کیتھولک فرقہ آیات کتب مقدسہ کی تفسیر اور مذہبی عقائد کی تاویل و تعین کا حق صرف پاپائے روما اور اس کے ماتحت پادریوں سے مخصوص سمجھتا ہے اور پراٹسٹنٹ فرقہ کے عقیدہ کے بموجب تورات و انجیل کی تفسیر و تاویل کے متعلق ہر لکھے پڑھے شخص کو حق اجتہاد حاصل ہے۔ یہ فرق اگرچہ بجائے خود بہت بڑا فرق ہے اور اس نے پراٹسٹنٹوں کے پاؤں سے قسیسیت کی بیڑیاں کاٹ کر انہیں بزعم خود معصوم وغیر خاطی پاپا کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے لیکن اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ تورات و انجیل کی آیات بدستور اسی منافقت آفریں شان کے ساتھ قائم ہیں جس نے سائنس کے ہاتھ میں منجنیق بن کر رومائی نصرانیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اب پراٹسٹنٹ نصرانیت کے حلقہ بگوشوں کو اس حد تک

آزاد خیال بناتی جا رہی ہے کہ ان کے نزدیک خدا کی حکمت اور ان کی قوت از قبیل مترادفات ہیں تاویل کا میدان نہایت وسیع ہے۔ لیکن نہ اتنا وسیع کہ ان تحریفات کو سائنس کے ساتھ تطبیق دینے میں عقل سلیم کا خون کئے بغیر کامیابی حاصل ہو سکے جن سے تورات و انجیل کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ایک فرانسیسی باورچی سے جو اپنے فن کا استاد تھا پیرس کے کسی امیر نے فرمائش کی تھی کہ فن طباخی میں جو بے مثل کمال اسے حاصل ہے اس کا ثبوت سڑے ہوئے مٹن کا قلیہ تیار کرنے سے دے۔ باورچی نے جواب دیا کہ جناب والا میں سو سال پرانے بوٹ کے تلے کا شوربا تیار کر سکتا ہوں۔ لیکن سڑے ہوئے مٹن کو قابل خورش بنانا میرے امکان سے خارج ہے۔ یہی حال تحریف شدہ تورات و انجیل کا ہے۔ اگر کوئی آیت حقیقت میں الہامی ہو اگر کوئی صحیفہ حقیقت میں آسمانی ہو تو اس کی سو تاویلیں ہو سکتی ہیں لیکن ان مہملات کی کیا صحیح اور مفید یقین تفسیر ہو سکتی ہے۔ جو انسان ظلوم و جہل کے تراشے ہوئے ہوں اور فطرت کے حقائق مسلمہ کی ضد ہوں۔

ڈاکٹر ڈریپر اگر اس مواد کی بنا پر جو ان کے پاس موجود تھا اور جس نے اس کتاب کی ترتیب میں بقدر ایک سو صفحہ کے حصہ لیا ہے کام لیتے تو وہ باآسانی ثابت کر سکتے کہ مذہب اپنی ترقی یافتہ شکل میں انسان کو نہ صرف اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ بہ آزادی تمام ان حقائق کا انکشاف کرے جو عقل انسان کی رسائی کے اندر ہیں اور تمام وہ کوششیں عمل میں لائے جن سے اس کی طبعی معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ ان کوششوں کو اپنی آغوش عاطفت میں لے کر جہاں انسان کو روحانی اور اخلاقی حیثیت سے کامل بننا اور ابدی زندگی کے تمتعات سے بہرہ اندوز ہونا سکھاتا ہے وہاں دنیوی حیثیت سے بھی اسے اعلے درجہ کے مدارج پر پہنچانا چاہتا ہے۔

اسلام کو ڈاکٹر ڈریپر نے نصرانیت کی ایک شاخ تصور کیا ہے۔ کوئی مستقل مذہب نہیں سمجھا۔ اس لئے انہوں نے اس کو رومن کیتھولک کلیسا کی اصلاح جنوبی اور پراٹسٹنٹ مذہب کو کلیسائے مذکور کی اصلاح شمالی سے تعبیر کیا ہے لیکن اگر ان کے اس خیال کو جس کے ایک حد تک معتدل ہونے میں کلام نہیں پوری طرح سے تسلیم کر لیا جائے تو پھر تو ان سے اس امر کی بدرجہ اولے توقع تھی کہ وہ اسلام کو مذہبی ترقی کی معراج یا منتہا قرار دے کر اور سائنس کی اس حیرت انگیز ترقی کو پیش نظر رکھ کر جو اسلام کی سرپرستی میں اسے میسر ہوئی اور جس نے یونان و مصر' کالد و ایران' ہندوستان و چین کی فرسودہ ہڈیوں میں نئی روح پھونک کر علوم جدیدہ کی بنیاد قائم کی اس نتیجہ پر پہنچتے کہ صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو

فطرت الٰہی و سنت ایزدی سے تطابق کلی رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر مذہب و سائنس میں اگر وفاق پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ مذہب سے مراد اسلام لی جائے۔ اور یہ تعبیر نادرست بھی نہ ہو گی اس لئے کہ اگر کوئی مذہب دنیا کے تمام مذاہب کے حسنات کے شیرازہ بند ہونے کی وجہ سے ہمہ گیری کا ادعا کر سکتا ہے اور اس حیثیت سے تمام مذاہب کا بچشم انصاف قائم مقام بن سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔

یہ دعوی ہم کچھ اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں بلکہ اسلام کے دینی و دنیوی کارناموں کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں جن کا ذکر خود ڈاکٹر ڈریپر نے اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔ اسلام کے اس اصولی عقیدہ کا ذکر کرنے کے بعد جس کا راز لا الہ الا اللہ میں چھپا ہوا ہے اور جو ہر قوم کے ترقی یافتہ مذہبی جذبات کا نصب العین ہے۔ اور ان روحانی و اخلاقی حقائق کا بالا جمال اعادہ کرنے کے بعد جن کی تکشیف حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمائی ڈاکٹر ڈریپر نے جہاں اسلام کی عدیم النظیر ملکی فتوحات اور قابل رشک تمدن کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام نے خود اپنے ہاتھوں سے سائنس کے اس پودے کو سینچا ہے جسے عجائب خانہ سکندریہ کے زندہ جاوید بانی بطلیموس سوٹر نے لگایا تھا لیکن جو نصرانیت کی بنجر زمین میں خشک ہو چلا تھا۔ اور یہ اسی آبیاری کا صدقہ تھا کہ علوم و فنون حکمت و فلسفہ و صنائع و بدائع کا وہ لہلہاتا ہوا چمن عقل و ادراک کی سیر کے لئے تیار ہو گیا جن کے پھول یورپ و امریکہ میں آج نئی شگفتگی کے ساتھ مہک رہے ہیں۔ علوم جدیدہ کا دور سولہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ ظہور اسلام چھٹی صدی میں ہوا۔ یہ ہزار سال کا زمانہ ان مسلسل و متوالی کوششوں سے بھرا پڑا ہے جو علوم قدیمہ کے احیا اور علوم مروجہ کی بقا کے متعلق دنیائے اسلام کے طول و عرض میں ظاہر ہوتی رہیں اور یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سائنس نے جو ترقی گزشتہ تین سو سال میں کی ہے اس کے لحاظ سے وہ اسلام ہی کا شرمندہ احسان ہے۔ گویا اسلام نے ایک ڈھانچ قائم کر لیا تھا جس پر یورپ نے گوشت و پوست چڑھا لیا۔

تم نے قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

ایسی حالت میں جب کہ اسلام یا بقول مصنف نصرانیت کی جنوبی شاخ نے جس کے ماننے والے روئے زمین پر بقدر تیس کروڑ نفوس کے موجود ہیں سائنس کی ہم آہنگی و ہم صفیری کا یہاں تک کا دم بھرا ہو۔ ایسی حالت میں جب کہ ہادی عرب کے جانشینوں نے

جاہلوں کو عالم، عامیوں کو فلسفی اور غلاموں کو شہنشاہ بنا دیا ہو۔ ایسی حالت میں جب کہ وادی بطحا سے ایک ابر رحمت نے اٹھ کر مغرب و مشرق میں خیر و برکت کے وہ موتی برسائے ہوں جن کو دنیا ابھی تک رول رہی ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ کل مومنین اخوۃ کی منادی نے ارذل تریں اقوام کو مسند نشیناں بزم شرافت کے پہلو میں جگہ دے کر حریت اخوۃ اور مساوات کے وہ سنہرے اصول قائم کر دیئے ہوں جن پر عمومیت کے ساتھ عمل کرنا صرف دنیائے اسلام ہی میں ممکن ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ **لکم دینکم ولی دین** کا فرمان واجب الاذعان مسالمت اور رواداری کے وہ حقوق ادا کرتا ہو جن کا یہود و نصاری مجوسی و ہنود کو یکساں اعتراف ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ **رب وزنی علما** کی نص صریح نے جس میں **لا اکراہ فی الدین** نے شان تاسیس پیدا کر دی ہے الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجد ہا فہواحق بہا کی وحی منطوق کے ساتھ مل کر علم و حکمت کو خواہ اس کا ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کی میراث قرار دیا ہو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اور علم کی سمائی ایک اقلیم میں نہیں ہو سکتی اور یہ دونوں ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہیں جس میں بالآخر مذہب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔

بہرحال ڈاکٹر ڈریپر نے یہ کتاب لکھ کر ہم پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے کہ تلاش حق کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس دروازہ کے اندر داخل ہو کر ہر شخص علی قدر توفیق گوہر مقصود سے اپنی جیب و دامان بھر سکتا ہے اور اگر اسے مبداء فیاض سے ذوق سلیم جسے دوسرے لفظوں میں ایمان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے عطا ہوا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف ہیں۔

کرم آباد۔ پنجاب — ظفر علی خاں

۵ مارچ ۱۹۱۰ء

دیباچہ مصنف

جس شخص کو یورپ اور امریکہ کی روشن خیال جماعتوں کی ذہنی حالت سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے اس کو معلوم ہوا ہو گا کہ لوگ جادہ مذہب سے جلد جلد اور بہ تعداد کثیر منحرف ہو رہے ہیں۔ اور اگرچہ اس جماعت نے جو راست گفتاری اور صاف گوئی کے اوصاف سے متصف ہے اس انحراف کو مخفی نہیں رکھا۔ لیکن ایک بہت بڑی جماعت ایسے اشخاص کی ہے جن کی بداعتقادی بہت زیادہ خطرناک ہے اس لئے کہ اخلاقی جرات کے فقدان کی وجہ سے یہ جماعت اپنے اعتزال کو علانیہ نہیں ظاہر کرتی۔

یہ اعتزال اس قدر عمیم الاثر اور اس درجہ زبردست ہے کہ اس کو نہ تحقیر دبا سکتی ہے نہ تعزیر مٹا سکتی ہے۔ اس کا سدباب نہ استحقا و استہزا سے ہو سکتا ہے نہ سب و شتم سے نہ جبر و تعدی سے۔ وہ ساعت جلد جلد قریب آرہی ہے جب کہ اس سے نہایت خطرناک سیاسی نتائج پیدا ہو کر رہیں گے۔

دنیا کی حکمت عملی کے جسم سے قسیسیت کی روح نکل چکی ہے۔ وہ جنگی جوش جو کبھی مذہب کی حمایت میں سربکف نظر آتا تھا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اور اس کی بچی کھچی یادگاریں حروب صلیبیہ کے ان سورماؤں کے مرمری مجسموں میں باقی رہ گئی ہیں جو گرجاؤں کے زمیں دوز مدفنوں میں محو آرام ہیں۔

دول عظمے نے پاپائیت کے مقابلہ میں جو روش اختیار کی ہے۔ وہ اس خطرہ کی آمد آمد کا پتہ دے رہی ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ وہ طاقت جس کا مظہر پاپائے روما ہے یورپ کی دو ثلث آبادی کے خیالات اور تمناؤں کی وکیل ہے۔ اس طاقت کو منسوب الی السما اور مامور من اللہ ہونے کا دعوے ہے اور اسی دعوے کی بنا پر وہ یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کی سیاسی فوقیت بمقابلہ دول یورپ تسلیم کرلی جائے۔ اس کو اس جہالت کی تجدید و احیا پر اصرار ہے جو قرون وسطی میں پائی جاتی تھی۔ اور وہ بہ بانگ دہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ اس

کی اور تمدن جدید کی ایک اقلیم میں سمائی نہیں ہو سکتی۔

یہ منافقت جو ہمیں مذہب اور سائنس کے درمیان نظر آرہی ہے۔ اس کشمکش کا تسلسل ہے جو اس وقت سے چلی آتی ہے جب کہ سیاسی اقتدار کی باگ نصرانیت کے ہاتھ میں اول اول آئی۔ الہام ربانی تردید کا روادار ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ وہ اپنے آپ کو کامل و بے عیب سمجھ کر مستوجب الترمیم ہونے سے سختی کے ساتھ ابا کرے اور اس ترمیم کو جو انسان کے نشوونمائے عقلی کی مقتضیات میں سے ہو۔ ازراہ حقارت رد کر دے۔ لیکن انسانی علم کی اٹل ترقی معلومات انسانی کے ہر شعبہ کے متعلق ہمارے مسلمات میں تبدیلی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایسی بحث کی اہمیت کے اظہار میں مبالغہ سے کام لے سکیں جس میں ہر ذی شعور انسان حصہ لینے پر خواہی نخواہی مجبور ہے؟ مذہب سے زیادہ مہتم بالشان حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے پس ظاہر ہے کہ بجز ان اشخاص کے جن کے دنیوی اغراض موجودہ مذہبی عقائد کے قیام کے ساتھ وابستہ ہیں باقی تمام اشخاص کی صدق دل سے یہی خواہش ہو گی کہ حق کی تلاش کریں۔ وہ مسئلہ مابہ البحث کے متعلق پوری واقفیت پیدا کرنی چاہیں گے اور اس امر کے خواہش مند ہوں گے کہ مباحثہ کرنے والوں کے وطیرہ اور روش پر روشنی ڈالی جائے۔

سائنس کی تاریخ کو انفرادی اکتشافات کے ایک بے ربط مجموعہ کی کہانی نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ یہ ان دو متخالف طاقتوں کی زور آزمائی کی داستان ہے جن میں سے ایک تو عقل انسانی کی انشراحی قوت ہے اور ایک روایتی ایمان اور انسانی اغراض کی متفقہ انقباضی قوت۔

کسی مصنف نے اب تک اس مسئلہ پر اس پہلو سے نظر نہیں ڈالی لیکن یہی وہ پہلو ہے جو سب سے زیادہ نکتہ آموز سب سے زیادہ نتیجہ خیز اور سب سے زیادہ مہتم بالشان ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے مصلحت اور صوابدید اسی میں سمجھی جاتی تھی کہ اس بحث کی طرف اشارہ تک نہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس جھگڑے سے الگ ہی رہنے کی کوشش کی جائے۔ جماعت انسانی کا سکون نفس و اطمینان قلب اس کے مذہبی عقائد کے ثبات و قیام پر اس درجہ منحصر ہے کہ کوئی شخص بلاوجہ موجود حجت کافی ان عقائد میں خلل انداز ہونے کے لحاظ سے حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن چونکہ ایمان بالطبع غیر متغیرہ

غیر متحرک اور سائنس بالطبع مندرج اور ترقی پذیر ہے لہٰذا ان دونوں میں اس افراق کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے جو چھپانے سے چھپ نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں ان لوگوں کو جو تخیل کے دونوں طریقوں سے بے آشنا ہیں فرض ہو جاتا ہے۔ کہ اپنی رائے کا اظہار فروتنی لیکن مضبوطی سے کریں اور مذہب و سائنس کے حریفانہ دعاوی پر متانت و سنجیدگی کے ساتھ بلا رورعایت فلسفیانہ انداز سے نظر انتقاد ڈالیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو انسان کو وہ تمدنی و عمرانی تباہیاں آگھیریں گی جن کا سلسلہ گوناگوں مصیبتوں کے ساتھ مدتوں قائم رہے گا۔ جب یورپ کی قدیم بت پرستی اپنے ہی نواقص کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تو نہ تو قیصران روم ہی لوگوں کا روحانی پیشوا بن سکے اور نہ اس زمانہ کے فلاسفہ ہی نے عقائد کا کوئی ضابطہ مرتب کیا۔ بلکہ انہوں نے مذہب کو بحال خود چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب جاہل اور آلود پادریوں' فکر گداؤں زنخوں اور غلاموں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔

اس غفلت کبرے کے باعث جو عقلی تاریکی یورپ پر چھا گئی وہ اب زائل ہو رہی ہے اور ہماری آنکھیں فہم و شعور کی صبح صادق کے نور سے منور ہونے لگی ہیں۔ جماعت انسانی طلوع آفتاب کا شوق سے انتظار کر رہی ہے تاکہ اس کی روشنی میں اسے نظر آجائے کہ وہ بھٹکتی ہوئی کدھر آ نکلی ہے۔ اس کو صاف دکھائی دینے لگا ہے کہ تمدن جس شاہراہ پر اب تک سفر کرتا چلا آیا تھا اسے چھوڑ کر اب وہ ایک نئی ڈگر پر پڑ لیا ہے جو اسے غیر معلوم سرزمین کی طرف لے جا رہی ہے۔

اگرچہ ان خیالات نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر ڈالا تھا لیکن اس کتاب کے لکھنے اور جو خیالات اس میں ظاہر کئے گئے ہیں انہیں ملک کی خدمت میں پیش کرنے کی جرات مجھے پھر بھی نہ ہو سکتی تھی۔ بااین ہمہ اگر میں نے یہ کتاب لکھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے موضوع پر میں نے مدتوں غور کیا ہے اور سالہا سال تک اس کے مباحث کی تنقید میں خلوص نیت اور صدق دل سے کام لیا ہے۔ ایک اور بڑی وجہ تحریک اس کتاب کی اشاعت کی یہ ہوئی کہ یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ جو میں نے کچھ سال ہوئے شائع کی تھی یورپ اور امریکہ ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ چنانچہ یہ تاریخ نہ صرف امریکہ میں کئی بار چھپ چکی ہے بلکہ انگلستان میں مکرر طبع ہونے کے علاوہ فرانسیسی جرمن روسی پولش سروئن وغیرہ متعدد یورپین زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

تاریخ خانہ جنگی امریکہ کے نام سے یہ جو کتاب میں نے بہت بڑی محنت شاقہ اٹھا کر شائع کی تھی' اس کے مواد کی فراہمی کے دوران میں مجھے متخالف بیانات کے مقابلہ اور

متخالف دعاوی کے تصفیہ کا موقع بار بار ملا تھا۔ اہل امریکہ نے جن کی وقت نظر واقعات زیر بحث کے انتقاد کے متعلق محتاج ایضاح نہیں قبولیت عام کی جو سند اس تاریخ کو عطا کی وہ میرے لئے مزید حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی۔ میں نے مظاہر قدرت کی عملی تحقیقات پر بھی بہت کچھ توجہ صرف کی تھی اور متعدد مشہور و معروف رسائل ان مضامین پر شائع کئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو ان مشاغل کی نذر کر دے اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ سائنس کا درس دینے میں گزارے وہ عدم پاسداری اور حق پرستی کے ان اصولوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو فلسفہ کی نکتہ آموزی کا ماحصل ہیں۔ فلسفہ ہم میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو ابنائے جنس کی بھلائی کے لئے وقف کر دیں تاکہ جب ہماری مشعل زندگانی کے گل ہونے کی گھڑی قریب آئے تو ہم اس کی ٹمٹماتی روشنی میں گزشتہ واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت کے ساتھ امر کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ وہ مشاغل جن میں ہم عمر بھر مصروف رہے پادر ہوا اور دوراز کار محض تھے۔

اگرچہ کوئی ایسی محنت نہیں جو اس کتاب کے لکھنے میں میں نے برداشت نہ کی ہو لیکن جس موضوع پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکنے کا مجھے پورا احساس ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ موضوع ہے جس کا حق ادا کرنے کے لئے مصنف کو سائنس تاریخ آلہیات اور سیاسیات میں دسترس ہونی چاہئے اور اس کی تصنیف کا ہر ورق معارف کا گنجینہ اور حقائق کا سفینہ ہونا چاہئے لیکن میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دے لی ہے کہ یہ کتاب ان تصانیف کا محض ایک دیباچہ یا مقدمہ ہے جو زمانہ موجودہ کے واقعات اور ضرورتوں کے اقتضا سے سپرد قلم ہو کر رہیں گی۔ ہم نے ایک بہت بڑے عقلی انقلاب کی وادی میں قدم رکھا ہے۔ آج کل جو لغو اور مزخرف کتابیں پڑھی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کا قائم مقام وہ دماغ آزما اور دانش آموز لٹریچر ہو جائے گا جس میں ہمارے روحانی مقاصد کے خطرات ایک نئی روح پھونک دیں گے اور مذہبی جذبات ایک نیا جوش پیدا کر دیں گے۔

میں نے اس کتاب میں فریقین کے افعال و آرا کو بصراحت اور بلارو رعایت درج کر دیا ہے۔ ایک لحاظ سے میں نے دونوں کے طرفدار بننے کی کوشش کی ہے تاکہ ان میں سے ہر ایک کی وجوہ تحریک کا اندازہ اچھی طرح سے کر سکوں لیکن ایک اعتبار سے جس کا مفہوم بہت کچھ ارفع و اعلے ہے میں نے اپنے مساعی کے دامن کو پاسداری کے دھبہ سے بچایا ہے اور دونوں کے کارنامے ہو بہو بیان کر دیئے ہیں۔

پس مجھے یقین ہے کہ جو حضرات اس کتاب پر نکتہ چینی کرنا چاہیں گے وہ اس امر کو

ضرور پیش نظر رکھیں گے کہ اس کا مقصد فریقین میں سے کسی ایک کے آرا و دعاوی کی حمایت نہیں ہے بلکہ دونوں کے آرا و دعاوی کو بوضاحت و صراحت اور بلا ڈرنے یا جھجکنے کے صاف صاف بیان کر دینا ہے۔ میں نے ہر باب کی ترتیب میں عام طور پر یہ خیال رکھا ہے کہ اول مذاہب کا خیال پیش کر دیا جائے اور اس کے بعد اس کے حریف کا۔

مضمون زیر بحث پر اس طور سے نظر ڈالتے وقت میں نے معتدل یا متوسط آرا کو معرض بحث میں لانا ضروری نہیں خیال کیا اس لئے کہ اگرچہ فی نفسہ ان کے قیمتی و گرانمایہ ہونے میں شک نہیں لیکن اس قسم کے مباحث میں غیر طرفدار اور انصاف پسند ناظرین کو اعتدال پسندوں سے نہیں بلکہ انتہا پسندوں سے بحث ہوتی ہے اور انتہا پسندوں کی افراط و تفریط ہی سے نتائج ترتب ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے مسیحیت کی دو بڑی شاخوں یعنی کلیسائے پراٹسٹنٹ و کلیسائے یونان کا بہت کم ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر نے سائنس کے احیا کے وقت سے ترقی علوم و فنون کی کبھی بھی مخالفت نہیں کی بلکہ الٹا اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ سچائی کو خواہ وہ اس کا ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس نے ہمیشہ بنظر استحسان و احترام دیکھا ہے۔ حقائق الہامی کی جو تعبیرات اس نے کی ہیں ان کو سائنس کے انکشافات سے بظاہر مغائر پا کر اس نے ہمیشہ سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس مغائرت و منافقت کی شافی تاویل ہونے کے بعد فریقین میں مصالحت ہو جائے گی اور اس امید میں اسے ناکامی بھی نہیں ہوئی۔ تمدن جدید کے دن اچھے ہوتے اگر کلیسائے روما نے یہی روش اختیار کی ہوتی۔

مسیحیت کا ذکر کرتے ہوئے عام طور سے کلیسائے روما ہی کا حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ مسیحی دنیا کی آبادی کا جزو غالب اسی کلیسا کا پیرو ہے۔ کچھ اس لئے کہ اس کے مطالبات حد سے زیادہ بالغ فی الادعا ہیں اور کچھ اس لئے کہ ان مطالبات کا نفاذ اس نے عموماً بزور حکومت کرانا چاہا ہے۔ پراٹسٹنٹ کلیساؤں میں سے کسی کو ایسا خود مختارانہ درجہ نصیب نہیں ہوا اور کسی کا سیاسی رسوخ اس درجہ عمیم الاثر نہیں ثابت ہوا۔ ان کلیساؤں نے اول تو جبر و مزاحمت کو روا ہی نہیں رکھا اور اگر گنتی کی چند صورتوں میں انہوں نے جابرانہ طرز عمل اختیار کیا بھی ہے تو وہ فتوائے بدعت کے صدور کی حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔

سائنس کے طرز عمل پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کبھی بھی زور حکومت کو اپنا طرف دار بنانا نہیں چاہا۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کہ کسی انسان کو

بوجہ اس کے عقائد کے بدعتی قرار دے یا اس کے تمدنی حقوق کو پامال کرے۔ اپنے مسلمات یا خیالات کی توثیق و اشاعت کی غرض سے اس نے کبھی کسی شخص کو عتاب روحانی یا عذاب جسمانی میں مبتلا نہیں کیا اور سزائے موت کا تو ذکر ہی نہیں۔ اس کے دامن پر قساوت و بے رحمی اور معصیت و جرائم کا دھبہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن جب ہم محکمہ احتساب عقائد کے کارناموں کو یاد کر کے پاپائے روما کے قصر "وٹیکن" کے اندر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ ہاتھ جو اس وقت دعا کے لئے ارحم الراحمین کی جناب میں اٹھے ہوئے ہیں بے گناہوں کی خون سے رنگے دکھائی دیتے ہیں۔

تاریخ نگاری کے دو طریقے ہیں۔ شاعرانہ و عالمانہ۔ اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ واقعات و حوادث انسان کے تابع ہیں اسی نے ان تصانیف میں جو اس طریقہ کے مطابق لکھی جاتی ہیں کسی سر بر آوردہ شخص کا انتخاب کر لیا جاتا ہے اور اس کے حیرت انگیز کارناموں کی تصویر کھینچ کر اسے کسی قصہ کا سورما جتا دیا جاتا ہے طریقہ ثانی الذکر کی رو سے معاملات انسانی ایک مسلسل زنجیر کے مشابہ ہیں جس میں ہر واقعہ کسی واقعہ سابقہ کا معلول اور کسی واقعہ آئندہ کی علت ہے اور اس اعتبار سے واقعات انسان کے تابع نہیں بلکہ انسان تابع واقعات ہے۔ طریقہ اول الذکر ان تصانیف کا ذمہ دار ہے جو خواہ کیسی ہی دلچسپ اور دل پسند کیوں نہ ہوں لیکن ان کا درجہ حقیقت میں افسانوں اور قصوں سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے۔ طریقہ ثانی الذکر بالکل ہی روکھا پھیکا ہے۔ بلکہ شاید موجب استکراہ بھی ہو اس لئے کہ وہ ہم ہر اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قانون کی حکومت اٹل اور انسان کی کوشش ناچیز ہے۔ جو مہتمم بالشان مسئلہ اس کتاب کا موضوع ہے اس کو خیال آرائی و اعجوبہ آفرینی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس شخص کو جسے اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہو مقدر کے اس تسلسل پر اپنی نگاہ جمائے رکھنی چاہیئے جو تاریخ عالم میں پایا جاتا ہے اسے پاپاؤں اور مدبروں اور شہنشاہوں کی پرچھائیوں کی طرف سے جو ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی طرح ہیں ازراہ تحقیر منہ پھیر لینا چاہیئے۔

اگر شاعرانہ تاریخوں کے ساقط الاعتبار ہونے کے ثبوت کی ضرورت ہو تو ہمارا ذاتی تجربہ اس کا شاہد ہے۔ ہمارے ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست بھی بسا اوقات ہمارے روزانہ اعمال کی حقیقی نیتوں سے واقف نہیں ہو سکتے اور اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ارادوں کی غلط تاویل کرتے ہیں۔ پس جب ان واقعات کی حالت یہ ہے جو روزمرہ ہماری نگاہ کے سامنے گزرتے ہیں تو ان اشخاص کے کارناموں کی نسبت کوئی قطعی حکم لگاتا تو

صریحاً" ناممکن ہے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور جن کی ہم نے صورت تک نہیں دیکھی۔

مضامین زیر غور کے انتخاب و ترتیب میں ایک حد تک قومیں نے اس کو نسل کی روئداد سے مدد لی ہے جو بصدارت پاپا پچھلی مرتبہ روما میں منعقد ہوئی تھی اور ایک حد تک واقعات تاریخی کی ترتیب سے حضرات ناظرین دلچسپ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے کہ جن مسائل پر ہم اب غور کر رہے ہیں وہ وہی ہیں جن پر قدیم فلاسفہ یونان نے بحث کی ہے یعنی خدا کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ دنیا کا انتظام کس طرح چلتا ہے؟ کیا حق کا کوئی معیار ہمارے پاس موجود ہے؟ جو ناظرین ان غوامض کی تہ کو پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ "آیا ہم نے ان مسائل کو ان سے بہتر حل کیا ہے؟"

القصہ اس کتاب کے مقدمات کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

میں نے اول جدید سائنس کا علوم قدیم سے مقابلہ کرکے اور یہ دکھا کر کہ نظریات پر مبنی ہونے کے بجائے اس کا انحصار، مشاہدہ، تجربہ اور مہندسانہ مباحثہ پر ہے ثابت کیا ہے کہ اس کی ابتدا مقدونوی فتوحات کی وجہ سے ہوئی جنھوں نے ایشیا اور یورپ میں تعلق پیدا کر دیا۔ ان فتوحات پر ایک اجمالی نظر ڈال کر اور عجائب خانہ اسکندریہ کے مختصر حالات بیان کرکے میں نے جدید سائنس کی نوعیت اور خصوصیت کی توضیح کی ہے۔

پھر میں نے بر سبیل ایجاز ظہور مسیحیت کے مشہور واقعات کا اعادہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے ترقی کرتے کرتے شہنشاہانہ اقتدارات حاصل کر لئے اور بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہو جانے کے باعث جو سلطنت روما کا مروجہ مذہب تھی اس کی شکل بالکل تبدیل ہو گئی۔ چونکہ اس کو صاف معلوم ہو چکا تھا کہ سائنس کا اور اس کا میل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس نے اسکندریہ کے فلسفیانہ مدارس جبراً" بند کر دیئے اور اس کارروائی پر اس کی سیاسی ضرورتوں نے اسے مجبور کیا۔

نصرانیت اور سائنس کو ایک دوسرے کا حریف ظاہر کرنے کے بعد میں نے ان کی پہلی علانیہ زور آزمائی یعنی اصلاح اولیٰ یا اصلاح جنوبی کی داستان قلمبند کی ہے۔ اس تنازع میں امرمابہ النزاع ماہیت باری تعالے تھا۔ اس کا نتیجہ ظہور اسلام ہوا جس نے ایشیا اور افریقہ کا بہت بڑا حصہ اور بیت المقدس اور کارتھیج کے تاریخی شہر مسیحی دنیا سے چھین لئے اور وحدانیت خدا کے اصول کو اس مملکت کے بہت بڑے حصے میں شائع کر دیا جس پر کبھی رومتہ الکبرے کا پھریرا اڑتا تھا۔

اس سیاسی واقعہ کے بعد سائنس میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اور عربوں کے ممالک محروسہ میں دارالعلم مدارس اور کتب خانے جا بجا قائم ہو گئے۔ کشور کشایان اسلام نے جو عقل و ادراک میں بسرعت تمام ترقی کر رہے تھے ماہیت ذات باری کے ان **تجسیمی** خیالات کو جو ان کے عامیانہ عقائد میں ملے ہوئے چلے آتے تھے ترک کر دیا اور ان کے بجائے اس قسم کے حکیمانہ و فلسفیانہ عقائد اختیار کر لئے جن کا ظہور مدتوں پہلے ہندوستان میں ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت روح انسانی کے متعلق علم اور مذاہب میں دوسری نزاع پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں فلسفہ ابن رشد کو ترقی ہوئی اور مسائل انفصال و انجذاب نے رواج عام پایا۔ ازمنہ وسطیٰ کے اختتام پر محکمہ احتساب عقائد یورپ سے ان مسائل کو خارج کرنے میں کامیاب ہوا اور اب ویٹیکن کونسل نے باضابطہ طور پر مذہبی رسموں کے ساتھ ان کی تکفیر کر دی ہے۔

اس اثنا میں ہیئت' جغرافیہ اور دوسرے علوم کے اکتساب کی بدولت نظام شمسی میں زمین کے مرتبہ اور دوسرے اجرام سماوی کے ساتھ اس کے تعلق اور ترکیب کائنات کے متعلق صحیح خیالات قائم کئے جا چکے تھے۔ اور چونکہ مذہب کو جو کتب مقدسہ کی آیات کی اس تاویل پر مبنی تھا جو تعبیر راشدہ و صحیحہ متصور ہوتی تھی اس امر پر اصرار تھا کہ زمین مرکز کائنات ہے اور موجودات میں کوئی شے بلحاظ عظمت و نشان اس سے لگا نہیں کھاتی لہٰذا تیسری نزاع برپا ہو گئی۔ اس جنگ میں سائنس کا علم بردار گلیلیو تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد ایک اور ضمنی بحث دنیا کی عمر کے بارہ میں چھڑ گئی۔ کلیسا کو اصرار تھا کہ دنیا کی عمر صرف چھ ہزار سال ہے اس بحث میں بھی اسے زک اٹھانا پڑی۔

تاریخ اور سائنس کی روشنی سے یورپ میں بتدریج اجالا ہو رہا تھا۔ سولھویں صدی میں رومائی نصرانیت کا اقتدار اور اثر بوجہ ان عقلی زکوں کے جو اسے اٹھانی پڑی تھیں اور نیز بباعث اپنی سیاسی اور اخلاقی حالت کے بہت کچھ گھٹ گیا۔ بہت سے ارباب زہد و اتقا کی نظر سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ مذہب خود ان خرابیوں کا ذمہ دار نہ تھا جو اس میں پائی جاتی تھیں بلکہ ان مفاسد و ذمایم کا باعث وہ رشتہ اتحاد تھا جو اس نے زمانہ قدیم میں روما کی بت پرستی کے ساتھ قائم کر لیا تھا پس اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ قرون اولے کی پاک اور صاف نصرانیت کی طرف عود کیا جائے۔ اس طور پر وہ چوتھی نزاع برپا ہوئی جو اصلاح اخرے یا اصلاح شمالی کے نام سے موسوم ہے۔ اس نزاع نے جو خاص شکل اختیار کی وہ معیار حق سے تعلق رکھتی تھی یعنی سچائی کا معیار اصلی کلیسا ہے یا بائبل اس بحث کے تصفیہ میں حریت عقل کا شاخسانہ نکل آیا یعنی امور عقلی میں ہر انسان کو شخصی اجتہاد کا

حق حاصل ہے۔ لوتھر نے جو اس دور کا سب سے زیادہ مشہور و سربرآوردہ شخص ہے اپنے مقاصد کی تکمیل میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور جب جنگ کے بعد دونوں حریف الگ ہو گئے تو معلوم ہوا کہ شمالی یورپ رومائی نصرانیت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

اب ہمارے سامنے یہ بحث ہے کہ انتظام عالم کس طرح چل رہا ہے۔ آیا اس انتظام کا تکفل خدا کی مسلسل و متوالی مداخلت سے متعلق ہے یا ازلی و غیر متغیر قانون سے مسیحی دنیا کی عقلی تحریک نشوونما کے اس نقطہ پر اب پہنچی ہے جس پر عربی دماغ دسویں اور گیارھویں صدیوں میں پہنچ چکا تھا اور ان مسائل پر جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے پیش نظر تھے اب مکرر غور ہو رہا ہے۔ مسئلہ ارتقا‘مسئلہ پیدائش‘ مسئلہ نشوونمائے موالید وہ مباحث ہیں جو انیسویں صدی کی نصرانیت کو دسویں صدی کے اسلام سے ترکہ میں ملے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ان عام عنوانات کی ذیل میں اس مہتم بالشان مباحث کے تمام اصولی نکات آجائیں گے اور ان جامع ابواب کی تحت میں واقعات زیر غور کو جمع کرنے اور ہر مجموعہ پر جداگانہ بحث کرنے سے ہمیں ان کے باہمی تعلق اور ان کی تاریخی ترتیب کا صحیح صحیح علم ہو جائے گا۔

سائنس اور مذہب کی ان معرکہ آرائیوں کی داستان میں حتی الامکان بہ ترتیب زمانی سپرد قلم کی ہے اور بہ نظر تکمیل و اتمام ذیل کے تین ابواب کا اضافہ اصل بحث پر کر دیا ہے۔

(۱) لاطینی نصرانیت نے تمدن جدید کو کیا فائدہ پہنچایا۔

(۲) سائنس سے تمدن جدید نے کیا فیض پایا۔

(۳) مذہب اور سائنس کی عنقریب چھڑنے والی جنگ میں ویٹیکن کونسل کے اعلان کے لحاظ سے رومائی نصرانیت کا رویہ۔

حق و راستی کی جستجو میں اکثر اشخاص نے مختلف مذہبی فرقوں کے تنازعات کی جزئیات پر اپنی توجہ کو اس حد تک صرف کر رکھا ہے کہ وہ صدیوں کا جھگڑا جس کے تاریخی واقعات سے ان اوراق میں بحث ہے لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ میں نے مستقیم العزم ہو کر کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو بلارو و رعایت لکھوں اور فریقین کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے حق کو ہرگز نہ چھپاؤں۔ اس امر کا اندازہ کہ اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے میں ناظرین اولا الالباب کے حق پسندانہ فیصلہ پر چھوڑتا ہوں۔

نیویارک یونیورسٹی

جان ولیم ڈریپر

دسمبر ۱۸۷۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معرکہ مذہب و سائنس

پہلا باب

سائنس کی ابتداء

یونانیوں کی مذہبی حالت چوتھی صدی قبل مسیح میں سلطنت ایران پر حملہ آور ہو کر وہ قدرت کے نئے نئے مناظر دیکھتے ہیں اور نئے نئے مذاہب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ مقدونوی فوج کشی سے فن حرب فن انجینری اور سائنس کو جو تحریک پہنچتی ہے اسکندریہ میں ایک دارالعلم کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔ یہی دارالعلم جس میں تجربہ مشاہدہ اور مہندسانہ تنقید کے ذریعہ سے علوم و فنون کی ترقی کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ سائنس یعنی علوم و فنون کا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔

ارباب فکر و دانش کی نظر میں کوئی سماں اتنا دردناک نہیں ہوتا جتنا کسی پرانے مذہب کا زوال اور وہ بھی اس مذہب کا زوال جس نے اپنے زمانہ میں بنی نوع انسان کی کئی نسلوں کے لیے تسکین روحانی کا سرمایہ بہم پہنچایا ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے چار سو سال پہلے یونان علم و حکمت میں اتنی جلد جلد ترقی کر رہا تھا کہ قدیم مذہب کی قبا اس کے قامت پر تنگ ہو چلی تھی۔ وہاں کے فلاسفہ نے جب ماہیت کائنات پر غور کیا تو قوانین فطرت کی عظمت و جبروت کے مقابلہ میں اولمپس کے دیوتا انہیں سخت حقیر اور ذلیل نظر آئے۔ مورخوں نے جب معاملات سیاسی

کے انضباط و ترتیب اور افعال انسانی کی ہموار اور باقاعدہ روش پر نگاہ ڈالی اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ دنیا میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آتا جس کی کوئی صریح علت کسی واقعہ سابقہ کی شکل میں موجود نہ ہو تو انہیں شبہ ہونے لگا کہ کہیں وہ معجزے اور آسمانی نشانات جن سے عہد عتیق کے سفائن معمور ہیں محض من گھڑت قصہ کہانیاں ہی تو نہیں۔ اور جب فوق القدرت سے واقعات کا ظہور موقوف ہو گیا تو یہ بدیہی سوال پیدا ہوا کہ کیا وجہ ہے کہ کسی دیوتا کے منہ سے اب کوئی پیشین گوئی سننے میں نہیں آتی اور کرامات و عجائبات کا دروازہ مطلقاً" مسدود ہو گیا ہے۔

قدیم روایات نے جو قرنہاقرن سے سینہ بسینہ چلی آتی تھیں اور جس کی صداقت خوش عقیدہ اشخاص کے لئے اصول موضوعہ کا حکم رکھتی چلی آئی تھی جزائر بحر روم اور ارض ملحقہ کو فوق العادت عجائبات سے آباد کر رکھا تھا۔ چنانچہ ان ممالک کی نسبت عام طور سے مشہور تھا کہ وہاں عجیب الخلقت ہستیاں مثلاً" جادوگر۔ جادوگرنیاں۔ دیو۔ بھوت۔ پڑیلیں۔ پروار سانپ کے بالوں والی بلائیں۔ نصف انسان اور نصف گھوڑے کے دھڑ والی آفتیں اور یک چشم عفریت بستے ہیں۔ آسمان کی لاجوردی محراب کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ یہ بہشت کا صحن ہے جس میں مہا دیوتا زیوس دیوتاؤں اور ان کی بیبیوں اور آشناؤں کے حلقہ میں دربار کرتا ہے۔ ان دیوتاؤں کے مشاغل بھی نوعیت میں انسانی مشاغل پر تفوق نہ رکھتے تھے یعنی آسمان والے بھی زمین والوں کی طرح جذبات بہیمیہ و اعمال سیہ سے بری نہ تھے۔

یونان کے ساحل کی انحنائی ہیئت نے ایک ایسے مجمع الجزائر کے موزوں موقع کے ساتھ مل کر جس کے بعض جزیرے خوشنمائی اور دلفریبی کے لحاظ سے دنیا بھر میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ یونانیوں میں جہاز رانی جغرافیائی' اکتشاف اور ممالک غیر میں نئی آبادیاں قائم کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔ ان کے جہاز بحیرہ اسود اور بحیرہ روم میں چکر لگانے لگے اور قرب و جوار کے سمندروں کا چپہ چپہ انہوں نے چھان مارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مہتم بالشان عجائبات جن کی ثناء و صفت سے کتاب "اوڈیسی" کے اوراق مزین تھے فرضی ڈھکوسلے ثابت ہوئے۔ قدرت کے واقعات کے متعلق جب زیادہ تجسس و تفحص سے کام لیا گیا تو معلوم ہوا کہ آسمان محض فریب نظر کا نام ہے اور اولمپس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ اگر ہیں تو ستارے ہیں یا فضائے بسیط غرض مکان کے ساتھ مکین بھی تشریف لے گئے نہ "آیوئین" خاندان کے معبود باقی رہے جن کا ذکر ہومر نے کیا ہے اور نہ "ڈورک" قبیلہ کے دیوتا جن

کے بھجن ہیسائڈ نے گائے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اتنا بڑا انقلاب بغیر کسی مزاحمت یا مخالفت کے واقع ہو گیا اول اول عوام الناس خصوصاً" اہل مذہب نے مشککین کے اٹھتے شبہات پر لامذہبی کا فتوی لگایا۔ انہوں نے خاطیوں میں سے بعض کا مال و اسباب ضبط کر لیا بعض کو جلاوطن کر دیا اور بعض کو قتل کر ڈالا۔ ان کا دعوی یہ تھا کہ جن باتوں کو لوگ ہزارہا برس سے مانتے چلے آئے ہیں وہ ضرور ہے کہ صحیح ہوں ورنہ اتنی مدت تک قائم کیوں رہتیں۔ لیکن جب شہادت مخالف اس قدر زبردست ہو گئی کہ اس کا کوئی جواب نہ ہو سکتا تھا تو انہیں مجبوراً" تسلیم کرنا پڑا کہ یہ عجائبات استعارے تھے جن کے پردے میں قدما کی دانش و حکمت نے بہت سے مقدس و پوشیدہ رموز و نکات کو ظاہر کیا تھا۔ اگرچہ خود ان کے دل میں بھی یہ خدشہ پیدا ہو چلا کہ ممکن ہے کہ جن باتوں کی ہم حمایت کر رہے ہیں ان کی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہ ہو لیکن چونکہ مذہب کا اثر دل پر قوی تھا لہٰذا ان کی کوششوں نے یہ صورت اختیار کی کہ اپنے معتقدات کو اپنے عقلی وادراک کی نشوونما کے ساتھ تطبیق دینے لگے۔ لیکن ممکن نہ تھا کہ یہ کوششیں بار آور ہوں۔ اس لیے کہ یہ امر مقدرات سے ہے کہ انسانی رائے خاص خاص مدارج ارتقا طے کرنے بعد ایک خاص نقطہ پر جا کر ٹھہر جائے۔ انسان جس عقیدہ کو حرمت اور توقیر کی نظر سے دیکھتا ہے اول اول اس کے متعلق اس کے دل میں شبہات و شکوک ناشی ہوتے ہیں۔ تشکک کے بعد تاویل کا دور آتا ہے۔ تاویل مبدل بہ اختلاف ہو جاتی ہے۔ اور اختلاف کل عقیدہ کو ایک فرضی افسانہ سمجھ کر انکار کی انتہائی اور قطعی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

فلاسفہ اور مورخین کے بعد شعراء کے اعتزال کی باری آئی۔ یورپیڈیز پر فاسد العقیدہ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ اسقلس کفر بکنے کی پاداش میں سنگسار ہوتے ہوتے بچا۔ لیکن جن لوگوں کی اغراض بے بنیاد باتوں کی حمایت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں ان کی مجنونانہ کوششیں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں۔ اس عقلی ہل چل کے آثار ادب و انشا کے ہر شعبہ میں نظر آنے لگے یہاں تک کہ عوام الناس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

قومی مذہب کے اس استیصال میں اہل یونان کے فلسفیانہ اکتشافات کو ان کی حکیمانہ تنقید سے بہت کچھ مدد ملی تھی۔ اسی تنقید کا نتیجہ تھا کہ عقاید مروجہ کے متعلق جو عام شکوک پھیل گئے تھے ان کی تائید میں شواہد و دلائل کا ایک انبار جمع ہو گیا اور مختلف مذاہب کے عقاید کے باہمی مقابلہ سے ان نواقض کی بنا پر جو ان میں پائے گئے یہ ثابت کیا

گیا کہ انسان کے پاس حق اور صدق کا کوئی معیار نہیں۔ نیکی اور بدی کے خیالات اس عالم کون و فساد میں سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ "مطلقاً" تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں اس لیے کہ ایک ملک میں جو بات بری سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اچھائی اور برائی نیکی اور بدی محض چند اعتبارات کا نام ہے جنہیں بنی نوع انسان نے اپنے فواید کے لحاظ سے قائم کر رکھا ہے۔ ایتھنز میں بعض فرقے تو یہاں تک ترقی کر گئے تھے کہ نہ صرف انہیں اس بات سے انکار تھا کہ کسی ان دیکھی ان بوجھی اور فوق القدرت ہستی کا وجود ہو سکتا ہے بلکہ وہ دنیا کو ایک خواب پریشان ایک خیال موہوم تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حقیقی وجود کسی شے کا نہیں ہے۔

یونان کی ماہیت ارضی و طبعی کا اثر اس کی پولیٹیکل حالت پر بھی پڑا۔ اس نے اہل یونان کو متعدد جماعتوں میں تقسیم کر دیا جن کی اغراض مختلف اور مقاصد جداگانہ تھے اور یہ بات ناممکن ہو گئی کہ ان کی ایک حکومت قائم ہو۔ ان مسلسل خانہ جنگیوں نے جو یونان کی رقیب ریاستوں کو ایک دم چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھیں اس کی ترقی رفتار کو روک دیا۔ ملک کی مالی حالت سقیم تھی اور ملک کے سربرآوردہ لوگ جادہ تدین سے منحرف ہو گئے تھے۔ وہ حب وطن کی بے بہا جنس کو ممالک غیر کے سیم و زر کے بدلے فروخت کرنے میں ذرا پس پیش نہ کرتے تھے اور ایرانی رشوت کی قربانگاہ پر یونانی اغراض کی بھینٹ چڑھانا ان کے لئے مساوات ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فنون بت تراشی و تعمیر کے ان محاسن نے جن کی دلاویزی و رعنائی آج تک دنیا میں اپنی مثال آپ سمجھی گئی ہے یونان کو حسن صوری کا اس حد تک شیفتہ ووالہ بنا دیا تھا کہ اس میں حسن معنوی یعنی سعادت و صداقت کے عملی امتیاز کی قابلیت سلب ہو گئی تھی۔

یونان کو جو حصہ یورپ میں واقع تھا اس نے تو خودمختاری و حریت کے ان خیالات کی بدولت جو وہاں پھیلے ہوئے تھے ایران کے باجگذار بننے سے انکار کر دیا لیکن ایشیائی یونان بلاتامل اس کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ اس زمانہ میں سلطنت ایران رقبہ میں موجودہ یورپ کے نصف کے برابر تھی۔ ایک طرف اس کے ساحلوں کو بحرروم۔ بحیرہ ایجین۔ بحیرہ اسود۔ بحیرہ خزر کی موجیں بوسہ دیتی تھیں۔ دوسری طرف اس کی سرحد بحر قلزم۔ خلیج فارس اور بحر ہند سے ملی ہوئی تھی۔ اس کے میدانوں اور وادیوں کو دنیا کے سب سے بڑے چھ دریا۔ فرات۔ دجلہ۔ انڈس۔ جیحون۔ سیحون اور نیل جن میں سے ہر ایک کا طول ہزار میل سے زیادہ تھا سیراب کرتے تھے۔ اس کی سطح سمندر کی سطح سے کہیں تیرہ سو فٹ نیچی اور کہیں

بیس ہزار فٹ بلند تھی اور اسی نشیب و فراز کا نتیجہ تھا کہ اس میں ہر قسم کی نباتی پیداوار موجود تھی اور معدنی دولت کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ میڈیا اور بابل کا جاہ و جلال اور اسیریا اور کالدیہ کی عظمت و تمکنت اسے متفقہ و مشترکہ طور پر ترکہ میں ملی تھی اور یہ وہ دولتیں تھیں جن کے تاریخی کارنامے بیس صدیوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

ایران یورپین یونان کو سیاسی پہلو سے ہمیشہ حقیر و ہیچ میرز سمجھتا رہا اس لئے کہ اس کا رقبہ کسی ایرانی صوبہ کے نصف کے مساوی بھی نہ تھا۔ لیکن جو چڑھائیاں اس سرکش علاقہ کو نیچا دکھانے کے لئے ایران نے وقتاً" فوقتاً" کیں ان کے اثنا میں اسے یونانیوں کی جنگی قابلیت کا اعتراف کرتے ہی بنی اور یہی وجہ تھی کہ ایرانی افواج کے سب سے زیادہ جانباز اور جری دستے ان یونانی سپاہیوں سے مرکب تھے جنہیں فرماں روایان ایران نے بیش قرار معاوضے دے کر نوکر رکھ لیا تھا۔ افواج ایران کے سپہ سالار اور ایرانی جہازوں کے بیڑے کے امیرالبحر تک بعض دفعہ یونانی ہوتے تھے۔ ان خانہ جنگیوں کے دوران میں جنھوں نے ایران کو طوائف الملوکی کا موقف بنا دیا تھا تخت و تاج کے دعوے داروں کی رقیبانہ کوششیں بسا اوقات یونانی سپاہیوں ہی کے مردانہ اوصاف کی شرمندہ احسان ہوئیں۔ ان نبرد آزمائیوں سے جو نتائج مترتب ہوئے وہ نہایت اہم تھے۔ بہادر اور جنگجو یونانیوں نے جن کے جوہر سپہ گری کو اب تک ایران کے روپیہ نے خرید رکھا تھا ایک نظر میں معلوم کر لیا کہ سلطنت روبہ انحطاط ہے اور تلوار کے زور سے تخت تک پہنچ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ کیونکسا کے میدان جنگ میں سائرس کے کام آنے کے بعد زنوفن کا اپنے دس ہزار ہمراہیوں کو ایران سے صحیح و سلامت لے نکلنا ایک ایسا زندہ جاوید واقعہ تھا جس نے اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ بالکل ممکن ہے کہ یونانی فوج قلب ایران پر ترکتاز کرے اور وقت آ پڑے تو صحیح و سلامت واپس چلی جائے۔

زرکسیس نے ہیلیسپانٹ پر پل باندھ کر اور کوہ ا-تھاس کی خاکنائے کو ابنائے کی شکل میں بدل کر یونانیوں کے دلوں پر ایشیائی سپہ سالاروں کی جنگی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا لیکن سلامس پلیٹیا اور مائیکیل کی لڑائیوں نے یہ نقش محو کر دیا۔ ایران کے مالامال صوبوں کو تاخت و تاراج کرنے کی ہوس کا ایک طوفان ان کے دلوں میں امنڈ آیا۔ اسپارٹا کا بادشاہ ایگیسلیس اسی خواہش کے اقتضا سے ایران پر چڑھ دوڑا اور کئی نمایاں فتوحات حاصل کیں لیکن ایرانی گورنمنٹ نے اس موقعہ پر اپنی قدیم حکمت عملی سے کام لے کر اس کی پیش قدمی کو روک دیا یعنی اسپارٹا کی ہمسایہ ریاستوں کو رشوت دے کر خود اسپارٹا پر حملہ کرا دیا۔

اگیسیلیئس کو اب اپنے گھر کی پڑ گئی اور جب جہاز پر سوار ہو کر وہ اسپارٹا کو واپس جانے لگا تو یہ تلخ اور تعریف آمیز جملہ اس کے منہ سے نکلا کہ "آہ میں مغلوب بھی ہوا تو فقط تیس ہزار ایرانی تیراندازوں سے"۔ اس سے اس کی مراد ایرانی سکہ "دارک" سے تھی جس پر تیرانداز کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

اس کے بعد فیلقوس شاہ مقدونیہ کو ایک زیادہ تر اہم مقصد نے ایک بہت بڑے جنگی پیمانہ پر ان کوششوں کی تجدید و احیا کا خیال دلایا۔ تمام یونانی ریاستوں کو اس نے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسے یونان کی افواج متحدہ کا سپہ سالار اعظم قرار دیں نہ اس غرض سے کہ صوبجات ایران کو تاخت و تاراج کیا جائے بلکہ اس غرض سے کہ دولت ایران کو مسخر کر کے یونان کا حلقہ بگوش بنا لیا جائے۔ ابھی اس عظیم الشان مہم کی تیاریاں مکمل نہ ہوئی تھیں کہ وہ قتل کر ڈالا گیا اور اس کا بیٹا سکندر جو ابھی بالکل نوعمر تھا اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ فیلقوس کے قتل کے بعد یونانیوں کی ایک عام مجلس شوریٰ بمقام کارنتھ منعقد ہوئی تھی اور اس میں بالاتفاق یہ قرار پایا تھا کہ سکندر اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے۔ انہی دنوں الیریا میں کچھ فساد اٹھ کھڑا ہوا۔ سکندر کو اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے اپنی فوج لے کر شمال کی جانب دریائے ڈینوب تک جانا پڑا۔ اس کی غیبت میں اہل تھیبز نے دیگر قبائل کے ساتھ مل کر اس کے برخلاف سازش کی۔ واپس آ کر اس نے تھیبز کو ایک دھاوے میں سر کر لیا اور اہل شہر میں سے چھ ہزار کو قتل کیا' تیس ہزار کو لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالا اور شہر کو مسمار کر دیا۔ یہ جبر و تشدد اس کی فوجی مال اندیشی کی بہت بڑی دلیل ہے اس لئے کہ جب وہ ایشیا کی تسخیر میں مصروف تھا تو اس کی غیبت میں کسی کو سر اٹھانے کی جرات نہ ہوئی۔

۳۳۴ ق ء کے موسم بہار میں سکندر ہیلسپانٹ کو عبور کر کے ایشیا کے ساحل پر لنگرانداز ہوا۔ اس کی فوج تعداد کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ چونتیس ہزار پیادے تھے اور چار ہزار سوار۔ خزانہ بھی اس کے ہمراہ واجبی ہی تھا یعنی کلم ستر ٹیلنٹ لے کر گھر سے نکلا تھا۔ ایرانی فوج دریائے گرینیکس کے اس پار ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ سکندر نے سیدھا غنیم کا رخ کیا اور دریا کو چیرتا ہوا حریف سے جا بھڑا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ایرانی اگرچہ جان توڑ کر لڑے لیکن سکندر کی بہادر اور قواعد دان فوج کے آگے ان کی ایک پیش نہ گئی۔ شکست فاش کھا کر انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور کل ایشیائے کوچک مع بے شمار خزانوں کے سکندر کے قبضہ میں آ گیا۔ سال کا باقی حصہ سکندر نے ممالک مفتوحہ کے فوجی نظم و

نسق میں گذارا۔ اس اثناء میں دارافرمانروائے ایران چھ لاکھ کا ٹڈی دل لے کر آگے بڑھا تاکہ مقدونوی فوج کو شام کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکے۔ کوہستان ایسس کی گھاٹیوں میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ ایرانیوں کو اس دفعہ بھی شکست ہوئی۔ اس خونریز جنگ میں جانوں کا جس قدر نقصان ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سکندر اور اس کا ایک جرنیل بطلیموس جب ایک گھاٹی میں سے گذرے تو اسے کشتوں کے ایک عظیم الشان پشتے سے اٹا ہوا پایا اور دونوں کو اس گنج قتیلاں کے اوپر سے ہو کر گذرنا پڑا۔ سکندر کے ہمراہ جو وقائع نویس تھے انہوں نے حساب لگایا کہ اس جنگ میں ایرانی فوج کا نقصان بقدر نوے ہزار پیادوں اور دس ہزار سواروں کے ہوا۔ شاہی حرم سرا کا خیمہ دارا کی بی بی اور اس کے کئی بچوں سمیت فاتح کے قبضہ میں آیا۔ اس طور پر ملک شام بھی یونانی فتوحات کی سلک میں منسلک ہو گیا۔ دمشق میں دارا اور اس کے اعیان دولت کی کثیر التعداد خواصیں مع بیشمار خزانہ کے سکندر کے ہاتھ آئیں۔

مسوپوٹیمیا کے میدانوں کی جانب اخیر جنگ کے لئے پیش قدمی کرنے سے پہلے سکندر نے ان ممالک کی حفاظت کے خیال سے جنہیں وہ فتح کرتا ہوا پیچھے چھوڑ آیا تھا اور نیز اس غرض سے کہ اس کے اور سمندر کے درمیان غنیم کو حائل ہونے کا موقع نہ ملے بحرروم کے ساحل کے کنارے کنارے جنوب کا رخ کیا اور رستہ میں جو جو شہر پڑے انہیں فتح کرتا گیا۔ ایسس کی لڑائی کے بعد جو مجلس شوریٰ منعقد ہوئی تھی اس میں سکندر نے ایک تقریر کرتے ہوئے اپنے افسران فوج سے کہا تھا کہ ایسی حالت میں جب کہ ٹائر مسخر نہیں ہوا اور مصر و قبرص ایران کے قبضہ میں ہیں دارا کا تعاقب کرنا کسی طرح قرین مصلحت نہیں اس لئے کہ اگر ایران بندرگاہوں پر مکرر قابض ہو گیا تو مرکز جنگ یونان میں منتقل ہو جائے گا۔ پس بجز اس کے چارہ نہیں کہ سمندر کے قبضہ میں ہمارا کوئی شریک و سہیم نہ ہو۔ سکندر اچھی طرح جانتا تھا کہ مصر اور قبرص پر قبضہ کر لینے کے بعد اسے یونان کی طرف سے کوئی کھٹکا نہیں ہو سکتا۔ ٹائر کے محاصرہ میں اسے چھ مہینے کی مدت لگی۔ اس تاخیر کی پاداش میں اس نے اہل ٹائر میں سے دو ہزار کو سولی پر لٹکا دیا۔ یورشلم نے بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دیئے اور اس لئے اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا گیا لیکن غازہ کے ایرانی گورنر بیطس نے مقدونوی فوج کو رستہ میں جانبازانہ مقابلہ سے دو مہینے تک روڑا اٹکائے رکھا۔ آخر ایک سخت حملہ کے بعد اس شہر کو بھی سکندر کی کشور کشا تلوار نے مسخر کیا۔ شہر کے دس ہزار باشندے تہ تیغ کئے گئے اور باقی اپنے بی بی بچوں سمیت لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے۔ خود

بطیس کو فاتح کے رتھ کے پہیوں کے ساتھ باندھ کر شہر کے گردا گرد گھسیٹا گیا۔ اس کے بعد کسی کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ اہل مصر نے جنہیں ایرانی حکومت سے نفرت تھی یونانی حملہ آور کا باشتیاق تمام خیرمقدم کیا اور مصر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اس کے ہاتھ آ گیا۔ مصر کے انتظام میں سکندر نے اپنی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا یعنی بڑے بڑے فوجی عہدے مقدونوی افسروں کو دیئے اور ملکی نظم و نسق کی باگ ابنائے وطن کے ہاتھ میں رہنے دی۔

جب ایران پر آخری حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو سکندر جو پیٹر ایمن دیوتا کے مندر کی جاترا کو روانہ ہوا جو دو سو میل کے فاصلہ پر صحرائے لبیا کے ایک خوش سواد مرغزار میں واقع تھا۔ مندر کے غیب دان کاہن نے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ تم اسی ہیکل کے دیوتا کی اولاد ہو جو سانپ کی شکل اختیار کر کے تمہاری ماں اولمپیاس کو اپنے تصرف میں لایا تھا۔ یہ خیال کہ بے باپ کے بھی اولاد ہو سکتی ہے اور یہ نتیجہ دیوتاؤں اور ان عورتوں کی مواصلت سے مترتب ہوتا ہے جو ان کی منظور نظر ہوں اس زمانہ میں اس قدر عام تھا کہ جو شخص اقران و اماثل میں غیر معمولی طور پر نمایاں اور سربرآوردہ ہوتا تھا آسمانی نسل سے سمجھا جاتا تھا اس قسم کے خیالات صدہا سال تک لوگوں میں پھیلے رہے۔ چنانچہ رومتہ الکبریٰ کی نسبت عام طور سے یہ مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک کنواری لڑکی رہی سلویا نامی گھڑا لئے ہوئے پانی بھرنے کے لیے چشمہ پر جا رہی تھی کہ مارس دیوتا کی اس پر نظر پڑ گئی۔ دیوتا اس دوشیزہ پر عاشق ہو گیا اور اس تعشق کا نتیجہ رومیولس ہوا جس نے شہر روما کی بنا ڈالی۔ اگر کوئی شخص اس روایت کے صحیح ہونے میں شک لاتا تو خدا جانے اس کی کیا گت بنتی۔ خود فلاطون کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اس کی ماں پیر کیٹونی کنواری تھی جسے اپالو دیوتا سے حمل رہ گیا تھا اور دیوتا ارسان کو جس کے ساتھ پیر کیٹونی کی نسبت ٹھہری تھی فلاطون کے آسمانی نسب کا حال بتا دیا تھا۔ بانی فلسفہ اشراقیہ کے مصری تلامذہ کے سامنے اگر کوئی شخص اس کی ابوت کے سماوی الاصل ہونے کے متعلق شبہ ظاہر کرتا تو ان کی ناراضی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ "شاہ اسکندر ابن جو پیٹر ایمن" کے القاب کے ساتھ جب سکندر کے احکام و فرامین جاری ہوتے تھے تو شام اور مصر کے باشندے انہیں اس انتہائے تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھتے تھے جس کا آج کل صحیح اندازہ ہونا مشکل ہے۔ لیکن آزاد خیال یونانی اس آسمانی نسبت کی اصلی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اولمپیاس جس سے زیادہ روشنی اس معاملہ پر اور کوئی نہ ڈال سکتا تھا ازراہ مزاح کہا کرتی تھی کہ "بہتر ہو اگر سکندر مجھے

اس فضیلت سے معاف رکھے تاکہ جو پیٹر کی بی بی کے ہر وقت کے رقیبانہ طیش و غضب سے تو بچی رہوں۔" مقدونوی مہم کے وقایع نویس اریئن کا بیان ہے کہ سکندر کی یہ کوشش کہ اس کا ربانی الاصل ہونا اس کی رعایا کے ذہن نشین ہو جائے قابل ملامت نہیں قرار دی جا سکتی اور نہ اس سے اس پر کوئی بڑا الزام عائد ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی تاویل بادی النظر میں یوں ہو سکتی ہے کہ اس کا مطلب اس کوشش سے اس سے زیادہ نہ تھا کہ اس کی فوج پر اس کا زیادہ رعب اور اقتدار قائم ہو۔

جب سب انتظام خاطر خواہ ہو چکا تو سکندر شام کو واپس آیا اور اپنے لشکر کے ساتھ جس میں اب پچاس ہزار جنگ آزمودہ اور قواعد دان بہادر موجود تھے مشرق کا رخ کیا۔ دریائے فرات کو عبور کر کے وہ کوہستان میسیا کے دامن دامن سفر کرتا رہا تاکہ مسوپوٹیمیا کے جنوبی میدانوں کی شدید تمازت سے پناہ ملے۔ اس رستہ کے اختیار کرنے میں ایک یہ فائدہ بھی تھا کہ گھوڑوں کے لیے چارہ بہ افراط مل سکا۔ دجلہ کے بائیں کنارے اربیلا کے قریب اس کا مقابلہ گیارہ لاکھ کے اس عظیم الشان لشکر سے ہوا جسے دارا بابل سے لایا تھا۔ ایرانیوں کو باوجود کثرت تعداد شکست ہوئی اور ان کا بادشاہ مارا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونوی سپہ سالاران تمام ممالک پر قابض ہو گیا جو دریائے ڈینوب اور انڈس کے درمیان واقع تھے۔ اس کے بعد سکندر نے اپنی فتوحات کو دریائے گنگا تک وسعت دی جو مال و متاع اسکے ہاتھ آیا وہ قیاس و شمار سے باہر ہے اریئن لکھتا کہ ایک فقط سوسا میں اسے پچاس ہزار ٹیلنٹ کی رقم ملی۔

زمانہ حال کے فن حرب میں جس شخص کو دستگاہ حاصل ہے وہ ان حیرت انگیز فوجی کارناموں کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آبنائے ہیلسپانٹ کا عبور۔ غنیم کی مزاحمت کے باوجود دریائے گرینیکس کا مرور۔ موسم سرما میں مفتوحہ ایشیائے کوچک کی تنظیم و تنسیق۔ بحر روم کے شامی ساحل کے کنارے کنارے فوج کے میمنہ و قلب کی یلغار۔ ٹائر کے محاصرہ کی مشکلات صعب کا حل۔ شہر غازہ کی تسخیر۔ یونان سے ایرانی سلسلہ تعلقات کا انقطاع۔ بحر روم سے ایران کے جنگی بیڑے کی بے دخلی۔ ایتھنس یا اسپارٹا والوں کو رشوت دے کر مقدونیہ کے برخلاف ابھارنے کے متعلق ایرانیوں کی مستمرہ حکمت عملی کا توڑ۔ مصر کی فتح اور ایک اور موسم سرما گذار کر اس کے ملکی و فوجی انتظام کی تکمیل۔ آئندہ موسم بہار میں کل فوج کا بحیرہ اسود اور بحیرہ قلزم کی متخالف سمتوں سے کوچ کر کے مسوپوٹیمیا کے شورہ زار میدانوں میں اجتماع۔ تھپساکس کے شکستہ پل پر بید مجنوں سے ڈھکے

ہوئے کناروں والے فرات سے گذر کر دریائے دجلہ کا عبور۔ اربیلا کی عظیم الشان اور یادگار زمانہ جنگ سے پہلے شبینہ طلایہ گری۔ میدان جنگ پر ترچھی سمت میں فوج کی نقل و حرکت۔ قلب غنیم پر ترکتاز (اور یہ وہ چال ہے جس کی تقلید صد ہا سال بعد آسٹرلٹز کے میدان جنگ پر کی گئی)۔ شہنشاہ ایران کا ان تھک اور سرگرم تعاقب۔ یہ تمام ایسے کارنامے ہیں جس کے لحاظ سے زمانہ مابعد کا کوئی سپہ سالار سکندر پر فوقیت نہیں لے گیا۔

اس طور پر یونانیوں کی دماغی تحریک کو بہت بڑی تقویت پہنچی۔ یونان میں لینے ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے مقدونوی فوج کے ہمراہ دریائے ڈینوب سے لے کر تابہ رودنیل اور رودنیل سے گنگا کے میدانوں تک سفر کیا تھا۔ ممالک آں روئے بحیرہ اسود کی بر فبار ہواؤں سے ان کا مغز استخوان تک منجمد ہوا تھا اور مصری صحراؤں کی آتشبار اور ریگ افشاں لوؤں نے ان کے چہروں کو جھلسا تھا۔ مصر کے اہرام جنہیں کھڑے کھڑے بیں صدیاں گزر چکی تھیں۔ لکسار کے مخروطی مینار جن پر مصر قدیم کے راز خط تصویر منقوش تھے قطار اندر قطار ابوالہول جو اسرار انگیز خموشی کا مرقع تھے۔ ان فرمانرواؤں کے دیوہیکل مجسمے جنہوں نے صبح آفرینش کے طلوع کے وقت زمام حکومت ہاتھ میں لی تھی۔ یہ تمام عبرت افزا منظر ان کے پیش نظر ہو چکا تھا۔ ایسرہیڈن کے عالیشان ایوانوں میں وہ اسیریا کے ان قدیم بادشاہوں کے تختوں کے سامنے کھڑے ہو چکے تھے جن کے چہروں سے جلال و رعب ٹپکتا تھا اور جن کے حاجب و محافظ پردار سانڈ تھے۔ بابل کی شہرپناہ جس کا دور کسی زمانہ میں ساٹھ میل سے اوپر تھا اور جو باوجود تین صدیوں اور تین حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کے اسی فٹ بلند تھی ابھی تک قائم تھی۔ بعل کے سربفلک مندر کے کھنڈر زبان حال سے پکار پکار کر اس کی گذشتہ عظمت و شوکت کی شہادت دے رہے تھے اور اس کی چھت پر وہ رصدگاہ موجود تھی جس میں کالدیہ کے اختر شمار ہیئت دان راتوں کو بیٹھ کر عالم بالا کی روشن و تابناک ہستیوں سے ہمکلام ہوا کرتے تھے۔ ابھی تک فرمانروایان بابل کے دو محلوں اور ان شہرہ آفاق معلق باغات کے آثار باقی تھے جن کے تناور درختوں کو دیکھ کر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ فضائے بسیط میں اگے ہوئے ہیں اور جن کلوں کے ذریعہ سے ان باغوں میں دریا کا پانی پہنچایا جاتا تھا ان کے ٹوٹے پھوٹے نشان بھی ابھی تک موجود تھے۔ اس شہر میں جو مصنوعی جھیل نہروں اور نالیوں کے ایک کثیرالتعداد اور پیچ در پیچ سلسلہ کے ساتھ بہ زمانہ سابق تیار کی گئی تھی وہ کوہستان آرمینیا کی پگھلی ہوئی یخ سے لبریز رہتی تھی اور دریائے فرات کا پشتہ اس انداز سے باندھا گیا تھا کہ نہروں کے ذریعہ سے جو پانی شہر میں

جائے وہ زائد از ضرورت بہاؤ کا سدباب کر سکے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب و غریب شاید وہ سرنگ تھی جس کے ذریعہ سے دریائے فرات کے نیچے سے آمدورفت ہوتی تھی۔

کالدیہ اسیریہ اور بابل کے حیرت افزا اور عظیم الشان آثار تو نہایت ہی قدیم تھے یہاں تک کہ ان کے آغاز پر زمانہ کی رات کا سیاہ پردہ پڑا نظر آتا ہے لیکن ایران بھی زمانہ مابعد کے عجائبات سے خالی نہ تھا۔ پرسپولس (اصطخر) کے ستون دار ایوانوں کو صناعی کا اعجاز خانہ کہنا چاہئے جن میں کندہ کاری بت تراشی مینا کاری کے نفیس و پاکیزہ نمونے۔ سنگ مرمر کی سلوں کے کتب خانے۔ مخروطی مینار۔ ابوالہول اور دیوپیکر سانڈ قرینہ سے آراستہ تھے۔ اکبتانا ہاجدا۔ ان ایران کا ایلاق یعنی موسم گرما بسر کرنے کا مقام تھا۔ اس شہر کے گرداگرد سات فصیلیں ترشے ہوئے اور مجلا پتھر کی تھیں۔ ہر اندر کی فصیل باہر کی فصیل سے اونچی ہوتی جاتی تھی۔ یہ فصیلیں جو سبعہ سیارہ کی تنجیمی مناسبت سے تیار کی گئی تھیں رنگ میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ شاہی محل کی چھت چاندی کی اینٹوں کی تھی اور شہتیروں پر سونے کے پتروں کا خول چڑھا ہوا تھا۔ آدھی رات کو جب روغن نفط کی مشعلوں سے محل میں چراغاں کیا جاتا تھا تو جگمگاہٹ کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ آفتاب کی روشنی کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں ایک پر فضا باغ جو شاہان مشرق کی دلفریبیوں کا سب سے بڑا سامان ہے لگایا گیا تھا۔ غرض سلطنت ایران ہیلسپانٹ سے لے کر انڈس تک گلزار عالم بنی ہوئی تھی۔

ہم نے ان حیرت افزا فتوحات کے حالات کا ذکر بالتفصیل اس لئے کیا ہے کہ حسیات میں جو ترقی یونانیوں نے ان کی وجہ سے کی وہ اسکندریہ میں ہندسہ و ریاضی اور فنون عملی کے ان دارالعلوں کے قیام کا باعث ہوئی جو سائنس کا مبداء و منشا ہیں۔ اگر سلسلہ بہ سلسلہ سراغ لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہماری تمام صحیح معلومات کا ماخذ اصلی یہی مقدونوی فتوحات ہیں۔ ہمبولٹ نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان جب کارگاہ ہستی کی نئی اور عظیم الشان قوتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے قوائے دماغی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ سکندر کے سپاہیوں اور ہمراہیوں کو ہر منزل پر غیرمترقب اور دلفریب مناظر دکھائی دیے۔ دنیا کی تمام قوموں میں یونانیوں کی قوت مشاہدہ سب سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور جو کچھ وہ دیکھتے تھے اس سے بہت جلد اور بدرجہ غایت متاثر ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ اگر انھیں غیر محدود ریگستان نظر آئے تو دوسرے مقام پر ایسے پہاڑ دکھائے دیے جن کی چوٹیاں بادلوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ صحراؤں میں انھیں سراب نے دھوکا دیا تو دامن کوہ میں صبا رفتار بادلوں کے

مہیب اور دیوہیکل سایہ نے اچنبھے میں ڈالا۔ عنبریں خرماستانوں اور زمردیں سرد و صنوبر کی سیر کرتے ہوئے وہ جھاؤ اور مہندی کی سرزمین میں پہنچے۔ اربیلا کے میدان میں انھیں ہندوستان کے سدھے ہوئے جنگی ہاتھیوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ بحیرہ خزر کے ساحل کے جنگلوں میں ان کی یلغار کی دھمک نے شیر ببر کو بیدار کیا۔ ایسے ایسے جانور ان کے دیکھنے میں آئے جو یورپ کے جانوروں کے مقابلہ میں نہ صرف عجیب الخلقت بلکہ بمراتب عظیم الجثہ تھے۔ گینڈا۔ اونٹ۔ دریائی گھوڑا۔ نیل و گنگا کے نہنگ ان کے لئے بمنزلہ عجائبات تھے۔ ایسی ایسی قوموں سے ان کی لڑائیاں ہوئیں جو شکل و شمائل اور وضع و قطع میں ان سے بالکل مختلف تھیں۔ کبھی وہ سیاہ فام افریقی سے نبرد آزما ہوئے اور کبھی سامنے شامی اور گندم رنگ ایرانی سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ خود سکندر کی نسبت یہ واقعہ مشہور ہے کہ بستر مرگ پر پڑے پڑے وہ اپنے امیرالبحر نیارکس سے اس کے دریائی سفر کی دلچسپ سرگذشت سن سن کر جی بہلایا کرتا تھا جو اس نے دریائے انڈس سے خلیج فارس تک کیا تھا۔ سکندر نے جب اول اول دریا کے مدوجزر کو دیکھا تو اسے بہت حیرت ہوئی۔ اسے یہ خیال تھا کہ بحیرہ اسود اور بحیرہ خزر بھی بحر احمر اور بحر فارس کی طرح جیسا کہ نیارکس نے دریافت کیا تھا کسی بڑے سمندر کی خلیجیں ہوں گی۔ چنانچہ اس قیاس کو پایہ تحقیقات پر پہنچانے کے لئے اس نے جہاز تیار کرائے تھے۔ اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اس کے جہازوں کا بیڑہ افریقہ کے گرداگرد چکر لگاتا ہوا آبنائے جبل الطارق میں سے ہو کر بحر روم میں داخل ہوجائے۔ اور یہ خیال اس کے ذہن میں اس قدیم روایت نے پیدا کیا تھا کہ یہ مہم ایک بار فراعنہ کے زمانہ میں طے ہو چکی تھی۔

ممالک مفتوحہ کے بہت سے غرایب و نوادر ایسے تھے جنھوں نے نہ صرف بڑے سے بڑے بہادران یونان بلکہ اعلیٰ ترین حکمائے یونان کو محو حیرت کر دیا۔ کیلستھنیز کو بابل میں مسلسل ایک ہزار نو سو تین سال کے کلدانی مشاہدات اجسام فلکی ہاتھ لگے جو اس نے بلاتامل ارسطو کی خدمت میں بھیج دئے۔ چونکہ یہ رصدی نتائج پختہ اینٹوں پر ثبت تھے اس لئے یہ ممکن ہے کہ اس کے دوسرے نسخے آثار قدیمہ کے تلاش کرنے والوں کو سریانی سلاطین کے خشتی کتب خانوں میں سے مل جائیں۔ مشہور مصری ہیئت دان بطلیموس کو ایک بابلی جدول ہاتھ لگی تھی جس میں ۷۴۷ قبل مسیح سے لے کر اس وقت تک کے مشاہدات کسوف و خسوف کے نتائج مندرج تھے۔ ان نتائج میں سے جو ہم تک پہنچے ہیں بعض کی محققانہ تنقید کے لئے ضرور ہے کہ ایک عرصہ دراز تک نہایت دقت نظر اور تسلسل سے رصد بنی کی گئی

ہو۔ بابلی مہندسوں نے سال[۵۱] انقلابی کی جو مدت قائم کی تھی وہ زمانہ حال کی متحققہ مدت سے فقط ۲۵ ثانیہ کم ہے اور سال[۵۲] کوکبی کی مدت کا اندازہ اصلی مدت سے صرف بقدر دو دقیقہ کے زیادہ ہے۔ استقبال نقاط اعتدال لیل[۵۳] و نہار کا بھی ان کو علم ہو چکا تھا۔ کسوف و خسوف کے اسباب وہ دریافت کر چکے تھے اور اپنے مجوزہ دور کی مدد سے جس کا نام ان کی اصطلاح میں سیروس تھا وہ ان کے اوقات وقوع کی نسبت پیشین گوئی کر سکتے تھے۔ اس دور کی مدت انہوں نے 6586 دن سے کچھ زیادہ قرار دی تھی اور یہ مدت اصلی مدت سے فقط ساڑھے انیس دقیقہ کم ہے۔

ان واقعات سے اس بات کا ناقابل تردید ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ مسوپوٹیمیا میں فن ہیئت کو نہایت استقلال اور قابلیت کے ساتھ ترقی دی گئی تھی اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں آلات رصد نہایت ہی ناقص اور غیر مکمل تھے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیوں کر انہوں نے اس فن میں ایسا کمال حاصل کر لیا۔ ان قدیم علماء ہیئت نے کواکب کی ایک فہرست تیار کی تھی منطقۃ البروج کو بارہ برجوں میں تقسیم کیا تھا۔ دن اور رات کے بارہ بارہ گھنٹے مقرر کئے تھے۔ ارسطو کا بیان ہے کہ انہوں نے بہت کچھ وقت احتجاب کواکب[۵۴] کی تحقیقات میں جو چاند کے حائل ہونے کے باعث واقع ہوتا ہے صرف کیا تھا۔ ان کو نظام شمسی کی ترکیب کا صحیح صحیح علم تھا اور وہ سیاروں کے مقامات کے اعتباری تغیرات کی ماہیت سے بھی واقف تھے۔ دھوپ گھڑی۔ پانی کی گھڑی۔ اصطرلاب اور دھوپ گھڑی کا کانٹا ان کی ایجاد ہے۔

ان کی چھپائی کا طریقہ بھی جس کا حال اس وقت کے موجودہ نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے خالی از ہنر نہ تھا۔ جو کچھ چھاپنا ہوتا تھا ایک گردش کرنے والے بیلن پر شرخی حروف میں کندہ کر دیا جاتا تھا اور اس بیلن کو نرم گیلی مٹی کی اینٹوں پر پھیر دیا جاتا تھا جس سے بیلن کے حروف اینٹوں پر ابھر آتے تھے اور پھر نہ مٹ سکتے تھے۔ ان کی اینٹوں کی کتابیں ابھی تک ہماری معلومات متعلقہ ادب و تاریخ میں بہت کچھ اضافہ کرنے والی ہیں۔ مناظر و مرایا کے اصول سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ مقام نمرود میں جو شیشہ محدب برآمد ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چیز کو بڑا کر کے دکھانے والے آلات کی ماہیت بھی جانتے تھے۔ فن حساب میں وہ مراتب اعداد کی قیمت سے واقف ہو چکے تھے لیکن ہندوستان کی مہتم بالشان ایجاد صفر ان سے چھوٹ گئی تھی۔

ان واقعات نے کشور کشا ایرانیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ آج تک تجربہ اور مشاہدہ

سے انہوں نے کام نہ لیا تھا۔ ان کا سب سے بڑا عقلی کارنامہ ان کے تخیل کی شاعرانہ بلند پروازی تھی اور بس۔

یونانیوں کی دماغی ترقی کو جس کے محرک ایک حد تک فطرت کے وسیع مشاہدات ہوئے ممالک مفتوحہ کے مذاہب کی واقفیت سے بہت بڑی تقویت پہنچی۔ یونان کی بت پرستی کو ایران نے ہمیشہ نفرت و کراہیت کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ جب کبھی فرمان روایان ایران نے یونان پر فوج کشی کی تو یونانی مندروں کے انہدام اور ان کے بہائم صفت دیوتاؤں کی تذلیل و توہین کا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جب اس قسم کی توہین و تذلیل کی پاداش میں دیوتاؤں کی طرف سے کوئی آفت ایرانیوں پر نازل نہ ہوئی تو لوگوں کی اس عقیدت میں جو اپنے معبودوں کی طرف سے ان کے دلوں میں جاگزیں تھی تزلزل واقع ہو گیا اور یونانی مذہب کی جڑ کھوکھلی ہو چلی۔ اولمپس کے ان ناپاک دیوتاؤں کے پجاری جن کی فحش کاریاں ہر پاکباز شخص کے اندام اتقا پر لرزہ طاری کرنے والی تھیں اب ایسے مہتم بالشان اور سنجیدہ و متین مذہب سے دوچار ہوئے جس کی بنیاد فلسفہ پر رکھی گئی تھی۔ ہر اس سلطنت کی طرح جس کی مدت حکومت طویل ہوتی ہے ایران میں بھی متعدد مذہبی انقلابات واقع ہو چکے تھے۔ اول اول اس نے زردشت کا موحدانہ مسلک اختیار کیا۔ وحدانیت کے بعد ثنویت کا دور آیا اور ثنویت کی جگہ مجوسیت نے لے لی۔ مقدونوی فوج کشی کے وقت اہل ایران کے عقاید یہ تھے کہ ایک عقل کل تمام کائنات کی خالق محافظ اور حکمران ہے جو راستی کا جوہر پاک اور صداقت و خیر کا سرچشمہ ہے۔ اس قادر بے ہمتا کو کسی بت یا تصویر کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا اور چونکہ اس دنیائے دونی میں ہر شے دو متخالف قوتوں کے آثار کی دوگونہ مظہر ہے لہٰذا قادر مطلق کے زیر فرمان دو ہموزن و ہمزاد ازلی و ابدی طاقتیں ہیں جنہیں استعارۃً نور و ظلمت کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں ایک ایسی کشاکش اور زور آزمائی میں مصروف ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں۔ عالم ان دونوں کا عرصہ کارزار اور انسان ان کا مال غنیمت ہے۔

ثنویت کی قدیم روایات میں مذکور تھا کہ بدی کی طاقت (اہرمن) نے ایک سانپ کو اس کام پر مامور کیا کہ نیکی کی طاقت (یزدان) کے بنائے ہوئے بہشت کو جا کر تباہ کر ڈالے۔ یہ روایات یہودیوں کو اس زمانہ میں معلوم ہوئیں جب وہ بابل میں قید کے دن کاٹ رہے تھے۔

جس طرح نور اور سایہ لازم و ملزوم ہیں اسی طرح عنصر شر عنصر خیر کا مستلزم ہے۔ اس دنیا میں جس کا خالق اور حکمران خیر مطلق ہے شر کی توجیہ اگر کی جا سکتی ہے تو صرف اسی

طریقہ ہے۔ عنصر خیر و عنصر شر یعنی یزدان و اہرمن میں سے ہر ایک کے ماتحت مجوسیوں کے عقیدہ کے بموجب فرشتے اور وزیر اور فوجیں بھی تھیں۔ اس مسلک کی رو سے ہر نیک انسان کا فرض ہے کہ راستی، پاکبازی اور محنت کے اصول اختیار کرے۔ اسے یقین رکھنا چاہئے کہ اس کالبد خاکی کی قید سے آزاد ہونے کے بعد اسے عالم عقبیٰ میں زندگی عطا ہو گی اور وہ اسی جسم سے اٹھے گا اس کی روح کو بقائے ابدی حاصل ہو گی اور وہ فہم و ادراک کی نعمتوں سے مستفیض ہو کر حیات اخروی بسر کرے گا۔

سلطنت کے دور اخیر میں مجوسی عقاید زردشتی عقاید پر بتدریج بہت کچھ غالب آ گئے تھے۔ مجوسیت دراصل پرستش عناصر تھی۔ ان میں سے آگ کو خدائے برتر کی نیابت کا حق سب سے زیادہ حاصل تھا۔ ان کے آتش کدوں میں جو بجائے مسقف مندروں کے زیر سما قائم کئے جاتے تھے ہمیشہ آگ روشن رہتی تھی اور آفتاب بوقت طلوع انسانی پرستش کا مقصد اعظم سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح بادشاہ کے ہوتے ہوئے اور کسی پر نظر نہیں پڑ سکتی اسی طرح آفتاب کی موجودگی میں باقی تمام اجرام فلکی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور مستحق عبادت نہیں سمجھے جا سکتے۔

۳۲۳ ق ء میں سکندر اپنے بڑے بڑے منصوبوں کو ادھورا چھوڑ کر ۳۳ سال کی عمر میں بمقام بابل انتقال کر گیا۔ بعض لوگوں کو اس کی قبل از وقت موت سے شبہ ہوا کہ اسے زہر دے کر مار ڈالا گیا ہے۔ اس کی طبیعت ایسی چڑچڑی اور اس کا مزاج ایسا بے قابو ہو گیا تھا کہ اس کی فوج کے بڑے بڑے افسر یہاں تک کہ اس کے بے تکلف دوست اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کلائٹس کو جو اس کا رضاعی بھائی اور ساتھ کا کھیلا ہوا دوست تھا اس نے حالت غیظ و غضب میں خنجر بھونک کر مار ڈالا۔ کیلستھینز کو جو اس کے اور ارسطو کے درمیان علمی واسطہ تھا اس نے سولی دلوا دی یا جیسا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے اول شکنجہ میں جکڑ کر انواع و اقسام کے عذاب میں مبتلا کیا اور اس کے بعد مصلوب کیا۔ "ایسی حالت میں بعید از قیاس نہیں کہ محض اپنی جان بچانے کے خیال سے اس کے گردوپیش کے لوگوں نے اس کے قتل کی سازش کی ہو۔ ارسطو کی بھی اس سازش میں شرکت بیان کی جاتی ہے لیکن یقیناً" یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ ارسطو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ سو بار مرنا قبول کرتا لیکن ایسے سنگین جرم کے ارتکاب کے معین ہونے کا ہرگز روادار نہ ہوتا۔

سکندر کی آنکھیں بند ہوتے ہی خونریزی اور خانہ جنگی کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جو کئی سال تک فرو نہ ہوا اور اس وقت بھی جب کہ اس کے افسران فوج نے سلطنت کے حصے

ٹکڑے کر لیے اور ہر ایک نے ایک نئی اور خودمختار بادشاہت قائم کر لی اس فساد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس طوفان بے تمیزی میں جو قصے قضیے پیش آئے ان میں سے صرف ایک واقعہ ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ بطلیموس ارسینو نامی ایک حسینہ و جمیلہ خواص کے بطن سے شاہ فیلقوس کا بیٹا تھا اور اس لحاظ سے گویا سکندر کا علاتی بھائی ہوتا تھا۔ بچپن میں ایک دفعہ باپ نے خفا ہو کر دونوں کو جلاوطن کر دیا اور اس وقت سے وہ برابر سکندر کے ہمراہ رہا۔ کوئی ایسی جنگ یا مہم نہ تھی جس میں اس نے سکندر کا ساتھ نہ دیا ہو۔ وہ اول مصر کا گورنر اور بالآخر مطلق العنان فرمانروا ہو گیا۔

روڈس کے محاصرہ کے وقت بطلیموس نے وہاں کے باشندوں کی ایسی گراں بہا مدد کی کہ انہوں نے فرط امتنان سے اس کی تعظیم و تکریم دیوتاؤں کے برابر کی اور اسے سوٹر یعنی نجات دہندہ کا لقب دیا۔ مصر کے سلسلہ مقدونویہ کے فرمانروایان مابعد سے اس کو یہی لقب ممتاز کرتا ہے۔

بطلیموس سوٹر نے بجائے ان شہروں کے جو سابق میں مصر کا پایہ تخت رہ چکے تھے اپنا دارالحکومت اسکندریہ میں قائم کیا۔ جو پیٹر ایمن کے مندر کو جاتے وقت اسکندر نے اس شہر کی بنیاد یہ سمجھ کر ڈالی تھی کہ موقع کے لحاظ سے یہ شہر یورپ اور ایشیا کی تجارت کا مرکز اتصال ہو سکے گا۔ یہ امر خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نہ خود اسکندر نے بہت سے یہودیوں کو فلسطین سے لا کر یہاں آباد کیا اور نہ صرف بطلیموس سوٹر نے اور ایک لاکھ یہودیوں کو یوروشلم کے محاصرہ کے بعد یہاں لا بسایا بلکہ اس کے جانشین فلیڈلفس نے بھی ایک لاکھ اٹھانوے ہزار یہودی غلاموں کو ان کے مصری آقاؤں کو معقول زر فدیہ ادا کر کے آزاد کرا دیا۔ ان تمام یہودیوں کو وہ تمام مراعات و حقوق عطا کیے گئے جو خود مقدونویوں کو حاصل تھے۔ اس لطف و انصاف کے برتاؤ کی وجہ سے کثیر التعداد یہودی اور بہت سے اہل شام برضا و رغبت خود آ آ کر مصر میں آباد ہوتے گئے۔ ان لوگوں کو یونانی یہودیوں کا امتیازی لقب عطا کیا گیا۔ سوٹر کی فیاض اور مہربان حکومت کا شہرہ سن کر بیشمار یونانیوں نے بھی مصر کو اپنا ملجاو ماوا بنا لیا اور پرڈیکاس اور انٹیگونس کے حملوں سے یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی کہ یونانی سپاہی دوسرے مقدونوی سپہ سالاروں کی اطاعت سے منحرف ہو کر سوٹر کی فوج میں آ ملنے کے لئے بہ آمادگی تمام تیار ہیں۔

اس اعتبار سے اسکندریہ میں گویا تین مختلف قوموں کے لوگ آباد تھے یعنی دیسی مصری۔ یونانی اور یہودی۔ اور یہ وہ واقعہ ہے جس کا اثر موجودہ یورپ کے مذہبی عقاید میں

صاف نظر آتا ہے۔

یونانی معماروں اور انجینئروں نے اسکندریہ کو اپنی صنعت کے زور سے دنیائے قدیم کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر بنا دیا تھا۔ عالیشان محلوں، خوش نما مندروں اور دل آرا تماشگاہوں سے شہر کا کوئی حصہ خالی نہ تھا۔ وسط میں دو وسیع سایہ دار سڑکوں کے مقام اتصال پر جو ایک دوسرے کو زاویہ قایمہ پر قطع کرتی تھیں جھنوں فواروں اور مخروطی میناروں کے درمیان وہ شاندار مقبرہ کھڑا تھا جس میں مصریوں کی رسم کے موافق سکندر کی خنوط آلودہ نعش محو آرام تھی۔ سکندر کا جنازہ نہایت طمطراق اور شکوہ و جلال کے ساتھ دو سال کے ماتمی سفر کے بعد بابل سے لایا گیا تھا۔ اول اول تابوت طلائے خالص کا تھا لیکن چونکہ اس کی وجہ سے مقبرہ کو نباشوں کی دستبرد کا صدمہ سہنا پڑا لہٰذا بجائے طلائے احمر کے تابوت سنگ مرمر کا بنا دیا گیا۔ لیکن نہ تو فن تعمیر کے یہ نظر افروز اور دلفریب کرشمے اور نہ سفید سنگ مرمر کا وہ عظیم الشان مینارہ روشنی ہی ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا اور اس قدر بلند تھا کہ وہ آگ جو ہر وقت اس کی چوٹی پر جلتی رہتی تھی جہازوں کو میلوں سے نظر آتی تھی۔ مقدونوی فرمانروایان مصر کی اصلی و حقیقی اور سب سے زیادہ شاندار اور انمٹ یادگار عجائب خانہ اسکندریہ ہے جس کا اثر دنیا میں اس وقت تک قائم رہے گا جب کہ اہرام مصر کی بنیادوں کے سنگریزے تک پس کر گرد روزگار میں مل گئے ہوں گے۔

اس عجائب خانہ کی ابتدا بطلیموس سوٹر کے عہد میں ہوئی اور اس کے بیٹے بطلیموس فلیڈلفس نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ عجائب خانہ کی عمارت بروشین میں واقع تھی جو شاہی محل کے نزدیک شہر کے اس حصہ کا نام تھا جہاں امرا و اعیان دولت آباد تھے۔ یہ عمارت سنگ مرمر کی تھی اور اس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے تاکہ لوگ ان میں چہل قدمی کرتے ہوئے مکالمہ کا لطف اٹھا سکیں۔ اس کے کمروں میں سنگتراشی کی صنعت کے نمونے تھے۔ فلیڈلفس کا کتب خانہ تھا اور چاروں طرف نہایت ہی حسین مجسمے اور دلربا تصویریں قرینہ سے سجائی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بالآخر اس کتب خانہ میں چار لاکھ جلدیں جمع ہو گئیں اور جب رفتہ رفتہ مزید کتابوں کے رکھنے کی گنجائش باقی نہ رہی تو ایک اور کتب خانہ اسی کے قریب **سریپان** یعنی سرپلس کے مندر میں قائم کیا گیا۔ اس دوسرے کتب خانہ میں جو پہلے کتب خانہ کا بچہ کہلاتا تھا آخر میں تین لاکھ جلدیں جمع ہو گئیں۔ اس حساب سے گویا ان دونوں شاہی کتب خانوں میں سات لاکھ کتابیں موجود تھیں۔

اسکندریہ فقط مصر ہی کا پایہ تخت نہ تھا بلکہ عقل و ادراک کے لحاظ سے تمام دنیا کا مرکز حکومت تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل مشرق آ کر عقل مغرب سے ہم آغوش ہوئی۔ یہ قدیم زمانہ کا پیرس ہر طرح کی نشاط انگیز اوباشیوں اور تشکک آفرین آزاد خیالیوں کا نقطہ اتصال بن گیا۔ یہاں کی دلچسپ اور رنگین صحبتوں میں شریک ہو کر یہودیوں تک کے دلوں سے ولولہ حب وطن و جذبہ جوش قومی محو ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی زبان چھوڑ دی اور یونانی زبان اختیار کر لی۔

عجائب خانہ کے قیام سے بطلیموس سوٹر اور اس کے بیٹے فلیڈ لفیس کے پیش نظر تین مقصد تھے۔ (۱) علوم موجودہ کی بقاء (۲) اس کی ترقی اور (۳) اس کی اشاعت۔

(۱) علوم موجودہ کی بقا

سرکاری کتب خانہ کے صدر مہتمم کو حکم دیا گیا کہ جو کتابیں مل سکیں سرکاری خرچ سے خرید لی جائیں۔ عجائب خانہ میں کاتبوں کی ایک جماعت اس خدمت پر مامور تھی کہ جن کتابوں کے مالک انہیں فروخت نہ کرنا چاہتے ہوں ان کی صحیح نقلیں کریں۔ باشندگان ممالک غیر جب کوئی کتاب مصر میں لاتے تھے تو وہ فوراً" عجائب خانہ میں بھیج دی جاتی تھی اور نقل مطابق اصل ہونے کے بعد اصلی نسخہ کتب خانہ میں رکھ لیا جاتا تھا اور نقل مالک کتاب کے حوالہ کر دی جاتی تھی۔ بسا اوقات بیش قرار رقمیں معاوضہ یا ہرجانہ کے طور پر بھی دی جاتی تھیں۔ مثلاً" بطلیموس یور جیٹیز کے عہد کا واقعہ ہے کہ ایتھنس سے یوریپڈیز سفا قلس اور اسقلس کی تصانیف بہم پہنچا کر اس نے ان کی نقول کے ساتھ پندرہ ہزار ڈالر ہرجانہ کے طور پر اصل نسخوں کے مالکوں کے پاس بھجوا دیئے۔ شام کی مہم سے جب وہ واپس ہوا تو اکبتانا اور سوسا سے وہ تمام مصری یادگاریں فتح و نصرت کے شادیانے بجواتا ہوا ہمراہ لایا جنہیں کیقباد اور دوسرے ایرانی حملہ آور مصر سے لوٹ کر لے گئے تھے۔ ان یادگاروں کو اس نے یا تو ان کے اصلی مقامات پر نصب کرا دیا اور یا اپنے عجائب خانوں کے سامان آرائش پر اضافہ کیا۔ جب کسی تصنیف کا نقل کے ساتھ ترجمہ بھی ہوتا تھا تو ایسا بیش قرار معاوضہ دیا جاتا تھا کہ آج کل اس کا یقین کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بائبل کے نسخہ "سپچواجنٹ" کے ترجمہ کے لئے جو بطلیموس فلیڈ لفس کے حکم سے ہوا اسی طرح کا گراں قدر معاوضہ دیا گیا۔

(۲) ترقی علوم

عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام کی ایک بہت بڑی غرض یہ بھی تھی کہ سرکاری خرچ سے ایک ایسی جماعت اشخاص کی کفالت کی جائے جو یہاں رہ کر اپنے آپ کو تحصیل علم کے لیے وقف کر دیں۔ بسا اوقات خود فرمانروائے وقت بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتا تھا چنانچہ ان خوردنوش کی صحبتوں کے لطائف کی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ علمائے مقیم عجائب خانہ کو بلحاظ تکمیل علوم و فنون ابتدا" چار طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی (۱) ادب (۲) ریاضی (۳) ہیئت اور (۴) طب۔ فروعی علوم کو باعتبار مناسبت ان میں سے کسی ایک کے ساتھ شریک کر دیا گیا تھا مثلاً" علم حیوانات طب کی ایک شاخ قرار دیا گیا تھا۔ کسی سربر آوردہ عالم کو اس دارالعلم کے حاکم اعلیٰ کی خدمت دی جاتی تھی اور وہی اس کے جزو و کل کا انتظام کرتا تھا۔ اول اول اس عہدہ پر ڈمٹریس فلیرئس کا تقرر ہوا جو کئی سال تک ایتھنز کا گورنر رہ چکا تھا اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا۔ حاکم اعلیٰ کے ماتحت مہتمم کتب خانہ ہوتا تھا۔ اس خدمت پر بعض ایسے نامور اشخاص مقرر ہوئے جن کی فضیلت کی شہرت ہم تک پہنچی ہے۔ مثلاً ایراٹا ستھنیز اور اپالونئس روڈئس۔

عجائب خانہ کے متعلق ایک باغ نباتات اور جانور خانہ بھی تھا۔ ان کا مقصد جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ تھا کہ نباتات و حیوانات کے حالات کے اکتشاف میں مدد ملے۔ ایک رسدگاہ بھی قائم کی گئی جس میں فلکی کرے۔ سادہ کرے۔ دوایر متعلقہ انقلابات۔ صیفی وشتوی۔ دوایر استوائی۔ اصطرلاب۔ کواکب کے حقیقی و اعتباری مواقع کے مقیاس اور دوسرے مروجہ آلات ہیئت موجود تھے اور پیائش کے آلات درجوں اور درجے کے چھٹے حصوں میں منقسم تھے۔ رصد گاہ کے فرش پر ایک خط نصف النہار کھنچا ہوا تھا۔ وقت اور حرارت کا صحیح انداز کرنے کے لئے اگرچہ آلات موجود تھے مگر ان کے نامکمل ہونے کے باعث صحیح اندازہ لگانے میں دقت پیش آتی تھی۔ ٹیسبئس[19] کی آبی گھڑی سے ٹھیک وقت دریافت نہ ہو سکتا تھا اور حرارت کے درجات کی دریافت کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ بائیات کے وزن دریافت کرنے کا آلہ پانی کے کٹورے میں تیرتا رہتا تھا اور پانی کی لطافت یا کثافت سے حرارت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ فلیڈلفس کو اخیر اخیر میں موت کی طرف سے سخت خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے بہت سا وقت اکسیر حیات کی تلاش میں صرف کیا۔ اس قسم کے مشاغل کے لئے عجائب خانہ میں ایک کیمیا خانہ قائم کیا گیا تھا۔ اس زمانہ کے مخالفانہ خیالات کے باوجود طب کے صیغہ کے متعلق علم تشریح کی تحقیقات کی غرض سے ایک کمرہ چیرنے پھاڑنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور اس کمرے میں نہ فقط مردوں کی

بلکہ ان زندوں کی بھی چیر پھاڑ کی جاتی تھی جن کی نسبت کسی جرم سنگین کی پاداش میں سزائے موت کا حکم ہو چکا ہوتا تھا۔

(۳) اشاعت علوم

عجائب خانہ میں معلومات انسانی کے ہر شعبے پر لکچر دیئے جاتے تھے یا مباحثے ہوتے تھے یا درس و تدریس کا کوئی اور موزوں طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ علوم و فنون کے اس عظیم الشان مرکز میں اطراف و اکناف عالم سے طالب العلم جوق جوق آتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ اس دارالعلوم کے طلبہ کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بعد میں کلیسائے عیسوی تک کے بعض سربرآوردہ پیشوا مثلاً کلینس اگزنڈرینس۔ آریجن اور اتھینیس یہیں سے تعلیم پا کر نکلے۔

اس عجائب خانہ کے متعلق جو کتب خانہ تھا اسے جولئس سیزر نے محاصرہ اسکندریہ کے وقت جلوا دیا۔ اس نقصان عظیم کی تلافی کے لیے مارک انٹونی نے یو مینیز شاہ پر گیمس کا جمع کیا ہوا کتب خانہ ملکہ کلیوپیٹرا کی نذر کیا۔ ابتدائے یہ کتب خانہ بطلیموسی کتب خانہ کی مسابقت کے خیال سے قائم کیا گیا تھا۔ جب یہ کلیوپیٹرا کے ہاتھ لگا تو سرپکلس کے کتب خانہ میں ضم کر دیا گیا۔

اب ہم کو مختصراً یہ بیان کرنا باقی رہتا ہے کہ یہ بے نظیر دارالعلم جس کو قدما نے ازراہ فخر "مدرسہ ایہ اسکندریہ" کا نام دے رکھا تھا کس فلسفہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا اور انسانی معلومات کے ذخیرے میں جن جن باتوں کا اس کی وجہ سے اضافہ ہوا ان میں سے بعض کی نوعیت کیا تھی۔

ہمارا فرض ہے کہ اس بے مثال عجائب خانہ کے جلیل القدر بانی کی یادگار میں ہم "تاریخ فتوحات اسکندر" کو جو خود اسی کی تصنیف ہے تصانیف علمی کی صف اول میں جگہ دیں۔ بطلیموس سوٹر جس طرح ایک بہت بڑا سپہ سالار اور ایک بہت بڑا تاجدار تھا اسی طرح ایک بہت بڑا مصنف بھی تھا۔ زمانہ ان احسانات کی یاد کو نہیں مٹا سکا جو اس نے ہم پر کئے ہیں۔ مگر اس کی تصنیف کے ساتھ اس نے اچھا برتاؤ نہیں کیا اس لئے کہ "تاریخ فتوحات سکندر" کا ایک بھی نسخہ آج موجود نہیں۔

سکندر بطلیموس اور ارسطو کی باہمی دوستی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فلسفہ مشائیہ عجائب خانہ اسکندریہ کا عقلی سنگ بنیاد قرار پائے۔ شاہ فیلقوس نے سکندر کی تعلیم و تربیت پر ارسطو کو

مامور کیا تھا جس نے اپنا یہ اثر دکھایا کہ جب سکندر ایران کی تسخیر میں معروف تھا تو باوجود انہماک مشاغل فوجی کے روپیہ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے کتاب "علم خواص الاشیاء" کی تیاری میں ارسطو کی مدد کرتا رہا جو اس وقت لکھی جا رہی تھی۔

ارسطو کے فلسفہ کا اصل اصول یہ تھا کہ جزئیات کے مطالعہ سے بذریعہ استقرا کلیات اخذ کئے جائیں جن واقعات و حقائق پر عمل استقرا کا انحصار ہے ان کی تعداد جس قدر زیادہ ہو گی اسی قدر یہ عمل زیادہ صحیح اور زیادہ قرین وثوق ہو گا۔ اسی طریقہ سے بذریعہ تجربہ و مشاہدہ واقعات کے جمع کرنے میں بے انتہا محنت پڑتی ہے اور ساتھ ہی واقعات مجتمعہ سے نتائج نکالنے میں بہت کچھ غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ طریقہ گویا عقل و محنت پر مبنی ہے نہ کہ تصور و تخیل پر۔ خود ارسطو سے بسا اوقات جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں وہ اس طریقہ کی بے اعتباری پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ اس کے معتبر ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ ان غلطیوں کا اصلی باعث صرف یہی ہے کہ کلیہ قائم کرنے میں جن واقعات سے کام لیا گیا وہ تعداد میں ناکافی تھے۔

ارسطو کے قائم کئے ہوئے بعض کلیات نہایت پرشکوہ ہیں مثلاً" ایک کلیہ اس نے یہ قائم کیا کہ ہر شے حیات کے سانچہ میں ڈھلنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے اور تماشاگاہ فطرت میں جو مختلف اعضائی صورتیں اور شکلیں ہمیں نظر آتی ہیں یہ حالات و کیفیات موجودہ کے مقتضیات کی تابع ہیں۔ اگر حالات و کیفیات بدل جائیں تو صورت و اشکال میں بھی تبدیلی پیدا ہو جائے۔ پس اس طور پر ہستی کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جو نباتات و حیوانات سے ہوتا ہوا انسان تک پہنچتا ہے اور موالید کی مختلف جماعتیں ایک دوسرے میں بتدریج اس طرح ضم ہوتی ہوئی چلی جاتی ہیں کہ حدود انضمام محسوس نہیں ہوتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ استقرائیہ جس کی ایجاد کا فخر ارسطو کو حاصل ہے ایک بہت بڑا زبردست طریقہ ہے اور جو ترقی سائنس نے اس وقت تک کی ہے وہ اسی کی شرمندہ احسان ہے۔ یہ فلسفہ جب تکمیل کو پہنچا تو مظاہر سے ان کے اسباب و علل کا استقرا کیا جانے لگا اور اسباب کے دریافت ہونے کے بعد بہ اتباع طریقہ اشراقیہ سبب سے مسبب کی تفصیل مستنبط ہونے لگی۔

اس طور پر اسکندریہ میں عقلیات کی بنیاد جہاں ایتھنز کے ایک نامور حکیم کے اصولوں پر رکھی گئی اخلاقیات کا سہرا بھی ایتھنز ہی کے ایک دوسرے مشہور حکیم کے سر رہا۔ اس حکیم کا نام زینو تھا جس کی اصل اگرچہ قبرس یا فنیشیا سے تھی لیکن کئی سال سے اس

نے مستقل طور سے یونان کے پایہ تخت ہی میں بودوباش اختیار کر لی تھی۔ اس کے شاگرد "اسٹوئک" (جبریہ) کے نام سے مشہور تھے۔ اس کے عقاید اسکے مرنے کے بعد مدتوں قائم رہے اور مصیبت کے وقت میں جب انسان کا بجز بیکسی کے اور کوئی یارومددگار نہیں ہوتا اس کے لیے سرمایہ تسکین و تسلی ثابت ہوئے اور نہ صرف مشاہیر یونان بلکہ رومتہ الکبری کے جلیل القدر حکیموں، مدبروں، سپہ سالاروں اور فرمانرواؤں کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتے رہے۔

زینو کا مقصد یہ تھا کہ روزانہ زندگی کے لیے ایک دستور العمل مقرر کیا جائے جس کی بدولت انسان برائی بھلائی میں تمیز کر سکے اور کوشش کی جائے کہ انسان نیک چلن ہو جائیں۔ اس کا قول تھا کہ تعلیم نیکی کی اصلی بنیاد ہے اس لیے کہ اگر آدمی کو معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا شے ہے تو وہ خواہ مخواہ اس کی طرف مائل ہو گا۔ علم کا مواد بہم پہنچانے کے لیے ہمیں اپنے حواس پر بھروسا کرنا چاہیے۔ باقی رہا اس مواد کی تالیف و ترتیب کا کام سو اس کی ذمہ دار عقل ہے۔ اس بارہ میں زینو اور ارسطو کا اتفاق رائے بداہتہ پایا جاتا ہے۔ ہر خواہش یا شہوت یا آرزو ناقص علم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہماری جبلت یا طبیعت تو مقدرات سے ہے لیکن یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے جذبات کو روکیں اور عقل کی پابندی کے ساتھ آزادانہ فہیمانہ اور پاکبازانہ زندگی بسر کرنا سیکھیں۔ ہماری زندگی ہماری دماغی قوتوں کی مطیع ہونی چاہیے اور زمانہ کے رنج و راحت سے نہ کبیدہ خاطر و بددل ہونا چاہیے نہ مسرور و خرم بلکہ قلب میں سکون و طمانیت کی کیفیت پیدا کرنی چاہیے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہم آزاد ہیں۔ اپنے ابنائے جنس کے غلام نہیں ہیں۔ ہمارے پاس ایک بیش قیمت خزانہ ہے جو تمام دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو ہم سے نہیں چھین سکتی اور وہ خزانہ موت ہے۔ ہمیں یہ امر نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ فطرت اپنے عمل درآمد میں عام نتائج کو پیش نظر رکھتی ہے اور افراد کے بچانے کی کبھی فکر نہیں کرتی بلکہ انہیں اپنے مقاصد عامہ کی تکمیل کا آلہ قرار دیتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کریں اور نیکی اعتدال صبر تحمل انصاف اور علم کے اکتساب میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ عالم متغیر ہے۔ فنا کے بعد بقا اور بقا کے بعد فنا لازمی ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں ہر شے مر رہی ہے اور مرے گی موت سے ڈرنا یا اس پر کڑھنا فضول ہے۔ جس طرح ہر سال آبشار کی ایک ہی صورت رہتی ہے لیکن جس پانی سے یہ مرکب ہے وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اسی طرح قدرت کی نمود سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ

خود بخود

مادہ کی ایک سیل ہر وقت بہ رہی ہے جس کے وجود کو بقا ہے لیکن شکل آنی و فانی ہے۔ کائنات بحیثیت مجموعی ناقابل تغیر ہے۔ بجز فضا اجزائے لا تیجزی اور قوت کے اور کسی شے کو بقا نہیں۔ فطرت کی صورتیں جو ہمارے پیش نظر ہیں چند روزہ ہیں اور ضرور ہے کہ گذر جائیں۔

ہمیں اس واقعہ کی طرف سے خالی الذہن نہ ہونا چاہئے کہ اکثر انسانوں کی تعلیم ناقص ہوتی ہے۔ اس لئے ہم کو اپنے زمانہ کے مذہبی عقاید کے خلاف بے ضرورت کوئی بات نہ کہنی چاہئے۔ خود ہمارے لئے یہ جان لینا کافی ہے کہ اگرچہ ایک ایسی قوت ضرور موجود ہے جو ہر ایک لحاظ سے کامل و مکمل ہے لیکن کسی ہستی کاملہ کا وجود مطلق نہیں۔ ایک غیر مرئی جوہر کے وجود میں تو کلام نہیں لیکن یہ کہنا کہ ایک ایسا شخص یا ذاتی خدا موجود ہے جس میں انسان کی صورت اور جذبات اور احساسات پائے جاتے ہیں اتنا باعث کفر نہ ہو گا جتنا موجب لغویت۔ الہام و تنزیل کی وقعت ایک ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں۔ جس شے کو انسان اتفاق یا حادثہ سے تعبیر کرتا ہے اسے ایک غیر معلومہ علت کا معلول سمجھنا چاہئے۔ اتفاقات و حوادث تک ایک مقررہ ضابطہ کے پابند ہیں جس سے وہ سرمو تجاوز نہیں کر سکتے۔ تائید ایزدی یا شان ربانی جس قوت کا نام رکھا گیا ہے اس کا مطلق کہیں وجود نہیں۔ اس لئے کہ قدرت کا طرز عمل اٹل اور امٹ قوانین کا تابع ہے اور اس لحاظ سے کائنات گویا ایک بہت بڑی کل ہے جو خودبخود چل رہی ہے۔ نظام کائنات کی رگ و پے میں جو زندہ طاقت ساری دواری ہے اسے جہلا خدا کہتے ہیں۔ وہ انقلابات اور تغیرات جن کا اثر ہر شے پر پڑتا ہے کسی طرح ٹل نہیں سکتے اور اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ترقی بپابندی قضا و قدر ایک بیج کی طرح ہے جو صرف اسی طریقہ پر اگ سکتا ہے جو اس کے لئے پہلے سے معین کر دیا گیا ہے۔[۱۵]

انسان کی روح شعلہ حیات کائنات کی ایک چنگاری ہے۔ حرارت کی طرح اس کا نفوذ ایک جسم سے دوسرے جسم میں ہوتا رہتا ہے اور بالآخر اس کا انضمام یا انجذاب اس جوہر کلی میں ہو جاتا ہے جس سے اس کا انفصال ہوا تھا۔ اس لئے ہم کو عدم یا فنائے محض کا اندیشہ نہ کرنا چاہئے بلکہ انجذاب یا اتصال کا یقین رکھنا چاہئے اور جس طرح تھکا ہوا آدمی اس غفلت کی تمنا کرتا ہے جو نیند سے ہم آغوش ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی طرح فلاسفہ کو چاہئے کہ مکروہات دنیا سے تنگ آ کر اس حالت مطمینہ کو اپنا مطمح نظر قرار دیں جو اس خاکدان کی قید سے آزاد ہونے کے بعد میسر ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ باتیں ایسی ہیں جن پر

غور کرتے وقت ہمیں ہر ہر قدم پر شبہ و شک سے کام لینا چاہیئے اس لئے کہ دماغ اپنے اندرونی ذرائع معلومات ہی سے حقیقت اشیاء سے مطلع نہیں ہو سکتا۔ علل اولی سے بحث کرنا خلاف شیوہ حکما ہے۔ ہمیں صرف مظاہر یعنی ان واقعات سے سروکار رکھنا چاہیئے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ سب سے زیادہ ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ انسان کے لئے حقیقت مطلق کا انکشاف محال ہے۔ مادہ کے متعلق انسانی تحقیقات کا انتہائی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کامل العلم ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ اگر اسے علم کامل حاصل ہو بھی جائے تو اس کے پاس کوئی معیار موجود نہیں جس کی بنا پر اسے اپنی معلومات کے صحیح و کامل ہونے کا یقین ہو سکے۔

ان تمام باتوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لئے باقی کیا رہا؟ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ تحصیل علم کی کوشش کریں۔ نیکی اور پاکبازی کو اپنا شعار قرار دیں۔ اپنے ابنائے جنس سے دوستانہ برتاؤ رکھیں۔ ایمانداری اور راستبازی کو ہاتھ سے نہ دیں۔ جو کچھ پیش آئے اس کو صبر و رضا کے ساتھ گوارا کریں اور ایسی زندگی بسر کریں جو ہر اعتبار سے عقل کے احکام کی پابند ہو۔

اگرچہ عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام کا مقصد خاص فلسفہ مشائیہ کی اشاعت و ترویج تھا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دوسرے مذاہب فلسفہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ عجائب خانہ کی بدولت فلسفہ اشراقیہ نہ صرف حد کمال تک پہنچا بلکہ آخر میں ارسطو کی حکمت کا ناسخ ثابت ہوا اور جدید اکاڈمی کے ذریعہ سے عیسائیت پر ایک مستقل اور دیرپا اثر چھوڑتا گیا۔ فلاطون کا فلسفیانہ طریقہ ارسطو کے طریقہ کی ضد تھا یعنی اس میں ابتدا کلیات سے کی جاتی تھی جس کا وجود ہی مذہبی اعتقادات کی طرح قیاسی ہے اور کلیات سے جزئیات یا تفصیلات کا استخراج کیا جاتا تھا۔ بخلاف اس کے ارسطو استقراء کے عمل کی وساطت سے جزئیات سے کلیات تک پہنچتا تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ افلاطون کے مذہب کی بنیاد تخیل پر تھی اور ارسطو کی تعقل پر۔ فلاطون ایک ابتدائی خیال کو سامنے رکھ کر اس کے تجزیہ سے اس کی تفصیلات تک پہنچتا تھا اور ارسطو جزئیات و تفصیلات سے نتائج استخراج کر کے ایک کلیہ قائم کرتا تھا۔ اسی لیے افلاطون کے طریقے سے بہت جلد بظاہر نہایت شاندار مگر دراصل ناقابل اعتبار نتائج پیدا ہو جاتے تھے حالانکہ ارسطو کے طریقہ سے اگرچہ نتائج دیر میں نکلتے تھے اور ان کے استخراج میں بے انتہا دقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن ہوتے بہت زیادہ محکم اور دیرپا تھے۔

ان نتائج کے استخراج کے لئے واقعات کے جمع کرنے میں جس کنج کاوی اور دیدہ ریزی سے کام لینا پڑتا تھا اور تجربہ اور مشاہدہ میں جو جانکاہی اور عرقریزی گوارا کرنی پڑتی تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ فلاطون کا فلسفہ گویا ایک شاندار قلعہ ہے جس کی بنیاد ہوا پر ہے اور ارسطو کی حکمت ایک مضبوط اور سنگین عمارت ہے جو بہت سی محنتیں برداشت کرنے اور بہت سی ناکامیوں کا رنج اٹھانے کے بعد ایک ٹھوس اور مستحکم چٹان پر بنائی گئی ہے۔

قوتِ متخیلہ سے کام لینا بمقابلہ قوت عقلیہ کے عمل میں لانے کے کہیں زیادہ دلآویز ہے۔ جب اسکندریہ کے عقلی انحطاط کا دور آیا تو مشاہدہ کی دیدہ ریزیوں اور فکر و غور کی جانکاہیوں کے بجائے طبیعتیں زیادہ تر سہل اور آسان طریقوں کی طرف رجوع ہو گئیں۔ فلسفہ اشراقیہ جدید[22] کے مدرسوں میں امونیس[23] سیکاس اور پلاٹینس[24] جیسے تخیل پرست متکلمین کا ہجوم نظر آنے لگا۔ خدا کی شان ہے کہ قدیم عجائب خانہ کے جفاکش مہندسوں کے جانشین ایسے لوگ بنیں جنھوں نے فلسفہ کو بازیچہ اطفال سمجھ رکھا ہو۔

دارالعلم اسکندریہ اس طریقہ کی پہلی مثال پیش کرتا ہے جس نے زمانہ حال کے ماہرین علم طبیعیات کے ہاتھ میں آکر ایسے حیرت خیز نتائج پیدا کئے ہیں۔ اس طریقہ کے اختیار کرنے والوں نے وہمی و خیالی باتوں سے ابا کیا اور اپنے مفروضات و نظریات کو ان واقعات و حقائق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا جو مہندسانہ ثبوت کی تائید سے تجربہ اور مشاہدہ کی بدولت حاصل ہوئے تھے۔ انہوں نے اس اصول کو عام طور سے رواج دیا کہ صحیفہ فطرت سے حقائق کے اقتباس کرنے کا صحیح طریقہ عملی تجربہ ہے۔ ارشمیدس کی تحقیقات اشیاء کے وزن مخصوص کے متعلق اور بطلیوس کی تصانیف مناظر و مرایا کے موضوع پر ہمارے آج کل کے عملی فلسفہ کے اکتشافات سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں اور زمانہ مابعد کے مصنفین کی فرضی و قیاسی مہملات کی طرف انگشت حقارت سے اشارہ کر رہی ہیں۔ لیپلس[25] کہتا ہے کہ دارالعلم اسکندریہ کے قیام سے پہلے یونانیوں نے علم ہیئت کے متعلق اگر کوئی عملی کام کیا تو وہ یہ تھا کہ ۴۳۲ ق م میں میٹن اور یوکٹیمن نے نقطہ انقلاب صیفی کا مشاہدہ کیا۔ دارالعلم اسکندریہ ہی میں پہلی مرتبہ ہم کو اس امر کی مثال ملتی ہے کہ جو مشاہدات کئے گئے ان میں زاویوں کی پیمائش کے آلوں اور علم مثلث کے اصولی طریقہ حساب سے کام لیا گیا۔

نہ تو اس کتاب میں اتنی گنجائش ہے اور نہ اس کا موضوع اجازت دیتا ہے کہ عجائب خانہ اسکندریہ نے معلومات انسانی میں جو جو اضافے کئے ان کا یہاں مفصل ذکر کیا جائے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا منشا صرف اسی قدر ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے کو ان ترقیات کی عام نوعیت کا اندازہ ہو جائے۔ اگر تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب "ہسٹری آف دی انٹیلکچوئل ڈیولپمنٹ آف یورپ" (یورپ کے دماغی نشوونما کی تاریخ) کا چھٹا باب ملاحظہ فرمایا جائے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حکیم زینو کے فلسفہ میں حقیقت مطلق کے ادراک کے متعلق شک ظاہر کیا گیا ہے۔ ادہر زینوان شکوک و شبہات میں گرفتار تھا ادھر اقلیدس اپنی اس معرکتہ الارا تصنیف کی تیاری میں مصروف تھا جو تمام دنیا کے مقابلہ میں کوس تحدی بجا کر بنی نوع انسان کو یہ دعوت دینے والی تھی کہ اگر دعوی ہے تو مجھ میں کوئی نقص نکالو۔ بائیس صدیوں کے گزرنے کے بعد بھی یہ کتاب صحت، سلاست۔ صفائی، اکملیت، اثبات اور استقرائے تام کا ایک عدیم النظیر نمونہ ہے۔ اس مہندس اعظم کی تصانیف نہ صرف ریاضی کی دوسری شاخوں مثلاً" فصول مخروطی یا اشکال کثیر النتائج میں پائی جاتی ہیں بلکہ علم الاصوات اور علم مناظرو مرایا پر بھی بعض رسائل ایسے ہیں جو اس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مناظرو مرایا میں اس نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ شعاعیں آنکھ سے نکل کر اشیائے مرئیہ پر پڑتی ہیں۔

ارشمیدس نے اگرچہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں سسلی میں جا کر اقامت اختیار کر لی تھی لیکن اس کا شمار بھی اسکندریہ ہی کے ماہرین علم ہندسہ و طبیعات کے زمرہ میں کرنا چاہئے۔ ریاضی میں اس نے دو کتابیں کرہ اور اسطوانہ کی ماہیّت پر لکھی ہیں۔ ان تصانیف میں اس نے ثابت کیا ہے کہ ہر ٹھوس کرہ کا جسم مقدار میں اس اسطوانہ کی مقدار کا دو ثلث ہوتا ہے جو اس کا محیط ہو۔ اس اکتشاف پر اسے اس قدر ناز تھا کہ مرتے وقت اس نے یہ وصیت کی کہ یہ شکل اس کی قبر کے تعویذ پر کندہ کی جائے۔ دائرہ اور شکل قریب الیفوی کی تربیع پر بھی اس نے بحث کی ہے۔ اس کا ایک رسالہ اشکال مثل مخروط و مثل کرہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اس چکردار شکل کو بھی اس نے اپنی عقل دقیقہ سنج کی موشگافی کا موضوع قرار دیا ہے جو اس کے نام سے مشہور ہے اور جس کا خیال اس کے ذہن میں اول اول اس کے دوست کانن نے اسکندریہ میں پیدا کیا تھا۔ ان کے بعد اس پایہ کا مہندس یورپ دو ہزار سال تک پیدا نہ کر سکا۔ طبیعات میں اس نے مائیات کی بنا ڈالی۔ وزن مخصوص کے دریافت کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ پانی پر تیرتی ہوئی اشیا کے توازن یعنی مرکز ثقل پر بحث کی۔ بیرم کی ماہیّت کا پتہ لگایا اور دریائے نیل سے پانی کھینچنے کے لئے ایک پیچ

کی شکل کا آلہ ایجاد کیا جو ابھی تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ غیر متناہی پیچ اور نیز وہ شیشہ آتشی جس سے سایراکیوز کے محاصرہ میں اس نے اہل روما کے جہازوں کا بیڑہ جلا دیا اسی کی ایجادات میں داخل ہیں۔

ایراٹا ستھنیز بھی جو ایک وقت میں کتب خانہ کا صدر مہتمم تھا بہت سی اعلیٰ درجہ کی تصانیف کا مصنف تھا۔ خطوط سرطان و جدی کا درمیانی فاصلہ اسی نے دریافت کیا اور زمین کی جسامت کے معلوم کرنے کی کوشش بھی اول اول اسی نے کی۔ برا عظموں کے جوڑ اور پھیلاؤ۔ پہاڑوں کے سلسلوں کے مقامات وقوع۔ بادلوں کے عمل۔ طبقات الارض کی غرقابی۔ ڈوبے ہوئے طبقات کے ابھار۔ آبنائے در دانیال و جبل الطارق کے افتتاح اور بحیرہ اسود کے تعلقات پر اس کے مباحث موجود ہیں۔ اس نے حالات ارضی پر ایک مکمل کتاب تین مقالوں میں لکھی تھی۔ پہلے مقالہ میں طبیعیات سے بحث تھی دوسرے میں ریاضیات سے تیسرے میں تاریخ سے۔ اس کتاب کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر ان ممالک کا ایک نقشہ بھی شامل تھا جو اس وقت تک معلوم ہو چکے تھے۔ اس کی "تاریخ شاہان تھبیز" کے بعض اجزا زمانہ کی دستبرد سے بچ رہے ہیں اور چند سال سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے ہیں ورنہ صدہا سال تک تو ہماری موجودہ دینی تاریخ کے مقابلہ میں جس کی حیثیت ایک مجموعہ لغویات سے زیادہ نہیں ان پر اعتنا ہی نہ ہوا۔

اس مقام پر ان دلائل کا بیان کرنا ضرور نہیں ہے جو سکندریہ کے علما نے زمین کو گول ثابت کرنے کے لئے اختیار کیں۔ ان لوگوں کو کرہ زمین۔ قطبین محور زمین۔ خط استوا۔ دائرہ قطب شمالی۔ دائرہ قطب جنوبی۔ نقاط اعتدال لیل و نہار۔ نقاط انقلاب صیفی و شتوی۔ سردی اور گرمی کی تقسیم اور مسائل متعلقہ کا صحیح صحیح طور پر علم تھا۔ یہاں صرف اپالو نیس کی ان تصانیف کا نام ہی لیا جا سکتا ہے جو اس نے فصول مخروطی اور مقادیر اکثر و اقل پر قلمبند کی تھیں۔ الفاظ "ا یلپس" (شکل اہلیلجی یعنی وہ شکل جو کسی جسم مخروطی کو ترچھا تراشنے سے پیدا ہوتی ہے) اور "ہائی پربلا" (شکل بعید الیقنوی) کا اول اول اسی نے استعمال کیا۔ ارسطیلس اور تماکرس کی رصدبنی کا ذکر بھی بوجہ قلت گنجائش یہاں اچٹتا ہوا ہی کیا جا سکتا ہے۔ استقبال نقاط اعتدال لیل و نہار کا عظیم الشان انکشاف جو ہپارکس نے کیا ہے تماکرس ہی کے ہیئتی مشاہدات پر مبنی تھا۔ قمر کی عدم مساوات اولین اور مساوات مرکز کی تحقیقات بھی ہپارکس نے کی ہے۔ حرکت دواری کے اصول پر اجسام فلکی کی بظاہری گردش کی تشخیص کے لئے اس نے وہ مہندسانہ طریقہ ایجاد کیا جس میں دو غیر مساوی

دائروں سے اس طرح کام لیا جاتا ہے کہ چھوٹے دائرہ کا مرکز ہمیشہ بڑے دائرہ کے محیط پر گردش کرتا رہے یا دو مختلف المرکز دوائر ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔ اس نے ستاروں کی ایک فہرست بھی ایک خاص طریقہ کے مطابق تیار کی تھی جس کی رو سے وہ ستارے جو بظاہر ایک خط مستقیم میں نظر آتے ہیں درج فہرست کئے گئے ہیں۔ جن ستاروں کا فہرست میں اس طور اندراج ہوا وہ شمار میں 1080 ہوتے تھے۔ آسمان کی طرح اس نے زمین کے متعلق بھی اسی طرح کی کنج کاوی کی تھی۔ یعنی عرض بلد اور طول بلد کے خط کھینچ کر دیار و امصار اور دوسرے مقامات کی نشاندہی کی تھی۔ شمس و قمر کی میزانیں بھی اول اول اسی نے تیار کی تھیں۔

مہندسین۔ منجمین اور طبیعیین کے اس جلیل القدر گروہ کی فہرست میں بطلیموس کا نام ہمیں نور کے حرفوں میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی شہرہ آفاق کتاب **"سنٹکسس"** (یعنی عالم بالا کی مہندسانہ ساخت) ڈیڑھ ہزار سال تک ہیئت کے متعلق دنیا کا ستور العمل بنی رہی اور نظام بطلیموسی کا چراغ صرف اس وقت گل ہوا جب کہ نیوٹن نے اپنی غیرفانی تصنیف **"پرنسپیا"** لکھ کر اس مسند کو زینت دی جو پندرہ صدیوں تک "سنٹکس" کے مصنف کے لئے وقف رہی تھی۔ بطلیموس کی کتاب کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ زمین گول ہے اور فضائے بسیط میں قائم ہے۔ اس میں میزان الاوتار کے بنانے کی ترکیب اور ان آلات کا حال مندرج ہے جن سے نقاط انقلاب صیفی وشتوی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ محققانہ بحث کے بعد اصول اعوجاج طریق الشمس کا استخراج کیا ہے۔ علم یا جیب کے ذریعہ سے ارضی عرض بلد نکالنے کا طریقہ بتایا ہے۔ موسموں کا حال بیان کیا ہے۔ معمولی وقت کو کبی وقت میں تحویل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ کوکبی سال پر انقلابی سال کو ترجیح دینے کی وجوہ بیان کی ہیں۔ نظام شمسی کا ذکر کرتے ہوئے اس اصول کی توضیح کی ہے کہ وہ دو ائرجن میں سیارے آفتاب کے گردگردش کرتے ہیں مختلف المرکز ہیں۔ مساوات وقت کے اصول کی تشریح کی ہے۔ قمر کی حرکات پر بحث کرتے ہوئے اس کی عدم مساوات اولین اس کے گہن اور اس کے نقطہ راس و ذنب کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد خود بطلیموس کے عظیم الشان انکشاف یعنی قمر کی عدم مساوات ثانیہ پر بحث کرتے ہوئے جس نے بطلیموس کے نام کو فنا کے رہین منت ہونے سے بچا لیا اسے اس مہندسانہ اصول کا تابع کیا گیا ہے۔ جس کے بموجب دو غیر مساوی دائروں میں سے چھوٹا دائرہ اپنے مرکز کو بڑے دائرہ کے محیط پر رکھ کر اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ پھر زمین سے سورج اور چاند کا فاصلہ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے

لیکن اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ آگے چل کر ہپارکس کی تحقیقات یعنی استقبال نقاط اعتدال لیل و نہار کا بیان کیا ہے جس کا مکمل زمانہ پچیس ہزار سال ہے۔ بالآخر 1022 ستاروں کی فہرست مرتب کی گئی ہے اور کہکشاں کی نوعیت پر نظر انتقاد ڈالنے کے بعد سیاروں کی حرکت پر نہایت محققانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور امر جس نے بطلیموس کی علمی شہرت کے استحقاق کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے یہ ہے کہ سیاروں کے مدار کی تعین میں وہ ہیئت داناں ازمنہ ماضیہ کے ترصدات سے اپنے مشاہدات کا مقابلہ کرنے کے بعد اسے قائم کرتا ہے۔ چنانچہ زہرہ کے مدار کو معین کرتے وقت اس نے تماکرس کے مشاہدات کو پیش نظر رکھا ہے۔

عجائب خانہ اسکندریہ میں ٹیسیبس نے آتشین انجن ایجاد کیا تھا۔ اس کے شاگرد ہیرو نے دواسطوانون کے اضافہ سے اسے ترقی دی۔ اول اول دخانی انجن سے بھی کام یہی کام لیا گیا کہ وہ بھی ہیرو کی ایجاد سے تھا اور ایک خاص ترکیب سے چلایا جاتا تھا جو یہ تھی کہ دہات کے ایک کھوکھلے گولے میں جس میں ایک چھوٹا سا منفذ ہوتا تھا پانی بھر دیا جاتا تھا اور نیچے آنچ پہنچائی جاتی تھی۔ حرات پہنچنے پر پانی بھاپ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا تھا اور بھاپ کے زور سے گولا گردش کرنے لگتا تھا جس سے انجن چلنے لگتا تھا۔ سرپلس کے ایوانوں کی خموشی میں ٹیسیبس اور اپالونیئس کی آبی گھڑیاں خلل ڈالتی تھیں جن میں سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے تھے اور وقت کا اندازہ کرتے جاتے تھے۔ جب رومتہ الکبری کی تقویم اس قدر ناقص ہو گئی کہ سال و ماہ کے حساب میں ہروقت غلطیاں ہونے لگیں تو جولیس سیزر نے اس کی اصلاح کے لئے سلسجنیز ہیئت دان کو اسکندریہ سے طلب کیا۔ چنانچہ اس کے مشورہ کی بنا پر قمری سال منسوخ کیا گیا اور سرکاری سال شمسی قرار پایا اور اس وقت سے وہ تقویم رائج ہو گئی جو جولیس سیزر کے نام سے منسوب ہے۔

مصر کے مقدونوی فرمانرواؤں کو اس برتاؤ کے لحاظ سے جو انہوں نے اپنے زمانہ کے مذہبی عقائد کے ساتھ کیا موردالزام قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کا آلہ بنایا یعنی جہلا اور عوام پر اس کے ذریعہ سے اپنا شاہانہ اقتدار قائم رکھا اور جو سمجھ بوجھ رکھتے تھے ان کی تشفی فلسفہ سے کر دی۔ لیکن بلاشبہ ان کے اس طرز عمل کا موید وہ تجربہ تھا جو یونانیوں کو اپنی ایشیائی فوج کشی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا اور جس کی بدولت وہ اقوام عالم میں ممتاز و سربرآوردہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آبائی وطن کی مذہبی روایات کے بوسیدہ طلسم کو اپنی آنکھو ٹوٹتا ہوا دیکھ چکے تھے اور ان عجائبات کی ظلمت کو

جن کا پردہ قدیم شاعروں کے تخیل نے بحر روم کے اطراف و جوانب پر ڈال رکھا تھا تجربہ اور معلومات کی تیز روشنی کے سامنے کافور ہوتے ہوئے مشاہدہ کر چکے تھے۔ اولمپس کی پراسرار چوٹیوں سے دیوتا غائب ہو چکے تھے اور دیوتا تو ایک طرف رہے خود اولمپس کا وجود ایک وہمی و فرضی فسانہ سے زیادہ ثابت نہ ہوا تھا۔ ہیڈیز کے خوفناک نظاروں کا نقش پردہ تصور سے محو ہو چکا تھا اس لئے کہ خود ہیڈیز ہی کا کہیں وجود نہ تھا۔ ایشیائے کوچک کے سبز جنگلوں، سایہ دار نشیمنوں اور بہتے دریاؤں سے مقامی دیوتا اور دیبیاں رخصت ہو چکی تھیں یہاں تک کہ ان کے پجاریوں کو شبہ ہونے لگا کہ یہ معبود کبھی ان مقامات میں رہتے بھی تھے یا نہیں۔ شامی لڑکیاں اگر اپنے عشقیہ گیتوں میں ابھی تک اڈانس[1] کے حسرتناک انجام کی یاد کو تازہ رکھتی تھیں تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اڈانس کا حقیقت میں وہ حشر ہوا جو روایات میں مذکور تھا بلکہ محض بطور تفنن طبع۔ ایران نے رہ رہ کر اپنا قومی مذہب تبدیل کیا تھا۔ زردشت کے الہامی مذہب کو چھوڑ کر اس نے مثنوی عقائد اختیار کئے تھے۔ پھر نئے سیاسی اثرات سے متاثر ہو کر مجوسیت کو اپنا قومی مسلک قرار دیا تھا۔ اس نے آگ کی پرستش کی تھی اور اپنی قربانگاہوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر مقدس عنصر سے روشن رکھا تھا۔ اس نے سورج کو اپنا معبود مانا تھا۔ اور جب سکندر آیا تو اس کا میلان عقیدہ ہمہ اوست کی طرف ہو چلا تھا۔

اس ملک کے لئے جس کی دستگیری وہاں کے مقامی دیوتا سیاسی مصیبت کے وقت نہ کر سکے ہوں تبدیل مذہب ایک لازمی شے ہے۔ مصر کے قدیم دیوتاؤں کو جن کے جلال و عظمت کی یادگار میں اونچے اونچے مینار اور بڑے بڑے مندر قائم کئے گئے تھے ممالک غیر کے حملہ آوروں کی تلوار کے سامنے پے بہ پے اپنی گردن جھکانی پڑی۔ اہرام و ابوالہول کی سرزمین میں دیوتاؤں کی مورتوں نے کسی زندہ طاقت کے مظہر ہونے کا ثبوت دینا مدت سے چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کو اب ان پر مطلقاً" ایمان نہ رہا تھا۔ اب ایسے دیوتاؤں کی ضرورت تھی جنہوں نے حال ہی میں جنم لیا ہو اور یہی وجہ تھی کہ آسیرس کی جگہ سرپیس نے لے لی۔ اسکندریہ کے گلی کوچوں میں ہزاروں یہودی ایسے تھے جو اس خدا کو بھول چکے تھے جس نے سرپیس کے مندر کے سب سے زیادہ مخفی حجرے کو اپنی سکونت کے لئے مخفی کر رکھا تھا۔

روایت الہام یا زمانہ کسی کا اثر باقی نہ رہا تھا۔ یورپین علم الاصنام کے افسانے ایشیائی الہام کی روایتیں۔ مصری کاہنوں کے قدامت آلودہ عقائد سب کے سب مٹ چکے تھے یا

مٹتے جاتے تھے۔ یہی وہ نشانیاں تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر فرمانروایان سلسلہ بطلیموسیہ کی آنکھوں میں مذہبی عقاید کی بے ثباتی کی تصویر پھر گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایک چیز ایسی بھی ہے جو مذہب کی مختلف شکلوں سے زیادہ دیرپا ہے۔ یہ شکلیں تو طبقات الارض کے ازمنہ قدیمہ کی اعضائی شکلوں کی طرح ایک دفعہ ناپید ہو کر ہمیشہ کے لئے پردہ خفا میں چلی جاتی ہیں اور دوبارہ منصہ شہود میں نہیں آ سکتیں لیکن وہ چیز جس پر اس ظاہر بے حقیقت اس نمود بے بود عالم کا پردہ پڑا ہوا ہے کیا ہے؟ ازلی و ابدی حقیقت!!

یہ حقیقت ہم کو ان پا در ہوا روایتوں سے نہیں معلوم ہو سکتی جو ان لوگوں سے ہمیں ترکہ میں پہنچی ہیں جنھوں نے صبح تمدن کے طلوع کے وقت عالم ہستی کا جلوہ دیکھا تھا اور نہ ان بزرگوں کا خواب و خیال اس کا ماخذ ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو ملہم من اللہ تصور کرتے تھے بلکہ اس کا مبدا و منشا مہندسانہ تحقیقات اور فطرت کا نظری و علمی تجربہ ہے۔ جس سے بنی نوع انسان پر مستقل بے شمار اور بے بہا برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

وہ دن کبھی نہ آئے گا جب کہ تحریر اقلیدس کی ایک شکل سے بھی کسی کو انکار ہو گا۔ ایراٹا ستھنیز کے اس دعوے کی تردید کی کبھی کسی کو مجال نہ ہو گی کہ زمین گول ہے۔ اسکندریہ اور سارا کیوز میں جو عظیم الشان طبیعی ایجادات و اکتشافات ہو چکے ہیں وہ لوح روزگار سے کبھی مٹ نہ سکیں گے۔ ہپارکس۔ اپالونیس۔ بطلیموس اور ارشمیدس کے نام ہر مذہب و ملت کے لوگوں میں اس وقت تک جب تک کہ انسان کے سر میں دماغ اور منہ میں زبان ہے تعظیم کے ساتھ لئے جائیں گے۔

اس طور پر عجائب خانہ اسکندریہ کے بطن سے علوم جدیدہ پیدا ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ اس عجائب خانہ کے قیام سے مدتوں پہلے چین اور مسوپوٹیمیا میں اجرام فلکی کے مشاہدات ہو چکے تھے اور ہندوستان میں فن ریاضی کو ایک حد تک ترقی دی جا چکی تھی لیکن ان ممالک میں سے کسی میں بھی علمی تحقیقات میں تسلسل اور ربط نہیں پایا گیا اور نہ عملی تجربوں ہی سے کام لیا گیا۔ یہ فخر موجودہ سائنس کی طرح اسکندروی سائنس ہی کو حاصل ہے کہ اس نے مشاہدہ محض کی حد سے بڑھ کر فطرت کے مطالعہ اور علمی تجربہ کی وادی میں قدم رکھا۔

۱؎ یونان کے صوبہ تھسلی میں ایک پہاڑ ہے جس کا ارتفاع ۹۷۴۹ فٹ اور حد اشلج کی بلندی ۹۰۰۰ فٹ ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی پر جو نہایت وسیع و فراخ ہے ہر وقت بادلوں کا ایک گھٹا ٹوپ چھایا رہتا ہے۔ ہومر اور اس کے بعد کے زمانہ کے یونانی شعرا کا یہ عقیدہ تھا کہ اس چوٹی پر مہادیو تازیوس جس کا دوسرا نام جوپیٹر تھا دوسرے چھوٹے بڑے دیوتاؤں اور دیبیوں کے ساتھ رہتا ہے اور وہاں سے یہ سب جب چاہتے ہیں بادلوں میں لپٹے ہوئے آسمان کو چلے جاتے ہیں۔ مترجم

۲؎ کتاب "الیڈ" کے شہرہ آفاق مصنف ہومر یونانی کی دوسری منظوم تصنیف کا نام۔ ہومر کا زمانہ شیخ مسیح کی ولادت سے نو سو چالیس سال قبل بیان کیا جاتا ہے۔ گویا حضرت سلیمان کی ولادت سے کوئی دس بارہ سال بعد۔ "اڈیسی" کو لحاظ سے "الیڈ" کا جو یونان کی مہا بھارت ہے ضمیمہ سمجھنا چاہئے۔ مترجم

۳؎ یہاں اولمپس کے عینی و حسی وجود سے انکار کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مصنف کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولمپس جو دیوتاؤں کا مسکن سمجھا جاتا تھا تحقیقات کرنے پر ڈھکوسلا ثابت ہوا۔ مترجم

۴؎ ایک قدیم یونانی شاعر جس نے آٹھویں صدی قبل مسیح کا وسطی زمانہ پایا ہے۔ اس کی تصانیف جن کی زبان ہومر کی زبان سے ملتی جلتی ہے جرمنی میں شائع ہو چکی ہیں۔ مترجم

۵؎ یونانی ڈراما نویس کی اس صنف میں جس کا خاتمہ حسرت پر ہوتا ہے یوریپیڈیز ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔ ۴۸۱ قبل مسیح میں بمقام سلامس پیدا ہوا۔ فلسفہ۔ بلاغت۔ طبیعات میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اول اول اس کا پیشہ نقاشی تھا۔ اس کے بعد شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ سقراط سے اس نے تعلیم تو نہیں پائی مگر اس کے زمرہ احباب میں ضرور شریک تھا۔ فلسفیانہ عقائد رکھنے کی وجہ سے اہل ایتھنز اس کے دشمن جان ہو گئے اور اس زمانہ کے مشہور ہزال ارسٹوفینس نے اس کی ہجو کہی۔ یہاں سے جان بچا کر وہ مقدونیہ کے دربار میں جا پناہ گزین ہوا لیکن دو شاعروں سے وہاں بھی اس کی جھڑپ ہو گئی اور انہوں نے اس پر کتے چھوڑے جنھوں نے اسے چیر پھاڑ ڈالا۔ اس کا انتقال ۴۰۶ ق م میں ہوا۔ اٹھارہ کتابیں اس کی تصنیف سے ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مترجم

۶؎ ڈراما نویسی کے اسی شعبہ کا جس کا اوپر ذکر ہوا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ۵۲۵ ق م میں یونان کے شہر الیوسس میں پیدا ہوا اور ۴۵۶ ق م میں بمقام گیلا واقع جزیرہ نمائے سسلی وفات پائی۔ اول میر-تھان کی جنگ اور اس کے دس سال بعد ۴۸۰ ق م میں سلامس کی مشہور بحری لڑائی میں

شریک ہوا۔ ستر ناٹک اس کی تصنیف سے ہیں جن میں سے صرف سات ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کا طرز ادا نہایت دلکش ہے اور عبارت نہایت سلیس سمجھی جاتی ہے۔ ڈراما میں مکالمہ کا طریق اسی کا رواج دیا ہوا ہے۔ مترجم

کہ اس مقام کا ٹھیک موقع تو معلوم نہیں لیکن زنوفن نے جو حالات اس جنگ کے جو یہاں ۴۰۱ ق م میں ہوئی بیان کیے ہیں ان سے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ بابل سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر جانب شمال و مغرب دریائے فرات کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ یہ جنگ سائرس خسرو ایران اور اس کے بھائی اردشیر میں ہوئی تھی۔ سائرس مارا گیا اور اردشیر فتح یاب ہو کر تخت نشین ہوا۔ مترجم

۵ مجمع الجزائر یونان کے ایک جزیرہ کا نام ہے جو ایتھنز کے قریب واقع ہے۔ اس کا رقبہ کوئی دس مربع میل ہو گا۔ جس جنگ کی طرف متن میں اشارہ ہے وہ ایک بحری لڑائی تھی جو ۴۸۰ ق م میں ایرانیوں اور یونانیوں میں ہوئی اور ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ مترجم

۹ یونان قدیم کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو شہر تھیبز سے ساڑھے چھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ۴۷۵ ق م میں یہاں ایرانیوں اور یونانیوں میں ایک سخت جنگ ہوئی جس میں میدان یونانیوں کے ہاتھ رہا۔ مترجم

۱۰ ابتدا میں ایک یونانی مقدار وزن کا نام تھا جو مختلف ریاستوں میں مختلف تھی۔ یعنی کہیں ۲/۱ ۲۸ سیر تھی اور کہیں ۲/۱ ۷ ۴ سیر۔ بعد میں اس لفظ کا اطلاق نقروی سکہ رائج الوقت کی مساوی مقدار پر ہونے لگا۔ اگر ٹیلنٹ کی مقدار ۲/۱ ۷ ۴ سیر بھی فرض کی جائے تاہم سکندر کے خزانہ میں اس مہم پر روانہ ہونے کے وقت آج کل کے ارزنقرہ کے حساب سے ایک لاکھ نوے ہزار روپیہ سے زیادہ رقم موجود نہ تھی۔ مترجم

۱۱ قدیم دولت فینشیا کا ایک بہت بڑا شہر جو اپنی جنگی قوت اور تجارتی عظمت کی وجہ سے مشہور تھا۔ اور بیروت سے ۴۷ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب کی سمت میں واقع تھا۔ اس کا کچھ حصہ ایک جزیرہ پر جو ساحل سے کوئی پون میل ہو گا اور کچھ حصہ ساحل پر آباد تھا۔ دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمانؑ کے دوست شاہ ہیرام نے اسے اپنا پایہ تخت قرار دیا اور موقع کی موزونی کے لحاظ سے اس کی دولت و قوت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ باوجودیکہ متعدد حملہ آوروں نے اس پر چڑھائی کی اور یہ شہر کئی مرتبہ لٹا اور برباد ہوا لیکن یہ تباہی ہر دفعہ عارضی ثابت ہوئی وہ بگڑ بگڑ کر بنا اور اجڑ اجڑ کر بسا اور ہر دفعہ پہلے سے بھی زیادہ رونق کے ساتھ آباد ہوا۔ اس کی یہ رونق و عظمت حروب صلیبیہ کے زمانہ تک قائم رہی۔ ۱۱۹۱ء میں شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ نہر سویز کے افتتاح سے اس کی تجارتی اہمیت بالکل کم ہو گئی۔ آج کل اس کا نام صور ہے اور اس کی آبادی ۵۰۰۰ ہے۔ مترجم

۱۲ ارض کنعان کا سب سے قدیم شہر۔ اس کی اہمیت اور عظمت کا راز اس کے جغرافیائی موقع

میں پوشیدہ تھا- یعنی یہ اس شاہراہ پر واقع تھا جو مصر کو شام سے ملاتی تھی- یہ شہر ۶۳۴ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا- جنہوں نے اس کا نام غزہ رکھا- آج بھی اس کا یہی نام ہے اور اس وقت اس کی آبادی پندرہ بیس ہزار ہے- مترجم

۳ک میں اس موقع پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا- جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہ قائم رکھا گیا ہے اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث- دوسری زبان کی خوبی و فصاحت- اردو سی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا- مگر مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جو درحقیقت قابل مبارکباد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے- لیکن یہ اسی سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسی فاضل مترجم کو حاصل ہے-

۴ک ارسطو کا بھتیجا اور شاگرد اور سکندر کا ہم سبق تھا- ۳۶۰ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۲۸ ق م میں اپنی صاف گوئی کے باعث سکندر کے حکم سے قتل کیا گیا- مترجم

۵ک سال انقلابی سے مراد وہ زمانہ ہے جو زمین کو منطقتہ البروج کے کسی ایک نقطہ مثلاً" نقطہ اعتدال صیفی یا نقطہ اعتدال شتوی سے روانہ ہو کر پھر اسی نقطہ تک پہنچنے میں صرف کرنا پڑتا ہے- اس کی مدت ۳۶۵٫۲۴۲۲۶ یوم شمسی ہے- مترجم

۶ک سال کوکبی سے مراد ان دو حالتوں کا درمیانی فصل ہے جب کہ زمین آفتاب اور کوئی ایک ستارہ ایک ہی ہیئت میں پائے جائیں- اس فصل کی مدت ۳۶۵٫۲۵۶۳۸ یوم شمسی ہوتی ہے- مترجم

۷ک زمین چونکہ کامل کرہ نہیں ہے لہٰذا جس محور پر یہ اپنے گرد گھومتی ہے وہ اس کے مدار کی جانب جھکا ہوا ہے اور اسی لئے وہ بڑے دائرے جو مدار ارض اور خط استوا کی سطوح کے تقاطع سے افلاک میں پیدا ہوتے ہیں ایک دوسرے کو دو نقطوں پر قطع کرتے ہیں جن کا نام نقاط اعتدال لیل و نہار ہے- ان فلکی دوائر میں سے ایک کا نام منطقتہ البروج ہے اور دوسرے کا دائرہ استوائیہ- دونوں نقطے منطقتہ البروج کے گرد آہستہ آہستہ گھومتے ہیں لیکن یہ گردش بلحاظ نوعیت موجبہ نہیں ہوتی بلکہ سالبہ ہوتی ہے اور اسی کا نام نقاط اعتدال لیل و نہار کا استقبال یا استقبال اعتدالین ہے- اس کی وجہ سے دائرہ استوائیہ کے قطب کو منطقتہ البروج کے قطب کے گرد گردش کرنی پڑتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کا محور ایک شکل بعید الیبضوی بناتا ہے جس کا محور منطقتہ البروج کے قطب میں سے ہو کر گزرتا ہے- اس گردش کا زمانہ ۲۵۸۰۰ سال ہے- گویا استقبال اعتدالین کا سالانہ اوسط ۵۰٫۲ ثانیہ ہے- مترجم

۱۸؎ قمر کا ثوابت یا سیار اور آفتاب کے درمیان یا سیار کا ثوابت اور آفتاب کے درمیان حائل ہو جانا۔ مترجم

۱۹؎ اسکندریہ کا ایک یونانی مہندس۔ پانی کھینچنے کا نل۔ آبی گھڑی اور سائفن یعنی خم دار نلی اس کی ایجاد سے ہیں اور اسی لئے وہ زیادہ مشہور ہے۔ مترجم

۲۰؎ حکیم زینو نے خدا کا انکار کیا لیکن ایک غیر مرئی جوہر۔ ایک زندہ طاقت کا اقرار کیا۔ تائید ایزدی کو سراپا لیکن قانون قدرت کو سراہا۔ کارفرمائے قضا و قدر سے سرتابی کی لیکن تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ حاکم کو نہ مانا لیکن حکم کو جائز اور قابل اطاعت سمجھا۔

"فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں"

اس پر بھی جناب باری کی ہستی سے انکار نہ ہو سکا۔ اپنی اپنی سمجھ ہے۔ کوئی اسے کسی طرح مانے کوئی کسی طرح لیکن اس پھندے سے بچ نکلنا محال ہے۔

"ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا"
"دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا"

مترجم

۲۱؎ لفظ اکاڈمی جس کے معنی بیت الحکمت کے ہیں ایک یونانی لفظ اکاڈیمیا سے مشتق ہے۔ اکاڈیمیا نواح ایتھنز میں ایک مقام کا نام تھا جہاں اول سقراط اور اس کے بعد فلاطون اپنے شاگردوں کو اکثر درس دیا کرتے تھے۔ فلاطون نے پچاس سال تک اس مقام پر حکمت آموزی کی اور یہی وجہ تھی کہ اکاڈمی کے معنی فلسفہ اشراقیہ کی درسگاہ کے ہو گئے۔ فلاطون کی وفات کے بعد جو ۳۴۸ ق م میں واقع ہوئی اس کے فلسفہ میں ترمیمات ہونی شروع ہوئیں جس کی وجہ سے مذہب اشراقیہ کی تین شاخیں ہو گئیں۔ تینوں شاخیں علی الترتیب قدیم اکاڈمی وسیط اکاڈمی اور جدید اکاڈمی کے نام سے موسوم ہیں۔ قدیم اکاڈمی سے مراد خالص اشراقی عقائد کا مسلک ہے۔ وسیط اکاڈمی کی بنا حکیم آرسیسی لیس نے ڈالی جس کا سن ولادت ۳۱۶ ق م ہے۔ اس کے بعد ۱۵۵ ق م میں حکیم کارنیاڈیز نے جو دیو جانس کلبی کا شاگرد تھا جدید اکاڈمی قائم کی۔ کارنیاڈیز کا خیال تھا کہ ماہیت اشیا ادراک انسانی سے بالا ہے۔ اس سے اس کی یہ مراد تھی کہ یہ بات ثابت نہیں کی جا سکتی کہ ادراک شے کو مادہ کے جوہر یا عرض کے لحاظ سے شے مدرکہ کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے جو کچھ ثابت ہو سکتا ہے وہ فقط اسی قدر ہے کہ ادراک اور شے مدرکہ میں ایک قسم کا باہمی تعلق ہے جس کا اثر انسان کے نظام عصبی پر مترتب ہوتا ہے۔ اس سے کارنیاڈیز نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی معلومات غیر یقینی ہیں۔ مترجم

۲۲؎ ذہنیات اور موجودات خارجی میں باوجود مشائی اور اشراقی توجیہات کے جو عقلی تناقض مدتوں سے چلا آتا تھا اس کے رفع کرنے کے لئے حکما کے ایک گروہ نے جنہیں مسیحی علم کلام کا بانی کہا

جا سکتا ہے تیسری صدی عیسوی میں فلسفہ کا ایک نیا مذہب فلسفہ اشراقیہ جدید کے نام سے اسکندریہ میں قائم کیا۔ اس مذہب کا مقصد یہ تھا کہ عقل اور ایمان میں توافق پیدا کیا جائے۔ ہستی علی الاطلاق یعنی خدا کی ذات کا تعقل چونکہ افلاطون کے کلیات عقلی کی وساطت سے ہونا محال تھا لہٰذا فلسفہ اشراقیہ جدید کے بانیوں نے مکاشفہ کے مسئلہ کو رواج دیا۔ اس مسئلہ کا مفہوم یہ ہے کہ ادراک کے اجزائے عاقدہ ومنعقدہ یعنی نفس ناطقہ و شے مدرکہ باہم مخلوط و منضم ہو کر ایک ہو جائیں اور ان میں کوئی فرق نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تاویل یوں کی جا سکتی ہے کہ انسان کی تمنا ہے کہ اس کو علم مطلق حاصل ہو لیکن اس حصول کے لئے خارجی اشیا کا ادراک یا طریقہ استعمال بیکار ہے۔ علم مطلق اس کو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ انجلاء نفس اور تزکیہ باطن سے محسوسات اور موجودات خارجی کو وہ اپنا پرتو بنا لے اور بیرونی اثرات سے یہاں تک مستغنی ہو جائے کہ عالم اور معلوم ایک ہو جائیں اور اس طور پر سب چیزوں کا ادراک مکاشفہ یا بصیرت سے ہونے لگے۔ کثرت کے تصور سے جو عقلی مشکلات فلاسفہ کو اکثر پیش آئی ہیں ان سے بچنے کے لئے فلسفہ اشراقیہ جدید کے پیروؤں نے مسئلہ انفصال کو اصول ہمہ اوست کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ اس مسئلہ سے مراد یہ ہے کہ کائنات مرئی کے جملہ شواہد خالق علی الاطلاق سے ماخوذ اور اس کے مظاہر ہیں۔ مترجم

[۱۷۲] ایک یونانی فیلسوف جس کا زمانہ ۱۷۵ء سے ۲۵۰ء تک ہے۔ فلسفہ اشراقیہ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ سیکاس کے معنی یونانی زبان میں حمال کے ہیں اور یہی اس کے نام کے رکن ثانی کی وجہ تسمیہ ہے۔ اسکندریہ میں وہ حمالی کا پیشہ کرتا تھا۔ فرفوریوس کہتا ہے کہ اس کے ماں باپ عیسائی تھے اور وہ خود بھی ابتدا میں عقائد عیسوی کا پابند تھا مگر بعد میں مرتد ہو گیا۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ وہ مرتے دم تک عیسائی رہا لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ فلسفیانہ تخیل نے مذہب عیسوی کے اصولوں کی طرف سے اس کے دل میں شبہات و شکوک پیدا کر دیئے اور اس نے فلسفہ اشراقیہ میں تصوف کا پیوند لگانا چاہا۔ اس نے اپنے خیالات قلمبند نہیں کئے بلکہ جو کچھ اپنے شاگردوں کو سکھایا زبانی طور پر سکھایا اور یہ تعلیم مدتوں سینہ بسینہ چلی آئی۔ خدا کو وہ تثلیث کی شکل میں مانتا ہے لیکن اس تثلیث کے ارکان بجائے باپ بیٹے اور روح القدس کے جوہر مطلق عقل فعال اور قوت نامیہ ہیں۔ مترجم

[۱۷۳] ۲۰۳ء میں مصر میں پیدا ہوا اور ایمونیس سیکاس سے دس سال تک فلسفہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد ایرانیوں اور ہندوؤں کے فلسفہ سے واقفیت پیدا کرنے کی غرض سے مشرقی ممالک کی طرف روانہ ہوا۔ چند سال کے بعد وہ روما آیا اور وہاں پچیس سال تک درس دیتا رہا۔ فرفوریوس اور لانجینس اس کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ رہبانیت اس کی زندگی کا جزو اعظم تھی۔ ایک دفعہ اس کے دوستوں نے اصرار کیا کہ تصویر کھنچواؤ۔ اس نے جواب دیا کہ انسان ایک سایہ ہے

اور سایہ کی نقل اتارنا حماقت ہے۔ پلاٹینس گوشت نہیں کھاتا تھا اور نہاتا بھی نہ تھا۔ ۲۷۰ء میں جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو طبیب کے معالجہ سے بھی انکار کیا۔ اس کی تصانیف سے جو تعداد میں چون ہیں ایک ہستی کاملہ کے خیال کا پتہ چلتا ہے جو ہر خواہشمند پر اپنی خیروبرکت کا پرتو ڈالنے کے لئے ہروقت آمادہ ہے۔ پلاٹینس کا خیال تھا کہ فلاسفہ میں ربانی عنصر موجود ہوتا ہے اور یہ لوگ عوام کالانعام کی طرح اس بات کے محتاج نہیں ہوتے کہ علایق مادی سے اپنے آپ کو منقطع کریں۔ خود ان کی طبیعتوں میں عالم بالا کے حقائق کے اکتساب کا رجحان موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح عشاق میں اس حسن کے ادراک کی استعداد موجود ہوتی ہے جو جسم سے معرا ہے اور موسیقی کا مذاق رکھنے والے ایک کمتر درجہ میں حسن مجرد کا تعقل کر سکتے ہیں پلاٹینس کی تصانیف کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کے بعض مقالات کا ترجمہ مسٹر ٹیلر نے کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۳۴ء) لوئس نے بھی اپنی تاریخ فلسفہ (مطبوعہ لندن ۱۸۶۷ء میں پلاٹینس کا حوالہ دیا ہے۔ مترجم

۲۵؎ لیلپیس ایک مشہور فرانسیسی مہندس اور ہیئت دان ہے جو ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا۔ سائنس میں اس کی اجتہادی عظمت کا یہ پایہ ہے کہ اسے نیوٹن کا سہیم و عدیل سمجھا جاتا ہے۔ نظام شمسی کی حرکات کے اصول کے متعلق اس نے ۱۷۹۹ء میں ایک مشہور و معروف کتاب لکھی جس میں قمر۔ سیارگان اعظم کے اقمار۔ مشتری اور زحل کی ہردو عدم مساوات اور حقیقت مدوجزر پر نہایت جدت و تحقیق سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ چار جلدوں میں بورڈچ نے کیا اور بمقام بوسٹن ۱۸۴۹ء میں چھپوایا۔ مترجم

۲۶؎ خط استوا کے شمال اور جنوب میں دو فرضی دوایر واقع ہیں جنہیں سرطان اور جدی کہتے ہیں۔ آفتاب موسم شتا و صیف یعنی جاڑے اور گرمی میں خط استوا کے جن بعید ترین نقطوں پر ہو کر گزرتا ہے انہیں نقاط انقلاب صیفی و شتوی کہتے ہیں۔ مترجم

۲۷؎ یونانی علم الاصنام کی روایات میں ایک نوجوان کا نام ہے جس پر بوجہ اس کے غایت درجہ حسین و جمیل ہونے کے وینس یعنی عشق و محبت کی دیوی عاشق ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اڈانس پر ایک جنگلی سور نے حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ وینس نے اپنے معشوق کے زخم پر اگرچہ شراب آسمانی کے قطرے ٹپکائے جس سے نرگس کے پھول پیدا ہو گئے لیکن وہ اس زخم جانستان سے جان بر نہ ہو سکا۔ مترجم

دوسرا باب

عیسائیت کی ابتدا

شاہی اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس کی قلب ماہیئت۔ اس کا تعلق سائنس کے ساتھ۔

روما کی جمہوری حکومت کی مذہبی حالت۔ جمہوریت کے مبدل بہ حکومت شخصی ہونے سے لوگوں کا میلان توحد کی طرف ہو جاتا ہے۔ سلطنت روما میں مذہب عیسوی کی اشاعت۔ عیسائیت کو حکومت جس طریقہ سے ہاتھ آتی ہے اس بکے سیاسی مقتضیات عیسائیت اور بت پرستی کے باہمی اتحاد کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ عیسائیت کے عقاید اور رسوم کے متعلق ٹرٹلین کا بیان۔ قسطنطین کی حکمت عملی کا مخرب اثر۔ عیسائیت کا اتحاد حکمران جماعت کے ساتھ۔ عیسائیت اور سائنس کا تناقض باہمی۔ کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی اور تحصیل فلسفہ کی ممانعت۔ آگسٹائن کے فلسفہ اور پادریوں کے علوم کی حقیقت۔ کتب مقدس کو سائنس کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

سیاسی معنوں میں عیسائیت وہ ترکہ ہے جو سلطنت رومتہ الکبریٰ نے دنیا کے لئے چھوڑا۔

جب روما نے جمہوری طرز حکومت چھوڑ کر شخصی حکومت کا طریقہ اختیار کیا تو وہ تمام آزاد و خودمختار قومیں جو بحر روم کے چاروں طرف آباد تھیں روما کی مطیع و منقاد ہو چکی تھیں۔ ان کا یکے بعد دیگرے مسخر ہونا بجائے اس کے کہ ان کو تباہ کرتا ان کے حق میں موجب سلامتی ثابت ہوا اس لئے کہ وہ ہمیشہ کی لڑائیاں جو ان کو ایک دوسرے سے دست و گریباں رکھتی تھیں موقوف ہو گئیں اور وہ مصیبتیں جو ان آئے دن کی خونریز معرکہ

آرائیوں سے پیدا ہوتی تھیں عالمگیر امن سے مبدل ہو گئیں۔

نہ صرف اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بلکہ فاتحانہ رعونت کے جذبہ کے اقتضا سے دولت روما نے مفتوح اقوام کے دیوتاؤں کو اپنے پایہ تخت میں لا بسایا اور اس رواداری اور مسالمت کے ساتھ جس سے بوئے استغنا آتی تھی اس نے ان سب کی پرستش کو جائز قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اصلی وطن میں جو غیر محدود اقتدار ہر دیوتا کو اپنے پجاریوں پر حاصل تھا وہ ان دیوتاؤں اور دیبیوں میں شامل ہونے کی وجہ سے جن کا ایک جم غفیر اس کی طرح دوسرے ممالک سے لایا گیا تھا عنقا ہو گیا۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے جغرافیائی اکتشافات اور فلسفیانہ تنقید کی بدولت لوگوں کے قدیم مذہبی عقائد میں پہلے ہی بہت کچھ تزلزل واقع ہو چکا تھا۔ رومتہ الکبریٰ کے اس طرز عمل کی بدولت جو رہا سہا اعتقاد تھا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

تمام ممالک مفتوحہ کے فرمانروا تخت سے اتارے جا چکے تھے اور ان کی جگہ ایک شہنشاہ مسند آرائے حکومت تھا۔ اسی طرح دیوتا بھی سب کے سب معدوم ہو چکے تھے۔ سیاسی اور مذہبی خیالات میں جو تعلق ہمیشہ قائم رہا ہے اس کے لحاظ سے یہ بات ہرگز قابل تعجب نہ تھی کہ متعدد معبودوں کی پرستش کے بجائے ایک معبود سے لو لگانے کا خیال دلوں میں گھر کر جائے۔ روما میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اول اول شہنشاہ کے مرنے پر اسے ربانی اعزاز دیئے گئے اور رفتہ رفتہ زندہ شہنشاہ خود پجنے لگا۔

جس آسانی سے دیوتا پیدا کر لئے جاتے تھے دلوں میں اس کا ایک زبردست اخلاقی اثر پیدا ہوئے بغیر نہ رہا۔ جب کوئی نیا دیوتا لوگوں کی عقیدت کے سانچہ میں ڈھل کر نکلتا تھا تو پرانے دیوتا کی لامحالہ تضحیک ہوتی تھی۔ مشرق میں اوتاروں نے اور مغرب میں انسانوں نے دیوتاؤں کا روپ دہار کر اولمپس کی ربانی آبادی کو بہت جلد جلد بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ایشیا کا اگر یہ قاعدہ تھا کہ دیوتا آسمان سے اتر کر انسانی قالب میں بروزی رنگ کے اندر ظاہر ہوتے تھے تو یورپ میں انسان زمین سے صعود کر کے آسمان پر چلا جاتا تھا اور دیوتاؤں کے زمرہ میں شریک ہو جاتا تھا۔ روما کے دامن اعتقاد کو تشکک کی جس گرد نے آلودہ کیا وہ یونان سے نہ اٹھی تھی بلکہ کثرت مذاہب کی وجہ سے روما میں خود بداعتقادی کی خاک اڑنے لگی تھی۔

تعدد سے توحد کی طرف رجوع کرنے میں روما کی آبادی کے تمام طبقوں نے یکساں سرعت کے ساتھ کام نہیں لیا۔ تجار قانون دان اور سپاہی جو اپنے مشاغل کی نوعیت کے

لحاظ سے سرد و گرم زمانہ کا زیادہ تجربہ رکھتے ہیں اور دماغی قابلیت سے بھی نسبتہ زیادہ بہرہ اندوز ہوتے ہیں سب سے پہلے متاثر ہوئے۔ ان کے بعد کاشتکاروں اور مزدوری پیشہ لوگوں کی باری آئی۔

جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما متہائے ترقی پر فائز ہو گئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ اخیر کو پہنچ چکی تھی۔ اہل روما کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیئے کہ زندگی کو ایک سلسلہ العیش بنا دے۔ پاکبازی حظ نفس کے غوان نعمت پر بمنزلہ نمکدان ہے اور اعتدال سلسلہ حظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے۔ ان کے دسترخوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچے کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے ملازم زرق برق کی پوشاکیں پہنے ان کی خدمت کے لئے کمربستہ کھڑے رہتے تھے۔ ماہرویان روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لئے محو ناز رہتی تھیں۔ عالیشان حماموں و لکشا تماشاگاہوں اور جوش آفرین دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آمائی رہتے تھے جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سو نہ جائے اہل روما کے سامان تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا۔ دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے۔ اس لئے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرقریزیوں سے پیدا ہوا ہے۔ مال و املاک کی ضبطی۔ صوبجات کے محاصل کی تشخیص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانروائے دولت روما اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے۔ غرض روما کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی لیکن یہ جھلک اس نمائشی طمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔

اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں دولت روما کے ایک مشرقی صوبہ یعنی شام میں طبقہ ادنیٰ کے چند بے بضاعت لوگوں نے ایک مذہبی برادری قائم کر رکھی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ابنائے جنس کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا جائے۔ ان لوگوں کے اصول ہمہ گیر اخوت کے اس جذبہ سے توافق کلی رکھتے تھے جس کا پیوند ممالک مفتوحہ کے الحاق و انضمام نے اخلاق کی شاخ میں لگایا تھا۔ یہ اصول حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کی تلقینات سے تھے۔

اس زمانہ میں بنی اسرائیل کا بعض روایات کی بنا پر یہ عقیدہ تھا کہ ان کی قوم میں سے ایک نجات دہندہ پیدا ہو گا جو ان کے گذرے ہوئے جاہ و جلال اور کھوئی ہوئی عظمت و توقیر کے احیا و رجعت کا باعث ہو گا۔ حضرت عیسیٰؑ کے شاگرد تو انہیں وہ مسیح موعود سمجھ کر ان پر ایمان لے آئے جس کے ظہور کی بشارت بزمانہ سابق دی جا چکی تھی لیکن یہودی کاہنوں نے یہ دیکھ کر کہ جناب مسیحؑ کی تعلیم ان کی اغراض کے منافی ہے ان کی شکایت رومی گورنر سے کر دی جس نے کاہنوں کی رضامندی مقدم سمجھ کر انہیں بہ تامل بسیار موت کے حوالہ کیا۔

جناب مسیحؑ کی فیاضانہ تعلیم جس میں انسانی اخوت کا نکتہ مضمر تھا اس واقعہ کے بعد بھی زندہ رہی۔ حواریان مسیحؑ نے منتشر ہونے کے بجائے اپنا ایک جتھا قائم کر لیا۔ اصول مساوات جائداد کی بنا پر اس برادری کا ہر رکن جائداد مشترکہ میں اپنا اپنا سرمایہ اور آدمی شریک کر دیتا تھا۔ اس طور پر جماعت مسیحی کی بیواؤں اور یتیموں کی پرورش اور مفلسوں اور مریضوں کی نگہداشت ہونے لگی۔ اس بیج سیرزدکس سپرس جماعت نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک نئی اور جیسا کہ واقعات نے آگے چل کر ثابت کر دیا ایک زبردست جماعت کی شکل اختیار کر لی جس کا نام کلیسا تھا۔ کلیسا کو نئی تحریک تو اس لئے کہنا چاہئے کہ اس قسم کی کوئی جماعت اس سے پہلے وجود میں نہ آئی تھی اور زبردست اس لئے کہ مقامی کلیساؤں نے جو اول اول منتشر و منفرد تھے اپنی مشترکہ اغراض کے تحفظ کے خیال سے اجتماعی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں اور ان سب کے باہمی اجتماع سے ایک کلیسا پیدا ہو گیا۔ اسی اجتماع کی بدولت عیسائیت کو تمام سیاسی فتوحات میسر ہوئیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں روما کے جنگی تسلط کی وجہ سے عالمگیر امن قائم ہو چکا تھا اور اقوام مفتوحہ میں برادرانہ ارتباط کے خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ لہٰذا سلطنت کے طول و عرض میں جدید تحریک یعنی مسیحی تعلیم کی سریع السیر اشاعت کے لئے رستہ صاف تھا۔ یہ تحریک ارض شام سے شروع ہوئی اور تمام ایشیائے کوچک میں پھیلتی ہوئی قبرس یونان اور اٹلی میں جا پہنچی اور بالآخر وہاں سے مغرب کی طرف بڑھتی ہوئی فرانس اور برطانیہ پر مسلط ہو گئی۔

مسیحیت کے اعلاین ان مناروں نے بہت بڑا حصہ لیا جو ہر طرف اس دین کی منادی کرتے پھرتے تھے۔ اور یہ وہ طریقہ تھا جس سے فلسفہ کے قدیم مذاہب کے پیروؤں نے کبھی فائدہ نہ اٹھایا تھا۔

اس نئے مذہب کی حدبندی میں سیاسی حالتیں ایک بڑے درجہ تک معین ہوئیں۔ چنانچہ آخر الامر عیسائیت ان تمام ممالک میں پھیل گئی جن پر رومی پھریرا اڑتا تھا۔ اور بجائے یروشلم کے جس کے مشہد مسیح ہونے میں کلام نہیں روما جہاں پطرس کا وفات پانا مشتبہ ہے مذہبی پایہ تخت ہو گیا۔ لیکن باوجود ان متبرک و مقدس یادگاروں کے جو جشیمن اور کیلوری کے ساتھ وابستہ ہیں بہتر یہی تھا کہ عیسائیت کا پرچم سات پہاڑیوں والے شہنشاہی دارالامارہ پر لہراتا ہوا نظر آئے۔

سالہا سال تک مذہب عیسوی صرف تین اصولوں کی تلقین کرتا رہا یعنی حق اللہ حق الذات اور حق العباد۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ خدائے بزرگ و برتر کی تعظیم و تکریم کرے۔ ذاتی طور پر نیک اور پاکباز ہو اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اول اول جب یہ مذہب کمزور تھا تو اس نے لوگوں کو نرمی اور انکسار کے ساتھ دعوت دی لیکن جب مسیحی جماعت تعداد اور اثر کے لحاظ سے غالب ہو چلی تو اس میں سیاسی شان نمودار ہوئی اور حکومت کے اندر حکومت اور سلطنت کے اندر سلطنت قائم کرنے کا رجحان اس میں پایا جانے لگا۔ چنانچہ یہ رجحان اس وقت سے لے کر اب تک برابر قائم رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا میلان اس کے نشوونما کا لازمی نتیجہ ہے۔ فرمانروایان روما نے اس کی اس اپج کو اپنے نظم و نسق سلطنت کی راہ میں مزاحم پا کر اس کا سدباب جنگی قوت سے کرنا چاہا اور ایسا کرنے میں انہوں نے اپنے ان فوجی اصولوں کو پیش نظر رکھا جن کی رو سے شہنشاہانہ تفوق کے برقرار رکھنے کا ذریعہ بجز دباؤ کے اور کچھ نہ تھا۔

۳۰۲ء کے موسم سرما میں بعض پلٹنوں کے عیسائی سپاہیوں نے ان مذہبی رسوم میں شریک ہونے سے انکار کر دیا جو دیوتاؤں کی پوجا کرنے اور انہیں بھینٹ دینے کے لئے قدیم سے چلی آئی تھیں۔ یہ بغاوت اس سرعت کے ساتھ پھیلی اور حالت ایسی نازک ہو گئی کہ قیصر ڈایو کلیشن کو مجبوراً ایک مجلس شوریٰ اس غرض سے منعقد کرنی پڑی کہ اس موقع پر کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ جو مشکلات پیدا ہو گئی تھیں ان کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ قیصر کی ملکہ اور اس کی بیٹی دونوں کی دونوں مسیحی المذہب تھیں۔ قیصر ایک نہایت بیدار مغز اور فرزانہ و دوربین شخص تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نئی جماعت کے زور کو توڑنا جس کے بغیر چارہ نہیں ایک سیاسی ضرورت ہے لیکن پھر بھی جب اس نے فرمان انطفائے بغاوت جاری کیا تو یہ صراحت کر دی کہ خونریزی سے احتراز کیا جائے۔ لیکن ایک غیظ آلود انبوہ کے جوش و خروش کو کون روک سکتا ہے۔ نکومیڈیا کے گرجے کی اینٹ سے اینٹ بج

گئی۔ اس کا جواب مسیحی جماعت نے یہ دیا کہ قیصر کے محل کو آگ لگا دی۔ ایک شاہی فرمان کی علانیہ توہین کی اور اسے پرزے پرزے کر ڈالا۔ مسیحی افسران فوج ملازمت سے برطرف کئے گئے۔ قتل عام کی نوبت پہنچ گئی۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ واقعات کی سیل جرار کا بہاؤ اس قدر زبردست تھا کہ قیصر بھی اس کی روک تھام نہ کر سکا۔

اب یہ بات روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی کہ عیسائی گروہ نے جو سلطنت کا ایک رکن اعظم ہے ان سفاکانہ مظالم کی وجہ سے جوش میں آ کر جو اس پر روا رکھے گئے تھے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ اب ان سختیوں کو برداشت نہ کرے گا۔ ڈایوکلیشن نے ۳۰۵ء میں اپنی مرضی سے تخت چھوڑ دیا۔ قسطنطین نے جو تخت و تاج کے مسابقین میں سے تھا ازراہ غایت مال اندیشی کھلم کھلا مسیحیت کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر حصہ میں مرد عورت بچے بوڑھے اس کی جان نثاری اور ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے اور اس کی خاطر لڑنے مرنے کے لئے مستعد ہو گئے۔ اس کے علاوہ شاہی افواج میں جو مسیحی بہ تعداد کثیر موجود تھے وہ اس کی جانبازانہ متابعت کے لئے تیار ہو گئے۔ سلویا کے پل کے قریب ایک بہت بڑی جنگ ہوئی جس میں اسے کامل فتح حاصل ہوئی اور اس کے تمام منصوبے بار آور ہو گئے۔ پہلے میکسمن اور اس کے بعد لا سینیس کی موت نے ان تمام رکاوٹوں کو جو اس کی راہ میں حائل تھیں دور کر دیا اور اولین مسیحی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے اس نے قیاصرہ کے تخت پر قدم رکھا۔

فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ اب جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے ملنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیادار لوگ جنہیں مذہب کی خس برابر بھی پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہو گئے۔ چونکہ وہ بظاہر عیسائی لیکن بہ باطن مشرک و بت پرست تھے لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی۔ قسطنطین نے کہ وہ بھی انہیں کا ہم مشرب تھا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرز عمل کا سدباب ہو۔ قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گذری اور کہیں آخری وقت ۳۳۷ء میں جا کر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔

ان ترمیمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے جو مذہب عیسوی میں بیرونی عناصر کی آمیزش کی وجہ سے پیدا ہو کر آج کے دن تک قائم ہیں اور جن کی بدولت اس مذہب کو سائنس کے ساتھ دست و گریبان ہونا پڑا ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانہ میں جب اس دین کا

چشمہ گدلا نہ ہوا تھا اس کی کیا حالت تھی۔ حسنِ اتفاق سے یہ کیفیت ہمیں ٹرٹلین کی اس تحریر سے بہم پہنچتی ہے جو اس نے قیصر سیویرس کے زمانہ میں جب کہ عیسائیوں پر طرح طرح کے ظلم ہو رہے تھے بمقام روما قلمبند کی تھی۔ یہ تحریر جس میں عیسائیوں کی طرف سے ان الزامات کا جواب دیا گیا ہے جو ان پر غیر مسیحیوں نے لگائے تھے قیصر کے نام نہیں ہے بلکہ اس کا روئے سخن ان حکام عدالت کی طرف ہے جو ملزمین کے مقدمات کی دریافت کی غرض سے مامور ہوئے تھے۔ اس میں نہایت سلیقہ اور متانت کے ساتھ ان تمام دلائل و واقعات کا استقصا کیا گیا ہے جو راقم عیسائیت کی تائید میں پیش کر سکتا تھا اور تمام دنیا کو مسیحی عقائد اور مسیحیوں کی حالت سے روشناس کیا گیا ہے۔ وہ سختی و خشونت جو پادریوں کے طرز خطاب کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اس میں نام کو نہیں پائی جاتی بلکہ ہر ہر سطر سے تاریخی متانت و ثقاہت ٹپک رہی ہے۔ عہد قدیم کی مسیحی تصانیف میں جو درجہ اس تحریر کو حاصل ہے کسی اور تصنیف کو میسر نہیں ہوا۔ ٹرٹلین کی اس تحریر کا زمانہ ۲۰۰ء ہے۔

ٹرٹلین اپنا بیان صفائی نہایت قابلیت سے شروع کرتا ہے۔ وہ حکام عدالت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ مسیحیت دنیا میں نئی نئی آئی ہے اور اس ملک میں جو اس کا اصلی وطن نہیں ہے اگر اسے دشمنوں سے سابقہ پڑے تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اس کی استدعا صرف اسی قدر ہے کہ روما کے مجسٹریٹ اسے برات کا موقع دیں اور اس کا بیان سماعت کئے بغیر اس کے خلاف تجویز صادر نہ کریں۔ اگر اسے ایسا موقع دیا گیا تو سلطنت کے قوانین آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں گے لیکن اگر اسے اپنی برات میں زبان ہلانے کی اجازت نہ دی گئی تو اس انصاف کی اغراض پوری نہ ہوں گی جس کے لحاظ سے رومتہ الکبری شہرۂ آفاق ہے۔ کسی شے سے خواہ وہ فی الحقیقت نفرت ہی کے قابل کیوں نہ ہو ایسی حالت میں نفرت کرنا جب کہ ہم کو اس کے متعلق کچھ علم نہ ہو خلاف شیوہ معدلت ہے۔ روما کے قوانین کا تعلق ان افعال سے ہے جو اشخاص سے سرزد ہوں نہ کہ اشخاص کے اسما سے۔ لیکن افسوس ہے کہ بایں ہمہ بعض اشخاص روما کی عدالتوں میں سزایاب ہوئے ہیں نہ اس لئے کہ ان سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ مسیحی کہلاتے تھے۔

اس کے بعد وہ مسیحیت کی ابتدا۔ اس کی ماہیت اور اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس کی بنا عبری اناجیل پر ہے جو سب کتب سے زیادہ متبرک اور قدیم ہیں اور اس مسئلہ کے متعلق مجسٹریٹوں سے اس طرح خطاب کرتا ہے۔ صحف موسیٰ جن میں خدا نے یہودی اور اس لحاظ سے عیسائی مذہب کو ایک بیش بہا خزانہ کی طرح محفوظ کیا ہے

آپ لوگوں کی قدیم ترین کتب بلکہ آپ کی سرکاری عمارات آپ کی قائم کی ہوئی حکومت آپ کے بڑے بڑے شہروں' آپ کے تاریخی کارناموں' آپ کی زبانی یادگاروں اور آپ کی اس ابجد کے حروف کی ایجاد سے بھی زیادہ قدیم ہیں جو علوم و فنون کی موجد اور عجائبات قدرت کی محافظ ہے۔ بلکہ میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صحائف آپ کے دیوتاؤں' آپ کے مندروں' آپ کے غیب گو کاہنوں اور آپ کی رب النوعی قربانیوں سے بھی عمر میں زیادہ ہیں۔ ان صحائف کی تنزیل کا زمانہ محاصرہ ٹرائے سے ایک ہزار سال اور ہومر سے پندرہ سو سال پہلے کا ہے۔ زمانہ راستی کا حلیف ہے اور ارباب فہم و تمیز بجز ان باتوں کے جو محقق اور مسلم ہوں اور جن کی تصدیق زمانہ کر چکا ہو اور کسی بات کو نہیں مانتے۔ ان صحف مقدسہ کی صحت کا سب سے بڑا انحصار ان کی غیر معمولی قدامت پر ہے۔ بسلسلہ بطلیموسیہ کے سب سے زیادہ فاضل فرمانروا ا فلیڈلفس نے جس کی اکملیت مسلم الثبوت ہے ڈیمٹرئس فلیرئس کے مشورہ سے ایک نسخہ ان کتب سماوی کا بہم پہنچایا تھا جو اب تک اس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ان کتُب کے سماوی الاصل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے زمانہ میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے ان میں مذکور ہے اور جو واقعات انسان کو ان کے نازل ہونے کے بعد سے پیش آئے ہیں وہ سب ان میں مندرج ہیں۔

کیا کسی پیشین گوئی کا پورا ہونا اس کی سچائی کی دلیل نہیں ہے؟ ان واقعات نے جو پیش آ چکے ہیں جب ان پیشین گوئیوں کی سچائی پر مہر لگا دی ہے جو ان کے متعلق قبل از قبل کی گئی تھیں تو کیا ان واقعات کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے جن کے وقوع کے متعلق دوسری پیشین گوئیاں اسی قبیل کی موجود ہیں ہم موردالزام قرار دئے جا سکتے ہیں؟ پس چونکہ ہم ان باتوں پر ایمان لائے ہیں جن کے متعلق اناجیل میں پیشین گوئی کی جا چکی ہے اور جو پیشین گوئی کے مطابق ظہور میں آئیں لہٰذا ضرور ہے کہ ہم دوسری باتوں پر بھی ایمان لائیں جو ابھی ظہور میں نہیں آئیں لیکن ان کے متعلق انہیں اناجیل میں دوسری پیشین گوئیاں موجود ہیں۔

اناجیل مقدسہ کی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک ہے جس نے کائنات کو عدم سے پیدا کیا اور جو اگرچہ ہر روز نظر آتا ہے لیکن پھر بھی آنکھوں سے نہاں ہے۔ اس کی غیر محدودیت کا حال بجز اس کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ اس کی بے انتہا بڑائی نے اسے چھپا رکھا ہے لیکن ساتھ ہی ظاہر بھی کر رکھا ہے۔ اس نے انسان کے اعمال حسنہ و سیۂ کے لحاظ سے جزا

و سزا مقرر کی ہے۔ یوم نشور کے دن تمام وہ انسان جو آفرینش کائنات سے اسکے خاتمہ تک پیدا ہو کر مر چکے ہیں اس کے حکم سے دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنے دنیوی قالب اختیار کریں گے۔ اس کے بعد وہ ان کے اعمال کی جانچ کرے گا اور جو نیک ہوں گے انہیں تو لذت جاودانی عطا فرمائے گا اور جو بد ہوں گے انہیں ابدی شعلوں میں جھونک دے گا۔ دوزخ کی آگ سے مراد وہ چھپے ہوئے شعلے ہیں جو قعرزمین میں بھڑک رہے ہیں۔ زمانہ گزشتہ میں وہ منادوں یا پیغمبروں کو اخلاق و روحانیت کی تعلیم کے لیے مامور کر چکا ہے۔ اس قدیم زمانہ کے پیغمبر یہودیوں کی قوم میں پیدا ہوئے اور انہوں نے غیب کی آواز بنی اسرائیل تک پہنچائی جنہوں نے اس آواز کو بشکل اناجیل قلمبند کر لیا۔ ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم ایک انسان کی پرستش کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے خدا کی عبادت نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ہمارے دلوں میں جناب مسیح کی طرف سے جو ارادت و عقیدت جاگزین ہے اس سے خدا کی اس عظمت میں جس کا ہمیں اعتراف ہے کوئی فرق نہیں آتا۔

ان بزرگان دین کی برگزیدگی کی وجہ سے یہودیوں پر خدا نے اپنے خاص احسانات اور برکتیں نازل کیں اور ان کو شرف ہم کلامی عطا کیا۔ تائید ایزدی سے وہ مراتب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ لیکن خبث نفس کے باعث یہ سرکش قوم خدا کو بھول گئی اور اس کے قوانین پر رجس پرستی کو ترجیح دینے لگی۔ اس پر خدا نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر تم باز نہ آؤ گے تو میں تم سے زیادہ وفادار اور اطاعت شعار بندوں کو اپنی رحمتوں کا شرف بخشوں گا لیکن جب ان کے تمرد نے اس انتباہ کو بھی نظرانداز کیا تو خدا نے ان کو ان کے وطن سے خارج کر دیا اور وہ دشت غربت میں سرگشتہ و سراسیمہ بھٹکنے لگے۔ آج وہ تتر بتر ہو کر تمام عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے نصیبوں میں ذلت و خواری ہے۔ وہ دربدر مارے مارے پھرتے ہیں اس ہوا سے ان کے شام ناآشنا ہیں جس کے جھونکوں نے ان کے گہواروں کو جھلایا تھا۔ اس زمین کو ان کی آنکھیں ترس گئی ہیں جہاں انہوں نے اول اول عالم ہستی کا تماشا دیکھا تھا۔ اب ان کا سرپرست نہ خدا ہے نہ انسان۔ خدا نے جس بات کی انہیں دھمکی دی تھی وہ پوری کر کے دکھا دی۔ اس نے دنیا کے دوسرے ممالک اور دوسری اقوام سے ایسے بندوں کا انتخاب کیا جو ان کے مقابلہ میں زیادہ وفادار تھے۔ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے اس نے یہ بشارت دی تھی کہ ان نئے بندوں پر اس کی خاص رحمتوں کا نزول ہو گا اور ان میں ایک مسیحا پیدا ہو گا جو ان میں ایک نئی شریعت کی اشاعت کرے گا۔ یہ مسیحا جناب عیسیٰؑ تھے جو

خدا بھی ہیں اس لئے کہ جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع جلتی ہے اسی طرح ایک خدا سے دوسرا خدا پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا اور اس کا بیٹا متحد الوجود ہیں۔ روشنی دونوں شمعوں کی ایک ہی ہے۔

کتب مقدسہ میں مذکور ہے کہ ابن اللہ کا ظہور دنیا میں دو مرتبہ ہو گا۔ پہلی مرتبہ بحالت عجز و انکسار۔ دوسری مرتبہ محشر کے روز جاہ و جلال کے ساتھ۔ یہودیوں کو یہ کل باتیں ان کے پیغمبر پیشتر سے جتلا چکے تھے لیکن ان کے گناہوں کی تاریکی ان کی آنکھوں پر کچھ ایسی چھا گئی تھی کہ جب وہ پہلی مرتبہ آیا تو انہوں نے اسے بالکل نہ پہچانا اور اس وقت تک اس کی آمد آمد کا فضول انتظار کر رہے ہیں۔ وہ یہی کہتے رہے کہ مسیح کے معجزے آسمانی نشان نہ تھے بلکہ جادو کے کرشمے تھے۔ علمائے مذہب اور پیشوایان دین اس کو حسد کی نظر سے دیکھنے لگے اور حاکم وقت پایلیٹ کے دربار میں جا کر اس پر طرح طرح کے بہتان باندھے۔ اس کو صلیب پر چڑھایا گیا اور جب اس کا دم نکل گیا اور وہ زمین میں دفن کر دیا گیا تو تین دن کے بعد وہ قبر سے اٹھا اور چالیس دن تک اپنے حواریوں میں رہا۔ اس کے بعد وہ بادل میں لپٹا ہوا سیدھا آسمان کو چلا گیا اور یہ وہ واقعہ ہے جس کی شہادت رومیولس یا کسی اور رومی بادشاہ کی معراج کی انسانی شہادت سے بدرجہا زیادہ معتبر ہے۔

اس کے بعد ٹرٹلین نے شیطان اور اس کے گروہ کثیر الانفار کی تکوین اور ماہیت بیان کی ہے اور کہا ہے کہ شیاطین اپنے فرمانروا ابلیس کے حکم سے طرح طرح کی بیماریاں۔ تغیرات ہوا' امراض وبائی اور پیداوار ارضی کی تباہی کے بانی ہوتے ہیں۔ انہیں کے ورغلانے سے انسان بتوں کو بھینٹ دیتا ہے تاکہ انہیں قربانیوں کا خون جو ان کی غذا ہے چوسنے کو ملے۔ شیاطین پرندوں کی طرح سبک سیر ہوتے ہیں اس لئے ربع مسکون میں جو واقعات گذرتے ہیں سب ان کو معلوم ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کی بودوباش ہوا میں ہے لہٰذا ان کو عرش کے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کو دھوکا دے کر غلط باتیں باور کرا دیتے ہیں اور غیب گوئی بھی کرتے ہیں جو انسان کو گمراہ کرتی ہے۔ مثلاً" روما میں شیاطین نے اس واقعہ کا اعلان کیا کہ شاہ پرسیوس پر رومی فوجوں کو فتح حاصل ہو گی لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ پیشین گوئی اس وقت کی گئی جب کہ فتح کی خبر ان کو مل چکی تھی۔ وہ بیماروں کو جھوٹ موٹ اچھا بھی کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ اول تو کسی شخص کے جسم میں حلول کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کوئی نسخہ تجویز کر کے اس کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں اور آسیب زدہ کو یہ خیال ہوتا ہے کہ

اسے واقعی شفا ہو گئی۔

اگرچہ عیسائی شہنشاہ کو خدا نہیں مانتے مگر پھر بھی وہ اس کی ترقی دولت و اقبال کے لئے ہمیشہ دست بدعا رہتے ہیں اس لئے کہ وہ عظیم تہلکہ جو دنیا میں پڑنے والا ہے اور وہ بلائے مبرم جس سے نظام عالم کا شیرازہ بکھرنے کا خوف ہے اسی وقت تک رکی ہوئی ہے جب تک کہ یہ سلطنت قوی شوکت قائم ہے۔ عیسائیوں کی یہ دعا ہے کہ خدا ان کو دنیا کا یہ ہولناک خاتمہ نہ دکھائے۔ وہ فقط ایک جمہوری سلسلہ کے قائل ہیں لیکن یہ سلسلہ تمام عالم کو محیط ہے۔ ان کی ایک برادری ہے۔ وہ ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں اور نجات اخروی کے امیدوار ہیں۔ وہ صرف شہنشاہ اور حکام ہی کے لئے نہیں بلکہ قیام امن کے لئے بھی دعا کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتب مقدسہ کو اس غرض سے پڑھتے ہیں کہ ان کے ایمان میں استواری' ان کی امیدوں میں وسعت اور اس بھروسے میں استحکام پیدا ہو جو انہیں خدا کی ذات پر ہے۔ ان کی مجلسیں افہام و تفہیم کی غرض سے منعقد ہوتی ہیں۔ وہ بدکرداروں کو اپنی جماعت سے خارج کر دیتے ہیں اور ان کے پیشوایان دین ان کے افراد کی رائے سے منتخب ہوتے ہیں جنہیں ان کا اقتدا کرنا ہوتا ہے۔ ہر مہینہ کے ختم پر ہر جماعت کے ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی مقدرت کے موافق کچھ رقم بطور چندہ دے لیکن چندہ دینے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ جو رقم اس طور پر جمع ہوتی ہے وہ گویا چندہ دینے والوں کے زہد و اتقا کی ضمانت ہے۔ یعنی اپنے نفس کی آسائش پر صرف نہیں کی جاتی بلکہ مساکین کی پرورش اور تجہیز و تکفین بیکس اور نادار یتیم بچوں کی خبر گیری۔ ضعیف العمر خادمان دین کی امداد اور ان لوگوں کی اعانت میں اٹھائی جاتی ہے جن کے جہاز تباہی میں آ گئے ہوں یا جن کو دین حق پر ثابت قدم رہنے کی وجہ سے جلاوطنی یا قید یا کانوں میں مزدوری کرنے کی سزا دی گئی ہو۔ عیسائیوں میں بجز ان کی بیبیوں کے اور کل مال و متاع مشترک الاستعمال ہے۔ نہ تو وہ اس حرص سے پیٹ بھرتے ہیں کہ گویا کل ہی مر جائیں گے اور نہ عمارتیں ایسی عالیشان بناتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامت کے بوریئے لپیٹیں گے۔ ان کی زندگی کا مقصد پاکبازی' انصاف' صبر' اعتدال اور عصمت ہے۔

ٹرٹلین نے جہاں اپنے زمانہ کے مسیحی عقائد اور روش زندگی کی یہ دلپذیر تصویر کھینچی ہے وہاں حکام عدالت کو ایک عظیم الشان واقعہ کے متعلق جو عنقریب پیش آنے والا تھا ان الفاظ میں بے دھڑک دھمکی بھی دی ہے۔ اگرچہ ہماری جماعت کے قیام کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن وہ کونسا مقام ہے جہاں ہم موجود نہیں۔ شہر۔ قلعے۔ جزیرے۔ صوبے۔

انجمنیں۔ شہر کے گلی کوچے، شاہی محلات، وکلائے جمہور کے اجلاس، فوجی بارکیں غرض ہر اس مقام پر جو آپ لوگوں کی قوت کی خارجی علامت ہے ہم لوگ برابر پائے جاتے ہیں۔ بجز آپ کے مندروں کے ہم نے آپ کے قبضہ میں اور کوئی شے نہیں چھوڑی۔ غور کیجئے کہ اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان عظیم بپا کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کو ہمارا مذہب جس کی تعلیم یہ ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے نہ روکے ہوئے ہو تو کس سرعت اور مستعدی سے ہم مسلح ہو کر آپ کے خلاف معرکہ آرا ہو سکتے ہیں۔

اپنا بیان صفائی ختم کرنے سے پیشتر ٹرٹلین نے اس دعوے کا ازسرنو ذکر کیا ہے جس پر ازمنہ مابعد میں عملدرآمد ہونے سے یورپ کی علمی ترقیوں پر ایک بہت بڑا اثر پڑا۔ اس کا دعوی یہ ہے کہ کتب مقدسہ کو وہ گنج شائیگان سمجھنا چاہئے جس سے دنیا نے علوم و فنون اور دانش و حکمت کے موتی اور جواہر ریزے حاصل کئے ہیں۔ اگر کسی حکیم نے فلسفہ کا کوئی نکتہ بیان کیا ہے تو انہیں صحف کے اسرار حکیمہ سے فیض پا کر اور اگر کسی شاعر کو کوئی اچھوتا مضمون ہاتھ آیا ہے تو انہیں مقدس کتابوں کی تخیل آفرینی کی بدولت۔ غرض اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد جدید و عتیق صدق و حقیقت کا معیار مطلق ہیں اور جو مسئلہ ان کے اصول کے مطابق نہ ہو وہ لامحالہ غلط ہے۔

ٹرٹلین کی اس فاضلانہ تحریر سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جب عیسائیت معاندین و مخالفین کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنی ہوئی زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو اس وقت اس کی کیا حالت تھی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ شہنشاہانہ اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس میں کیا تبدیلی پیدا ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیویرس کے زمانہ کی عیسائیت اور قسطنطین کے زمانہ کی عیسائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بت پرستی اور مذہب عیسوی کے مخلوط ہو جانے کے دو بڑے اسباب تھے۔ اول نئے خاندان شاہی کی ملکی مصلحتیں اور سیاسی ضرورتیں۔ دوم وہ طرز عمل جو نئے مذہب نے اپنی اشاعت کے لئے اختیار کیا۔

1- اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنی گون کا سمجھا اسے تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی نہ حاصل ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا استیصال کلی کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بارہ میں یہ بڑا فرق ہے کہ

اسلام نے اپنے مدمقابل کو مطلقاً" نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقائد کو بلا کسی آمیزش کے شائع کیا۔

قسطنطین کا طرزِ عمل ہمیشہ اس کے اس عندیہ کی شہادت دیتا رہا کہ وہ اپنی رعایا کے کل طبقوں کو ایک آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے فریق کامیاب کی وکالت کو اپنی فرمانروائی کا اصول نہیں قرار دینا چاہتا۔ پس جہاں اس نے گرجا تعمیر کئے بت پرستوں کے لئے مندر بھی بنوا دئے۔ اگر پادریوں کی سرگوشیوں پر کان دھرا تو بت پرست کاہنوں سے بھی مشورہ کیا۔ نائسیا کی مسیحی کونسل منعقد کی تو دولت کے بت پر بھی چڑھاوے چڑھائے۔ اصطباغ کی رسم کو قبول کیا تو ایک تمغہ بھی مسکوک کرایا جس پر اس کا ربانی لقب ثبت تھا۔ قسطنطنیہ میں سنگ سماق کے ایک مینار کی چوٹی پر اس کا جو مجسمہ نصب کیا گیا وہ اصل میں اپالو دیوتا کی ایک قدیم مورت تھی جس کے خط و خال بدل کر قسطنطین کی صورت سے مشابہ بنا دئے گئے اور سر کے گرداگرد وہ میخیں جن کی نسبت بیان کیا جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرتے وقت کام میں لائی گئی تھیں اس صنعت گری کے ساتھ جمائی گئیں کہ عظمت و جلال کے تاج کی شکل پیدا ہو گئی۔

اس خیال سے کہ بت پرستوں کے دل میں شکست نے جو ناسور ڈال دیا ہے اس کا اندمال مراعات خاص اور نوازشہائے پنہاں کے مرہم سے ضروری ہے قسطنطین نے اپنے دربار میں بت پرستی کی رسموں کی تجدید و ترویج سے نہ صرف اغماض کیا بلکہ ان کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کوششوں میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے اسی کے خاندان کے اراکین تھے۔

2- اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت تھے اپنا ذاتی فائدہ سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اسی میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت و ارتباط پیدا کیا جائے۔ اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا اس لئے کہ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخرکار نجاستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔ اس انضمام و اختلاط کی بزم آرائی میں شہنشاہ کی ماں ہلینا نے شاہی دربار کی بیگمات کے ساتھ مل کر شمع انجمن کا کام دیا۔ مصلحت شناس اور مزاجدان لوگوں کو ملکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ایک نئی تدبیر ہاتھ آ گئی۔ بیت المقدس کے ایک

غار سے حضرت عیسیٰؑ کی صلیب۔ دونوں چوروں کی صلیبیں۔ واقعہ تصلیب کا کتبہ اور وہ میخیں جو اس موقع پر استعمال میں لائی گئی تھیں تین صدیوں تک امانت رہنے کے بعد بر آمد کی گئیں۔ اور ایک مناسب حال معجزہ سے جس کے تصنیف کرنے میں ان بزرگواروں کو ذرا بھی دقت پیش نہ آئی ان متبرک آثار کی تصدیق بھی ہو گئی۔ غرض اچھی خاصی آثار پرستی شروع ہو گئی۔ یونانیوں کے اوہام باطلہ از سرنو نمودار ہو گئے اور اس زمانہ کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی جب کہ وہ آلات جن سے محاصرہ ٹرائے کا مشہور برنجی گھوڑا تیار کیا گیا تھا میٹاپانٹم میں رکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ جب کہ پیلاپس کا عصائے شاہی کرونیا میں۔ اسکلیز کا نیزہ فیسلس میں اور میمنن کی تلوار نکومیڈیا میں کانہا موجود تھی۔ جب کہ اہل ٹیجیا کیلیڈونیا کے جنگلی سور کی کھال دکھا سکتے تھے اور بہت سے شہروں کو یہ دعویٰ تھا کہ ان کے پاس شہر ٹرائے کے محافظ دیوتا کا اصلی بت موجود تھا۔ جب کہ منرواد یبی کے اپنے ایسے مجسّمے پیش کئے جا سکتے تھے جو برچھے لا سکتے تھے۔ ایسی ایسی تصویریں دکھائی جا سکتی تھیں جو ہنس سکتی تھیں۔ ایسی ایسی مورتیں موجود تھیں جنہیں پسینہ آ سکتا تھا اور ایسے ایسے ہزارہا معبد اور ہیکل اطراف ملک میں پھیلے ہوئے تھے جہاں معجزوں سے مریض اچھے کئے جا سکتے تھے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ اولمپس تو وہی پہلا سا موجود ہو گیا مگر دیوتاؤں کے نام بدل دیئے گئے۔ سلطنت کے جن صوبوں کی قوت بڑھی ہوئی تھی وہاں کے باشندوں نے علی الرغم مذہب شاہی اپنے قدیم عقائد اختیار کر لئے۔ عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا۔ نہ صرف آئسس کی پرستش بہ تبدیل نام از سرنو ہونے لگی بلکہ اس کا بت بھی جو کسی زمانہ میں ایک ہلال کے قوس پر رکھا ہوا نظر آیا کرتا تھا از سرنو نمودار ہو گیا۔ اس دیبی کا مجسمہ جو گود میں اپنے بچے ہورس کو لئے ہوئے ہے بت تراشی اور نقاشی کی صنعتوں کے ذریعہ سے ہمارے زمانہ تک حضرت مریم اور ان کے معصوم فرزند کی دلربا تصویر کی شکل میں پہنچا ہے۔ نئے لباس میں قدیم تصورات کی اس تجدید کا ہر جگہ بہ اشتیاق تمام خیر مقدم کیا گیا۔ جب اہل افیرشیا کے سامنے اس امر کا اعلان کیا گیا کہ وہاں کی مسیحی مجلس نے بصدارت بطریق سائرل یہ فیصلہ کیا ہے کہ مریم عذرا کو "خدا کی ماں" کے لقب سے یاد کیا جائے تو ان لوگوں نے خوشی کے آنسوؤں سے اپنے بطریق کے قدم دھوئے۔ یہ اشک ریزی اسی قدیم ناسور کی تراوش تھی جس پر اگرچہ مسیحیت

کے اثر کی وجہ سے انگور آچلا تھا مگر مادہ فاسد ہنوز اندر باقی تھا۔ اگر ان کے آباؤاجداد کے زمانہ میں ڈاینا دیبی کے لئے یہی بات کی جاتی جو جناب مریم کے لئے کی گئی تو ان کے دلوں پر بھی یہی اثر ہوتا۔

دنیادار نو مسیحیوں کی تالیف قلوب کا یہ طریقہ جس پر ان کے رسوم و عقائد کے اختیار کر لینے سے عمل کیا گیا ان لوگوں کے اعتراض سے نہ بچا جن کی بصیرت اس کی علت غائی کی تہ کو پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ فاسٹس نے قیصر آگسٹائین سے برملا ان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا: "تم میں اور بت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تمہاری جماعت علیحدہ ہے اور ان کی جماعت علیحدہ۔ ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی سے ہیں۔ ان کے ہاں قربانیاں ہوتی ہیں جن میں بدمستیوں کا زور ہوتا ہے تمہارے ہاں بزم محبت ترتیب دی جاتی ہے جو مذہبی شکل میں ہوسناکی اور عیش پرستی کا دوسرا نام ہے۔ ان کے ہاں بت پجتے ہیں۔ تمہارے ہاں شہداء اولیا کی پرستش ہوتی ہے۔ تم ان کی طرح مردوں کی روحوں کی تواضع شراب و کباب اور چنگ و رباب سے کرتے ہو۔ بت پرستوں کے تمام مذہبی تہوار تمہارے ہاں اسی ذوق و شوق سے منائے جاتے ہیں۔ غرہ ماہ اور راس الجدی و راس السرطان میں آفتاب کی تحویل کے وقت تم وہی رسمیں ادا کرتے ہو جو بت پرستوں کے ہاں رائج ہیں اور طرز ماند و بود اور عادات و اطوار کے لحاظ سے تو تم میں ان میں مطلق فرق نہیں۔" غرض کہ بت پرستی کے تمام رسم و رواج جاری ہوئے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ شادیوں میں عشق و محبت کی دیبی وینس (زہرہ) کے بھجن گائے جاتے تھے۔

اس مقام پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ عیسائیت کے ساتھ بت پرستی کے شامل کر دینے کی اس چال نے بالآخر لوگوں کو انحطاط عقلی کے کس طبقہ سافل تک پہنچا دیا۔ بت پرستی کی رسمیں اختیار کر لی گئیں۔ پرستش کے نمائشی اور بھڑک دار طریقے جاری ہو گئے۔ پادریوں نے پرتکلف لباس اور ٹوپیاں اور تاج پہننے شروع کر دیے۔ کافوری شمعیں۔ سونے چاندی کے گلدان مراسم مذہبی کے لوازم میں داخل ہو گئے۔ عبادت میں براتوں کے جلوس کی سی دھوم دھام نظر آنے لگی۔ قربانی کے ذریعہ سے طہارت ہونے لگی۔ رومی بت پرست کاہنوں کی جادو کی چھڑی عیسائی اسقف کی حکومت ملی کا عصا بن گئی۔ گرجا شہدا کے مزاروں پر بنائے جانے لگے اور ان کی تطہیر و تقدیس ان رسموں کے ذریعہ سے ہونے لگی جو سلف میں بت پرست پجاریوں کے ہاں رائج تھیں۔ جھوٹ سچ جہاں کہیں

کسی شہید کے کچھ آثار بہم پہنچ گئے فوراً" ان کی یادگار میں میلے اور عرس قائم کر دیے گئے۔ خدا کے غضب کو فرو کرنے اور آسیب اتارنے کا سب سے بڑا ذریعہ فاقہ کشی قرار دیا گیا۔ بیت المقدس اور شہدا کے مزاروں کی زیارت و طواف کے لئے لوگ ہزارہا کوس چل کر جاتے تھے۔ بیت المقدس سے منوں خاک دھول لا کر لوگ موتیوں کے مول بیچتے تھے اور اس مٹی کو شیطان کے دفیعہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ دم کئے ہوئے پانی کے اوصاف و خواص میں تو کسی کو کلام ہی نہ تھا۔ مورتیں اور تبرکات گرجاؤں کے ضروری لوازم تھے اور خوش عقیدہ لوگ بتوں کی طرح ان کو بھی پوجتے تھے۔ جس طرح زمانہ سابق میں بت پرستوں نے بعض مقامات کو خوارق عادات اور معجزات کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اسی طرح خاص خاص مقامات عیسائی دنیا میں بھی اعجاز و کرامات کے مرکز قرار دیے گئے۔ عیسائیوں کی نجات یافتہ روحوں کو حاضرات کے طریقہ پر طلب کیا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ روحیں اطراف عالم میں بھٹکتی پھرتی ہیں یا اپنے مقابر کے اوپر منڈلا رہی ہیں۔ مندروں اور قربان گاہوں کی تعداد خارج از حد شمار تھی۔ توبہ اور ازالہ معصیت کے لئے خاطی کو جو تکلیف دہ اور ایذارسان لباس پہننا پڑتا تھا اس کی بہت سی قسمیں تھیں۔ حضرت مریم کی عید تطہیر کا تہوار اس غرض سے قائم کیا گیا کہ جو بت پرست نئے نئے عیسائی ہوئے تھے ان کے دلوں سے پین دیوتا کے یوم جشن کے منسوخ ہونے کی کھٹک جاتی رہے۔ مورتوں صلیب کے ٹکڑوں ہڈیوں کیلوں اور دوسرے تبرکات کی پرستش عام رواج پا گئی گویا اچھی خاصی جماد پرستی رائج ہو گئی۔ ان آثار متبرکہ کی تصدیق کا انحصار دو براہین پر تھا یعنی پادریوں کے حکم یا معجزات کے اظہار پر۔ اولیا کے پھٹے پرانے کپڑوں اور ان کی قبروں کی خاک تک متبرک سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ فلسطین سے کچھ بوسیدہ ہڈیاں لائی گئیں اور ان کی نسبت بوثوق تمام یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرت مرقس اور حضرت جیمس اور دوسرے اولیائے عہد سابق کے آثار جسمانی ہیں۔ بت پرستی کے زمانہ میں انسان کو دیوتا بنا دیا جاتا تھا عیسائیوں نے اسے ولی کر دکھایا کہ اسکا تصرف بھی معاملات انسانی میں ربانی مداخلت سے کسی طرح کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ مقامی دیوتاؤں کی جگہ مقامی پیر اور اولیا قائم ہو گئے۔ اس کے بعد عشائے ربانی کی پراسرار رسم کا ظہور ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ پادری کے عمل سے روٹی اور شراب مسیح کے گوشت اور خون کی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ مرور قرون نے عیسائیت اور بت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل و مکمل کر دیا۔ نئے نئے تہوار منائے جانے لگے جن میں سے ایک تو اس برچھے کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا جس سے حضرت

عیسیٰؑ کے پہلو میں چرکا دیا گیا تھا۔ ایک ان میخوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے قائم کیا گیا تھا جن سے آپ کا جسم صلیب میں جڑ دیا گیا تھا اور ایک سے کانٹوں کے اس تاج کی یاد تازہ رکھنا مقصود تھا جو مصلوب کرتے وقت آپ کو پہنچا دیا گیا تھا۔ اگرچہ بیسیوں خانقاہوں میں کانٹوں کا یہ بے بہا تاج موجود تھا لیکن زمانہ کا یہ رنگ تھا کہ کوئی شخص یہ کہنے کی جرات نہ کر سکتا تھا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سب کے سب تاج اصلی ہوں۔

پادری نیوٹن نے اس تعلق کی نسبت جو عیسائیت اور بت پرستی میں پیدا ہو گیا تھا۔ جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کا اقتباس اس مقام پر خالی از فائدہ نہ ہو گا۔ وہ کہتے ہیں۔ "کیا آج کل اولیا و ملائکہ کی پرستش ہر اعتبار سے زمانہ سابق کی پرستش شیاطین سے مشابہ نہیں ہے؟ صرف نام کا فرق ہے۔ باقی سب کچھ یکساں ہے۔ بت پرست اپنے بزرگوں کو دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔ عیسائیوں نے اپنے بزرگان دین کو خدا بنا رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس قسم کی پرستش کو مذہب عیسوی میں رائج کیا وہ خوب جانتے تھے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک طریقہ عبادت کی جگہ دوسرے طریقہ عبادت نے لے لی ہے اور چونکہ دونوں طریقے دراصل ایک ہی ہیں لہذا ان کی رسمیں بھی ایک ہی سی ہیں۔ وقت واحد میں متعدد قربانگاہوں پر لوبان یا خوشبوی کی دھونی دینا۔ گرجاؤں کو جاتے اور وہاں سے واپس آتے وقت آب متبرک یا نمک ملے ہوئے پانی کا ان میں چھڑکاؤ کرنا۔ دن دوپہر صدہا چراغوں اور موم بتیوں کا بتوں کی قربانگاہوں اور مورتوں کے سامنے جلانا۔ بیماریوں اور خطروں سے فوق العادت طور پر شفا یا نجات پانے کے شکرانہ میں نذر و نیاز گذرانا اور منتیں چڑھانا۔ گذرے ہوئے بزرگان دین کو ولی یا خدا قرار دینا۔ ہر ایک صوبہ یا ضلع کو کسی گذرے ہوئے نامور بہادر یا ولی یا پیر کی حمایت میں خاص طور سے سونپنا' قبروں اور مزاروں پر جا کر مردوں کی پرستش کرنا یا ان کے آثاروں کو پوجنا۔ بتوں کی تقدیس اور ان کو سجدہ کرنا اور ان کو صاحب اعجاز و کرامات جاننا۔ گذرگاہوں' شاہراہوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بت خانوں' قربان گاہوں اور مورتوں کا قائم کرنا۔ گاجے باجے دھوم دھڑکے کے ساتھ بتوں اور آثاروں کے جلوس نکالنا۔ خاص خاص اوقات پر مجاہدہ اور ریاضت کے دھوکے میں جسم کو درے مار مار کر ایذا پہنچانا۔ پادریوں کے مختلف فرقے اور برادریاں قائم کرنا۔ پادریوں کا خاص انداز سے اپنی چاند منڈوانا۔ ازدواجی تعلقات سے عمر بھر محترز رہنے کو جنس ذکور و اناث دونوں کے زہد و اتقا کی دلیل سمجھنا۔ یہ سب وہ رسمیں ہیں جو اور بہت سی رسموں کے ساتھ بت پرستوں اور پوپ روما کے پیروؤں کے توہمات کی اجزا سے لاینفک

ہیں اور یہی نہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہی مندر اور وہی بت جو ایک زمانہ میں جوپیٹر اور اس کی برادری کے دوسرے خناسوں سے نامزد تھے آج مریم عذرا اور دوسرے مسیحی اولیا سے منسوب ہیں۔ دونوں کی عبادت کی رسمیں اور کتبے ایک سے ہیں اور جو معجزے اور کرامتیں زمانہ سلف میں بت پرستوں کا منہاج ارادت تھیں وہی آج کے دن مسیحیوں کی عقیدت کی تکیہ گاہ ہیں۔ غرض کل کی کل بت پرستی مسیحیت میں منتقل ہو گئی ہے۔ دونوں کا مبدا و منشا ایک ہی اصول و فروع ایک ہیں۔ یہاں تک کہ قدیم و جدید اور بت پرست و مسیحی روما میں طریقہ عبادت کے لحاظ سے نہ صرف توافق بلکہ تطابق تام پایا جاتا ہے۔"

پادری نیوٹن صاحب کی رائے سے استفادہ کرنے کے بعد ہم پھر قسطنطین کے زمانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ قدیم اور عام پسند عقائد کی بقا بلکہ ان کی ترویج میں ان مراعات و بدعات کے ذریعہ سے حصہ لیا گیا لیکن مسیحی فریق نے جو فریق غالب تھا اپنے فیصلوں کو بزور حکومت نافذ کرانے میں کبھی بھی ایک لمحہ کا تامل نہ کیا اور حکومت کی طرف سے بھی ان فیصلجات کے نفاذ میں پوری طرح سے تائید کی گئی۔ اس طور پر قسطنطین نائسیا کی کونسل کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرتا رہا۔ ایریئسؒ کے معاملہ میں تو اس نے یہاں تک حکم دے دیا کہ جس شخص کو اس کافر اکفر کی کوئی کتاب ملے اور وہ اسے جلا نہ ڈالے اس کی گردن ماری جائے۔ اسی طرح شہنشاہ تھیوڈوسیس اصغر کے زمانہ میں نسطور کو جلاوطنی کی سزا دے کر صحرائے افریقہ کے ایک دوردراز حصہ میں جہاں درختوں کے ایک جھنڈ اور پانی کے ایک چشمہ کے سوا صدہا فرسنگ تک ریگ رواں اور سموم سوزان کا عمل تھا بھیج دیا گیا۔

بت پرست فریق میں سلطنت کے قدیم طبقہ امرا کے بہت سے ذی وجاہت خاندان شریک تھے اور پرانے فلسفیانہ مذاہب کے تمام پیرو اس کے حامی و مددگار تھے۔ (فریق مخالف کو یہ لوگ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کا یہ دعوی تھا کہ انسان کو علم صرف مشاہدہ اور عقل کے ذریعہ سے محنت اٹھانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

بہ خلاف اس کے مسیحی فریق کا یہ دعوی تھا کہ کل علم اناجیل و روایات کلیسا میں محفوظ ہے اور خدا اپنی الہامی کتابوں میں انسان کے لئے نہ صرف حق و صدق کا معیار قرار دے چکا ہے بلکہ اس کی دانست میں جن باتوں کا جاننا ہمارے لئے ضروری تھا وہ سب ہمیں بتا چکا ہے۔ اس لئے کتب مقدس انسانی معلومات کا مجموعہ ہیں جس پر اضافہ ہوا غیرممکن ہے

اور اس علمی اجارہ میں پادری بحمایت شہنشاہ کسی رقیب یا حریف کی مسابقت گوارا نہیں کریں گے۔

یہاں سے علم کی دو قسمیں ہو گئیں علوی و سفلی اور دو مخالف فرقے پیدا ہو گئے جن میں سے ایک نے اپنا ہادی و رہبر عقل کو قرار دیا اور دوسرے نے الہام کو۔ بت پرست جماعت کو اپنے فلاسفہ کے علم و فضل پر غرہ تھا اور عیسائیوں کو اپنے بزرگان دین کے الہام پر۔

اس طور پر کلیسا نے علم و حکمت کا مبداء و منشا بن کر اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اس کے فیصلوں کی تکمیل کے لئے زور حکومت ہر وقت تیار رہنے لگا۔ اس طرز عمل نے اس کے آئندہ کارناموں پر جبر و تحکم کی مہر لگا دی اور ایک ہزار سال تک وہ یورپ کی دماغی ترقی کا سدراہ بنا رہا۔

قیصر قسطنطین کے عہد سے مسیحیت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جب کہ اس نے مذہبی رنگ چھوڑ کر سیاسی رنگ اختیار کیا اور اسے دنیوی سلطنت حاصل کرنے کی فکر شروع ہوئی۔ اگرچہ ایک لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مذہب گرتے گرتے بت پرستی کی شکل میں مسخ ہو گیا لیکن دوسرے اعتبار سے یہ کہنا بھی نادرست نہ ہو گا کہ اس نے ترقی کرتے کرتے قدیم یونانی اصنم پرستی کی نشوونما پذیرفتہ صورت اختیار کر لی۔ یہ اصول کہ جب دو جسم آپس میں ٹکراتے ہیں تو دونوں کی صورت بدل جاتی ہے طبعیات و عمرانیات دونوں پر یکساں صادق آتا ہے۔ بت پرستی نے مذہب عیسوی کے اصول میں تغیر پیدا کر دیا اور مذہب عیسوی نے بت پرستی کی ہیئت بدل دی۔

مصر میں جہاں قدیم الایام سے تثلیث کا زور رہا ہے مسیحی تثلیت کے معرکتہ الارا مسئلہ کا چھڑنا ایک لازمی بات تھی۔ سب سے زیادہ اہم بحث اس مسئلہ میں یہ تھی کہ ابن اللہ ہونے کی حیثیت سے مسیح کا کیا درجہ قرار دیا جائے۔ اسکندریہ میں ان دنوں ایک پادری ایریس نامی رہتا تھا جو ایک دفعہ بشپ (اسقف) کی خدمت کا امیدوار تھا مگر محروم رہا۔ اس نے یہ بحث پیش کی کہ بلحاظ رشتہ فرزندی و پدری ضرور ہے کہ ایک وقت ایسا ہوا ہو جب کہ بیٹے کا وجود نہ تھا۔ اس لئے کہ باپ کی عمر بیٹے سے زیادہ ہونی چاہئے۔ پس حضرت مسیح نے یہاں تک حکم دے دیا کہ جس شخص کو اس کافر اکفر کی کوئی کتاب ملے اور وہ اسے جلا نہ ڈالے اس کی گردن ماری جائے۔ اسی طرح شہنشاہ تھیوڈوسیس اصغر کے زمانہ میں نسطور کو جلاوطنی کی سزا دے کر صحرائے افریقہ کے ایک دور دراز حصہ میں جہاں درختوں کے

ایک جھنڈ اور پانی کے ایک چشمہ کے سوا صد ہا فرسنگ تک ریگ رواں اور سموم سوزان کا عمل تھا بھیج دیا گیا۔

بت پرست فریق میں سلطنت کے قدیم طبقہ امراء کے بہت سے ذی وجاہت خاندان شریک تھے۔ اور پرانے فلسفیانہ مذاہب کے تمام پیرو اس کے حامی و مددگار تھے۔ فریق مخالف کو یہ لوگ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا یہ دعوی تھا کہ انسان کو علم صرف مشاہدہ اور عقل کے ذریعہ سے محنت اٹھانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

بہ خلاف اس کے مسیحی فریق کا یہ دعوی تھا کہ کل علم اناجیل و روایات کلیسا میں محفوظ ہے اور خدا اپنی الہامی کتابوں میں انسانوں کے لئے نہ صرف حق و صدق کا معیار قرار دے چکا ہے بلکہ اس کی دانست میں جن باتوں کا جاننا ہمارے لئے ضروری تھا وہ سب ہمیں بتا چکا ہے۔ اس لئے کتاب مقدس انسانی معلومات کا مجموعہ ہے جس پر اضافہ ہونا غیر ممکن ہے۔ اور اس علمی اجارہ میں پادری بحمایت شہنشاہ کسی رقیب یا حریف کی مسابقت گوارا نہیں کریں گے۔ احتساب مذہبی لوگوں کے عقائد کی جانچ پڑتال کے لئے قائم کیا۔ ایک شاہی فرمان اس مضمون کا صادر ہوا کہ جن لوگوں کے عقائد روما کے بشپ ڈماسس اور اسکندریہ کے بشپ پیٹر کے عقائد کے مطابق نہ ہوں گے وہ جلاوطن کئے جائیں گے اور ان کے حقوق چھین لئے جائیں گے۔ اور جو شخص ایسٹر کی عید اسی روز منائے گا جس روز یہودی مناتے ہیں اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یونانی زبان کا چرچا مغرب میں بہت ہی کم ہوتا جاتا تھا اور علوم صحیح مفقود ہو گئے تھے۔

اس زمانہ میں اسکندریہ کا بشپ تھیا فیلس تھا۔ اسیرس کا ایک قدیم مندر مسیحیوں کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ اس کو مسمار کر کے اس کی جگہ گرجا بنایا جائے۔ نئی عمارت کی بنیاد کھودتے وقت قدیم پرستش کے بعض فحش آثار برآمد ہوئے۔ تھیا فیلس نے حیا و شرم کے جذبات کو حرارت مذہبی کے طاق پر رکھ کر ان علامات قبیحہ کی تشہیر کی۔ تثلیث کی بحث کے زمانہ میں جب عیسائیوں کے مذہب کی ناٹکوں میں توہین و تذلیل کی جاتی تھی اس وقت بیچارے عیسائی تو چپ چاپ رہے لیکن اس موقع پر جب کہ خود بت پرستوں کی باری آئی تو ان سے ضبط و تحمل نہ ہو سکا۔ وہ فساد پر آمادہ ہو گئے اور ایک عام بلوہ ہو گیا۔ "سر تیپن" کو انہوں نے اپنا بنگاہ بنایا اور وہ فساد اور خونریزی ہوئی کہ شہنشاہ کو مداخلت کرنی پڑی۔ اس نے تھیا فیلس کے نام اس مضمون کا فرمان بھیجا کہ "سر تیپن" کو منہدم کر دیا جائے۔ اس طرح وہ عظیم الشان اور قدیم کتب خانہ جس کو تاجداران سلسلہ بطلیموسیہ نے جمع کیا تھا اور

جو جولیس سیزر کی آتش زنی سے بچ رہا تھا اس جاہل و متعصب پادری کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔

تھیا فیلس کے بعد اسکندریہ کی دینی پیشوائی کی خدمت اس کے بھتیجے سینٹ سایرل کو ملی جو اپنے دلپذیر اور پر تاثیر مواعظ و خطبات کی وجہ سے اسکندریہ کے مذہبی حلقوں میں مشہور و ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ حضرت مریم کی پرستش اسی کی کوششوں سے اسکندریہ میں عام ہو گئی۔ لیکن جو اثر اس کی عام پسند تقریروں نے اہل اسکندریہ کی نیمچن طبیعتوں میں پیدا کیا تھا اسے ایک عورت ہائی پیشیا نامی نے بہت کچھ کمزور کر دیا۔ ہائی پیشیا جس کا باپ تھیان بڑے پایہ کا مہندس تھا نہ صرف فلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کی شارح تھی بلکہ اپالونیس اور دوسرے مہندسوں کی تصانیف پر بھی اس نے عالمانہ شرحیں لکھی تھیں۔ ہر روز اس کے مدرسہ کے سامنے امرا و اعیان کے رتھوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ اور اسکندریہ کے تمام وضیع و شریف اس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ جن مسائل پر اس کی تقریریں ہوتی تھیں وہ وہی معمے ہیں جن پر ہمیشہ سے بحث ہوتی چلی آئی ہے لیکن آج تک حل نہیں ہو سکے یعنی "میں کیا ہوں"؟ "کون ہوں؟" "کہاں ہوں؟" اور "میرے علم کی کیا حد ہے؟"

ہائی پیشیا اور سایرل! ایک کو علم و حکمت میں تبحر دوسرے کو جہل و تعصب میں توغل!! بھلا اجتماع ضدین کیونکر ممکن تھا؟ سایرل نے سمجھ لیا کہ اگر یہی لیل و نہار رہا تو ہائی پیشیا کے آگے اس کی مشیخت کا چراغ گل ہو جائے گا اور یہ سمجھ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بن پڑے اپنے حریف کا خاتمہ کر دے۔ ایک دن ہائی پیشیا مدرسہ کو جا رہی تھی کہ سایرل کی امت کے ایک گروہ کثیر الانفار یعنی بہت سے پادریوں نے اسے آ گھیرا۔ ان سب نے مل کر بیچ بازار میں اس کے کپڑے نوچ کھسوٹ ڈالے اسے بالکل برہنہ کر دیا اور پھر کھینچتے گھسیٹتے ہوئے ایک گرجا میں لے گئے جہاں عصائے پطرس کی متواتر ضربوں سے اس کا سر توڑا گیا۔ اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ گوشت و پوست کو سیپوں سے چھیلا گیا اور ہڈیاں آگ میں جھونک دی گئیں۔ اس خوفناک جرم کے متعلق سایرل سے جواب تک نہ لیا گیا۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ چونکہ مقصد محمود تھا اس لئے اس کی تکمیل کا جو ذریعہ اختیار کیا گیا وہ بھی محمود ہو گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی یونانی فلسفہ کا اسکندریہ سے چرچا اٹھ گیا اور اس علم کا جس کی اشاعت کے لئے فرمانروایان سلسلہ بطلیموسیہ نے اس قدر کوششیں کی تھیں قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ "سیرتپین" کا کتب خانہ برباد ہو ہی چکا تھا جو کچھ رہی سہی امنگیں فلسفہ و

حکمت کے اکتساب کی دلوں میں باقی تھیں ان کا ہائی پیشیا کے عبرتناک انجام نے یوں خون کر دیا۔ انسانی خیال کے پاؤں میں مذہب نے بیڑیاں ڈال دیں۔ آزادی خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ غرض ۴۱۴ء وہ تاریخ ہے جب کہ انسان کو متنبہ کر دیا گیا کہ ہر شخص صرف انہیں خیالات کو ذہن میں جگہ دے سکتا ہے جس کی اجازت حکام کلیسا صادر کریں۔ ا۔تھینز میں بھی فلسفہ دم توڑ رہا تھا۔ جسٹینین نے اس کی تعلیم کی ممانعت کر دی اور اس شہر کے تمام مدارس بند کر دیئے۔

سلطنت روما کے مشرقی صوبجات میں تو یہ واقعات گذر ہی رہے تھے لیکن مغرب میں بھی وہ قوت رنگ لائے بغیر نہ رہی جو ان واقعات کی محرک ہوئی تھی۔ ایک برطانوی راہب جس نے اپنا نام پلیجس رکھ لیا تھا مغربی یورپ اور شمالی افریقہ کے علاقوں سے ہو کر گذرا۔ وہ جہاں جاتا تھا یہ وعظ کرتا تھا کہ موت دنیا میں حضرت آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے نہیں آئی بلکہ وہ طبعاً" اور فطرتاً" فانی تھے اور اگر ان سے گناہ سرزد نہ بھی ہوتا جب بھی وہ ضرور مرتے۔ ان کے گناہوں کی ذمہ داریاں انہیں کی ذات تک محدود تھیں جو ان کی اولاد پر کسی طرح عائد نہیں ہوتیں۔ ان صغری و کبری سے پلیجس نے جو مذہبی نکتے اخذ کیے وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت کچھ نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔

روما میں پلیجس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن کارتھج میں سینٹ آگسٹائن کے ایما سے اس پر بہت کچھ لے دے ہوئی۔ اور اسے بدعتی قرار دیا گیا۔ ڈا۔سپولس میں ایک بڑی مجلس ان الزامات کی تحقیقات کے لئے منعقد کی گئی جو اس پر لگائے گئے تھے اور اگرچہ ارکان مجلس نے اسے بری کر دیا لیکن جب انوسنٹ اول روما کے بطریق اعظم سے اس معاملہ مین استفتا کیا گیا تو اس نے پلیجس کی تکفیر کا فتوی صادر کیا۔ اس فتوے کی تعمیل نہ ہونے پائی تھی کہ انوسنٹ کا انتقال ہو گیا اور اس کے جانشین زاسمس نے فتوے کو منسوخ کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ پلیجس کے عقائد درست ہیں۔ وہ جماعت جو پوپ کی معصومیت کی منکر ہے ابھی تک ان متخالف و متضاد فتاوی کو اپنے فریق مخالف کی تردید میں پیش کرتی ہے۔ پلیجس کی قسمت یون پلٹے کھا رہی تھی کہ افریقہ کے عیار اور چالباز پادریوں نے کاؤنٹ ویلرئس کو گانٹھ کر قیصر تک رسائی پیدا کر لی۔ وہاں سے یہ فرمان صادر ہوا کہ پلیجس بیشک کافر ہے اور اس کے ساتھی جلاوطن کیے جائیں اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے۔ یہ کہنا کہ موت کا گذر دنیا میں ہبوط آدم سے پہلے ہو چکا تھا گویا ایک سرکاری جرم تھا۔

جن اصول پر یہ عجیب و غریب فیصلہ مبنی تھا ان پر غور کرنا خالی از نفع نہ ہو گا۔ چونکہ مسئلہ زیر بحث محض فلسفہ کا ایک مسئلہ تھا اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ اس پر جو بحث کی جائے گی وہ قوانین فطرت کی رو سے کی جائے گی لیکن ایسا نہ کیا گیا بلکہ فقط مذہبی پہلو سے بحث کی گئی۔ جس شخص نے اس کتاب کو بغور پڑھا ہے اسے یاد ہو گا کہ ٹرٹلین نے مذہب عیسوی کے جو ارکان بیان کئے ہیں ان میں گناہ اولین۔ شقاوت مطلق۔ سرنوشت ازلی۔ عفو اور کفارہ کے مسائل کا کہیں ذکر نہیں۔ عیسائیت کے جو مقاصد اس نے بیان کئے ہیں ان میں حصول نجات کے اس طریقہ کا نشان تک نہیں پایا جاتا جو دو صدی بعد مذہب عیسوی کا جزو لاینفک بنا دیا گیا۔ ان اہم مسائل کی توضیح و تشریح کے لئے ہم سینٹ آگسٹائن کا رتجی کے رہین منت ہیں۔

اس مسئلہ کا تصفیہ کرتے وقت کہ موت کا گذر اس دنیا میں حضرت آدم کے ہبوط سے پہلے ہو چکا تھا یا وہ فقط ان کے گناہوں کی پاداش میں بطور سزا تجویز کی گئی تھی یہ تو کسی نے نہ پوچھا کہ آیا پلیجئس کے خیالات قانون فطرت کے موافق ہیں یا مخالف بلکہ دریافت کیا گیا تو یہ کیا گیا کہ وہ سینٹ آگسٹائن کے عقائد سے بھی مطابق رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ جس عقیدہ کو پادریوں نے اس شدومد کے ساتھ سراپا حقیقت قرار دیا اس کو آج کل کے مسلم الثبوت علمی اکتشافات نے تہ و بالا کر دیا ہے۔ انسان کے ظہور سے مدتوں پہلے کروڑوں افراد بلکہ مخلوقات کی ہزارہا نوعین اور جنسیں نیست و نابود ہو چکی تھیں اور جو باقی ہیں وہ ایک ادنی اور ناچیز جزو ہیں ان بے شمار گروہوں کا جن کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

اس بحث و مباحثہ کے اخیر فیصلہ سے ایک نہایت اہم نتیجہ مترتب ہوا۔ کتاب پیدائش کو بنائے مذہب عیسوی قرار دیا جا چکا تھا۔ پس جب اس کی اس روایت کو کہ حضرت آدم سے بہشت میں گناہ سرزد ہوا جس کی ان کو سزا دی گئی مذہبی لحاظ سے اس قدر موثق مانا گیا تو کیا وجہ ہے کہ بزرگان دین عیسوی اس کتاب کو تمام فلسفہ اور علوم کا محک و معیار نہ قرار دیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ہیئت۔ طبقات الارض۔ جغرافیہ۔ علم الانسان۔ علم تاریخ غرضیکہ معلومات انسانی کے کل شعبوں کو اس سے تطبیق دے دی گئی۔

چونکہ سینٹ آگسٹائن کے عقائد نے دینیات کو سائنس کا حریف بنا دیا ہے لہٰذا اس ذی اثر بزرگ کے بعض خالص فلسفیانہ خیالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنا خالی از لطف نہ ہو گا۔ اس کی ایک کتاب ہے جس کا نام "کنفشنس" (اقبالات) ہے۔ اس کتاب کی گیارہویں

بارھویں اور تیرھویں فصل میں اس نے کتاب پیدائش کے پہلے باب کی تفسیر لکھی ہے جس کے بعض موزوں مقامات کا ہم ذیل میں انتقاط کرتے ہیں۔

یہ مقامات حکیمانہ مباحث سے معمور ہیں۔ اگرچہ اکثر حصہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ایک مقام پر خدا سے دعا مانگی ہے کہ بارالہا مجھے توفیق عطا فرما کہ اس کتاب مقدس کو سمجھ سکوں اور اس کے معانی مجھ پر ظاہر ہو جائیں۔ اس کا بیان ہے کہ یہ کتاب حشو و زواید سے پاک ہے لیکن ایک ایک لفظ سے صدہا معنی پیدا ہو سکتے ہیں۔

خلقت کی صورت سے ظاہر ہے کہ اس کا خالق ضرور ہو گا۔ مگر ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس خالق نے زمین اور آسمان کو کیوں کر بنایا؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس نے ان کو زمین اور آسمان کی حدود کے اندر بنایا ہو اس لئے کہ دنیا دنیا کے اندر موجود رہ کر نہیں بنائی جا سکتی اور نہ وہ ایسی حالت میں بنائے جا سکتے تھے جب کہ ان کے بنانے کے لئے کوئی سامان ہی موجود نہ تھا۔ اس ابتدائی چیستان کا حل سینٹ آگسٹائن نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ "تو نے کہا اور زمین و آسمان بن گئے۔"

مگر یہ مشکل یہاں ہی طے نہیں ہو جاتی۔ سینٹ آگسٹائن لکھتا ہے کہ جو الفاظ خدا نے کہے ان کے اجزائے ترکیبی میں بوقت اظہار فصل واقع ہوا ہو گا یعنی الفاظ و حروف یکے بعد دیگرے ادا کئے گئے ہوں گے۔ ضرور ہے کہ کوئی شے مخلوق ان الفاظ کا ذریعہ اظہار بنی ہو۔ پس وہ شے گویا آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے موجود ہو گی حالانکہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی مادی شے زمین و آسمان سے قبل کیونکر موجود ہو سکتی ہے۔ اس شے کا مخلوق ہونا لازمی ہے اس لئے کہ الفاظ منہ سے نکل کر ختم ہو گئے مگر ہم کو معلوم ہے کہ خدا کا کلام ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ الفاظ یکے بعد دیگرے ادا ہوئے ہوں۔ کل الفاظ وقت واحد میں ادا ہوئے ہوں گے ورنہ حدوث اور زمان لازم آتا ہے۔ تدریج کے لئے زمان کی قید لازمی ہے حالانکہ اس وقت سوائے قدم و بقا کے اور کچھ موجود نہ تھا۔ خدا کا علم اور قول ان امور کی بابت جو بقید زمان حادث ہوتے ہیں ازل و ابد سے متصف ہے۔

پھر بہت کچھ اغلاق کے ساتھ سینٹ آگسٹائن نے کتاب پیدائش کے افتتاحی الفاظ "ابتدا میں" کی شرح کی ہے۔ اس شرح میں اس نے کتاب مقدس کی ایک اور آیت سے مدد لی ہے جو یہ ہے: "اے خدا! تیری صناعیاں کس قدر عجیب و غریب ہیں۔ تو نے ان کو اپنی حکمت سے بنایا۔" پس یہ "حکمت" ہی گویا "ابتدا" تھی اور اسی "ابتدا میں" خدا نے زمین آسمان بنائے۔

آگے چل کر سینٹ آگسٹائن کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ آسمان و زمین بنانے سے پہلے خدا کیا کر رہا تھا۔ اگر اس کی صفت خالقیت کسی خاص وقت سے شروع ہوئی تو اس سے زمان لازم آتا ہے نہ کہ قدم اور قدم میں کوئی شے حادث نہیں ہوتی بلکہ سب کچھ موجود و مستحضر ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینے میں اس نے اس بلاغت آفرینی سے کام لیا ہے جس کے لحاظ سے وہ مشہور ہے۔ وہ کہتا ہے: "میں اس سوال کے جواب میں یہ تو نہ کہوں گا کہ خدا زمین و آسمان بنانے سے پہلے ان لوگوں کے لئے جو اس کے اسرار اور کنہ کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جہنم کے بنانے میں معروف تھا۔ البتہ مستفسر کو یہ جواب دوں گا کہ زمین و آسمان پیدا کرنے سے پہلے خدا نے کوئی شے نہیں بنائی اس لئے کہ مخلوق ہونے سے پہلے کوئی شے مخلوق نہیں ہو سکتی۔ زمانہ خود مخلوق ہے اور اس لئے ممکن نہیں کہ خلقت کے قبل اس کا وجود ہو۔ پھر زمانہ کیا ہے؟ زمان گذشتہ تو ہے نہیں۔ زمان مستقبل بھی معدوم ہے۔ رہ گیا زمان موجودہ۔ اس کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہے۔ اگر ہو تو شاید وہ شے ہو جسے دو عدموں کے درمیان کوئی بقا نہیں۔ زمانہ طویل یا زمانہ قلیل مہملات ہیں اس واسطے کہ جب ماضی و مستقبل ہی موجود نہیں تو ان کا وجود کیسا۔ ان کا وجود سوا روح کے اور کہیں نہیں۔"

جس عبارت میں سینٹ آگسٹائن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ گویا ایک مجذوبانہ بڑ ہے جس کا مخاطب خدا ہے۔ اس کی تصانیف کی حقیقت خواب پریشان کے ایک مجموعہ سے زیادہ نہیں۔ اس خیال سے کہ ناظرین ہمارے اس بیان کی تصدیق کر سکیں ہم بلاانتخاب کسی ایک مقام سے اس کی عبارت کے چند فقروں کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ذیل کی عبارت بارہویں فصل سے نقل کی جاتی ہے۔

"پس اے میرے خدا یہی وہ بات ہے جو میری سمجھ میں آتی ہے جب کہ میں تجھے اپنے کلام پاک میں یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور زمین نہ تو دکھائی دیتی تھی نہ اس کی کوئی شکل تھی۔ اور سمندر پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اور تو نے یہ نہیں فرمایا کہ تو نے ان کو کس دن پیدا کیا۔ یہ ہے وہ بات جو میری سمجھ میں آئی ہے اور اس کی وجہ فلک الافلاک ہے یعنی وہ عقلی آسمان جس کی عقول کو سب کچھ ایک ہی دفعہ معلوم ہو جاتا ہے تھوڑا تھوڑا کر کے اس طرح نہیں معلوم ہوتا کہ گویا چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے یا کوئی چیز آئینہ میں سے نظر آ رہی ہے بلکہ کل کا کل تیرا مظہر بن کر دوبدو ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شے کا علم اب ہوا اور ایک شے کا تھوڑی دیر کے بعد بلکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ان عقول کو بلاتدریج یا فصل زمان سب کچھ ایک

ہی دفعہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین غیر مرئی اور غیر مشکل اور تدریج زمانی سے عاری ہے۔ اور تدریج یا فصل ہی وہ حالت ہے جس کے باعث ایک شے اب ظاہر ہوتی ہے اور ایک شے کچھ دیر کے بعد۔ اس لئے کہ شکل یا صورت کے موجود نہ ہونے سے اشیا میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ پس ہر شے کا وجود انہیں دونوں کے ساتھ وابستہ ہے یعنی ایک تو اس ابتدائی ہستی کے ساتھ جو شکل پکڑ چکی تھی اور ایک اس ابتدائی ہستی کے ساتھ جس کی کوئی شکل نہ تھی۔ ایک فلک تھا لیکن فلک الافلاک تھا۔ دوسری زمین تھی لیکن وہ زمین جو متحرک اور بے شکل تھی۔ انہیں دونوں کی وجہ سے یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اے خدا تیری کتاب مقدس بلاتخصیص ایام کہتی ہے کہ ابتدا میں خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ کیونکہ ساتھ ہی اس امر کی بھی تشریح و توضیح کر دی گئی کہ معہود ذہنی کونسی زمین ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ قبہ لاجوردی دوسرے دن پیدا کیا گیا اور اس کا نام آسمان رکھا گیا۔ جس سے ہم کو بلا تعیین ایام معلوم ہو جاتا ہے کہ کس آسمان کا پہلے ذکر کیا گیا۔ اے خدا تیرا کلام بھی کس قدر گہرا ہے جس کی سطح ہمارے سامنے ہے۔ ہم بچوں کی طرح ہیں اور وہ ہمارا دل لبھاتی ہے۔ اے میرے خدا تیرے کلام کی گہرائی تعجب خیز ہے اور بہت ہی تعجب خیز ہے۔ اس گہرے کنوئیں میں جھانکتے ہوئے دل پر ہیبت چھا جاتی ہے وہ ہیبت جو عزت و آبرو میں لپٹی ہوئی ہے اور لرزہ طاری ہو جاتا ہے وہ لرزہ جو عشق و محبت کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کے دشمنوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کاش تو اپنی تیغ دودم سے قتل کر ڈالتا تاکہ وہ تیرے کلام سے دشمنی کرنے کے قابل نہ رہتے اور میرے نزدیک ان کا اپنے نفس کے اندر مارا جانا بہت ہی پسندیدہ ہے اس لئے کہ اس طور پر وہ تیری ذات کے اندر بقا حاصل کر سکیں گے۔"

ذیل کے فقرہ کا اقتباس سینٹ آگسٹائن کی کتاب "اقبالات" کی تیرہویں فصل سے کیا جاتا ہے جس میں وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ مسئلہ تثلیث کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ اس اقتباس سے ہمارا مقصود اس کی شان تفسیر نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ دکھانا ہے کہ وہ کتاب مقدس کے اسرار و غوامض کی گتھیاں کیوں کر سلجھاتا ہے۔

"اب مجھ کو تثلیث نظر آ رہی ہے اور اس طرح نظر آ رہی ہے جیسے آئینہ میں کوئی چیز دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہو۔ اور یہ اے میرے خدا تیرا جلوہ ہے کیونکہ تو نے باپ ہونے کی حیثیت سے آسمان و زمین کو اس کا مظہر بن کر پیدا کیا جو ہماری عقل و تمیز کا مبدا ہے اور جو تیری عقل ہے اور تجھ سے پیدا ہوا اور ازل و ابد میں تیرا شریک و سہیم ہے یعنی تیرا بیٹا۔ ہم فلک الافلاک کا بہت کچھ حال بیان کر چکے ہیں اور اس زمین کا جو دکھائی نہ

دیتی تھی اور بغیر کسی صورت کے تھی' اور تاریک سمندر کا بھی بلحاظ اس کی مسخ شدہ روحانیت کے تزلزل اور بے ثباتی کے ہم نے بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اس کی شکل اختیار کرلی ہو جس نے بقدر اس کی نشوونمائے موجودہ کے اس میں جان ڈالی تھی اور اس کی روشنی کی وجہ سے حسن و جمال کے سانچہ میں ڈھل کر وہ فلک الافلاک بن گیا ہو جو آگے چل کر اس طرح قائم کیا گیا کہ اوپر نیچے پانی ہی پانی تھا۔ اس طرح خدا کے نام کے ذریعہ سے مجھ کو باپ کی حقیقت کا علم ہوا جس نے یہ کائنات بنائی اور ابتدا کے نام کے ذریعہ سے مجھے بیٹے کی ماہیت معلوم ہوئی جس میں ساری دوائر ہو کر اس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور اپنے خدا پر بشکل تثلیث ایمان لا کر جب میں نے اس کے کلام پاک کو اور زیادہ تجسس اور تفحص کی نظر سے دیکھا تو مجھے روح القدس کا جلوہ سطح آب پر نظر آگیا۔ پس اے میرے خدا مجھ پر تثلیث یعنی باپ بیٹے اور روح القدس کی حقیقت آشکارا ہو گئی کہ وہی آفرینیت کون و مکان ہے۔"[۱۵]

سینٹ آگسٹائن کی تصانیف کو اہل مذہب پندرہ سو برس سے مستند مانتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے ہم کو بھی لازم ہے کہ ان کا ذکر ادب سے کریں اور سچ تو یہ ہے کہ ہم کو سوء ادبی کی ضرورت بھی نہیں۔ جن فقرات کا ہم نے ان کی تصانیف سے اوپر اقتباس کیا ہے وہ اپنی تنقید خود کر رہے ہیں۔ سائنس اور مذہب میں جو نزاع پیدا ہو گئی اس کے بانی مبانی یہی حضرت ہیں۔ کتاب مقدس کی اصلی غرض یہ تھی کہ لوگوں کو نیکی اور پاکبازی کا رستہ دکھائے۔ ان بزرگوار نے علوم انسانی کی قسمت کا فیصلہ جو اس کے بس کا نہ تھا اس کے حوالے کر کے نہایت بے باکی کی راہ سے انسان کے قوائی عقلی پر جابرانہ حکومت کا سلسلہ قائم کر دیا۔ مثال تو قائم ہو ہی چکی تھی پیرو بہت سے پیدا ہو گئے۔ مشاہیر فلاسفہ یونان کی تصانیف کو ان مقدس پیروان کلیسا نے علوم سفلی کی ذیل میں داخل کیا۔ عجائب خانہ اسکندریہ کے عدیم المثال اور روشن کارناموں پر جہالت تعصب اور غیر ممکن الفہم مہملات کے کالے بادلوں کی گھٹا چھا گئی جس میں سے پادریوں کے قہر و انتقام کی بجلیاں رہ رہ کر کوندنے لگیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ علوم و فنون میں جن کا مدار علیہ الہام ربانی ہو کسی تغیر یا تبدل یا ترقی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اگر الہام کو سائنس کا سرچشمہ مان لیا جائے تو تمام نئے اکتشافات غیرضروری ٹھہرتے ہیں۔ جو باتیں خدا کو بتانی منظور تھیں وہ اس نے بذریعہ کتب مقدس انسان پر ظاہر کر دیں۔ ان کے سوا اور کسی قسم کی دریافت کی کوشش گویا خدا کی کنہ کی بیہودہ اور گستاخانہ تلاش ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس مقدس سائنس کی حقیقت کیا ہے جو بذریعہ الہام ربانی حاصل ہوا اور جس پر بزرگان دین یعنی پادری صاحبوں نے معلومات انسانی کا حصر کر دیا۔ یہ علم وہ علم ہے جو کائنات کے تمام مادی و روحانی مظاہر کو افعال انسانی کے مشابہ قرار دیتا ہے اور خدائے قیوم کو ایک عظیم الجثہ انسان سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس کی رو سے زمین ایک چپٹی سطح ہے جس پر آسمان گنبد کی طرح قائم ہے یا بقول سینٹ آگسٹائن جھلی کی طرح کھنچا ہوا ہے۔ آسمان میں سورج' چاند اور ستارے اس غرض سے حرکت کرتے ہیں کہ انسان کو شبانہ روز روشنی پہنچائیں۔ زمین اس مادہ سے جسے خدا نے عدم سے پیدا کیا ان تمام حیوانات و نباتات سمیت جو اس پر آباد ہیں چھ دن میں تیار ہوئی۔ آسمان کے اوپر بہشت ہے اور زمین کے نیچے ایک تاریک و آتشیں مقام میں دوزخ ہے۔ زمین مرکز کائنات ہے اور باقی تمام اجسام فلکی و غیر فلکی اس کے تابع اور اس کے فائدہ کی غرض سے بنائے گئے ہیں۔ انسان کو زمین کی خاک سے بنایا گیا۔ اول اول وہ اکیلا تھا مگر بعد میں اس کی ایک پسلی سے عورت بنائی گئی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسے خدا نے فردوس میں جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھا رہنے کو جگہ دی۔ وہ نہایت عاقل اور پاک تھا لیکن چونکہ اس نے ثمر ممنوعہ کھا کر خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی لہٰذا اسے مشقت اور موت کی سزا دی گئی۔ اس انسان اول کی اولاد کو اس کی سزا سے کچھ عبرت نہ ہوئی بلکہ ان سے ایسی ایسی بدیاں اور شرارتیں سرزد ہوئیں کہ خدا کو ان کے تباہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس لئے ایک طوفان عظیم روئے زمین پر نازل کیا گیا کہ پہاڑوں کی چوٹیاں تک پانی میں غرق ہو گئیں۔ جب یہ طوفان انسان کو غارت کر چکا تو ایک ہوائے تند چلی جس نے پانی کو خشک کر دیا۔

اس آفت سے حضرت نوحؑ اور ان کے تین بیٹے حام' سام اور یافث مع اپنی بیبیوں کے ایک کشتی میں سوار ہو کر بچ گئے۔ ان میں سے سام نے ایشا کو ازسرنو آباد کیا حام نے افریقہ کو اور یافث نے یورپ کو۔ چونکہ امریکہ کی حقیقت مقدس پادری صاحبوں کو معلوم نہ تھی اس لئے اس کی آبادی کے مورث اعلی کے نام کی گنجائش نہیں نکالی گئی۔

اب ذرا سنئے کہ یہ بزرگوار اپنے دعاوی کی تائید میں کس قسم کے دلائل پیش فرماتے ہیں۔ لکٹنشیس نے زمین کے کروی الشکل ہونے کی تردید ان الفاظ میں کی ہے: "کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اس درجہ لغو اور مہمل ہو کہ یہ بات باور کر لے کہ درخت اور پودے زمین کی دوسری طرف نیچے کو لٹک رہے ہیں۔ یا وہاں کے باشندوں کے پاؤں اوپر ہیں اور سر نیچے۔ اگر ان لوگوں سے پوچھا جائے کہ ان مہملات کی کیا توجیہ کرتے ہو اور کیوں یہ

چیزیں زمین پر سے گر نہیں جاتیں تو وہ کہتے ہیں کہ خاصیت اشیا یہی ہے کہ بھاری چیزیں پہیئے کے آروں کی طرح مرکز کی طرف مائل ہوں اور ہلکی چیزیں مثلاً بادل و ہوا اور آگ مرکز سے اوپر کی طرف اٹھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کو کیا کہوں جو ایک بار غلطی کرتے ہیں تو اس ہٹیلے پن سے اس قائم ہو جاتے ہیں کہ ایک حماقت کی تائید میں دوسری حماقت پیش کرتے ہیں۔" مسئلہ تقابل وجلین یعنی اس مسئلہ کے متعلق کہ زمین کے دوسری طرف جو انسان آباد ہیں ان کے پاؤں کے تلوے ہمارے پاؤں کے تلووں کے متقابل ہیں سینٹ آگسٹائن یوں ارشاد فرماتے ہیں: زمین کے اس طرف آبادی کا ہونا محال ہے اس لئے کہ کتاب مقدس میں حضرت آدم کی اولاد میں سے کوئی قوم اس قسم کی بیان نہیں کی گئی۔" لیکن شاید سب سے زیادہ زبردست اور لاجواب دلیل زمین کے کروی الشکل ہونے کے خلاف یہ پیش کی جاتی تھی کہ اس طرف کے باشندوں کو حشر کے دن خداوند خدا کا ہوا سے زمین پر اترتا کیوں کر نظر آئے گا۔

دنیا میں موت کی آمد' واقعات عالم میں روحانیات کا پیہم تصرف۔ ملا ئکہ و شیاطین کے مناصب۔ زمین کا ایک وقت معہودہ پر آگ سے جل جانا۔ بابل کے مینارہ کا واقعہ۔ زبانوں کا اختلاف۔ بنی نوع انسان کا روئے زمین پر منتشر ہونا۔ مظاہر قدرت مثلاً کسوف و خسوف و قوس قزح کی تاویل۔ یہ تمام ایسے مسائل ہیں جن پر یہاں بحث کرنا فضول ہے۔ خصوصاً ان تصورات پر جو مقدس پادری صاحبوں نے خدا کی ذات و صفات کے متعلق قائم کئے ہیں میں کچھ نہیں کہنا چاہتا اس لئے کہ ان تصورات کے پردہ پر خدا کی جو شبیہہ کھینچی گئی ہے وہ انسان سے بہت ہی مشابہ شان ایزدی سے بہت ہی گری ہوئی ہے۔

البتہ کاسماس انڈیکا پلیوسٹیز کے بعض خیالات کا انتقاط اس مقام پر کرنا غیرموزوں نہ ہو گا۔ یہ خیالات چھٹی صدی میں عام طور سے رائج تھے۔ اس شخص نے ایک کتاب "کرسچن ٹاپوگرافی" (مسیحی جغرافیہ) کے نام سے لکھی تھی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اس ملحدانہ عقیدہ کی تردید کی جائے کہ زمین کروی الشکل ہے اور نیز بت پرستوں کے اس دعوی کا ابطال کیا جائے کہ منطقہ حارہ کے جنوب میں منطقہ معتدلہ واقع ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جغرافیہ کے صحیح اور سچے اصول کی رو سے زمین ایک سطح ذوار .بعة الزوایا ہے جو بقدر چار سو دن کی مسافت کے مشرق سے مغرب تک اور شمالاً جنوباً اس سے نصف فاصلہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن پر آسمان قائم ہے۔ شمال میں ایک پہاڑ واقع ہے جو سب پہاڑوں سے بڑا ہے۔ جب یہ پہاڑ آفتاب کی شعاعوں کا حائل ہو جاتا ہے تو دنیا پر تاریکی چھا جاتی ہے جسے رات کہتے ہیں۔ زمین بالکل مسطح نہیں

ہے بلکہ جنوب کی طرف تھوڑی سی جھکی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریائے فرات و دجلہ وغیرہ جیسے بہاؤ کا رخ جانب جنوب ہے نہایت تیزی سے بہتے ہیں لیکن دریائے نیل کا دہارا بلندی پر چڑھنے کے باعث بہت سست رفتار ہے۔

بیڈ جو ساتویں صدی میں اسی طبقہ کا ایک مصنف ہو گذرا ہے لکھتا ہے: "دنیا چھ دن میں پیدا کی گئی اور زمین اس کا مرکز اور سب سے بڑا جسم ہے۔ آسمان ایک آتشین اور سیال جسم مدور ہے جو زمین پر شامیانہ کی طرح تنا ہوا ہے اور مرکز زمین سے اس کا ہر ایک حصہ مساوی ابعد ہے۔ یہ ہر روز نہایت تیزی سے گھومتا ہے مگر اس تیزی میں سات سیاروں کی مزاحمت کی وجہ سے اعتدال پید ہو جاتا ہے۔ تین سیارے زحل مشتری اور مریخ آفتاب سے اونچے ہیں۔ ان کے نیچے آفتاب ہے اور آفتاب کے پیچھے باقی تین سیارے ہیں یعنی زہرہ عطارد اور قمر۔ ستارے اپنے مقررہ دائروں میں گردش کرتے ہیں۔ اور شمالی ستاروں کا مدار سب سے چھوٹا ہے۔ عرش معلی کی حدود مقرر ہیں۔ اس میں ملا ئکہ آباد ہیں جو زمین پر اتر کر انسانی شکل اختیار کرتے ہیں اور انسانی فرائض ادا کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ آسمان کی حرارت یخ کے ٹھنڈے پانی سے معتدل ہوتی رہتی ہے ورنہ اسے آگ لگ جائے۔ فلک ادنیٰ کا نام آسمان ہے اس لئے کہ یہ آب فوقانی و تحتانی کے درمیان حد فاصل ہے۔ آسمانی عالم آب فلک الارواح سے نیچا مگر تمام جسمانی اشیا سے اونچا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا ذخیرہ ایک دوسرے طوفان کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کے ساتھ اتفاق ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ عالم آب ثوابت کی حرارت کے اشتداد میں اعتدال پیدا کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔"

جہل تعصب اور خیرہ چشمی کی بھی کوئی حد ہے!! کیا انہی لغو اور مہمل خیالات کی اشاعت کے لئے فلاسفہ یونان کی تصانیف سے ابا کیا گیا تھا؟ لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ ایک دن ان مہملات کی قلعی کھلنے والی تھی۔ جب "ریفارمیشن" (اصلاح کینہ) کا دور آیا تو ان فاضل نقادوں نے جو اس زمانہ میں پیدا ہوئے ان تمام مصنفین کی کتابوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کے بعد ان کو حقارت کی اس ٹوکری میں جھونک دیا جو ان کے لئے صدہا سال سے تیار کی جا رہی تھی۔ آج کے دن ان میں سے ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے ہم نفرت کی نظر سے نہ دیکھتے ہوں۔

علوم و فنون کا جو نظام اس طور پر مدون کیا گیا اس کا سب سے زیادہ عجیب و غریب جزو اس کی منطق اور اس کے دعوؤں کے ثبوت کا ڈھنگ تھا۔ اثبات دعاوی کے لئے معجزات

پیش کئے جاتے تھے اور ایک واقعہ کے ثبوت میں ہمیشہ کسی غیر متعلق واقعہ کی مثال پیش کر کے سمجھ لیا جاتا تھا کہ ثبوت مکمل ہو گیا۔ ایک عربی عالم نے اس طرز ثبوت کی نسبت کیا خوب لکھا ہے[3]: "اگر کوئی بھان متی کا تماشا کرنے والا مجھ سے کہے کہ تین کا عدد دس سے زیادہ ہے اور اس کا ثبوت چاہو تو میں اس چھڑی کا سانپ بنا کر دکھا دیتا ہوں تو میں بے شک اس کے ہتھکنڈے کا تو قائل ہو جاؤں گا مگر اس کے دعوی کو کسی طرح تسلیم نہ کروں گا۔"

چونکہ وہ فریق جو سلطنت میں برسراقتدار ہو گیا تھا اس قسم کی کتابیں تصنیف کرنے سے عاجز تھا جنہیں بت پرست مصنفین کی مشہور تصانیف سے عقلی طور پر یارائے مسابقت ہو سکے اور یہ ممکن نہ تھا کہ فریق مذکور مدمقابل کو دانش و حکمت میں اپنے سے بڑھ کر تسلیم کرے لہٰذا مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ علوم سفلی یعنی فلسفہ و طبیعیات کی اشاعت کی راہ میں نہ صرف روڑے اٹکائے جائیں بلکہ فلاسفہ و طبیعین پر سختیاں کی جائیں تاکہ وہ اکتساب و ترویج علوم و فنون سے بالکل ہی دست بردار ہو جائیں اور علم کا چراغ گل ہو جائے۔ قیصر ویلنٹا نین کے عہد میں جو مظالم حکمائے اشراقیین پر روا رکھے گئے ان کی محرک یہی پولیٹیکل مصلحت تھی۔ ان پر جادوگری کا الزام لگایا گیا اور بہت سے فلاسفہ قتل کرا دئے گئے۔ فلسفہ کو قدم قدم پر خطرات کا سامنا تھا۔ فلسفہ دانی سرکاری جرائم کی فہرست میں شامل ہو گئی۔ علم و حکمت کی جگہ اب عجائبات و توہمات نے لے لی جن سے طبیعتوں کو عشق پیدا ہو گیا۔ اور مصر کے جن مشاہیر نے عجائب خانہ اسکندریہ کو بقائے دوام کی چادر اڑھا دی تھی ان کے جانشین جاہل اور اوہام پرست راہبوں کے گروہ بن گئے۔

---

[1] ایشیائے کوچک کا ایک قدیم شہر جسے سکندر کی فوج کے ایک افسر انٹیگونس نے بسایا اور دوسرے افسر پرڈیکاس نے اپنی بی بی کی یادگار میں اس کا نام نا۔سیا رکھا۔ مترجم

[2] جس طرح مسلمانوں میں شرع کے تین ماخذ ہیں قرآن۔ حدیث اور اجماع اسی طرح عیسائیوں میں بھی ان مسائل کے متعلق جو مابہ النزاع ہوتے تھے اور جن کا تصفیہ اناجیل سے نہ ہو سکتا تھا پادریوں کی کونسلیں منعقد کی جاتی تھیں چنانچہ اس قسم کی پہلی کونسل ۳۲۵ء میں بصدارت قیصر قسطنطین نا۔سیا میں منعقد ہوئی۔ مترجم

[3] ٹرائے کے محاصرہ کو جسے ہومر نے اپنی مشہور کتاب "ایلیڈ" میں زندہ جاوید کر دیا ہے جب دس سال کی مدت گذر چکی اور یہ شہر یونانیوں سے سر نہ ہو سکا تو یولیسیز کو جو بہادران یونان میں بوجہ اپنی ذکاوت و فراست کے ایک خاص شہرت رکھتا تھا ایک حیلہ سوجھا۔ اس نے پیتل کا ایک

گھوڑا تیار کیا اور اس کے جوف میں خود چھپ گیا اور اس گھوڑے کو شہر پناہ کے قریب لے جا کر راتوں رات رکھ دیا۔ محصورین اسے ایک اچنبھے کی بات سمجھ کر اندر اٹھا لے گئے۔ اس ترکیب سے یولیسیز شہر کے اندر داخل ہوگیا اور گھوڑے سے باہر نکل کر شہر کا پھاٹک کھول دیا اور محاصرین شہر پر قابض ہو گئے۔ مترجم

۲ مشہور جغرافیہ نویس اسطرابو لکھتا ہے کہ جنوبی اطالیہ کا یہ شہر ۷۰۰ قبل مسیح میں خلیج ٹارنٹم کے کنارے آباد کیا گیا تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح تک اس کا شمار دولت یونان کے سب سے زیادہ آباد اور مرفہ الحال شہروں میں ہوتا رہا۔ لیکن ہنی بال افریقی سپہ سالار کی فوج کشی کے زمانہ کے بعد سے اس میں انحطاط کے آثار شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ یہ ایسا مٹا کہ جب سیسرو کا زمانہ آیا تو بجز چند بوسیدہ دیواروں اور کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ حکیم فیثاغورث کی زندگی کے آخری دن یہیں گذرے اور سیسرو کے زمانہ تک اس کی قبر کے آثار بھی یہاں موجود تھے۔ مترجم

۵ قدیم یونانی روایات میں اپنی بہادری اور شجاعت کے لحاظ سے بے مثل سمجھا جاتا تھا۔ ایک روایت یہ تھی کہ اس کے باپ ٹینٹلس نے ایک دفعہ دیوتاؤں کی دعوت کی اور بیٹے کو ذبح کر کے مہمانوں کے سامنے دسترخوان پر چن دیا۔ صرف ایک دیوتا کو دھوکا ہوا اور وہ مقتول کا ایک بازو کھا گیا۔ اس کے بعد ہرمس نے آب حیات چھڑک کر اسے زندہ کر دیا اور جس دیوتا نے اس کا بازو کھا لیا تھا بجائے گوشت و خون کے بازو کے عاج کا بازو لگا دیا۔ مترجم

۶ قدیم یونان کا ایک شہر جس پر اہل ایتھنز نے ۴۴۷ ق م میں قبضہ کیا۔ اسی مقام پر سکندر کے باپ شاہ فیلقوس نے یونانی ریاستوں کی متحدہ فوجوں کو شکست فاش دے کر ان ریاستوں کی خودمختاری کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس شہر کے کچھ کھنڈر ابھی تک باقی ہیں۔ مترجم

۷ "ایلیڈ" کے مشاہیر میں سب سے زیادہ ممتاز و سربرآوردہ پہلوان کا نام۔ مترجم

۸ قدیم یونانی روایات کے بموجب حبش کا ایک شاہزادہ تھا جو ٹرائے کی جنگ میں لشکر کے محصورین کی کمک کے لئے آیا تھا اور بہت کچھ داد شجاعت دینے کے بعد آخر ایکلیز کے ہاتھوں مارا گیا۔ مترجم

۹ نکومیڈیا دولت روما کا ایک آباد اور پر رونق شہر تھا جس کی بنا نکومیڈیز اول نے ۲۶۴ ق م میں ڈالی تھی۔ قیصرڈ ایو کلیشین و قسطنطین اس زمانہ میں جبکہ رومی افواج ممالک مشرقیہ کے مسخر کرنے میں مصروف تھیں یہیں بودوباش رکھتے تھے۔ چنانچہ قسطنطین کا انتقال ۲۲ مئی ۳۳۷ ق م کو اسی مقام میں ہوا۔ اسکندر اعظم کا وقائع نویس ایرئن یہیں پیدا ہوا تھا۔ مترجم

۱۰ یونانی علم الاوثان میں مذکور ہے کہ اینئس شاہ کیلیڈان نے آرٹمیس دیبی کو بھینٹ نہیں دی تھی۔ اس پر دیبی نے غضب ناک ہو کر ایک جنگلی سور کو مامور کیا کہ اس بادشاہ کی سلطنت کو تباہ کر ڈالے چنانچہ یہ آفت آسمانی ملک کو برباد کرنے لگی۔ بادشاہ کے بیٹے میلجر نے یونان کے بہت

سے سورماؤں کے ساتھ مل کر اس بلائے ناگہانی کے استیصال کی غرض سے ایک جتھا قائم کیا اور بالآخر اپنے برچھے سے ہلاک کر ڈالا اور اس کی کھال پر بطور فتح و نصرت کی کشائی کے قبضہ کر لیا۔ مترجم

لے تیسری صدی عیسوی کے وسط میں بمقام لبیا پیدا ہوا اور چوتھی صدی کے شروع میں اسکندریہ کا نائب پادری مقرر ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق عیسائیوں کا عام عقیدہ تیسری صدی میں یہ تھا کہ خدا بشکل انسان یسوع مسیح کے قالب میں نمودار ہوا لیکن اس کی یہ انسانی حیثیت اس کی ربانی حیثیت کے تابع تھی۔ بالفاظ دیگر بیٹا اگرچہ خدا تھا لیکن باپ پر فوقیت نہ رکھتا تھا اور نہ اس کے مساوی تھا بلکہ اس سے دوسرے درجہ پر تھا۔ لیکن چوتھی صدی کے شروع میں بوجہ ان نواقض کے جو ابنیت و الوہیت کے اس پراسرار و ناقابل فہم مسئلہ میں پائے جاتے تھے لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہو چلا۔ بعض کی یہ رائے تھی کہ بیٹا باپ سے دوسرے درجہ پر ہے۔ لیکن جو زیادہ خوش عقیدہ تھے اور بیٹے کی جناب میں زیادہ ارادت رکھنے کے مدعی تھے یہ دعویٰ کرنے لگے کہ بیٹا اور باپ مساوی ہیں۔ ایرئس آخرالذکر جماعت کا مخالف تھا اور اس مخالفت میں اس نے نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ اگر بیٹے کا درجہ باپ سے کم ہے تو وہ خدائے مطلق نہیں یعنی باپ کے برابر نہیں اور چونکہ برابر نہیں اس لئے اس کا جوہر یا اصل خدا کے جوہر یا اصل سے مختلف ہے اور اگر برابر ہے تو اس کا جوہر کامل اور نقص سے مبرا ہے اور اس لئے وہ خود بھی کامل اور بے عیب ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دو خدا موجود ہو گئے جو ہر ایک لحاظ سے مساوی الحیثیت ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ خدا کے علاوہ جو غیر مخلوق ہے اگر کوئی شے موجود ہو سکتی ہے تو وہ مخلوق ہستیاں ہیں یعنی وہ موجودات حادث جنہیں خدائے قدیم نے عدم سے پیدا کیا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ بیٹا قدیم نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ایسا وقت بھی تھا جب کہ وہ نہ تھا اس لئے وہ زمانی اعتبار سے محض اول و اشرف المخلوقات ہے۔ رحمت ہو ایرئس کی روح پر جس کے یہ سچے مسیحیانہ عقائد دو صدی تک تثلیث کے طلسم کو توڑنے کی کوشش میں سرگرم رہے۔ لیکن بت پرستی عیسائی مذہب کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔ ساتویں صدی کے خاتمہ سے پہلے ایرئس کے مذہب کا خاتمہ ہو گیا۔ غرض یہی عقائد تھے جن کی وجہ سے بیچارہ ایرئس کافر اکفر قرار دیا گیا اور جلاوطن ہوا۔ مترجم

۱۲ اس حقیقت کو جس پر علوم جدیدہ کو اس قدر ناز ہے اور جس کے انکشاف کے لئے اسے علما و حکما کے بے تعداد تجربوں اور مشاہدوں کا شرمندہ احسان ہونا پڑا مکہ کے ایک امیؐ نے جو نہ اشراقی تخیل سے آشنا تھا نہ مشائی تعقل میں دسترس رکھتا تھا جس کو نہ کبھی مہندسانہ تجربہ سے سابقہ پڑا نہ طبیعیانہ مشاہدہ کا اتفاق ہوا ان روشن الفاظ میں رہ رہ کر دہرایا ہے۔ "کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام"۔ "کل نفس ذائقۃ الموت"۔ جس ہمہ گیر اصول کی طرف ان ربانی الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے اس کا اطلاق اشرف المخلوقات آدم سے لے کر ازل

موجودات جراثیم تک یکساں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معارف و حقائق پر انسان کی عقل مجرد کے علاوہ ایک اور طاقت بھی روشنی ڈال سکتی ہے اور وہ طاقت مذہب ہے۔ مذہب اور سائنس گو اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے مختلف اشیا کے حقیقت آموز ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ضمناً اگر کسی ایسے مسئلہ کا ذکر مذہب میں آ جائے جس پر بحث کرنا سائنس کا کام ہو تو مذہب کوئی ایسی بات کہہ جائے جسے عقل انسانی غلط ثابت کر سکے۔ اس لئے کہ مذہب اور سائنس روشنی کی وہ کرنیں ہیں جو ایک ہی شعلہ سے نکلی ہیں۔ ایک خدا کا کلام ہے دوسرا خدا کا کام۔ دونوں میں تضاد ممکن نہیں۔ مسئلہ حدوث ممات بعد از ہبوط یا قبل از ہبوط آدم کے متعلق عیسائیت نے جو غلطی کی ہے وہ جیسا کہ خود مصنف نے ظاہر کر دیا ہے اس مذہب سے منسوب نہیں کی جا سکتی جس کی تلقین ٹرٹلین نے کی تھی اگرچہ الوہیت مسیح کے متعلق اس زمانہ کے عقائد بھی فاسد ہو چکے تھے۔ جو رومن کیتھولک پادریوں کے اختراعات کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ غرض حقیقت ہر جگہ ایک ہے خواہ اس کا اظہار مذہب کے ذریعہ سے ہو خواہ سائنس کی وساطت سے۔ اسلام نے جو شرک بت پرستی اور توہمات باطلہ کی آمیزش سے شروع ہی سے پاک رہا جو کچھ سکھایا ہے وہ ہمارے اس دعوے پر گواہ عادل ہے۔ مترجم

[23] جن دو مقامات کا اقتباس یہاں کیا گیا ہے اگرچہ بہتر یہی ہوتا کہ انہیں قلم انداز کر دیا جاتا اس لئے کہ ان کا مطلب یا تو خود جناب آگسٹائن نے سمجھا ہو گا اور یا وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس کو روح القدس کے فیضان سے خاص طور پر بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ ملا ہو لیکن اس خیال سے کہ ناظرین بھی سینٹ آگسٹائن کی ہرزہ سرائی یا بقول مصنف مجذوبانہ بڑ کا لطف اٹھانے میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں اصل عبارت کا لفظی ترجمہ درج کرنا ہم نے ضروری خیال کیا۔ مترجم

[24] امام غزالی علیہ الرحمتہ کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم

تیسرا باب

نزاع مذہب و سائنس
درباره مسئلہ توحید۔
پہلی یعنی جنوبی اصلاح

اہل مصر اصرار کرتے ہیں کہ مریم عذرا کی پرستش کو رواج عام دیا جائے۔ قسطنطنیہ کا بطریق نسطوران کی مخالفت کرتا ہے لیکن انجام کار بوجہ اس رسوخ کے جو مصریوں کو دربار قیصر میں حاصل ہے وہ نسطور کو جلاوطن کرا دیتے ہیں اور نسطور کے پیرو منتشر ہو جاتے ہیں۔

اصلاح جنوبی (یعنی اسلام) کا آغاز۔ حملہ ایران۔ اس کے اخلاقی نتائج۔ اصلاح عرب۔ حضرت محمدؐ نسطوری فرقے کے راہبوں سے ملتے ہیں اور ان کے اصول اختیار کر کے ان اصول پر اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مریم عذرا کی پرستش' مسئلہ تثلیث اور اس عقیدے سے جو توحید باری سے توافق نہیں رکھتا وہ ابا کرتے ہیں۔ عرب کی بت پرستی کو بہ جبر مٹا دیتے ہیں اور دولت روما پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے جانشین شام مصر ایشیائے کوچک شمالی افریقہ اور ہسپانیہ کو مسخر اور فرانس پر حملہ کرتے ہیں۔

اس کشمکش سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وحدت واجب الوجود کا اصول دولت روما کے اکثر حصہ میں رائج ہو جاتا ہے۔ سائنس از سرنو زندہ ہوتا ہے اور مسیحی دنیا کے بہت سے مشہور مرکز حکومت مثلاً" اسکندریہ کارتھج یہاں تک کہ بیت المقدس تک عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔

دولت روما کی حکمت عملی نے عہد قدیم کی عیسائیت میں بت پرستی کا عنصر ملا کر سلطنت،

کے باشندوں کو کفار مسیحی نما بنا دیا تھا۔ بت پرست اور عیسائی بلحاظ عقائد ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دونوں فریق ایک دوسرے میں مذہبی طور پر ضم ہو گئے تھے۔ عیسائیت نے بت پرستی میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں اور بت پرستی نے عیسائیت کو بہت کچھ متغیر کر دیا تھا۔ یہ دوغلا مذہب دولت روما کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔

اس اختلاط سے جو عظیم الشان توسیع مترتب ہوئی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسیحی جماعت دولت مند ہو گئی اور اس کے سیاسی اقتدار کا پلہ بھاری ہو گیا۔ سرکاری مالگزاری کی رقم خطیر کا ایک بہت بڑا حصہ کلیسا کے خزانوں میں داخل ہونے لگا۔ اس دولت پر دست مسابقت دراز کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دین عیسوی کی حمایت کا جامہ ریائی پہن کر حقیقت میں اس کے دنیوی فوائد سے مستفید ہونے کو اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔

قیاصرہ زمانہ سابق کے عہد میں فتوحات کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ سلطنت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ سپاہیانہ زندگی کے مقاصد اصلی سب ختم ہو چکے تھے۔ جنگ و جدل تغلب و تصرف اور لوٹ مار کا زمانہ گذر چکا تھا۔ لیکن اہل حرص و ہوا کے لئے ایک اور رستہ بھی کھلا تھا اور ان کی مقصد برآریوں کے اور بھی بہت سے طریقے تھے۔ کلیسائی زندگی کی کامیابی میں ان عظیم الشان فوائد کا راز چھپا ہوا تھا جو عہد گزشتہ کے جنگی کارناموں کے مقابلہ میں سودمندی کے اعتبار سے کسی طرح کم نہ تھے۔

اس زمانہ میں مذہبی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سیاسی تاریخ کے پرکار کا مرکز کشاکش قسطنطنیہ اسکندریہ اور روما کے بطریقوں کی مسابقانہ جدوجہد تھی۔ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھا کر عنان سطوت و اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ قسطنطنیہ کے دعوی تفوق کا انحصار اس واقعہ پر تھا کہ وہ قیصر کا پایہ تخت ہے۔ اسکندریہ کو اپنی تجارتی اور علمی حیثیت پر ناز تھا اور روما اپنی گزشتہ عظمت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا تھا۔ لیکن قسطنطنیہ کے بطریق کے منصوبوں کی راہ میں ایک بڑی مشکل بھی حائل تھی اور وہ یہ کہ قیصر کی ہر وقت اس پر نظر رہتی تھی اور وہ کسی معاملہ میں خودسرانہ کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ بخلاف اس کے اسکندریہ اور روما کو مرکز حکومت سے دور ہونے کے باعث شہنشاہ کی مداخلت کا خوف نہ تھا اور وہ بے کھٹکے من مانی کارروائیاں کر سکتے تھے۔

مشرق میں مذہبی مباحث عموماً" خدا کی ذات و صفات کے متعلق ہوتے رہے ہیں لیکن

مغرب میں اس قسم کے مناقشوں کا میلان تعلقات و حیات انسان کی طرف رہا ہے۔ یہ خصوصیت ان تغیرات میں صاف طور سے نمایاں ہے جن سے مذہب عیسوی ایشیا و یورپ میں متاثر ہوا۔ اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں سلطنت روما کے مشرقی صوبوں میں ایک عقلی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ تثلیث۔ جوہر ذات باری تعالیٰ۔ درجہ ابن اللہ۔ ماہیت روح القدس۔ اقتدار مریم عذرا۔ وہ مسائل تھے جن پر نہایت سختی کے ساتھ مذہبی حلقوں میں مناظرے اور مجادلے ہوتے تھے۔ آج ایک فریق نقارہ فتح و نصرت بجاتا تھا تو کل دوسرا فریق اپنی کامیابی کا اعلان کرتا تھا اور متخاصمین اپنے دعاوی کے ثبوت میں کبھی معجزے اور کرامتیں پیش کرتے تھے اور کبھی نوبت تیغ آزمائی تک پہنچتی تھی جس سے خون کی ندیاں بہ نکلتی تھیں۔ یہ کوشش کبھی نہ کی جاتی تھی کہ آراء متقابل کو منطقیانہ استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹے کھرے کا امتیاز کر لیا جائے۔ لیکن ان سب متخالف فرقوں کے نزدیک یہ امر متفق علیہ تھا کہ بت پرستانہ مسلک کی تمام قدیم شکلیں باطل تھیں اس لئے کہ جس آسانی سے ان مذاہب کا استیصال ہو گیا وہ خود ان کے بطلان پر دلالت کرتی تھی۔ چنانچہ پادریوں نے بہ بانگ دہل اس امر کا اعلان کر دیا کہ جب امتحان کا وقت آیا تو دیوتاؤں کی مورتیں اپنی حفاظت میں انگلی تک نہ اٹھا سکیں۔

یورپ کی جنوبی اقوام نے ہمیشہ تعدد ذات باری تعالیٰ کو اپنا کیش و آئین قرار دیا ہے اور سامی اقوام کا میلان عقیدہ وحدت واجب الوجود کی طرف پایا گیا ہے۔ شاید زمانہ حال کے ایک مصنف کے خیال کے مطابق اس کی یہ وجہ ہو کہ پہاڑوں وادیوں جزیروں دریاؤں اور خلیجوں کی رنگا رنگ منظر آرائیاں انسان کے دل میں معبودوں کی کثرت کا تصور پیدا کر دیتی ہیں اور ایک وسیع و فسیح ریگستان اور ناپیدا کنار سمندر کا نظارہ اس کے دماغ پر جناب باری کی یکتائی کا نقش مرتسم کرتا ہے۔

ملکی مصلحتوں نے قیصران روم سے سفارش کی تھی کہ عیسائیت اور بت پرستی کی آمیزش کو بنظر استحسان دیکھیں اور اس میں شک نہیں کہ اس طرز عمل نے دونوں حریفوں کی باہمی رقابت کی تلخی کو کسی قدر کم کر دیا تھا۔ عام پسند مذہب عیسوی کی بہشت وہی قدیم اولمپس قرار دیا گیا تھا جس میں یونانی دیوتا رہا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس بہشت میں بجائے یونانی دیوتاؤں کے جو وہاں سے نکال دیئے گئے تھے ایک بہت بڑے سفید تخت پر باپ یعنی خدا بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے دہنے ہاتھ کی طرف بیٹا تھا۔ بیٹے کے برابر مقدس مریم زوجہ کا خلعت پہنے انواع و اقسام کے زیوروں سے لدی ہوئی جلوہ افروز تھیں

اور خدا کے بائیں طرف روح القدس متمکن تھی۔ اس تخت کے گرداگرد ملائکہ کا ایک جم غفیر ہاتھوں میں بانسریاں لئے پر اجمائے کھڑا تھا۔ ملائکہ کی صفوں سے گذر کر ایک وسیع میدان نظر آتا تھا جہاں اطعمہ لذیذ و اشربہ نفیسہ سے لدی ہوئی میزیں بچھی ہوئی تھیں جو نیک اور پاکباز بندوں کی ارواح پر فتوح کے کام و زبان کے لئے سرمایہ لذت جاودانی بہم پہنچاتی تھیں۔

عوام و جہال کے اطمینان کے لئے تو راحت و سرور کی یہ تصویر کافی تھی اور شاید ان کا ذہن اس تصویر کے دوسرے رخ کی طرف کبھی منتقل بھی نہ ہوتا ہو اور ان کے دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوتا ہو کہ آخر ایسے غیر متغیر و غیر متحرک نظارہ میں جس کو دیکھ دیکھ کر طبیعت کا کبھی نہ کبھی اچاٹ ہو جانا لازمی ہے لذت آفرینی کی قابلیت کس حد تک موجود ہو سکتی ہے لیکن جو ذرا سمجھ دار تھے ان سے عوام کالانعام کی تقلید کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ طبقہ اعلیٰ کے دقیقہ سنج و نکتہ رس پیشوایان دین میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے ان تصورات کو جو مادہ پرستی اور ہوس رانی کی آلائشوں سے آغشتہ تھے کمال حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا اور حاضر و ناظر، قادر مطلق خدا کی ذات صفات کو ان ناپاک قیود سے بری کرنے کے لئے اپنی آواز بلند کی۔

عیسوی مذہب میں بت پرستی کے عنصر کی آمیزش کا عمل تو ہر طرف جاری ہی تھا۔ اب ہر بطریق کو ہر دلعزیز بننے یا اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لئے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ جس طرح بن پڑے اپنے مقتدیوں کے عقائد کو عام اس سے کہ ان عقائد کا زمانہ قبل ظہور مسیحیت ہو یا بعد ظہور مسیحیت مذہب میں داخل کر لیا جائے۔ مصریوں نے اسی طرح مسئلہ تثلیث کے متعلق اپنے خاص قسم کے عقائد کو عیسائیت میں زبردستی داخل کرا لیا تھا اور اب وہ چاہتے تھے کہ مریم عذرا کی پرستش کے بہانہ اسے آئسس کی قدیم پرستش کو از سرنو زندہ کیا جائے۔

انہیں دنوں میں قیصر تھیوڈوسیس نے نسطور کو جو فلسفہ میں تھیوڈور ساکن ماپسوسٹیا کا ہم مسلک تھا قسطنطنیہ کا بطریق اعظم مقرر کیا (۴۲۷ء) ان ذلیل تجسیمیہ عقائد سے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے نسطور کا انکار تھا اور اس کا یہ خیال تھا کہ خدائے ذوالجلال و قیوم کو جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں ساری وداری ہے ذات یا صفات میں انسان کے مشابہ یا مماثل قرار دینا کفر ہے۔ نسطور پر ارسطو کے فلسفہ نے نہایت گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ عقائد مشائیہ کو خالص مسیحی عقائد کے ساتھ تطبیق دی جائے۔ اس بنا پر اس میں اور

اسکندریہ کے بطریق سائرل میں جھگڑا ہو گیا۔ سائرل کا تعلق کلیسا کی اس جماعت سے تھا جو بت پرستی کی حامی تھی اور نسطور اس فریق کا سرگروہ تھا جو مذہب کو مطابق عقل ثابت کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ سائرل وہی ہے جس نے ہائی پیشیا کو قتل کیا تھا۔ سائرل نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ حضرت مریم کی پرستش خدا کی ماں ہونے کی حیثیت سے ارکان کلیسا میں داخل ہو جائے اور نسطور کا مصمم قصد تھا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے صدر گرجا میں نسطور نے ایک خطبہ پڑھا جس میں خدائے قیوم کی صفات کو شرک سے مبرا قرار دیتے ہوئے اس نے ازراہ استعجاب یہ سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے خدا کی ماں ہو؟ اس کے علاوہ متعدد موقعوں پر اس نے اور جو خطبے پڑھے یا مضامین لکھے ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت مریم کو خدا کی ماں نہ سمجھنا چاہئے بلکہ حضرت مسیح کے انسانی حصہ کی ماں تصور کرنا چاہئے اور یہ انسانی حصہ ربانی حصہ سے ایسا ہی جدا ہے جیسا معبد اپنے معبود سے۔

اسکندریہ کے ادنیٰ درجہ کے پادریوں کی شہ پا کر قسطنطنیہ کے پادریوں نے "خدا کی ماں" کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور نسطور کی مخالفت شروع کی۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ شہنشاہ کو مجبور ہو کر حکم دینا پڑا کہ افیسس میں کونسل منعقد ہو۔ سائرل نے اس اثنا میں دربار شاہی کے صدر خواجہ سرا کو کئی سو مثقال سونے کی رشوت دے کر شہنشاہ کی بہن تک رسائی حاصل کر لی۔ اس طور پر آسمانی دربار کی مقدس دوشیزہ کو اپنے ہی ہم جنسوں میں سے ایک حمایت کرنے والی شہنشاہی دربار کی مقدس دوشیزہ کی شکل میں ہاتھ آ گئی۔ سائرل مردوں اور عورتوں کے ایک جم غفیر کو جو طبقہ اراذل و انفار سے تھا ہمراہ لئے ہوئے کونسل میں پہنچا اور خودبخود صدر نشین مجلس بن بیٹھا۔ اس کے ہمراہیوں نے شور مچانا شروع کر دیا اور اس شوروغل میں قبل ازانکہ شامی بطریق جو کونسل میں شریک ہونے کے لئے طلب کئے گئے تھے پہنچیں شہنشاہ کا فرمان پڑھوا دیا گیا۔ اس طور پر سائرل نے ایک دن میں میدان مار لیا اور اپنے حریف کو شکست فاش دے کر خوش خوش گھر پہنچا۔ نسطور نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے کہ اس کے عذرات تو سن لئے جائیں اور جو دلائل وہ پیش کرنا چاہتا تھا ان کو ایک نظر دیکھ تو لیا جائے لیکن اس کی ایک پیش نہ گئی۔ بلا اس کے کہ اس کو صفائی کا موقع دیا جاتا اس پر فرد قرارداد جرم لگا دی گئی۔ جب شامی بطریق جو نسطور کے طرف دار تھے پہنچے تو انہوں نے ایک جلسہ میں اس فیصلہ سے ناراضی و بیزاری کا اظہار کیا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فریقین میں فساد ہو گیا۔ سینٹ جان کے گرجا میں

لاٹھی چل گئی اور بہت کچھ سرپھٹول ہوئی۔ نسطور موردِ عتاب ہوا اور جلاوطن کر کے مصر کے ایک ریگستان میں بھیج دیا گیا۔ اس کے دشمن عمر بھر اس کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے رہے اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی مرثیہ خوانی ان الفاظ میں کی گئی کہ "اس کی کفر بکنے والی زبان میں کیڑے پڑ گئے تھے اور اگرچہ وہ مصری ریگستان کی جھلسنے والی لوؤں کی لپیٹ سے مر کر بچ نکلا ہے لیکن یقین ہے کہ اب اس کا جسم جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونکا جائے گا۔"

لیکن نسطور کی شکست اور سزایابی اس کے عقائد کو کسی طرح نہ مٹا سکی۔ سینٹ میتھیو کی کتاب کے پہلے باب کی آخری آیت اور اسی کتاب کے تیرھویں باب کی پچپنویں اور چھپنویں آیتوں کے صاف اور صریح الفاظ کو جن کے مفہوم میں تاویل کو دخل نہیں پیش نظر رکھ کر وہ اور اس کے پیرو اس بات کا اعتراف نہ کر سکتے تھے کہ آسمان کی نئی ملکہ کی حالت دوشیزگی ایک ہمیشہ قائم رہنے والی صفت ہے۔ ان کے فلسفیانہ رجحانات کی جھلک بہت جلد ان کے طرزِ عمل میں نظر آنے لگی۔ جس زمانہ میں نسطور ریگستان افریقہ میں قید کاٹ رہا تھا اس کے بہت سے پیرو ہجرت کر گئے اور دریائے فرات کے کنارے جا آباد ہوئے جہاں انہوں نے کلیسائے کلدانیہ قائم کیا۔ انہیں کی ساعی نے ایڈیسا کے مشہور دارالعلم کی بنا ڈالی۔ نیسس (نصیبین) کے دارالعلم سے وہ علما و حکما تاج فضیلت سر پر رکھ کر نکلے جنہوں نے نسطوری عقائد کو شام عرب ہندوستان تاتار مصر اور چین میں پھیلا دیا۔ نسطوریوں نے فلسفہ شاؤ کو اپنا عقل مسلک قرار دیا اور ارسطو کی تصانیف کا ترجمہ شامی اور ایرانی زبانوں میں کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے زمانہ مابعد کے دوسرے مصنفین مثلاً پلاٹینی کی تصانیف کا بھی ترجمہ کیا۔ یہودیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے جندی سابور میں ایک طبی مدرسہ قائم کیا۔ ان کے مناووں نے عیسائیت کو نسطوری شکل میں اطراف و اکناف ایشیا میں یہاں تک پھیلا دیا کہ اس کے پرستش کرنے والوں کی تعداد بالاخر کلیسائے یونان و کلیسائے رومن کیتھولک کے یورپین پیروؤں کی مجموعی تعداد سے بھی بڑھ گئی۔ یہ امر خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ عرب میں نسطوری مسیحیوں کا ایک بطریق موجود تھا۔

غرض قسطنطنیہ اور اسکندریہ کی ان مذہبی معرکہ آرائیوں نے ایشیا کے مغربی حصے کو بہت سے فرقوں کی جولانگاہ بنا دیا جو ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور چونکہ دربار شاہی نے ان میں سے اکثر کو سخت سخت سزائیں دی تھیں اور ان پر طرح طرح کی سختیاں کی تھیں لہٰذا ان کے دلوں میں شہنشاہ کی طرف سے نفرت اور کینہ کا طوفان بپا ہو رہا

تھا۔ اس کا نتیجہ ایک بہت بڑے مذہبی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا جس کا اثر آج کے دن تک ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر تھا کہ تمام دنیا اس کی لپیٹ میں آ گئی۔

اس مہتم بالشان واقعہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے مناسب ہو گا کہ اسے دو جداگانہ اجزا میں تحلیل کر کے ہر ایک پر باری باری سے نظر ڈالی جائے یعنی اول تو ایرانیوں کے ہاتھوں ایشیائی مسیحیت کی ہنگامی و عارضی پامالی اور دوم وہ قطعی اور فیصلہ کن اصلاح جو عربوں کے ذریعہ سے عمل میں آئی۔

اولاً۔ مشرقی دربار اپنے آئے دن کے انقلابات کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ اسی طرح کے ایک انقلاب نے خسرو ولی عہد تخت ایران کو مارس قیصر روم کے دربار میں جا کر پناہ لینے اور اس سے مدد مانگنے پر مجبور کیا۔ مارس نے اپنے شاہی مہمان کی دلجوئی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ایک لشکر جرار اس کے ہمراہ کر دیا جس کی مدد سے خسرو مالک تخت و تاج ہو گیا۔ لیکن وہ نمایاں فتوحات جو اس لشکر نے ایران میں حق کو حق دار تک پہنچانے کے لئے حاصل کی تھیں خود مارس کے دولت و اقبال کی محافظت نہ کر سکیں۔ یعنی رومی فوج میں غدر بپا ہو گیا۔ اس بغاوت کا سرغنہ ایک شخص فوکاس نامی تھا جو فوج میں سو سپاہیوں کی کمان کے عہدہ پر مامور تھا۔ قیصر کے مجسمے منہدم کر دئے گئے اور قسطنطنیہ کے بطریق نے اس اعلان کے ساتھ کہ فوکاس کے مذہبی عقائد کلیسائے مقدس کی میزان احتساب میں پورے اترتے ہیں اس کی تاجپوشی کی رسم اپنے ہاتھ سے ادا کی۔ برگشتہ بخت مارس ایک خانقاہ سے جہاں اس نے پناہ لی تھی کشاں کشاں باہر لایا گیا۔ اس کے پانچ بیٹے یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کئے گئے اور آخر میں اس کی گردن ماری گئی۔ اس کی ملکہ کو سینٹ صوفیا کے گرجے سے بلطائف الحیل باہر نکلنے کی ترغیب دی گئی اور جب وہ اس مقام امن سے اپنی تین کم سن بیٹیوں کو لئے ہوئے باہر نکلی تو ان چاروں کو طرح طرح کے عذاب دے کر تہ تیغ کیا گیا۔ شاہی خاندان کے ہوا خواہوں پر انواع و اقسام کے ظلم کئے گئے۔ ظالموں نے بعض کی آنکھیں نکلوا ڈالیں۔ بعض کی زبان گدی سے کھنچوا ڈالی۔ بعض کے ہاتھ پاؤں کٹوا ڈالے۔ بعض کو کوڑے مار مار کر مار ڈالا اور بعض کو زندہ جلا دیا۔

جب یہ خبر روما میں پہنچی تو بطریق گریگوری نے خوشیاں منائیں اور دعا مانگی کہ فوکاس کو اپنے دشمنوں پر غالب آنے کی توفیق بخشے۔ اس ذلیل چاپلوسی کے صلہ میں اسے اسقف اعظم کا لقب دیا گیا۔ اس کی اور نیز بطریق قسطنطنیہ کی متحدہ مخالفت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ

مارس کی نسبت یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ ایرانیوں سے راہ و رسم رکھنے کے باعث اس کا میلان مجوسی عقائد کی طرف ہو گیا ہے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے گلی کوچوں میں جب اسے تشہیر کیا گیا تو عوام الناس نے اس پر پھبتیاں اڑائیں اور آوازے کسے اور اس کو ازراہ استحقار مجوسی کہہ کر پکارا۔

خسرو کو جب اپنے دوست کے قتل کا حال معلوم ہوا تو دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی اور غم اور غصہ کا ایک طوفان اس کے دل میں امنڈ آیا۔ فوکاس نے مارس اور اس کے بیٹوں کے سرکسری کے پاس بھیج دیئے تھے۔ جب یہ کٹے ہوئے سر اس کے دربار میں پیش ہوئے تو اس نے لرز کر اپنا منہ پھیر لیا اور اپنے محسن کے قاتلوں کو اس کا انتقام لینے کے لیے فوراً دولت روما پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

افریقہ کے نائب السلطنتہ ہیرقلس کو بھی جو سلطنت کا رکن اعظم تھا اس دردناک سانحہ کے سننے سے نہایت صدمہ ہوا اور اس نے دل میں ٹھان لی کہ جو ہو سو ہو قیصران روم کے تخت کو ایک کریہ المنظر اور فرد مایہ فوجی افسر کی غاصبانہ دستبرد سے بچایا جائے۔ فوکاس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اس کا قد چھوٹا اور اس کی صورت مکروہ تھی۔ اس کی نالایم گھنی بھورن اس کے سرخ رنگ کے بالوں اور اس کی نکیل ٹھڈی نے جس پر داڑھی کی علامت تک نہ تھی اس کے چہرے کے ایک مہیب داغ کے ساتھ مل کر اس کی شکل کو نہایت ہی گھناؤنا اور ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ وہ جاہل مطلق اور کندہ ناتراش تھا۔ ملک کے قوانین سے بالکل نابلد تھا حتیٰ کے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی واقف نہ تھا۔ اور عیاش اور شرابخواری اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ پہلے تو ہرقلس نے اسے خراج دینے اور اس کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر کھلم کھلا علم مخالف بلند کیا لیکن چونکہ ضعف پیری اور انحطاط قوا لئے اس قابل نہ رکھا تھا کہ میدان جنگ کی سختیوں اور صعوبتوں کی خود تاب لا سکے لہٰذا یہ خطرناک مہم اس نے اپنے بیٹے کو جو کہ اس کا نام بھی ہرقلس تھا سونپی۔ نوجوان ہرقلس ایک جرار جنگی بیڑا لے کر روانہ ہوا اور موافق ہواؤں کی مدد سے بہت جلد قسطنطنیہ کے سامنے آپہنچا۔ زمانہ کی ادا پہچاننے والا پادری۔ ارکان سلطنت اور شہر کے باشندے فتح کا پلہ اس کی طرف جھکا ہوا دیکھ کر اس کے شریک ہو گئے آخر غاصب گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

لیکن قسطنطنیہ کا یہ انقلاب فرمانروائے ایران کی یلغار کا مزاحم نہ ہوا۔ کسریٰ کے مجوسی ریدون نے یونانیوں کی دروغ آمیز اور ظالمانہ اوہام پرستیوں کے خلاف اس کے کان اچھے۔

طرح سے بھر دیئے تھے اور اس کو جتلا دیا تھا کہ یونانیوں کی ایک نہ سنی چاہئے بلکہ جو کچھ کرنا چاہئے اپنی قوت ممیزہ کے بھروسے پر کرنا چاہئے۔ غرض خسرو نے دریائے فرات کو عبور کیا۔ شام کے مسیحی فرقون نے جو قسطنطنیہ کی طرف سے خار کھائے بیٹھی تھی اس کی فوج کے راستے میں اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ حملہ آور کا خیر مقدم ہر جگہ نہایت تپاک سے گیا۔ جس شہر میں اس کا گذر ہوا وہاں کے باشندے روما کی اطاعت کا جوا کندھے سے اتارا کر اس کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح انطاکیہ قیصریہ اور دمشق یکے بعد دیگرے نہایت آسانی سے مسخر ہوتے ہوئے چلے گئے۔ بیت المقدس کسی قدر مزاحمت کے بعد ہلہ میں سر ہو گیا۔ ایرانیوں نے مرقد مسیح اور قسطنطنیہ وہلینا کے گرجاؤں میں آگ لگا دی۔ صلیب عیسوی کو بطور یادگار فتح ایران بھیج دیا۔ گرجاؤں کا مال و متاع لوٹ لیا۔ مقدس تبرکات کو جنہیں دست اوہام نے بڑے چاؤ سے جمع کیا تھا نیست و نابود کر دیا۔ پھر مصر پر حملہ کیا اسے فتح کر کے سلطنت ایران کے ساتھ شامل کر لیا۔ اسکندریہ کے بطریق نے بھاگ کر قبرس میں جا پناہ لی۔ ساحل افریقہ طرابلس تک ایرانی فوج کے قبضہ میں آگیا۔ شمال کی جانب ایشیائے کوچک کل کا کل مسخر ہو گیا اور دس سال تک ایرانی فوجیں قسطنطنیہ کے سامنے باسفورس کے ساحل پر ڈیرے ڈالے پڑیں رہی۔

جب ہرقلس پر سخت ہی آبنی تو اس نے بدرجہ مجبوری صلح کی التجا کیا۔ لیکن پرغرور اور متکبر کسریٰ نے یہ جواب دیا کہ جب تک شہنشاہ روم اپنے مصلوب خدا سے ابا کر کے آفتاب کی پرستش نہ کرے گا میں اس کی التجا سے صلح قبول نہ کروں گا۔ آخر بعد وقت ساڑھے سات سو من سونا اسی قدر چاندی ایک ہزار خلعت ہائے فاخرہ ایک ہزار گھوڑی اور ایک ہزار صاحب جمال دوشیزہ لڑکیاں سلطنت روما کی آزادی کا فدیہ قرار پائیں۔

لیکن ہرقلس کی یہ اطاعت چند روزہ تھی۔ اس نے کچھ عرصے کے بعد نہ صرف وہ ملک جو خسرو نے اس سے چھینا تھا واپس لے لیا بلکہ ایران پر چڑھائی کر کے وہ جنگی کارنامے یاد دلائے جن کے لحاظ سے دولت روما کا سب سے زیادہ روشن زمانہ یادگار تاریخ ہے۔

اگرچہ سلطنت روما کی جنگی عظمت اس طور پر بحال ہو گئی تھی اور اگرچہ اس نے وہ تمام ملک جو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا واپس لے لیا تھا لیکن ایک نقصان اسے ایسا پہنچا تھا جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہ تھی۔ یعنی دولت ایمان گئیے وقت کی طرح پھر نہ آ سکتی تھی۔ مجوسیت نے ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے مسیحیت کا خاکہ اڑایا تھا اور حضرت مسیح کے مزار کو آگ لگا کر۔ گرجاؤں کو لوٹ کر اور مٹا کر۔ بیش بہا تبرکات کو خاک کی طرح

ہوا میں اڑا کر اور صلیب کو ہر طرح کے تمسخر اور تضحیک کے بعد مال غنیمت میں ملا کر مسیحیت کے مقدس ترین مقامات یعنی بیت اللحم جشمین اور کیلوری کی توہین کی تھی۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ شام مصر اور ایشیائے کوچک میں معجزوں کی بھرمار تھی۔ کوئی گرجا ایسا نہ تھا جو ایک طول و طویل فہرست آسمانی نشانات کی پیش نہ کر سکتا ہو۔ بات بات پر معجزے اور کرامتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ لیکن اس نازک موقع پر جب آسمانی نشانات کی ایسی سخت ضرورت تھی ایک بھی نشان ظاہر نہ ہوا۔

ارض مشرق کی مسیحی آبادی نے جب دیکھا کہ مجوسی حملہ آوروں نے ان کے گرجاؤں کو آگ لگا دی ان کی خانقاہوں کو مسمار کر دیا ان کی پاک یادگاروں کی بے حرمتی کی اور اس پر بھی حملہ آوروں پر عذاب آسمانی نازل نہیں ہوا تو اس بوالعجبی نے انہیں کچھ دیر کے لئے ساکت و صامت کر دیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کا قہران کفار پر بجلی بن کر گرے گا۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ زمین پھٹ جائے گی۔ خدا کی تلوار برق خاطف کی طرح اوج فلک پر چمکتی ہوئی نظر آئے گی اور ان دین مقدس کی بے حرمتی کرنے والوں کا حشر بھی وہی ہو گا جو سناچرب کا ہوا تھا۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ ایک آسمانی نشانی بھی اس موقع پر ظاہر نہ ہونے پایا۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ لوگوں کا تعجب مبدل بہ خوف ہو گیا اور خوف کی جگہ بداعتقادی نے لے لی۔

ثانیاً اگر اس میں شک نہیں کہ ایرانی فتوحات کے نتائج مسیحیت کے حق میں سخت خطرناک تھے لیکن ان نتائج کو پھر بھی اس مہتم بالشان واقعہ کا محض ایک مقدس سمجھنا چاہئے جس کا ذکر اب آتا ہے یعنی مسیحیت کے خلاف جنوبی اقوام کی بغاوت۔ اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ممالک عیسائیوں کے قبضہ میں تھے ان کا نو دسواں حصہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا یعنی ایشیا و افریقہ کلا اور یورپ جزا" مسیحیت کی حلقہ بگوشی سے آزاد ہو گیا۔

۵۸۱ء کے موسم گرما میں اونٹوں کا ایک قافلہ شہر بصرا میں پہنچا جو دمشق کے جنوب میں ملک شام کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ کاروان مکہ سے آیا تھا اور جنوبی عرب کی گراں بہا پیداوار اپنے ساتھ لایا تھا کارواں سالار کا نام ابو طالب تھا جس کے ہمراہ اس کا ایک دوازدہ سالہ بھتیجا بھی تھا۔ چچا بھتیجے شہر کی نسطوری خانقاہ میں اتارے گئے جہاں کے مہمان نواز راہبوں نے ان کی بہت کچھ خاطر مدارت کی۔

سکه خانقاہ کے راہبوں کو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا خورد سال مہمان جس کا نام حلیبی یا محمد تھا عربوں کے مقدس معبد کعبہ کے محافظ کا بھتیجا ہے۔ ان میں سے ایک راہب

بحیرہ نامی نے کوشش کی جس طرح ہو اس لڑکے کے دل سے اس بت پرستی کے اثر کو جو اس کا آبائی مذہب ہے زائل کیا جائے۔ بحیرہ نے دیکھا کہ لڑکا نہایت ہونہار اور غیر معمولی طور پر ذہین ہے اور مذہبی باتوں کو نہایت شوق اور توجہ سے سنتا ہے۔

محمدؐ کے اہل وطن یعنی مکہ کے باشندوں کا سب سے بڑا معبود ملک ایک کالا پتھر از قسم شہاب ثاقب تھا جو تین سو ساٹھ بتوں کے ساتھ کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔ یہ بت کالے پتھر کے توابع متصور ہوتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں شمسی سال تین سو ساٹھ دن کا محسوب ہوتا تھا لہٰذا ہر بت سال کے ایک دن سے منسوب تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کلیسائی عیسوی کا شیرازہ پادریوں کے حب جاہ اور خباثت نفس کی وجہ سے پراگندہ ہو رہا تھا۔ اجتہادات کو شان اجماع بخشنے کے بہانے سے اکثر کونسلوں کے اجلاس منعقد ہوتے تھے لیکن اس انعقاد کا اصل مقصد پوشیدہ رکھا جاتا تھا۔ بسا اوقات ان کونسلوں میں جبر' ارتشا اور بددیانتی کا سماں نظر آتا تھا۔ مغرب میں بطریقہ کا عہدہ دولت و تمول عیش و عشرت اور شکوہ و طمطراق کی ایسی نیت آزما ترغیبات پیش کرتا تھا کہ اس عہدہ پر کسی پادری کے نامزد ہوتے وقت خونریز ہنگاموں کا واقع ہونا مساوات ہو گیا تھا۔ مشرق میں دربار قسطنطنیہ کے طرز عمل نے کلیسا کو مباحثوں مناقشوں اور مجادلوں کی جولا نگاہ بنا رکھا تھا۔ جو بے شمار فرقے ان مذہبی معرکہ آرائیوں نے پیدا کر دیئے تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ اریئن' سیلیڈین' کالیریڈئن' یوٹیشئن' ناسٹک' جیکوبائٹ' مارسیو نائٹ' نسطورین' سیلئن' ویلنٹا نئن' منجملہ ان کے میریونائٹ فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ تثلیث کے ارکان حسب ذیل ہیں باپ خدا بیٹا خدا اور مریم عذرا خدا۔ فرقہ کالریڈئن حضرت مریم کو خدا سمجھ کر پرستش کرتا تھا اور ان کی موت پر مٹھائی کا چڑھاوا چڑھاتا تھا۔ فرقہ نسطوری جیسا کہ ہم کو معلوم ہی ہے اس عقیدہ سے انکار کرتا تھا کہ خدا کی بھی ماں ہو سکتی ہے۔ اس فرقہ کو اس امر پر ناز تھا کہ وہ یونان قدیم کے علوم و فنون کا وارث و مالک تھا۔

یہ تمام فرقے اگرچہ عقائد میں ایک دوسرے کے حریف تھا لیکن ایک بات قدر مشترک کے طور پر ایسی بھی جس پر ان سب کا اتفاق تھا اور جس کے لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے حلیف کہلا سکتے تھے اور وہ بات تھی ان کی باہمی نفرت اور عداوت جس نے ہر فرقہ کو دوسرے فرقہ کا دشمن جان بنا رکھا تھا۔ عرب جس کو اپنی حریت اور خود مختاری پر ناز تھا جس کو کسی کی کشور کشائی مسخر نہ کر سکی تھی اور جس کی وسیع سرزمین بحر ہند سے لے

کر ریگستان شام تک پھیلی ہوئی تھی آڑے وقت میں ان میں سے ایک ایک کا لجا وماوی بنا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ قدیم سے یہی ہوتا چلا آیا تھا۔ جب کوئی قوم مغلوب ہوئی اور فریق غالب نے اس کا قافیہ تنگ کر دیا تو اس نے بھاگ کر عرب ہی میں پناہ لی۔ چنانچہ جب رومیوں نے فلسطین کو فتح کیا تو یہودیوں کی ایک تعداد کثیر یہیں آکر پناہ گزین ہوئی۔ سینٹ پال اہل گلیشیا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب مشرف بہ اصطباغ ہو کر میں نے اپنے آپ کو ہر طرف سے مخالفین کے نرغہ میں گھرا ہوا پایا تو فورا عرب چلا آیا۔ غرض عرب کی وادیوں اور صحراؤں میں عیسائی راہبوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آنے لگے۔ جنگی تبلیغی کوششوں نے عرب کو سربر آوردہ قبایل میں سے اکثر کو دائرہ مسیحیت میں داخل کر لیا۔ جا بجا گرجے بن گئے۔ اور عرب کا جنوبی حصہ جس میں حبش کے نسطوری العقاید فرمانرواؤں کے قبضہ میں آگیا۔

بحیرہ راہب نے بصرا کی خانقاہ میں حضرت محمدؐ کو نسطوری عقاید کی تعلیم دی اور اپنے مظالم کی داستان شروع سے آخر تک حرف بحرف کہہ سنائی۔ یہ انہیں ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلعم کے دل میں کلیسائے مشرقی کی بت پرستانہ رسموں کی طرف سے عموماً" اور اوثان و اصنام کی پرستش کی طرف سے خصوصاً" وہ نفرت بیٹھ گئی جس کو کوئی قوت مٹا نہ سکی۔ اور بحیرہ راہب ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اس عجیب و غریب زندگی کے دوران میں جس کے کارناموں نے دنیا کو محو حیرت کر دیا حضرت مسیح کو کبھی خدا کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا بلکہ ہمیشہ مسیح ابن مریم کے لقب سے یاد فرمایا۔ آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن مستعدو اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیقوں کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا اور یہ وہ اتالیق تھے جنہیں ارسطو کے جانشین اور حکمت مشائیہ کے سبق آموز ہونے کے لحاظ سے اپنی ذات پر ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں کے مذہبی عقاید نے آپ پر کہاں تک قابو پا لیا تھا چنانچہ اس ارادت و محبت کا جو آپ اس فرقہ کے ساتھ رکھتے تھے آپ نے متواتر ثبوت دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت اس انس و عقیدت کا کیا ہو گا کہ آپ نے اپنی زندگی کو نسطوریوں کے دینی عقاید کی توسیع و اشاعت کے لیے وقف کر دیا اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے ان کے علمی و مشائی اصول اختیار کر لیے اور نہایت سرگرمی سے ان کی اشاعت میں حصہ لیا۔

جب حضرت محمدؐ سن رشد کو پہنچے تو آپ نے ارض شام کے اور بھی سفر کیے۔ یہ خیال

کرنا بعید از قیاس نہ ہو گا کہ ان موقعوں پر آپ نسطوری خانقاہ میں جا کر اس کے مہمان نواز کمینوں سے جنہیں آپ نے فراموش نہ کیا تھا ضرور ملے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک شام کی آپ کے دل میں بڑی وقعت تھی۔ مکہ کی ایک دولت مند بیوہ جن کا نام خدیجہؓ تھا اپنی شامی تجارت کا کل کاروبار آپ کے سپرد کر چکی تھی۔ آپؐ کی قابلیت اور ایمانداری نے جناب خدیجہؓ کو آپؐ کا گرویدہ بنا دیا اور چونکہ مبداء فیاض سے حسن کامل اور خلق عظیم آپ کے حصہ میں آیا تھا لہذا وہ آپ پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئیں۔ عورتوں کا دل ہر ملک اور ہر زمانہ میں اسی قسم کے جذبات کی جولا نگاہ بنا رہا ہے۔ غرض جناب خدیجہؓ نے ایک کنیز کے ذریعہ سے اپنے دل کا حال آپ پر ظاہر کیا اور دونوں کا عقد ہو گیا۔ اس کے بعد چوبیس سال تک جناب خدیجہ زندہ رہیں۔ اس مدت دراز میں آن حضرتؐ نے اپنے آپ کو ان کا وفادار شوہر ثابت کیا اور ایک ایسے ملک میں جہاں کثرت ازدواج کی رسم عام تھی آپ کبھی دل میں یہ خیال تک نہ لائے کہ دوسرا نکاح کر کے جناب خدیجہؓ کی توہین و دل آزاری کا موجب بنیں۔ کئی سال کے بعد جب آپؐ نیر اقبال نصف النہار پر تھا ایک دفعہ جناب عائشہ صدیقہؓ نے جو حسن و جمال کے لحاظ سے عرب بھر میں مشہور تھی آپ سے جناب خدیجہ الکبریٰ کا ذکر ان الفاظ میں کیا: "کیا وہ بڑھیا نہ تھی"؟ کیا مجھے آپ کے حبالہ عقد میں لا کر خدا نے آپ کو اس سے اچھی بی بی عطا نہیں فرمائی"؟ آن حضرت یہ سن کر بے قرار ہو گئے اور اس لہجہ میں جس سے بوئے امتنان آتی تھی یہ جواب دیا "واللہ خدیجہ سے بہتر بی بی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب اور لوگ مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تو وہ مجھ پر ایمان لائی۔ جب میں کوڑی کوڑی کو محتاج تھا اور دنیا میرے درپے آزار تھی تو اس نے مجھے نہال کر دیا"۔

جناب خدیجہؓ سے عقد کرنے کی بدولت آپ معاش کی طرف سے فارغ البال ہو گئے اب آپ کو اس مذہبی غور و فکر کا پورا موقعہ ہاتھ آیا جس سے آپ کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ جناب خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی ورقہ نے جو یہودی تھا اس زمانہ میں دین عیسوی اختیار کر لیا تھا اور عیسائی ہونے کے بعد پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ بائبل کا ترجمہ عربی میں کر ڈالا۔ آنحضرتؐ کو مذہبی امور پر ورقہ سے گفتگو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا اور ان مکالمات نے اس نفرت کو جو آپ کے دل میں بت پرستی کی طرف سے جاگزین تھی اور زیادہ راسخ کر دیا۔

جس طرح تارک الدنیا مسیحی راہبوں نے صحراؤں میں آبادی سے دور اپنے جھونپڑے

ڈال رکھے تھے جن میں وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اسی طرح آنحضرتؐ نے کوہ حرا کی ایک غار میں جو مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا عزلت گزین ہو کر خدا کی عبادت کرنی شروع کی آپ کا وقت مراقبہ و استغراق میں کٹنے لگا۔ اس عالم تنہائی میں آپ نے خدائے قیوم و ذوالجلال کی صفات جلالی پر غور و خوض کرتے کرتے ایشیائی مسیحیت کے عقاید پر نظر ڈالنی شروع کی۔ اقانیم ثلثہ کے عقیدہ کو جب سلجھانا چاہا تو یہ مشکل پیش آئی کہ ایک طرف تو حضرت مسیح کو نسبت ابوت قادر مطلق سے وابستہ کیے ہوئے ہے دوسری طرف حضرت مریم ہیں کہ ایک ہی وقت میں شان دوشیزگی بھی لیے ہوئے ہیں گود بھی بھری ہوئی ہے اور آسمان کی ملکہ بھی ہیں۔ ان مشکلات نے نے آپ کے دل میں یہ سوال پیدا کیا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ انسان اس قسم کے عقاید اختیار کرے اور پھر بھی گناہ میں مبتلا نہ ہو یا کفرو شرک کے خطرات میں گرفتار نہ ہو۔

غارِ حرا میں مدتوں محوِ غور و فکر رہنے کے بعد حضرت محمدؐ اس نتیجے پر پہنچے کہ متضاد و متباین عقاید کے بادلوں کا جو گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے اس میں ایک بڑی حقیقت یعنی توحید باری کی روشنی نظر آسکتی ہے۔ چنانچہ ایک کھجور کے درخت کے تنے سے پیٹھ کو ٹیکا دے کر آپ نے اپنے خویش و اقارب کے سامنے اس بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے علی روس الاشهاد فرمایا کہ آپ اس حقیقت کی اشاعت کے لیے اپنی زندگی کو وقف فرما دیں گے۔ اپنے خطبوں میں اور نیز قرآن میں بار بار آپ نے ان الفاظ کو دہرایا ہے۔ "میں تو محض ایک مناد ہوں اور خدا کی وحدانیت کی تلقین کرتا ہوں"۔ اپنی نبوت کے متعلق خود آپ کا خیال یہی تھا۔ چنانچہ اس دن سے اپنی وفات کے وقت تک آپ اپنی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنے رہے جس کے نگینہ پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ "محمد الرسول اللہ"

اطبا اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو شخص صایم الدہر ہوتا ہے اور عرصہ تک دماغی پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا رہتا ہے اسے التباس حواس کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے یعنی وہ چیزیں محسوس ہونے لگی ہیں جن کی خارجی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ نفس کش راستباز اور مستقیم العزم اشخاص نے جن مذاہب کی بنیاد ڈالی ہے ان میں سے شاید ایک بھی مذہب ایسا نہ ہو گا جس میں فوق العادت آزمایشات و امتحانات اور فوق القدرت احکام و اوامر کی مثالیں نہ ملتی ہوں۔ پُراسرار آوازیں عربی پیغمبر کو سنائی دیتی تھیں جس میں آپ کو استقامت کی ہدایت ہوتی تھی اور عجیب و غریب صورتوں کی پرچھائیاں آپ کے سامنے سے

گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں دور سے گھنٹی کے بجنے کی سی آواز ہوا کو چیرتی ہوئی آپ کے کانوں میں پڑتی تھی۔ ایک دفعہ رات کے وقت عالم خواب میں جبریل امین آپ کو مکہ سے بیت المقدس کی طرف لے گئے اور وہاں سے دونوں نے آسمان کا رخ کیا۔ چھ آسمانوں کی سیر میں جبریل نے آپ کی مشایعت کی لیکن ساتویں آسمان کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے ان کے بھی پر جلے۔ اس لیے آپ تن تنہا اس مہیب ہاول میں داخل ہوئے جس کا نقاب ہمیشہ قادر مطلق کے چہرے پر پڑا رہتا ہے۔ اور جب باری تعالیٰ کے سرد ہاتھ کا لمس آپ کو اپنے شانہ پر محسوس ہوا تو آپ کا دل دہل گیا۔

اول اول آپ کے مواعظ و نصائح کی لوگوں نے بہت مخالفت کی اور آپ کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ بت پرستوں نے آپ کو مکہ سے نکال دیا اور آپ کو مدینہ میں جہاں بہت سے یہودی اور نسطوری موجود تھے پناہ لینی پڑی۔ نسطوریوں نے فوراً آپ کا مذہب قبول کر لیا جس سے فی الجملہ آپ کو تقویت ہو گئی۔ کفار کی ایذار رسانی سے مجبور ہو کر آپ نے اپنی صاحبزادی اور بعض صحابہ کو پہلے سے حبش بھیج دیا تھا جہاں کا فرمانروا نسطوری المذہب عیسائی تھا۔ چھ سال کی مدت میں صرف پندرہ سو آدمی آپ کے مذہب میں داخل ہوئے۔ لیکن تین چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جو بعد میں بدر، احد اور احزاب کے نام سے مشہور ہوئیں آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ کی سب سے زبردست دلیل تلوار ہے۔ چنانچہ اس خیال کو آپ نے ان فصیح الفاظ میں جو مشرق سے آپ کو میراث میں ملے تھے اسطرح ظاہر کیا ہے۔ "جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔" غزوات کے ایک کامیاب سلسلہ نے آپ کے دشمنوں کا استیصال کلی کر دیا۔ عرب کی بت پرستی نیست و نابود ہو گئی۔ اصول لا الہ الا اللہ کو جس کا آپ نے اعلا فرمایا تھا آپ کے ابنائے وطن نے یک زبان ہو کر تسلیم کر لیا اور آپ کی نبوت پر بھی ایمان لے آئے۔

آؤ اب ہم آپ کی طوفان انگیز زندگی کے مہتم بالشان کارناموں سے قطع نظر کریں اور سنیں کہ جب آپ کے دولت و اقبال کا آفتاب بصد آب و تاب چمک رہا تھا اور آپ کی حیات مستعار کا آخری وقت قریب آچلا تھا تو آپ کا طرز زندگی کیا تھا اور آپ نے اس وقت کیا کیا خیالات ظاہر کئے۔

عقیدہ وحدت باری تعالے کے امٹ نقش کو اپنی لوح ایقان پر مرتسم کئے ہوئے آپ اس حج کے قصد سے جس کے بعد پھر کوئی حج آپ نے نہیں کیا مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے۔ ایک لاکھ چودہ ہزار مسلمانوں کا قافلہ آپ کے پیچھے پیچھے تھا۔ اونٹ پھولوں کے ہاروں سے آراستہ و مزین تھے۔ لہراتے ہوئے پرچموں سے اس پرشکوہ کاروان کی سج دھج

دوبالا ہو رہی تھی۔ اس شان و شوکت کے ساتھ جب آپ مکہ معظمہ کے قریب پہنچے تو آپ نے یہ دعا کی: "الٰہی میں تیری عبادت کے لئے یہاں موجود ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ تجھی کو عبادت سزاوار ہے۔ تو ہی مالک الملک ہے۔ کونین کی سلطنت میں تیرا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

آپؐ نے اپنے ہاتھ سے اونٹوں کی قربانی کی۔ اس قدیم رسم کی نسبت آپ کا یہ خیال تھا کہ نماز اور قربانی مساوی الفضائل ہیں۔ جو دلیل ایک کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے اسی سے دوسری کو ثابت کیا جا سکتا ہے[۵]۔

کعبہ کے منبر پر چڑھ کر آپؐ نے فرمایا کہ اے مسلمانوں میں بھی تمہاری طرح محض ایک انسان ہوں۔ جب یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلے تو سننے والوں کو معاً وہ واقعہ یاد آ گیا جب ایک شخص ڈرتے ڈرتے آپ کے قریب آیا تھا اور آپ نے اس سے فرمایا تھا کہ بھئی اس قدر کیوں سہمے جاتے ہو میں کچھ بادشاہ تو ہوں نہیں۔ ایک غریب عرب عورت کا بیٹا ہوں جو اونٹ کا گوشت دھوپ میں سکھا کر کھایا کرتی تھی۔

حج کر کے آپ نے مدینہ کو مراجعت کی۔ آپ کی زندگی کا مقصد مکمل ہو چکا تھا۔ اب وہ وقت آ گیا کہ آپ دنیا سے رحلت کریں۔ آخری تقریر جو آپ نے مسلمانوں کی جماعت کے سامنے کی اس کے الفاظ یہ تھے: "ہر شے خدا کی مرضی کے تابع ہے۔ اور اس کے لئے ایک خاص وقت مقرر ہے جس میں نہ تقدیم کو دخل ہے نہ تاخیر کو۔ جس نے مجھے دنیا میں بھیجا تھا میں اس کی طرف مراجعت کرتا ہوں اور تم کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ بھائی بھائی ہو کر رہو۔ ایکدوسرے کے ساتھ عزت اور محبت کا برتاؤ کرو۔ وقت پر ایک دوسرے کے کام آؤ اور ایکدوسرے کو ایمان پر ثابت قدم رہنے اور نیک عمل کرنے کی ہدایت کرو۔ میں جب تک زندہ رہا تمہاری بھلائی کی تدبیریں کرتا رہا اب مرتے وقت بھی اگر مجھے کوئی خیال ہے تو تم لوگوں کی بہبودی کا۔"

حالت نزع میں آپ کا سر حضرت عائشہؓ کے زانو پر تھا۔ فرط کرب سے آپ رہ رہ کر اپنا ہاتھ پانی کے طشت میں جو پاس رکھا ہوا تھا ڈالتے تھے اور اپنا چہرہ تر کرتے تھے۔ آخر اس کی بھی طاقت نہ رہی۔ آپؐ کی نگاہیں عرش بریں کی طرف اٹھ گئیں اور ٹوٹے ہوئے لہجہ میں یہ آخری الفاظ آپ کے منہ سے نکلے: الٰہی——— میرے گناہ معاف کر——— آمین——— میں آیا۔"

کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے شخص کا نام تعظیم و تکریم کے ساتھ نہ لیا جائے؟" یہ شخص وہ ہے جس کے اصول آج کے دن بنی نوع انسان کے ایک تہائی حصہ کے رہنما و پیشوا ہیں۔

حضرت محمدؐ اپنے ملک کے قدیم بت پرستانہ عقائد سے تو پہلے ہی ابا کر چکے تھے۔ ان اصول کے تسلیم کرنے سے بھی آپ نے انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے نسطوری اساتذہ نے آپ کو سکھائے تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل ان کی تائید نہ کر سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کے ابتدائی صفحوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے ان صحائف آسمانی کو جو حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئے منجانب اللہ سمجھا اور ان دونوں انبیائے کرام کو بھی آپ نے واجب التعظیم خیال کیا لیکن باری تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تعظیم و تکریم کا جلوہ خصوصیت کے ساتھ قرآن کی ہر سورت میں نظر آتا ہے۔ الوہیت مسیح کا مسئلہ آپ کو نہایت ہی قبیح و مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ خدا کی ماں کی حیثیت سے حضرت مریم کی پرستش کو اور عام طور سے مورتوں اور تصویروں کی عبادت کو آپ ایک ذلیل درجہ کی بت پرستی تصور کرتے ہیں۔ آپ تثلیث کے قطعی منکر ہیں جس کی نسبت آپ کا یہ خیال ہے کہ اس مسئلہ کی بجز اس کے اور کوئی تاویل ممکن نہیں کہ تین خدا علیحدہ علیحدہ موجود ہیں۔

آپ کا مقصد خاص صرف اسی قدر تھا کہ مذہب کی اصلاح کی جائے اور جو خرابیاں اس میں پیدا ہو گئی ہیں انہیں دور کیا جائے یعنی عربوں کی بت پرستی کو مٹا کر اس وحشیانہ فرقہ بندی کا خاتمہ کر دیا جائے جس نے عیسائیت کو فساد کا گھر بنا دیا تھا۔ یہ خیال کہ آپ ایک نیا مذہب قائم کرنا چاہتے تھے ایک بہتان تھا جو آپ پر قسطنطنیہ میں باندھا گیا۔ جہاں آپ ویسے ہی برے سمجھے جاتے تھے جیسا کئی صدیوں کے بعد لوتھر روما میں سمجھا گیا۔

لیکن اگرچہ آپ نے فرط حقارت سے ان تمام باتوں کو رد کر دیا جن سے مسئلہ وحدت باری تعالیٰ کی کچھ بھی نفی ہوتی تھی پھر بھی تجسیمی تصورات کی قید سے آپ اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔ قرآن کا خدا بالکل انسان کے مشابہ ہے بلکہ اگر موزونی الفاظ اجازت دے تو کہا جا سکتا ہے کہ جسمانی اور دماغی ہر ایک اعتبار سے یہ خدا مثیل انسان ہے۔ لیکن مسلمان بہت جلد ان ادنیٰ درجہ کے خیالات کی پستی سے نکل کر ان رفیع الشان تصورات تک پہنچ گئے جن میں حکمت و ادراک کی لطافتیں اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔

اسلام کی ابتدائی صورت کا جو خاکہ یہاں کھینچا گیا ہے اس پر بڑے بڑے قابل نکتہ سنج اہل آرا کا صاد ہے۔ سر ولیم جونس نے بہ اتباع لاک یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اسلام اور عیسائیت کا سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ مسلمان مسیح کو نہ تو ابن اللہ سمجھتے ہیں اور نہ بیٹے کو الوہیت کی حیثیت سے باپ کا ہم درجہ مانتے ہیں۔ خدا کی وحدانیت اور صفات کے متعلق ایسے ایسے خیالات رکھتے ہیں جن سے انسان کے قلب پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔" اٹلی میں اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے۔ ڈینٹی کا خیال تھا کہ اسلام عیسائیت کی محض ایک

نئی شاخ ہے اور مسلمانوں کو اریُس کے پیروؤں کا ایک فرقہ سمجھنا چاہئے۔ انگلستان میں
و میٹلی اسلام کو عیسائیت کی ایک مسخ شدہ شکل سمجھتا ہے۔ لیکن ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ
اسلام نسطوری مذہب کی ایک شاخ تھا جس کے مقاصد ابتدائی محدود تھے۔ جب تک کہ
یونانی مسیحیت کو بہت سی نتیجہ خیز لڑائیوں مین نیچا دکھا کر یہ مذہب بہ سرعت تمام ایشیا و
افریقہ میں پھیل نہ لیا اور اپنی حیرت انگیز فتوحات کے نشہ میں چورنہ ہو لیا اس وقت تک
اس نے اپنے ابتدائی مقاصد کو پس پشت نہ ڈالا اور ایک نئی شرع کے بانی ہونے کا دعوی نہ
کیا۔[الخ]

حضرت محمدؐ کی قریباً" ساری زندگی اپنے ہی وطن کا مذہب بدلنے یا اسے فتح کرنے میں
بسر ہوئی۔ لیکن اخیر دنوں میں آپ کی قوت اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ مسلمانوں کو شام اور
ایران پر حملہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو چلا تھا۔ چونکہ آپ نے سلطنت کو اپنے خاندان میں
قائم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا لہٰذا آپ کی جانشینی کا مسئلہ جھگڑے میں پڑ گیا۔ آخر
بہت کچھ کشمکش اور جدوجہد کے بعد جناب عائشہؓ کے والد حضرت ابوبکرؓ جانشینی کے لئے نامزد
ہوئے اور پہلے خلیفہ یا نائب رسول اللہ مقرر ہوئے۔

اشاعت اسلام و اشاعت مسیحیت میں ایک بہت بڑا اہم فرق ہے۔ مسیحیت کو کبھی بھی
اتنی طاقت حاصل نہ ہوئی کہ دولت روما کی بت پرستی کا قلع قمع کر سکتی۔ جس قدر اس کو
ترقی ہوئی اسی قدر بت پرستی کا عنصر اس میں زیادہ ملتا گیا۔ ایک مذہب کی قدیم شکلیں زندہ
ہو کر دوسرے مذہب میں آملیں اور نتیجہ جیسا کہ گزشتہ اوراق میں بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے
یہ ہوا کہ مسیحیت بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہو گئی۔

لیکنؔ عرب میں حضرت محمدؐ نے قدیم بت پرستی کو ایسا مٹایا کہ اس کا نشان تک باقی نہ
رکھا۔ جن عقائد کی آپ نے اور آپ کے جانشینوں نے تلقین کی ان میں بت پرستی کا
ڈھونڈے سے بھی سراغ نہیں ملتا۔ وہ حجر اسود جو آسمان سے گرا تھا اور وہ بت جو اس کے
گرد حلقہ زن تھے سب نظر سے غائب ہو گئے۔ نئے مذہب کا اصل اصول یعنی لا الہ الا اللہ
دنیا میں بغیر کسی قسم کی مشرکانہ آمیزش کے پھیل گیا۔ جنگی فتوحات نے قرآن کے مذہب کو
دنیوی اعتبار سے بہت کچھ نفع بخش ثابت کیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ مذہب کا اصل اصول
خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جب تلوار کا زور ہوتا ہے تو بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر نئے
مذہب کی حلقہ بگوشی کے لئے تیار ہو ہی جاتے ہیں۔

اسلام کے باقی عقائد کو جو مشہور و معروف ہیں میں یہاں نظر انداز کرتا ہوں۔ جن
ناظرین کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ میری کتاب "ہسٹری آف دی انٹلکچوئل ڈیویلپمنٹ

آف یورپ" (یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ) کا گیارہواں باب ملاحظہ فرمائیں جس میں میں نے قرآن پر تنقید کی ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا لکھ دینا کافی ہو گا کہ مسلمانوں کی بہشت کی سات منزلیں ہیں اور ہر منزل گویا فرمانروایان مشرق کا ایک محل ہے جس میں ہر طرح کی جسمانی لذتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سیاہ آنکھوں والی حوریں اور غلمان بھرے پڑے ہیں۔[1] اسلام کے خدا کی صورت شاید کفر آلودہ عیسائیت کے خدا کی شکل کی بہ نسبت زیادہ مہیب اور بارعب ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کو انسانی صفات سے متصف کرنے کا خیال ان لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہو سکتا جو حکمت آشنا نہیں ہیں۔ ان کا خدا زیادہ سے زیادہ گویا ایک دیو ہیکل انسان ہے جس کا سر آسمان سے لگا ہوا ہے اور ٹانگیں زمین پر ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی حسب ذیل اعلان شائع کیا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ جل شانہ کی حمد و ثنا کرنے اور محمد رسول اللہ پر درود بھیجنے کے بعد ابوبکر تمام مسلمانوں کے لئے دعا مانگتا ہے کہ ان پر خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں اور ان کو صحت و عافیت کی نعمت میسر ہو۔ اس کے بعد تم لوگوں کو واضح ہو کہ میرا ارادہ مسلمانوں کو شام کی جانب روانہ کرنے کا ہے تاکہ یہ ملک کفار کے ہاتھوں سے لے لیا جائے۔ میں تم سب کو یہ جتلا دینا چاہتا ہوں کہ مذہب کی حمایت میں لڑانا خدا کی اطاعت کرنا ہے۔"

پہلی لڑائی میں جب عربی فوج کے سپہ سالار خالد کا قافیہ غنیم نے تنگ کیا تو اس نے اپنی سب فوج کے سامنے ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں خدا سے دعا مانگی: "بار الٰہا یہ بدبخت مشرک بتوں کا نام لے لے کر دعا مانگتے ہیں اور تیرے سوا دوسرے خدا کی پرستش کرتے ہیں حالانکہ ہم تیری توحید کے قائل ہیں اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ تیرے سوا اور کوئی خدا نہیں۔ پس ہم نہایت عاجزی کے ساتھ تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ اپنے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہماری مدد کر اور ہمیں ان بت پرستوں پر فتح دے۔" عربوں نے فتح شام میں حرارت دینی کا حد سے زیادہ اظہار کیا۔ شامی عیسائیوں کے عقائد ان کے دلوں میں غیظ و غضب اور نفرت و حقارت کے طوفان بپا کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر خالد کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے: "میں اس کفر بکنے والے بت پرست کی کھوپڑی پھوڑ ڈالوں گا جو اللہ جل جلالہ کی شان میں یہ کہے گا کہ وہ بھی بیٹے والا ہے۔"

حضرت عمرؓ فاتح بیت المقدس ہرقل قیصر روم کو خط لکھتے ہیں جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: "حمد ہو اللہ کی جو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے اور جس کے نہ بی بی ہے اور نہ بیٹا۔" اہل عرب عیسائیوں کو مشرک کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ عیسائیوں نے مریم و عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ

جل شانہ کا شریک بنا رکھا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کا یہ قصد نہیں تھا کہ فوج کی کمان خود کریں۔ یہ خدمت نام کو ابوعبیدہ اور دراصل خالد کے سپرد کی گئی۔ رخصت کے وقت جب خلیفۃ المسلمین نے فوج کا جائزہ لیا تو افسروں اور سپاہیوں کو تاکید کی کہ فریق مقابل سے انصاف اور رحم کا برتاؤ کریں اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم رہیں۔ بیہودہ گفتگو سے بچیں۔ شراب خوری سے پرہیز کریں۔ پانچوں وقت پابندی کے ساتھ نماز پڑھیں۔ جہاں جہاں گذریں عام لوگوں کے ساتھ بہ ملاطفت پیش آئیں مگر ان کے پادریوں پر ذرا رحم نہ کریں۔

دریائے ژردنؓ کے مشرق کی جانب بصرا کا مستحکم شہر واقع ہے جہاں رسول عربیؐ کا اول اول اپنے نسطوری معلموں سے ملتے تھے۔ دولت روما کے جو قلعے ارض شام میں جا بجا بنے ہوئے تھے انہیں میں بصرا کے قلعہ کا بھی شمار تھا۔ فوج عرب نے اس کے سامنے ڈیرے ڈال دیئے۔ قلعہ بند فوج کی طاقت غنیم کے مقابلہ میں کچھ کم نہ تھی اور اس طاقت میں انؓ مقدس صلیبوں اور متبرک جھنڈوں نے اضافہ کر دیا تھا جنہیں محصورین کی خوش اعتقادی نے فصیل پر بلند کر رکھا تھا۔ اہل قلعہ عرصہ دراز تک اپنی حفاظت کر سکتے تھے لیکن قلعدار رومینس کی نیت بدل گئی اور اس نے چپکے سے پھاٹک کھول دیئے۔ اس کے اس طرز عمل سے ظاہر ہے کہ اہل شام کی حالت کیسی بری ہو رہی تھی۔ جب فوج محاصرہ شہر میں داخل ہو گئی اور رومینس نے قلعہ کی کنجیاں سپہ سالار عرب کے حوالہ کر دیں تو اہل قلعہ کو اس نے حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا: "آج سے میں تم لوگوں سے جدا ہوتا ہوں۔ دنیا و عقبی دونوں جگہ میری تمہاری راہیں الگ الگ ہوں گی۔ مجھے اس خدا سے انکار ہے جو مصلوب ہوا تھا اور جو لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں میں ان سے بھی بیزار ہوں۔ میرا خدا آج سے خدائے واحد ہے۔ میرا مذہب آج سے مذہب اسلام ہے۔ میرا قبلہ آج سے مکہ معظمہ ہے۔ میرے بھائی آج سے مسلمان ہیں اور میرا رسول آج سے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے ہم لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا اور جس نے علی رغم مشرکین اعلائے کلمۃ الحق میں کامیابی حاصل کی۔" ایران کے حملہ کے بعد ایشیائے کوچک، شام بلکہ قسطنطین میں بھی نمک حراموں اور مرتدوں کا ایک گروہ کثیر ایسا پیدا ہو گیا تھا جو عربوں کے ساتھ مل جانے کے لئے صرف موقع کا منتظر تھا۔ رومینس کا شمار بھی ان ہزارہا لوگوں میں تھا جو ایرانی فتوحات کی وجہ سے بداعتقاد ہو گئے تھے۔

شام کا پایہ تخت دمشق بصرا سے صرف بہتر میل جانب شمال واقع تھا۔ فوج عرب بلاتوقف اسی طرف روانہ ہوئی۔ اہل دمشق سے کہا گیا کہ تین باتوں میں سے جو چاہو اختیار

کرو یعنی یا تو اسلام لاؤ یا جذیہ دو یا مقابلہ کرو۔ شہنشاہ ہرقلس اس وقت انطاکیہ میں مقیم تھا جس کا فاصلہ دمشق سے بہ سمت شمال صرف بقدر ڈیڑھ سو میل کے رہ گیا تھا۔ حملہ آوروں کی پیش قدمی کی خبر وحشت اثر سن کر ہرقلس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے فوراً" ستر ہزار فوج غنیم کا راستہ روکنے کے لئے روانہ کی۔ عربوں کو مجبوراً" دمشق کا محاصرہ چھوڑنا پڑا۔ اجنادین کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور رومی فوج شکست فاش کھا کر بحالت تباہ منتشر و پریشان ہو گئی۔ یہاں سے مظفر و منصور ہو کر خالد نے پھر دمشق کے سامنے اپنا علم جس پر سیاہ عقاب کا نشان بنا ہوا تھا بلند کیا اور ستر دن کے محاصرہ کے بعد اہل دمشق نے ہتھیار ڈال دیئے۔

عربی تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک افواج عرب کی حالت مذہبی خطیبوں کی ایک بے قاعدہ جمعیت سے کچھ بہتر نہ تھی۔ بہت سے سپاہی ایسے ہوتے تھے جنہیں تن ڈھکنے کے لئے کپڑا تک میسر نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص فوج کی صف سے نکل کر میدان میں آ کھڑا ہوتا تھا اور فریق مقابل سے مبارز طلب کرتا تھا اور دونوں اس وقت تک لڑتے رہتے تھے جب تک کہ ایک کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ مرد تو ایک طرف رہے عورتیں تک شریک جنگ ہوتی تھیں اور داد شجاعت دیتی تھیں۔ چنانچہ ان کے ان بہادرانہ کارناموں کی بہت سی دلچسپ روایتیں تاریخوں میں موجود ہیں۔

کوہستان لبنیس کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور دریائے ارانطس کے خوش سواد اور پر فضا کناروں کی رہ نمائی سے عربی فوج دمشق کے شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ رستہ میں بعلبک اور حمص دو شہر پڑتے تھے۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے اس نے مسخر کیا۔ ہرقلس کو پل پل کی خبریں لگتی تھیں۔ حملہ آوروں کی مزید پیش قدمی کا سدباب کرنے کے لئے اس نے ایک لاکھ چالیس ہزار کا لشکر جرار جمع کیا۔ یرموک کے میدان جنگ میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ پہلے حملہ میں عربی فوج کے میمنہ کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن عرب عورتوں نے ہزیمت کھائے ہوؤں کے دلوں میں اپنے غیرت آفرین الفاظ سے نیا جوش پیدا کر دیا۔ وہ پلٹے اور اس بے جگری سے لڑے کہ لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ رومی فوج ان کے حملہ کی تاب نہ لا سکی اور اسے شکست فاش ملی۔ چالیس رومی قید ہوئے اور ہزاروں میدان جنگ میں کام آئے۔ اب تمام ملک فاتحوں کے قبضہ میں آ گیا۔ چونکہ انہوں نے دریائے ژردن کے مشرق کی جانب پیش قدمی کی تھی لہذا صاف ظاہر تھا کہ ایشیائے کوچک پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے فلسطین کے مستحکم اور سربرآوردہ شہروں کا مسخر ہو جانا ضروریات سے ہے۔ سرداران فوج میں اس مسئلہ کے متعلق اختلاف رائے ہوا کہ اول قیصریہ پر حملہ کرنا چاہیئے یا بیت

المقدس پر۔ جب بحث اس اختلاف کا تصفیہ نہ کر سکی تو دربار خلافت سے استمدا کیا گیا۔ خلیفہ کی عقل سلیم نے بیت المقدس کی فتح کے اخلاقی فوائد کو تسخیر قیصریہ کے جنگی فوائد پر ترجیح دی چنانچہ عربی فوج کے سپہ سالار کے نام اس مضمون کا حکم پہنچا کہ بیت المقدس پر اول حملہ ہو اور جس طرح بن پڑے اسے سر کیا جائے۔ غرض اس شہر کا بہ سرگرمی تمام محاصرہ کیا گیا۔ یہاں کے باشندوں کو ایرانی حملہ کے وقت مزار مسیحؑ کی توہین فراموش نہ ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے محافظت و مدافعت کی بہت بڑی تیاریاں کیں اور جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ لیکن چار مہینے کے محاصرہ کے بعد جب انہوں نے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو بطریق سفرائنس فصیل شہر پر آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اگر ہم کو امان دی جائے اور شرائط طے ہو جائیں تو ہم لوگ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہیں۔ چونکہ فتح دمشق کے وقت سرداران فوج کی غلط فہمیوں کی وجہ سے باشندگان شہر کا قتل عام ہوا تھا لہٰذا سفرائنس نے یہ شرط پیش کی کہ بیت المقدس خلیفہ کی موجودگی میں مسلمانوں کے حوالے کیا جائے گا۔ یہ شرط منظور کر لی گئی اور حضرت عمرؓ جو اس وقت خلیفہ تھے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ نے سفر اس حیثیت سے کیا کہ ایک سرخ رنگ کے اونٹ پر سوار تھے اور زادراہ کی قسم سے آپ کے ساتھ ایک تھیلے میں کچھ اناج تھا۔ ایک تھیلے میں کھجوریں تھیں۔ ایک لکڑی کی رکابی تھی اور پانی کے لئے ایک چمڑے کی چھاگل تھی۔ غرض اس شان کے ساتھ عرب فاتح عیسائی بطریق کی سواری کے ہمراہ بیت المقدس میں داخل ہوا اور مسیحیت کا صدر مقام بغیر کسی شور و شر اور بغیر کسی خونریزی کے پیشوائے اسلام کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ حکم دینے کے بعد کہ ہیکل سلیمانی کی جگہ ایک مسجد تعمیر کی جائے خلیفۃ المسلمین نے مدینہ کو مراجعت کی۔

ہرقلس سے یہ بات مخفی نہ تھی کہ جو تباہیاں اور مصیبتیں عیسائیت پر پیہم نازل ہو رہی ہیں ان کا باعث متخالف العقاید مسیحی فرقوں کا تفرقہ ہے۔ اسی لئے جہاں اس نے سلطنت کی حمایت میں تلوار اٹھائی وہاں ان اختلافات کے مٹانے کی بھی بدل کوشش کی۔ اس غرض کو پیش نظر رکھ کر اس نے یہ اصول مسیحی دنیا میں شائع کرنا چاہا کہ چونکہ مسیحؑ کی ربانی اور انسانی فطرتیں ایک دوسرے میں ضم ہو چکی ہیں اور جدا جدا نہیں لہٰذا مسیحؑ کی مشیت بھی جس سے اس کے ربانی و انسانی افعال صادر ہوتے ہیں ایک ہی ہے اور وہ مشیت ایزدی ہے مشیت انسانی نہیں۔ لیکن یہ کوشش ہرقلس نے اس وقت کی جب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ بیت المقدس کی تسخیر کے بعد مسلمان ایشیائے کوچک کی طرف بڑھے اور حلب اور انطاکیہ پر قبضہ کیا۔ وہ برابر بڑھتے ہوئے چلے جاتے تھے اور کوئی طاقت ایسی نہ

تھی جو ان کی فتوحات کے سیلاب کو روک سکے۔ خود ہرقلس کو جان بچانے کے لئے فرار ہونا پڑا اور شام کا صوبہ جسے جولئس سیزر کے رقیب پامپی اعظم نے سات سو سال پہلے دولت رومتہ الکبریٰ کے ساتھ ملحق کیا تھا جو عیسائیت کا زاد بوم تھا جہاں اس کی مقدس اور قیمتی یادگاریں موجود تھیں جہاں سے خود ہرقلس نے ایک مرتبہ ایرانی حملہ آوروں کو نکال دیا تھا اب ایسا ہاتھوں سے نکلا کہ پھر واپس نہ آیا۔ کہتے ہیں کہ جس جہاز میں ہرقلس سوار ہو کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا جب اس نے لنگر اٹھایا تو ہرقلس حسرت بھری نگاہوں سے پیچھے ہٹتی ہوئی پہاڑیوں پر ٹکٹکی جما کر دردو کرب کے لہجہ میں پکارا: "الوداع اے شام ہمیشہ کے لئے الوداع۔"

فتوحات عرب کے باقی واقعات کی تفصیل اس مقام پر درج کرنی ضروری نہیں ہے۔ طرابلس اور ٹایر (صور) کا خود اپنے ہی افسروں کی غداری سے مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جانا۔ قیصریہ کا فتح ہونا۔ کوہستان لبنیس کے درختوں اور فنیشیا کے ملاحوں کی مدد سے ایک بیڑے کا تیار کیا جانا اور اس بیڑے کا روما کے جنگی بیڑے کو شکست دے کر ہیلسپانٹ کی طرف بھگانا۔ قبرس روڈس اور سکلیڈس کا تاخت و تاراج ہونا اور کلاسس کے مجسمہ کا جو عجائبات دنیا میں شمار ہوتا تھا ایک یہودی کے ہاتھ جو اس کے پیتل سے نو سو اونٹ لاد کر لے گیا بکنا اور اسلامی فوج کا بحیرہ اسود کی طرف بڑھنا بلکہ قسطنطنیہ کی دیواروں کے سامنے ڈیرے ڈالنا۔ یہ تمام ایسی باتیں تھیں جن کی فتح بیت المقدس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔

فتح! اور وہ بھی بیت المقدس کی!! عیسائیت کے پایہ تخت کی!!! کس طرح ممکن تھا کہ لوگ اس واقعہ کو اسلام کے غلبہ اور مسیحیت کی شکست سے تعبیر نہ کریں۔ دونوں مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو سچا سمجھ کر اس یقین کے ساتھ کہ فتح سچائی کی ہو گی ایک دوسرے کا مقابلہ کیا تھا اور فیصلہ خدا پر چھوڑا تھا۔ خدا نے فتح اسلام کو عطا کی اور فتح کا تمغہ بیت المقدس کی شکل میں مسلمانوں کو دیا۔ اور اگرچہ حروب صلیبیہ کے دوران میں عیسائیوں کو تھوڑی دیر کے لئے کامیابی حاصل ہو گئی لیکن نتیجہ یہ ہے کہ ہزار سال کی جدوجہد کے بعد آج بھی وہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ دولت قسطنطنیہ کے مورخین پر وقائع نگاری کا جو طریقہ اختیار کرنے کا الزام لگایا گیا ہے اس کے لحاظ سے وہ ایک حد تک قابل معافی ہیں۔ "انہوں نے کلیسائے شرقی کی تباہی کے اہم مسئلہ کو چھوا تک نہیں۔" باقی رہا کلیسائے غربی۔ سو اس کی یہ حالت ہے کہ ازمنہ وسطے یعنی دو حروب صلیبیہ کے ذلیل اساقف تک کی رگ حمیت پھڑکنے لگتی تھی جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ ہم روما کو اس جھوٹی

روایت کی بنا پر کہ سینٹ پیٹر نے یہاں قدم رنجہ فرمایا تھا مجبور ہو کر مسیحیت کا پایہ تخت قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ عیسائیت کا اصلی مرکز حکومت یعنی مسیحؑ کی ولادت زندگی اور وفات کا عظیم الشان اور مقدس مقام کفار کے قبضہ میں ہے۔ یورپ کے مسیحی مصنفین نے ہر مضمون پر قلم اٹھاتے وقت خواہ اس کا موضوع تاریخ ہو یا مذہب یا سائنس جب اپنے فتحمند مخالفین کا ذکر کیا ہے تو اسی طرح زہر اگلا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ جس چیز میں وہ کوئی منقصت کا پہلو نہ نکال سکیں اسے چھپائیں اور جس چیز کو چھپا نہ سکتے ہوں اس کی تنقیص کریں۔

قلت گنجائش اور نیز اس کتاب کا موضوع ہم کو اجازت نہیں دیتا کہ جس طرح فتح بیت المقدس کا ذکر ہم نے بہ تفصیل کیا ہے اسی طرح پوری وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کی دوسری فتوحات کے واقعات لکھیں جن کی بدولت آگے چل کر ایک ایسی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہو گئی جو جغرافیائی وسعت میں اسکندر کی سلطنت بلکہ دولت رومتہ الکبری پر بھی بمراتب فوقیت لے گئی۔ لیکن اس مضمون پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے ہم اس قدر کہنا بے موقع نہیں سمجھتے کہ عیسائیت پر جو طمانچہ پڑا تھا مجوسیت نے اس سے بھی زور کا تھپڑ کھایا۔ قادسیہ کی جنگ نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ مداین کے لٹنے پر خزانہ و اسلحہ شاہی اور بے انتہا مال غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا۔ معرکہ نہاوند کو عرب مورخوں نے جو "فتح الفتوح" کا لقب دیا ہے وہ کچھ غیر موزوں نہیں۔ ایک طرف تو وہ بحیرہ خزر کی طرف بڑھے اور دوسری طرف جنوبی سمت میں دجلہ کے کنارے کنارے اصطخر کا رخ کیا۔ فرمانروائے ایران اس شہر کے میناروں اور پتھر کی مورتوں میں سے گذر کر جو اسکندر کی محفل مے نوشی کی رات سے اجڑا پڑا تھا صحرائے نمک میں سے ہوتا ہوا جان سلامت لے کر بھاگ گیا۔ عربی فوج کا ایک حصہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اس کو جیحون عبور کرا آیا جہاں اسے ترکوں نے قتل کر ڈالا۔ اس کے بیٹے کو چین میں پناہ لینی پڑی جہاں وہ فغفور چین کی فوج میں کپتان ہو گیا۔ جیحوں کے اس پار کا علاقہ بھی مسلمانوں کا مطیع و منقاد ہو گیا اور خراج میں دو لاکھ اشرفیاں دینی منظور کیں۔ غرض ایک طرف تو فغفور چین اپنے پایہ تخت پیکن سے مدینہ میں اپنا سفیر بھیج کر خلیفتہ المسلمین سے التجائے صلح و آشتی کر رہا تھا اور دوسری طرف علم نبوی دریائے انڈس کے کناروں پر لہرا رہا تھا۔

شام کی لڑائیوں میں جن سرداران فوج نے علم امتیاز بلند کیا ان میں سے ایک عمرو بن العاص بھی تھا جس کے مقدر میں فاتح مصر ہونا لکھا تھا۔ خلفاء نے اپنی شمالی و مشرقی فتوحات ہی پر قناعت نہ کی بلکہ اب مغرب کی طرف نگاہ اٹھائی اور افریقہ کے الحاق کی تیاریاں

شروع کیں۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی مذہبی فرقوں کا باہمی عناد و تفرقہ ان کی کامیابی کا باعث ہوا۔ فرقہ "جیکو بائٹ" نے مسلمانوں کو اپنا ذریعہ مخلصی سمجھ کر عرب فوج کا خیرمقدم صدق دل سے کیا۔ فرقہ منوفسطائیہ نے جو بقول پیروان مذہب سینٹ اتھنیشس ذات ابن اللہ کی الوہیت و انسانیت کو مخلوط سمجھتا تھا اپنے سرگروہ مقوقس کے ذریعہ سے اس امر کا اعلان کیا کہ ہم یونانیوں سے نہ دنیا میں تعلق رکھنا چاہتے ہیں نہ عقبیٰ میں اور ظالم قیصر قسطنطنیہ اور اس کی کونسل سے جس کا مستقر چیلسیڈان ہے ہمیشہ کے لئے ابرا کرتے ہیں۔ غرض انہوں نے خلیفتہ الاسلام کو خوشی خوشی خراج دینا قبول کیا۔ سڑکوں اور پلوں کی مرمت خود کر دی اور حملہ آور فوج کو نہ صرف رسد بہم پہنچائی بلکہ اس کے لئے جاسوسی کی خدمت بھی انجام دینے میں دریغ نہ کیا۔

ممفس پر جو فراعنہ کے زمانہ میں مصر کا پایہ تخت تھا مسلمانوں کا بہت جلد قبضہ ہو گیا اور اس کے بعد افواج اسلام نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا۔ چونکہ اسکندریہ کے پس پشت سمندر کی راہ کھلی تھی لہٰذا ہرقلس کو محصورین کے لئے کمک بھیجنے کا موقع ملتا رہا۔ ادھر حضرت عمرؓ نے بھی جو اس وقت مسند خلافت پر متمکن تھے فوج محاصرہ کی امداد کے لئے شام کی جنگ آزمودہ سپاہ روانہ کی۔ محاصرین کی طرف سے بہت سے دھاوے ہوئے اور محصورین نے بہت دفعہ نکل نکل کر مسلمانوں پر حملے کئے۔ ایک دفعہ محصورین نے عمرو کو گرفتار کرلیا مگر وہ ایک غلام کی جانبازانہ عیاری سے بچ کر نکل آیا۔ غرض چودہ مہینے کے محاصرہ کے بعد جس میں مسلمانوں کی تیئیس ہزار فوج کام آئی اسکندریہ کو اسلام کے آگے سر بسجدہ ہونا پڑا۔ عمرو بن العاص نے جب دربار خلافت میں فتح اسکندریہ کا مژدہ بھیجا تو مغرب کے اس شہر کے شان و شکوہ اور جاہ و جلال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اس میں چار ہزار محل چار ہزار حمام چار سو تماشاگاہیں بارہ ہزار پھل ترکاری اور اناج کی دکانیں ہیں اور چالیس ہزار باج گذار یہودی آباد ہیں۔

اس طرح عیسائی دنیا کا دوسرا شہر بھی کشورکشایان اسلام کی سلک فتوحات میں منسلک ہو گیا اور جو حشر بیت المقدس کا ہوا تھا وہی اس اسکندریہ کا بھی ہو اس کو اپنے مسیحی آثار پر ناز تھا جس نے اتھنیشس اور ایرئس اور سائرل کو گودیوں میں کھلایا تھا جس نے کلیسا کے عقائد کی شاخ میں اقانیم ثلثہ اور پرستش مریم کا پیوند لگایا تھا۔ ہرقلس قسطنطنیہ میں تھا کہ یہ جانکاہ خبر پہنچی۔ اس صدمہ سے اس کی کمر ٹوٹ گئی اور دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا عیسائیت کے زوال سے اس کی حکومت کے ماتھے پر کلنک کا امٹ ٹیکا لگنے والا ہے۔ فتح اسکندریہ کے صدمہ نے اسے ایک مہینہ سے زیادہ زندہ نہ

رہنے دیا اور وہ اسی رنج میں گھل گھل کر مر گیا۔

اسکندریہ کا ہاتھ سے نکل جانا قسطنطنیہ کے لئے ایک دہرا دکھ تھا۔ اس لئے کہ مذہب کے مرکز ہونے کے علاوہ اس کا وجود روزمرہ کی رسد رسانی کے لحاظ سے بھی قسطنطنیہ کے لئے ضروریات سے تھا۔ مصر رومیوں کے لئے اناج کی منڈی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زبردست جنگی بیڑوں اور جرار فوجوں کی مدد سے دو دفعہ اس مقام کو مسلمانوں سے چھین لینے کی کوشش کی گئی اور دونوں دفعہ عمرو کو یہ شہر گویا ازسرنو فتح کرنا پڑا۔ فاتح اسکندریہ نے جب یہ دیکھا کہ سمندر کے کنارے پر واقع ہونے کے باعث اس شہر پر غنیم باسانی حملہ آور ہو سکتا ہے جس کے دفعیہ کی ترکیب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ شہر پناہ کو ہی مسمار کر دیا جائے تو اس کے منہ سے بے اختیار یہ کلمات نکلے: "قسم ہے خدائے قیوم کی کہ اگر تیسری مرتبہ پھر یہی کوشش اغیار کی طرف سے ہوئی تو میں اسکندریہ کو کسی طوائف کے دروازہ کی طرح تمام دنیا کے لئے کھول دوں گا۔" یہ دھمکی پوری ہو کر رہی۔ عمرو نے جو کچھ کہا تھا اس سے زیادہ کر دکھایا۔ یعنی فوراً" شہر کی فصیلوں اور دمسون کو زمین کے برابر کر دیا جس سے اس کی قوت مزاحمت و مدافعت سلب ہو گئی۔

خلفائے اسلام کا قصد یہ نہ تھا کہ اپنے دائرہ فتوحات کو مصر ہی تک محدود رکھیں۔ حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث نے افریقہ کے کل شمالی ساحل کی تسخیر و الحاق کا عزم کیا۔ چنانچہ آپ کے سپہ سالار عبداللہ نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ ممفس سے روانہ ہو کر صحرائے برقہ کو قطع کرتے ہوئے طرابلس کا جا محاصرہ کیا۔ لیکن چونکہ فوج میں وبا پھوٹ پڑی اس لئے اسے مجبوراً" مصر کو واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد بیس سال تک مسلمانوں نے کوئی پیش قدمی نہ کی لیکن تقریباً" ربع صدی کا جوش کشور کشائی جو اندر ہی اندر کسی چشمہ کی طرح ابل رہا تھا کب تک رکا رہتا۔ آخر یہ جوش ظاہر ہوا اور فتوحات کا ایک سیلاب شمالی افریقہ پر چھا گیا۔ عقبہ وادی نیل سے آندھی کی طرح اٹھا اور کوہ و صحرا دشت و بیابان کو قطع کرتا شہروں اور ملکوں کو حلقہ بگوش خلافت بناتا ہوا بحر اوقیانوس کے ساحل تک جا پہنچا۔ اور جب سمندر کی موجوں نے اس کے اسپ صبا رفتار کے سموں کو جزایر کنیری کے بالمقابل بوسہ دیا تو یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے: "سبحان زی الکبریاء والجبروت! اگر یہ سمندر میرا مزاحم نہ ہوتا تو میں مغرب کے نامعلوم ملکوں میں برابر بڑھتا ہوا چلا جاتا اور خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت کا ڈنکا بجاتا ہوا ان تمام سرکش قوموں کو تلوار کے گھاٹ اتارتا جو خدائے واحد کے سوا کسی دوسرے خدا کی پرستش کرتی ہیں۔"

عربوں نے یہ چڑھائیاں ملک کے اندرونی علاقوں پر کی تھیں۔ اس لئے کہ ابھی تک بحیرہ روم پر فرمانروایان قسطنطنیہ کے اقتدار کا علم لہراتا تھا اور جو شہر ساحل پر واقع تھے وہ بحری قوت کی بدولت ان کے قبضہ میں تھے۔ آخرکار خلیفہ عبدالملک نے کارتھج کی تسخیر کا عزم کیا جو ان شہروں میں سب سے زیادہ آباد اور طاقتور تھا بلکہ گویا شمالی افریقہ کا دارالسلطنت تھا۔ اموی سپہ سالار حسن نے کمندیں اور سیڑھیاں لگا کر ایک ہلہ میں اسے سر کر لیا لیکن چونکہ کارتھج والوں کو قسطنطنیہ سے کمک پہنچ گئی اور اس کے علاوہ سسلی اور گاتھ کی فوج بھی ان کی مدد کے لئے آ گئی لہٰذا حسن کو پسپا ہونا پڑا۔ لیکن یہ کامیابی چند روزہ ثابت ہوئی۔ حسن نے چند مہینے کے بعد سنبھل کر پھر حملہ کیا اور اس مرتبہ غلبہ پانے کے بعد کارتھج کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا۔

بیت المقدس اور اسکندریہ پہلے ہی عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ کارتھج کی تسخیر سے عیسائی طاقت کا ایک اور زبردست مرکز کم ہو گیا۔ قسطنطنیہ کا فتح ہونا بھی صرف چند دن کی بات تھی۔ اس کے مسخر ہو جانے کے بعد عیسائیوں کے پاس لے دے کر ایک صرف روما باقی رہ جاتا تھا۔

عیسائیت کے نشوونما میں کارتھج نے کچھ کم حصہ نہیں لیا تھا۔ اسی کی بدولت یورپ میں رومن کیتھولک مذہب نے رواج پایا۔ اسی کی خاک سے اس مذہب کے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں سینٹ آگسٹائن کے سے شہرآفاق پادری نے جنم لیا۔

جب ہم دنیا کے مذاہب کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سرعت و وسعت اشاعت میں کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اسلام کوہ الطائے سے لے کر بحر اوقیانوس اور وسط ایشیا سے لے کر افریقہ کی مغربی حدود تک کوس لمن الملک الیوم بجا رہا تھا۔

اب خلیفہ ولید کا دور آیا اور اس نے فرمان صادر کیا کہ یورپ پر چڑھائی کی جائے اور اندلس یعنی مغرب الاقصی کو سلطنت اسلام میں شامل کر لیا جائے۔ مذہبی تفرقہ اور ملکی نمک حرامی ہمیشہ سے اسلامی حملہ آوروں کی اعانت کرتی چلی آئی تھی۔ اس موقعہ پر بھی مسلمانوں کے سپہ سالار موسیٰ کو بھی دو پرانے رفیق مجسم ہو کر ٹالیڈو کے اسقف اور گاتھ فوج کے سپہ سالار کاؤنٹ جولین کی شکل میں مل گئے۔ جنگ زیر بزم میں عین اس وقت جب کہ مسلمانوں اور مسیحیوں میں برابر کی چوٹیں چل رہی تھیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ فریقین میں سے شکست کون پائے گا اور فتح کس کو ہوگی مسیحی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ ٹالیڈو کے پادری اور کاؤنٹ جولین کی تحریک پر مسلمانوں کے ساتھ آ ملا۔ ہسپانیہ کے بادشاہ

کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا اور دریائے گواڈلکوئیور کی موجوں نے اسے غنیم کے تعاقب سے ہمیشہ کے لئے امان دے دی۔

موسیٰ کا نائب طارق بہ سرعت تمام ٹالیڈو کے میدان جنگ سے شمال کی طرف روانہ ہوا اور رستہ میں جو شہر ملا اسے فتح کرتا ہوا برق دبار کی طرح بڑھا چلا گیا۔ جب موسیٰ شمالی افریقہ سے جہاں وہ کچھ عرصہ کے لئے چلا گیا تھا واپس آیا تو طارق کی تلوار تمام جزیرہ نمائے اسپین کو مسخر کر چکی تھی اور گاتھ فوج کا بقیتہ السیف بحال تباہ کوہستان پرینیز سے گذر کر فرانس میں جاپناہ گزین ہوا تھا۔ تسخیر اسپین کو اپنی فتوحات کی پہلی منزل قرار دے کر طارق نے اپنا یہ عندیہ ظاہر کیا کہ فرانس کو فتح کرتا ہوا اٹلی میں جا پہنچے اور پوپ کے محل میں توحید کا نقارہ بجا کر قسطنطنیہ پر فوج کشی کرے۔ پھر دولت رومتہ الکبریٰ کو ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سلاتا ہوا دمشق پہنچ کر اپنی مظفر و منصور تلوار کو خلیفتہ المسلمین کے قدموں پر جا رکھے۔

مگر کارپردازان قضا و قدر کو یہ بات منظور نہ تھی۔ موسیٰ نے طارق کے ان روشن کارناموں کو رشک و حسد کی نظر سے دیکھ کر اسے طرح طرح کی ذلتیں دیں طارق کے بھی دربار خلافت میں بہت سے ہواخواہ موجود تھے۔ انہوں نے موسیٰ کی اس بدسلوکی کی کیفیت کو خلیفہ سے خوب نمک مرچ لگا کر بیان کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق سے ایک سفیر روانہ ہو کر اسپین پہنچا۔ موسیٰ اپنے خیمہ میں تھا کہ سفیر نے آ کر شاہی فرمان سنایا اور اسے گرفتار کر کے دمشق لے گیا۔ موسیٰ جب دربار خلافت میں پہنچا تو خلیفہ نے اس پر بے حد عتاب کیا اور حکم دیا کہ سب کے سامنے اسے کوڑے لگائے جائیں۔ اس بے عزتی نے موسیٰ کا دل توڑ دیا اور وہ اس صدمہ سے جان بر نہ ہو سکا۔

طارق کا منصوبہ تو بروئے کار نہ آ سکا لیکن بعض دوسرے اسلامی سپہ سالاروں نے فرانس پر ضرور فوج کشی کی۔ پہلی ہی لڑائی میں فرانس کا وہ علاقہ جو دریائے گیرون اور دریائے لائر کے دہانوں کے درمیان واقع ہے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس کے بعد اسلامی سپہ سالار عبدالرحمن نے فوج کو دو جماعتوں میں تقسیم کر کے ایک جماعت کو ہمراہ لیا اور مشرق کی طرف بڑھ کر دریائے رون کو عبور کرنے کے بعد آرلس کا محاصرہ کیا۔ جو مسیحی فوج محصورین کی کمک کے لئے آئی تھی اسے سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ اس کی فوج کے دوسرے ٹکڑے کو بھی جس نے مغرب کی طرف پیش قدمی کی تھی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس حصہ فوج نے دریائے ڈارڈون سے گذر کر ایک اور مسیحی فوج کو جو اس کا رستہ روکے پڑی تھی سخت شکست دی اور اس کا ایسا سخت نقصان ہوا کہ خود ان

لوگوں کا جو میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگے یہ بیان ہے کہ "مقتولوں کی تعداد کا خدا ہی کو علم ہے۔" تمام وسط فرانس پر عرب ہی عرب چھا گئے اور دریائے لائر کے ساحل تک تمام علاقہ پر مسلط ہو گئے۔ گرجاؤں اور خانقاہوں کی برسوں کی جمع کی ہوئی دولت ان کی لوٹ میں آئی اور وہ مسیحی پیراورولی جو اپنے روحانی تصرفات کے کرشمے آئے دن بے وجہ و بلاضرورت دکھایا کرتے تھے آج جب کہ ان کی کرامتوں کی ایسی سخت ضرورت تھی ایسی بٹی بھولے کہ ایک بھی کرامت یا معجزہ نہ دکھا سکے۔

آخر کار ۷۳۴ء میں چارلس مارٹل نے حملہ آوروں کی پیش قدمی کو روک دیا۔ تُواس اور پائشیرس کے درمیان ایک عظیم الشان جنگ ہوئی جو سات دن تک رہی۔ اس معرکہ میں عبدالرحمٰن شہید ہوا اور عرب پسپا ہوئے۔ اس کے بعد انہیں بہت جلد کوہستان پر۔نیز سے گزر کر اسپین واپس آنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس لحاظ سے گویا دریائے لائر کا ساحل مغربی یورپ میں مسلمانوں کی پیش قدم کی انتہائی حد ہے۔ گبن ان مہتم بالشان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حسب ذیل رائے ظاہر کرتا ہے: "جبل الطارق سے لے کر تابہ ساحل لائر عربوں نے فتح و نصرت کا ایک مسلسل خط کھینچ دیا تھا جس کی لمبائی ایک ہزار میل سے اوپر تھی۔ اگر اسی قدر فاصلہ وہ اور طے کرتے تو پولینڈ کی حدود تک اور دوسری طرف اسکاٹلینڈ کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچ جاتے۔"

اسلام کے ان جنگی کارناموں پر ان واقعات کا اضافہ کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ بحرروم میں اپنے فتح مند بیڑوں کو لے جا کر انہوں نے اول کریٹ کو فتح کیا پھر سسلی کو مسخر کیا اس کے بعد روما کو ذلیل و رسوا کیا۔ البتہ اس امر کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی اطالیہ اور سسلی میں ان کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی ترقی کو ایک بہت بڑی تحریک پہنچی۔

بر سبیل تذکرہ ہمارے قلم سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں کہ اسلام نے روما کو ذلیل و رسوا کیا۔ حقیقت میں ان واقعات سے زیادہ اور کیا امر اس کے لئے باعث ذلت و رسوائی ہو سکتا تھا جو ۸۴۶ء میں پیش آئے۔ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جمیعت دریائے ٹائبر میں سے ہوتی ہوئی روما کی دیواروں کے سامنے آ لنگر انداز ہوتی ہے۔ اس قدر طاقت تو اس جماعت میں ہے نہیں کہ زبردستی شہر میں داخل ہو جائے لہٰذا وہ حوالی شہر ہی کو لوٹتی ہے۔ گرجاؤں اور خانقاہوں کی بے حرمتی کرتی ہے اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے مزاروں کو پاؤں تلے روندتی ہے۔ خود اگر شہر کا تاخت و تاراج ہو جاتا تو اس کا اخلاقی اثر ایسا برا نہ ہوتا جیسا اس حالت میں ہوا۔ مسلمانوں نے سینٹ پیٹر کے گرجا سے اس کی چاندی کی قربانگاہ اکھیڑ

ڈالی اور اسے بطور یادگار غلبہ اسلام افریقہ بھیج دیا۔ مسیحیت کے جگر میں اس سے زیادہ ناسور اور کیا پڑ سکتا تھا کہ سینٹ پیٹر کی وہی قربانگاہ جو اس کی سب سے بڑی مذہبی علامت تھی یوں غارت ہو جائے۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ عرب پہلے ہی کئی دفعہ کر چکے تھے۔ اس کی تسخیر ٹل نہ سکتی تھی۔ صرف معرض التوا میں پڑی ہوئی تھی۔ روما کی ایسی سخت توہین ہوئی تھی کہ اس کے تصور سے مسیحیوں کے اندام ارادت پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ایشیائے کوچک کے قدیم کلیسا معدوم ہو چکے تھے۔ کوئی مسیحی مسلمانوں کی اجازت کے بغیر بیت المقدس میں قدم تک نہ رکھ سکتا تھا۔ ہیکل سلیمان کی جگہ مسجد عمرؓ کھڑی تھی۔ اسکندریہ کے کھنڈروں میں "مسجد رحمت" اس عرب سپہ سالار کی یاد کو تازہ کرتی تھی جس نے قتل عام سے سیر ہو کر رسول عربیؐ کے بچے کھچے دشمنوں کو جنہیں ڈھونڈے سے بھی راہ فرار نہ ملتی تھی حقارت آمیز رحم کے ساتھ امان دی تھی۔ جہاں ایک زمانہ میں کارتھج کا پررونق اور دلکشا شہر آباد تھا وہاں اب بجز اس کے آگ میں جھلسے ہوئے کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ تھا۔ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور مذہبی سلطنت دفعتہ پردہ عدم سے نکل کر منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا ایک سرا بحراوقیانوس پر تھا تو دوسرا دیوار چین پر۔ ایک حد بحیرہ خزر کے کنارے سے ملتی تھی تو دوسری بحر ہند کے ساحل سے۔ اس پر بھی ایک لحاظ سے یہ سلطنت اپنے منتہائے عروج پر نہ پہنچی تھی۔ اس لئے کہ ایک دن وہ آنے والا تھا جب وہ قیاصرہ کے جانشینوں کو ان کے دارالحکومت سے نکال کر اور جزیرہ نمائے یونان پر اپنا پھریرا اڑا کر ایک طرف تو یورپ کے قبضہ کے لئے اس براعظم کے بیچوں بیچ عیسائیت پر حملہ کرنے والی تھی اور دوسری طرف افریقہ کے آتش خیز صحراؤں اور وبا انگیز جنگلوں میں اپنے موحدانہ عقائد کی تلقین کرتی ہوئی ساحل بحر روم سے خط استوا کے پرلے سرے تک نقارہ انا و لاغیری بجانے والی تھی۔

اسلام کو اگرچہ ابھی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرنی باقی تھیں لیکن سلطنت خلفا نصف النہار کمال پر پہنچ چکی تھی۔ یورپ کو اسلام کی حلقہ بگوشی سے جس چیز نے بچایا وہ چارلس مارٹل کی تلوار نہ تھی بلکہ عربوں کی وسیع سلطنت کے اندرونی فسادات تھے۔ اگرچہ خلفائے بنو امیہ کی حکومت سے شام کے لوگ خوش تھے لیکن باقی ہر جگہ وہ غاصب اور جابر سمجھے جاتے تھے اور عام خیال یہ تھا کہ اصلی مستحق خلافت آل رسولؐ ہے۔ تین جماعتوں نے جو اپنے اپنے علموں کے رنگ سے ممتاز ہوئیں خلافت کو اپنے فسادوں اور نزاعوں سے پارہ پارہ کر دیا اور ان کے وحشیانہ مظالم سے اس کی وہ بے وقری اور بے حرمتی ہوئی کہ

بیان سے باہر ہے۔ بنی امیہ نے سفید رنگ اختیار کیا۔ بنی فاطمہ نے سبزاور بنی عباس نے سیاہ۔ آخرالذکر جماعت آن حضرتؐ کی اولاد عم تھی۔ ان خانہ جنگیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ دسویں صدی میں سلطنت اسلام کے تین حصے ہو گئے اور تین علیحدہ علیحدہ خلافتیں بغداد قاہرہ اور قرطبہ میں قائم ہو گئیں۔ مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کا اب خاتمہ ہو گیا اور مسیحیت کی جان میں جان آئی۔ لیکن مسیحیت کی سلامتی کا باعث تائید آسمانی نہ تھی بلکہ مسلمان فرمانرواؤں کی رقابت اور باہمی نزاع۔ اندرونی فسادوں اور خانہ جنگیوں کو اغیار و اجانب کی دست اندازیوں نے اور زیادہ مہلک بنا دیا اور جب ترک اور بربر برسراقتدار ہوئے تو اس عربی تحریک کا جس نے دنیا کی عقلی و دماغی ترقی میں اتنا بڑا حصہ لیا تھا خاتمہ ہو گیا۔

اپنی خانہ جنگیوں میں عرب اس درجہ منہمک ہو رہے تھے کہ انہیں یورپ کی مخالفت کی خس برابر بھی پرواہ نہ رہی تھی۔ آکلی اپنی تاریخ میں سچ کہتا ہے کہ "عربوں میں ایک بھی سپہ سالار یا جرنیل یا کپتان ایسا نہ تھا جو یورپ بھر کی متفقہ فوجوں سے اگر اپنی توہین کرالیتا تو اسے اپنی بہت بڑی ذلت اور رسوائی نہ خیال کرتا اور اگر کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ کیا وجہ تھی کہ یونانیوں نے ان شوخ چشم حملہ آوروں کے استیصال کے لئے جان نہ لڑا دی تو جو شخص ان لوگوں کی طبیعتوں سے واقف ہے اس کے لئے یہ جواب کافی ہو گا کہ عمرو بن العاص اسکندریہ میں برسرحکومت تھا اور معاویہ دمشق میں۔"

یورپ والوں کو مسلمان جس حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ جب نائسیفورس قیصر روم نے خلیفہ ہارون الرشید کو ایک خط لکھا جس میں خلیفہ کو دھمکی دی گئی تو اسے یہ جواب ملا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امیرالمومنین ہارون الرشید کی طرف سے نائسیفورس رومی کتے کے نام۔ او بے ایمان ماں کے بیٹے میں نے تیرا خط پڑھا۔ تو اس خط کا جواب سنے گا نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھے گا۔"

تاریخ گواہ ہے کہ یہ جواب خون و آتش کے حروف میں فریجیا کے میدان جنگ کے صفحہ پر لکھا گیا۔

کسی قوم سے اگر ملک چھین لیا جائے تو وہ زندہ رہ سکتی ہے۔ اگر اس کے خزانے لوٹ لئے جائیں تو وہ پھر بھی پنپ سکتی ہے۔ بڑے سے بڑا تاوان جنگ ادا کرنے کے بعد بھی اس کی حالت کا سدھر نا ممکن ہے لیکن جنگ کے اس نہایت ہی خوفناک عمل کے بعد یعنی اس کے بعد کہ اس کی قوم کی عورتوں کو فاتح اپنے تصرف میں لے آئے اس قوم کی بقا محال ہے۔ جب ابوعبیدہ نے فتح انطاکیہ کی خبر دربار خلافت میں بھیجی تو حضرت عمرؓ نے جو

اس وقت خلیفہ تھے ابوعبیدہ کو اس بات ملامت کی کہ کیوں اس نے فوج کے سپاہیوں کو عورتوں کی صحبت سے روکا۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں: "اگر وہ شام میں شادی کرنا چاہیں تو کرنے دو اور لونڈیاں بھی جتنی رکھنی چاہیں رکھنے دو۔" حقیقت یہ ہے کہ کثرت ازدواج کی رسم جس پر ممالک مفتوحہ کی عورتوں کو اپنے حبالہ تصرف میں لاتے وقت مسلمانوں نے عمل کیا اسلامی حکومت کے ثبات و قیام کی مد ہوئی۔ ان شادیوں سے جو اولاد پیدا ہوئی اس کے لئے فاتحوں کی نسل سے ہونا مایہ فخر و ناز ہو گیا۔ اس حکمت عملی کے موثر و کارگر ہونے کا سب سے بڑا ثبوت شمالی افریقہ میں ملتا ہے جہاں کثرت ازدواج کا قومی اثر ملک کی سیاسی و عمرانی حالت کے بدلنے میں نہایت حیرت انگیز ثابت ہوا۔ ایک بھی نسل نہ گزرنے پائی تھی کہ اس علاقہ کے حکام نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ خراج اب موقوف ہونا چاہئے اس لئے کہ یہاں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں سب مسلمان ہیں اور سب کے سب عربی بولتے ہیں۔

اسلام کو جس صورت میں اس کا بانی چھوڑ گیا اس پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک تجسیمیہ مذہب ہے۔ اس کا خدا محض ایک کوہ پیکر انسان تھا۔ اس کی بہشت جسمانی لذتوں کا ایک عیش آفرین محل تھی۔ لیکن ان ناقص خیالات کی قید سے ان مسلمانوں نے جو زیادہ فطین و فہیم تھے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور بجائے ان کے زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ صحیح خیالات قائم کئے۔ آخرکار لا ادریت کے حکیمانہ عنصر کی آمیزش کی بدولت ان خیالات کو ان خیالات کے ساتھ مطابقت ہو گئی جنہیں آج کے دن پاپائے روم کی کونسل بھی صحیح سمجھتی ہے۔ چنانچہ امام غزالی کا قول ہے: "خدا کا علم اس علم کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا جو انسان کو اپنے یا اپنی روح کے متعلق حاصل ہے۔ خدا کی صفات کو انسان کی صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی شاہنشہی اور آئین حکمرانی کا نہ مقابلہ ہو سکتا ہے اور نہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"[1]

---

[1] تاریخ میں اس نام کے دو مشاہیر کا تذکرہ موجود ہے۔ اکبر و اصغر۔ یہاں پلائنی اکبر سے مراد ہے۔ جو نہ صرف دولت رومتہ الکبریٰ کے اراکین سلطنت میں ایک خاص درجہ رکھتا تھا بلکہ کثیر التعداد کتابوں کے مصنف ہونے کے لحاظ سے مصنفین عہد قدیم کی صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ ۲۳ء میں بمقام ویرونا پیدا ہوا۔ روما نے جب جرمنی پر فوج کشی کی تو اسے بھی فوج کے ایک دستہ کی کمان ملی۔ اس وقت اس کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس فوج کشی کی تاریخ اس نے

بیس جلدوں میں لکھی ہے۔ اس کے بعد سلطنت کے بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر اس کا تقرر ہوتا رہا لیکن باوجود انہماک مشاغل سرکاری وہ تالیف و تصنیف کے لئے بہت کچھ وقت نکالتا رہتا تھا۔ اس کی کتاب "ہسٹوریا نیچریلس" (صحیفہ فطرت) اس کی علمی مستعدی کی سب سے بڑی یادگار ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس کتاب کی سینتیس ۳۷ جلدیں ہیں اور جیسا کہ مصنف مقدمہ کتاب میں لکھتا ہے اس میں بیس ہزار مسائل پر بحث ہے جن کا ماخذ دو ہزار مختلف المضامین کتابیں ہیں۔ پلائینی کی اس تصنیف کا ترجمہ یورپ کی قریب قریب ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ پلائینی کی موت کا واقعہ عجیب و غریب ہے۔ ۷۹ء میں جب وہ دولت روما کا امیرالبحر تھا ایک دن اس نے مائسینم سے جہاں اس کا بیڑہ متعین تھا کوہ ویسوویُس کی چوٹی سے دھواں اٹھتا دیکھا۔ اس کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے وہ ایک جنسوی پر سوار ہو کر پہاڑ کے قریب چلا گیا۔ اور ساتھ اپنی نوٹ بک بھی لیتا گیا تاکہ جو کچھ دیکھے اس پر درج کرتا جائے۔ قلعہ کوہ کی آتش افشانی کا منظر اور زیادہ قریب سے دیکھنے کی غرض سے وہ کشتی سے اتر کر دامن کوہ کی طرف بڑھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں اور ابلتی ہوئی راکھ کا مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ اس کے نوکر تو جان بچا کر بھاگ گئے مگر وہ خود وہیں تلف ہو گیا۔ مترجم

سے ایک سریانی بادشاہ تھا جس کا زمانہ ۷۰۵ سے ۶۸۱ قبل مسیحؑ تک ہے۔ اس کی عظیم الشان فتوحات اور عالیشان محلوں کی تعمیر کا ذکر ان خشتی کتابوں کے مخروطی حروف میں موجود ہے جو کلدانی و سریانی آثار قدیمہ کی ذیل میں برآمد ہوئی ہیں۔ تورات سے پایا جاتا ہے کہ اس نے فنیشیا۔ مصر اور جوڈیا پر چڑھائی کی تھی لیکن خدا کو اس کی سرکشی پسند نہ آئی اور اس پر عذاب آسمانی نازل کیا گیا چنانچہ ملائکہ کے جنود و مجندہ نے راتوں رات اس کے لشکر جرار کو تباہ کر ڈالا اور وہ بحالت تباہ اپنے پایہ تخت نینوہ لوٹ گیا۔ ہراڈوٹس یونانی مورخ ملائکہ کے بجائے چوہوں کی ایک عظیم الشان فوج کا ذکر کرتا ہے جو مصریوں کے مخالفین پر حملہ کر کے ان کی تیروں کمانوں اور ڈھالوں کو نگل گئی اور اس طور پر وہ جب نہتے رہ گئے تو مارے گے۔ سناچرب اس لحاظ سے گویا یہودیوں کا ابرہہ ہے۔ مترجم

سے جناب رسالت مآبؐ مختلف القاب سے یاد فرمائے گئے ہیں۔ مخالفین و معاندین نے اگر ازراہ خبث نفس آپ کو ابو کبشہ یارائی ابتر کہا ہے تو موافقین و معتقدین نے بقاضائے ارادت امین مصطفے اور مجتبیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے لیکن کوئی روایت بسند صحیح اس مضمون کی ہمارے علم میں موجود نہیں ہے کہ آپ حلیبی بھی پکارے جاتے ہوں۔ "حلیب" اونٹنی کے دودھ یا دودھ دوہنے والے کو کہتے ہیں۔ معلوم نہیں مصنف کو یہ نام کیسے ہاتھ آیا اور اس کی کیا اصلیت ہے۔

مترجم

؎ عیسائی مصنفین جو نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور ان تعلقات کی ماہیت کو نہیں جان سکتے جو خدا اور اس کے برگزیدہ مرسلین کے درمیان وقتاً" فوقتاً" قائم ہوتے رہے ہیں۔ عام طور سے جب ہمارے رسول مقبولؐ کا ذکر آتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ وہ لکھے پڑھے تھے یا انہوں نے تورات و انجیل کا بامعان نظر مطالعہ کیا تھا یا عیسائی راہبوں سے انہوں نے تعلیم پائی تھی اور اسی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے دنیا کے سامنے وہ مہتم بالشان اور زندہ جاوید تحریک پیش کی جس کا نام اسلام ہے۔ یورپین مصنفین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کو اگر ایک چھوٹا سا واقعہ مل جائے تو اس سے سینکڑوں نتائج اپنے مفید مطلب بلا تامل نکالتے ہوئے چلے جاتے ہیں خواہ وہ نتائج مقدمہ کے صغری و کبری سے دور کی نسبت بھی نہ رکھتے ہوں۔ سوئی کا پھاوڑا اور رائی کا پربت بنا دینا ان کا ایک ادنی کرشمہ ہے۔ پنسل کے مدھم سے خاکے پر ایسی ایسی رنگ آمیزیاں کرتے ہیں کہ دیکھنے والا جو سطح سے نیچے جانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا بے اختیار فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈریپر مصنف کتاب ہذا بھی باوجودیکہ اسلام اور بانی اسلام کا ذکر معقولیت سے کرتے ہیں اور ان کی تحریر سے اس تعصب کی بو نہیں آتی جو پادریوں کی تحریروں کا خاصہ ہے اس لغزش سے نہیں بچ سکے۔ فقط ایک اتنے سے واقعہ سے کہ رسول اللہ گیارہ بارہ برس کی عمر میں شام گئے تھے اور بحیرہ راہب سے ملے تھے اور یہ وہ متفق علیہ واقعہ ہے جو بسند ابن اسحق و ابن ہشام ہم تک پہنچا ہے ڈاکٹر ڈریپر نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ بحیرہ نے آپ کو نسطوری عقائد کی تلقین کی اور آپ نے اس تلقین سے متاثر ہو کر نسطوریت کو بالآخر بنام اسلام دنیا میں شائع کیا۔ بحیرہ کے علاوہ اور جس شخص کا اثر رسول اللہؐ پر بقول ڈریپر پڑا وہ ورقہ ابن نوفل مترجم انجیل تھا جس سے آن حضرتؐ کو مذہبی امور پر گفتگو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا۔

اسلامی تاریخوں اور روایتوں سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ بعثت سے قبل آنحضرتؐ کی رسم و راہ یہودیوں اور عیسائیوں سے رہی ہو اور آپ نے ان کے مذہبی پیشواؤں سے مذہبی تعلیم حاصل کی اور ایسی حالت میں جبکہ اسلام اور اس کے مقدس و محترم بانی کے متعلق مغربی مصنفین کی کل معلومات کا ماخذ اسلامی تاریخیں اور روایات ہی ہوں اس قسم کے نتیجہ پر پہنچ جانا جس پر کہ ڈاکٹر ڈریپر پہنچے ہیں ان کی قوت متخیلہ کی شگرف آفرینی پر ایک گواہ عادل ہے۔

اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ایک گیارہ برس کا عرب لڑکا (کیونکہ رسول اللہ جب اپنے چچا کے ساتھ شام کو تشریف لے گئے ہیں تو آپ کی یہی عمر تھی) جو بت پرستی و جاہلیت کے حوالی سے گھرا ہوا ہو اقانیم ثلثہ کی اس عجیب و غریب بحث کو سمجھنے کی قابلیت رکھ سکتا ہے جسے مسیحیت کا چھ صدیوں کا فلسفہ بھی سلجھا نہ سکا تھا تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس لڑکے

نے اسی پراسرار بھول بھلیاں میں سے توحید کی وہ سیدھی اور سچی راہ کیوں کر ڈھونڈ نکالی جو فلسفہ و مذہب دونوں کی نگاہ سے اب تک پوشیدہ تھی۔ نسطوریت باوجود اس میلان کے جو اسے توحد کی جانب تھا پھر بھی شرک کے دائرہ کا مرکز تھی۔ مانا کہ وہ مسیح کے جسمانی حصہ ہی کو بطن مریم سے نسبت دیتی تھی لیکن مسیح کے ربانی حصہ سے تو اس کو انکار نہ تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ اس بات کی تو قائل تھی کہ خدا انسان کا روپ ایک طرح سے دھار سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت کے دوسرے عقائد مثلاً" کفارہ جو اصل اصول نجات ہونے کے اعتبار سے مذہب عیسوی کا سنگ بنیاد ہے نسطوریت میں بلا کسی ترمیم کے داخل تھے۔ ورقہ کا اثر اگر رسول اللہ پر پڑا تو وہ بھی گویا زیادہ سے زیادہ ایک نسطوری المذہب عیسائی کا اثر تھا۔ یہودیوں سے توحید کا خیال اگر رسول اللہ مستعار لیتے تو اس میں بھی تجسیمیت کے مادی عناصر شامل تھے۔ پھر وہ کون سی قوت تھی جس نے مکہ کے اس یتیم و یسیر اور امی بچے کے قلب میں ابتدا ہی سے ان حقائق کو جمع کرنا شروع کر دیا جن کی روشنی میں اسے تمام ادیان و مذاہب موجودہ کی اچھائیاں اور برائیاں نظر آنے لگ گئیں اور جب ارتقا کے اس ہمہ گیر عمل نے جس سے پیغمبر بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا اس کے قوائے ذہنی کو ترقی دے کر مشاہدہ اور تجربہ کی مدد سے منتہائے کمال پر پہنچا دیا یعنی بعثت کی ساعت قریب آئی تو اس نے اچھائیوں کو چن لیا اور انہیں ایک دلاویز و دل آرا شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اس زبردست اور فوق العادت تائید کی بدولت جو ہمیشہ اس کے شامل حال رہتی ہے درجہ معرفت و یزداں شناسی پر خودبخود پہنچ جاتا ہے اور اس کی مثال بعینہٖ حضرت ابراہیمؑ کی سی مثال ہوتی ہے جن کی نسبت قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ جب انہوں نے ستارے کو چمکتا ہوا دیکھا تو ان کی قوت مدرکہ نے جو مائل بہ ایمان تھا ان کو یہ سمجھایا کہ ہو نہ ہو یہی ان کا معبود ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو ان کو معاً" یہ خیال پیدا ہوا کہ فنا ہو جانے والی چیز معبود و خالق نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح درجہ بدرجہ ان کو چاند اور سورج نظر آئے اور انہوں نے ان اجرام سماوی کے قرص کی عظمت و تجلی کو دیکھ کر پہلے کی طرح انہیں کو اپنا خدا سمجھا مگر جب یہ بھی غروب ہو گئے تو انہوں نے ان سے یہ کہہ کر ابا کیا کہ میں آفلین سے محبت نہیں رکھتا۔ استدلال و استنباط کے اسی روحانی زینہ کے ذریعہ سے وہ اس خالق ذوالجلال کے بام معرفت پر جا پہنچے جو آسمان و زمین ثوابت و سیار بشر و فلک سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہمارے رسول اکرمؐ بھی تائید ایزدی سے خودبخود معراج عرفان پر پہنچے۔ اس منزل کے طے کرنے میں نہ ان کو بحیرہ نے مدد دی نہ ورقہ نے نہ زید بن عمر کی راست روی نے ہدایت کی نہ امیہ تمیمی کے دین حنیف نے۔ خدا خود ان کا رہبر تھا اور تائید ایزدی خود ان کی پیشوا تھی۔ بت پرستی سے ان کو نفرت دلائی تو خدا نے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت پاک ظاہر کر رہی ہے ووجدک ضالاً" فھدی اور شرک اور

جس سے ان کے دل میں کراہت پیدا ہوئی تو خدا کی تحریک سے الم نشرح لک صدرک ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظھرک رسول اللہ اگر بقول ڈریپر نسطوریت کے اصول ہی کی تلقین کرتے تو آج دنیا میں اقانیم ثلثہ کا ایک دوسری صورت میں راج ہوتا۔ وہ خالص توحید جو اسلام کا خاصہ ہے مفقود ہوتی۔

ان کے علاوہ جیسا کہ پروفیسر نکلسن نے اپنی ایک قابل قدر تصنیف میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے لکھا ہے اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ کے معاصرین میں متعدد اشخاص ایسے تھے جو بت پرستی سے کارہ تھے اور حنیف کہلاتے تھے اور ممکن ہے کہ ان کا اثر رسول اللہ پر پڑا ہو لیکن ان میں اور محمدؐ میں یہ فرق تھا کہ ان کو تو اپنی ہی نجات کی پڑی تھی اور انہوں نے ذاتی اغراض کی حدود سے متجاوز ہو کر تمام دنیا کی منقل جان میں نور ایمان کی چنگاری ڈال دی

گفت آن کلیم خویش برون آور و زموج دین جھدی کند کہ برآرد غریق را

مترجم

لے آخر مصنف کو حقیقت کا اعتراف کرتے ہی بنی۔ یا تو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہ نے جو کچھ حاصل کیا بحیرہ سے حاصل کیا اور اپنی طرف سے جو کچھ کیا یہ کیا کہ نسطوریت کی اشاعت کر دی اور یا اب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ رسول اللہ مدتوں محو غوروفکر رہ کر توحید باری کے نکتہ پر پہنچے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بحیرہ بت پرستی کا اثر رسول اللہ کے دل سے مٹا چکا تھا اور نسطوریت کے تمام اسرار انہیں سمجھا چکا تھا تو پھر انہیں غار حرا میں مدتوں محو غوروفکر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ آگے چل کر مصنف نے اپنے اس خیال کی کہ رسول اللہ اسلام کی اشاعت کے لحاظ سے نسطوریت کے شرمندہ احسان تھے صاف الفاظ میں یہ کہہ کر تردید کر دی ہے کہ "ان اصول کے تسلیم کرنے سے بھی آپ نے انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے نسطوری اساتذہ نے آپ کو سکھائے تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل ان کی تائید نہ کر سکتی تھی۔" مترجم

لہ تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی تپیدن رگ مرغان رشتہ برپا را

کیا اطبا ہم کو یقین دلا سکتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ سے پاک نفس اور پاک سرشت انسانوں کو جو حقیقتیں نظر آتی ہیں ان کا وجود ذہن میں بھی نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت اشیا کا راز ان کی خارجی اصلیت ہی میں مرکوز ہے؟ روحانی کرشموں کو اطبا چاہے التباس حواس سے تعبیر کریں چاہے اختلال دماغ کہیں لیکن ان سے انکار نہیں ہو سکتا اور سچ تو یہ ہے کہ اس التباس حواس پر جس کا نتیجہ قرآن کا سا معجزالتزام کلام اور اسلام کی سی اخلاق آموز حقیقت اتنا فائدہ رساں اور ہمہ گیر تحریک ہو ہزار مشائی و اشراقی فلسفے قربان ہیں۔ دنیا میں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں شخص ایسے گذرے ہیں جنہوں نے روزے بھی رکھے ہیں ریاضتیں بھی کی ہیں۔ دماغی پریشانیوں اور فکروں میں بھی مبتلا ہوئے ہیں لیکن باوجود ان تمام باتوں کے کسی میں محمدؐ کی شان نہ پیدا ہو سکی۔

مترجم

۵۷ معلوم نہیں یہ لغو اور مہمل فقرہ کہاں سے ڈریپر کو ہاتھ لگ گیا۔ معراج کے متعلق رویت کے امکان پر قرآن نے تو قاب قوسین او ادنی کا پردہ ڈال رکھا ہے لیکن آپ تجسیمیت کے درجہ سافل میں پہنچ کر انسان کی قوت لامسہ کو خدا کے احساس کا شرف عطا کرتے ہوئے تامل نہیں فرماتے۔ غالباً اسی بنا پر آپ نے آگے چل کر اسلام پر تجسیمیت کا الزام لگایا ہے۔ مترجم

۵۸ افسوس ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول سے ناواقف اور ان واقعات سے بے خبر ہونے کے باعث جو غزوات نبوی کے محرک ہوئے یہ تحکمانہ اصول قائم کر دیا کہ اسلام کی سب سے زبردست دلیل تلوار ہے۔ اگر مصنف کے حین حیات میں پروفیسر آرنلڈ کی کتاب "اشاعت اسلام" ہی شائع ہو گئی ہوتی تو شاید یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے اسے تامل ہوتا۔

اسلام تو اپنے مسلمہ حقوق کی حفاظت ہی میں تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے مگر وہ مذہب ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں جس کا اصول تو یہ ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے مگر عمل یہ ہے کہ بے کسوں کو بھی پامال کر کے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

مترجم

۵۹ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر قرآن مجید کی اس آیت پر پڑ گئی ہو گی "فصل لربک وانحر" لیکن نماز اور قربانی کو مساوی الفضائل قرار دینا اور اس تساوی فضیلت کے خیال کو جناب رسالت مآب سے منسوب کرنا مصنف کی کمی معلومات پر مبنی ہے۔ مترجم

۶۰ اسلام پر جو چند سوقیانہ اعتراضات عیسائی پادریوں کے تعصب سے یورپین مصنفین کو ترکہ میں پہنچے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام میں خدا کا تصور انسانی حیثیت سے کیا گیا ہے اور قرآن کا خدا گویا ایک دیوپیکر انسان ہے جس میں تمام عادات و خصائل وہی پائے جاتے ہیں جو عام طور سے بنی نوع انسان میں پائے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر ڈریپر جیسا نکتہ رس شخص بھی جو وسیع النظر ہونے کے علاوہ اسلامی تعلیم کو رواداری اور مسالمت کی آنکھ سے دیکھتا ہے اس اعتراض کو صحیح سمجھتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی بے مثل کتاب الکلام حصہ دوم میں اس مضمون پر ایک لطیف بحث لکھی ہے جس کی یہ عبارت ہمیں نہیں بھولتی۔

"دنیا اس عالمگیر تاریکی میں پڑی ہوئی تھی کہ دفعتہ اسلام نے آ کر تمام غلط خیالات اور معتقدات کا پردہ چاک کر دیا۔ اس نے بتایا کہ خدا واحد محض ہے اور زمان و مکان جہت و اشارہ تحت وفوق ہر قسم کے قیود و خصوصیات سے مبرا ہے۔ یہ وہ تقدیس و تنزیہ تھی جس پر یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی اور گبن نے کہا کہ جب زمان و مکان و جہت و اشارہ تمام خصوصیتوں کو الگ کر لیا جائے تو خیال کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسی تقدیس کی بنا پر اسلام نے ہر قسم کی بت پرستی

کا استیصال کر دیا کیونکہ اسلام نے خدا کی نسبت جو پاک اور منزہ خیال قائم کیا تھا وہ ایسا نہ تھا کہ خدا کا تصور جسمانی پیکر اور صورت کے بغیر دلوں میں نہ آ سکے۔ ہندو۔ مصری۔ صابی۔ رومن کیتھولک سب خدا کے تصور کے لئے جسمانی تمثل کے محتاج تھے اور اس وجہ سے بت پرستی میں مبتلا تھے لیکن اسلام میں باوجود سینکڑوں ہزاروں فرقوں کے پیدا ہو جانے کے بھی کسی فرقہ کو آج تک بت پرستی کا کبھی خیال نہ آ سکا۔"

اگر ڈاکٹر ڈریپر نے قرآن کی آیات کو بصیرت کی نظر سے دیکھا ہوتا تو جو اعتراض انہوں نے کیا ہے کبھی نہ کرتے۔ ہم مثال کے طور پر کلام مجید سے صرف چند مقامات کا استقصا کرتے ہیں:

(۱) اللہ لا الہ الا هو الحی القیوم لاتاخذہ سنتہ ولا نوم لہ ما فی السموات وما فی الارض من ذاللذی یشفع عندہ الا باذنہ یعلم مابین ایدیھم وماخلفھم ولایحیطون بشی من علمہ الا بماشاء وسع کرسیہ السموت والارض ولا یودہ حفظھما وھوالعلی العظیم

(۲) ھواللہ الذی لا الہ الا ھو الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون۔ ھواللہ الخالق الباری المصور لہ الاسماء الحسنی یسبح لہ ما فی السموت و الارض وھوالعزیز الحکیم۔

(۳) اللہ نور السموت والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجہ الزجاجتہ کانھا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکتہ زیتونتہ لاشرقیتہ ولا غربیتہ یکادزیتھا یضی فلولم تمسہ نار نور علی نور یھدی اللہ لنورہ من یشاء ویضرب اللہ الامثال للناس واللہ بکل شی علیم۔

(۴) لیس کمثلہ شی وھوالسمیع العلیم۔

(۵) قل ہو اللہ احد ○ اللہ الصمد ○ لم یلد ○ فلم یولد ○ فلم یکن لہ کفوا احد۔

اس قسم کے بیسوں جواہر ریزے جن سے یہ گنج شایگاں جگمگا رہا ہے تشکک و الحاد کی نگاہ کو خیرہ کرنے کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص جو ذرا بھی انصاف پسند ہے دعوی کر سکتا ہے کہ خدا کا وہ تصور جو ان آیات سے ذہن انسانی میں پیدا ہوتا ہے شان تجسیم لئے ہوئے ہے۔ یا ان صفات میں سے جو ان آیات میں گنائی گئی ہیں کوئی صفت ایسی ہے جو مطلقاً" انسان میں پائی جاتی ہو۔

ڈاکٹر ڈریپر فرماتے ہیں کہ مسلمان ان ادنی درجہ کے تصورات کی قید سے بہت جلد آزاد ہو کر

ان رفیع الشان تصورات تک پہنچ گئے جن میں حکمت و فلسفہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے بڑے سے بڑے حکیم اور فلسفی کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مابعد الطبیعیات میں آیات قرآنی کا شارح ہے اور بس۔ ابن رشد۔ ابن تیمیہ ابن حزم غزالی۔ ابن عربی فخر رازی۔ جامی۔ بوعلی سینا۔ فارابی۔ شاہ ولی اللہ اور سر سید احمدؒ خان وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت کے امام ہو گذرے ہیں اور آزاد خیالی میں ڈریپر سے بھی دو قدم آگے ہی ہیں لیکن توحید رسالت اور معاد کی حقیقتوں کے متعلق جو کچھ ان مشاہیر نے لکھا ہے وہ یا تو قرآن کی تشریح ہے یا تاویل۔ پروفیسر نکلسن جن کا حوالہ ہم ایک مرتبہ پہلے بھی دے چکے ہیں لکھتے ہیں کہ اس بیس سال کی مدت میں جو رسول اللہ کی بعثت اور آپ کے انتقال کے درمیان منقضی ہوئی آئندہ نسلوں کے مسلمانوں کی سیاسی اور عقلی ترقی کی بنیاد قائم کی جا چکی تھی۔ دنیا میں محمد صلعم سے بڑھ کر اور کسی شخص نے اپنی قوم کے مقدر کو اپنے خاص اثر کے سانچہ میں نہیں ڈھالا۔ اور اگرچہ مسلمان تمدن کی دوڑ میں بہت جلد آپ سے کوسوں آگے نکل گئے لیکن ہر ہر منزل بلکہ ہر ہر قدم پر ہر مسئلہ کے حل کرنے میں وہ آپ ہی سے استناد و استشارہ کرتے رہے۔ مترجم

ﷺ آج تک کسی اہل الرائے کو یہ دعویٰ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا تھا کہ آیہ الیوم اکملت لکم دینکم کی تنزیل کے بعد ان اصول میں جو اسلام دنیا کے سامنے علی روس الاشہاد پیش کر چکا تھا یا ان مقاصد پر جن کا اظہار انسان کی اصلاح معاش و معاد کے متعلق قرآن میں علی الاعلان کیا جا چکا تھا کوئی اضافہ کیا گیا یا ان اصول و مقاصد میں کوئی تنسیخ یا ترمیم روا رکھی گئی۔ تعجب ہے کہ مصنف کو باوجود اس بات کے جاننے کے کہ اسلام کا دارومدار قرآن پر ہے اور حامل قرآن یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی حجت حق ختم ہو گئی جس میں نہ آج تک کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو گی اس عجیب و غریب دعوے کی جرات کیوں کر ہوئی کہ رسول اللہ کی وفات تک تو اسلام کے مقاصد محدود تھے لیکن ایشیا و افریقہ میں پھیلنے کے بعد بوجہ اس کے کہ وہ اپنی فتوحات کے نشہ میں چور ہو گیا تھا اس نے ان مقاصد کو پس پشت ڈال دیا اور ایک نئی شرع کی ترویج کا مدعی ہوا۔ اس قسم کے دعاوی مسیحی جہلا کو خوش کر سکتے ہیں لیکن مسلمانوں سے اور مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ بالغ نظر و آزاد خیال مسیحی مستشرقین تک سے یہ توقع رکھنا کہ وہ انہیں بلاچون و چرا تسلیم کر لیں گے گویا دن دہاڑے ان کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کرنا ہے۔

اسلام اور اس کے مقاصد سے جو شخص تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس اصولی نکتہ سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کسی ایک قوم یا ملک یا زمانہ تک محدود نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے اس نے تمام دنیا کو اپنے آغوش اثر میں لینے کا ڈھنگ ڈال دیا تھا چنانچہ اس کی یہ شان ہمہ گیری آیہ کریمہ وما ارسلنک الا رحمتہ للعلمین میں نظر آ رہی ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص یہ

خیال ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی مقاصد محدود تھے یعنی اس کا ظہور صرف عربوں کی بت پرستی کے استیصال کے لئے ہوا تھا وہ گویا اپنے آپ کو اس برادری میں داخل کرتا ہے جس کی جبین معلومات پر "نہ داند ویداند کہ بداند" کا قشقہ لگا ہوا ہے۔

یہ دعوی بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے کہ اسلام نے تمام دنیا میں پھیلنے اور نشہ فتح و نصرت میں سرشار ہونے کے بعد اس امر کا ادعا کیا کہ وہ ایک نئی شرع کا بانی ہے۔ اول تو سرے سے اس ادعا کو اس سے منسوب کرنا ہی غلطی ہے اس لئے کہ قرآن میں بار بار جتایا گیا ہے کہ جو دین محمد مصطفے صلعم کے ذریعہ سے انسان کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا وہ محض ادیان سابقہ کا مصدق اور حقائق ماضیہ کا موید ہے۔ آیات قرآنی کے سیاق سے ہر مقام پر یہ نکتہ مترشح ہوتا ہے کہ اسلام نے ان سچائیوں کو جن کا اظہار ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے مرسلین نے اپنے اپنے وقت میں کیا تھا ان کدورتوں اور آلائشوں سے پاک کر کے جن سے وہ بوجہ امتداد روزگار آلودہ ہو گئی تھیں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ جابجا اس نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ وہ معرفت اور یزداں شناسی کی وہی پرانی شراب ہے مگر نئی بوتل میں اور اخلاق و روحانیت کا وہی قدیم پیکر نورانی ہے مگر نئے لباس میں۔ ثانیا" اگر ڈاکٹر ڈریپر کی خاطر سے یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ مسلمانوں نے اس قسم کا متناقض دعوی ایشیا اور افریقہ کی تسخیر کے بعد اپنی فتوحات کے نشہ میں چور ہو کر علی رغم وحی منطوق و نص صریح کسی موقع پر کیا ہے تو اس کا اثر اسلام پر پڑ سکتا ہے۔ اسلام پر اگر کوئی الزام لگایا جاتا ہے تو آیات قرآنی کا حوالہ دے کر اسے ثابت کیا جائے ورنہ دعوی بے دلیل سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر ڈریپر کا یہ خیال بھی انوکھا ہے کہ اسلام نسطوریت کی ایک شاخ ہے۔ جیسا کہ ہم ایک گذشتہ نوٹ میں ظاہر کر چکے ہیں نسطوریت اور چھٹی صدی عیسوی کی مسخ شدہ عیسائیت میں بجز اس مسئلہ کے اور کسی بات میں فرق نہ تھا کہ نسطوری حضرت عیسیٰؑ کی ذات کے ربانی و جسمانی عناصر کو جدا جدا خیال کرتے تھے اور حضرت مریمؑ کو ان کے عنصر جسمانی کی والدہ تصور کرتے تھے۔ باقی ہر ایک لحاظ سے وہ ان کی الوہیت کے قائل تھے یعنی حضرت عیسیٰؑ کی فطرت ربانی و جسمانی کو متحدہ غیر منفصل سمجھتے تھے اور ان کا ایمان تھا کہ مسیح کے افعال جسمانی شان ربانی لئے ہوئے ہیں۔ اقانیم ثلثہ کی بھی وہ اسی ترمیم کے ساتھ قائل تھے اور کفارہ و عشائے ربانی اور دوسرے غوامض مسیحیت سب ان کے عقائد کا جزولاینفک تھے اور یہی وہ باتیں تھیں جن کی نسبت ڈریپر نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان اصول کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے نسطوری اساتذہ نے آپ کو سکھائے تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل ان کی تائید نہ کر سکتی تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کو نسطوریت کی ایک شاخ قرار دینا مصنف کی خوش فہمی نہیں تو اور کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک پیغمبر اولوالعزم کی لوح بصیرت بمنزلہ ایک ذکی الحس آئینہ عکسی کے

ہوتی ہے جس پر اس کے اخلاقی حوالی کے باریک سے باریک نقوش شعاع ادراک سے اثر پذیر ہوتے ہی مرتسم ہو جاتے ہیں۔ حقائق کے اس مرقع کو پیش نظر رکھ کر وہ اپنی قوت ممیزہ کی مدد سے جو فیضان باری کی مسطرح خاص ہوتی ہے ان صورتوں کا انتخاب کر لیتا ہے جن سے اقوام و امم فیض یاب ہو کر قدرت کے منشاء اخلاقی کی تعمیل کرتی ہیں۔

حضور سرور کائنات جو انبیائے اولوالعزم کے سرتاج ہیں اس زمانہ میں مبعوث ہوئے جب کہ دنیا کی قومیں ارتقائے اخلاق کے تمام مدارج طے کر چکی تھیں لیکن ان کی روحانیت گون کے زاویتہ الراس سے گر کر مائل بہ قاعدہ فساد ہو رہی تھی۔ وحدت واجب الوجود۔ بقا و قدرت باری تعالی۔ عدم تغییر قوانین ایزدی۔ بقائے روح۔ حیات اخروی۔ حسن اخلاق۔ اخوت جماعت انسانی۔ یہ تمام اصول انسان کو معلوم ہو چکے تھے اور ان کے فروع ہند مت۔ بدھ مت۔ مجوسیت۔ موسویت۔ مسیحیت میں موجود تھے لیکن انسان کے طغیان و عصیان نے ان نورانی حقیقتوں پر شرک ورجس کا تاریک پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس پردہ کے اٹھانے کے لئے ایک ایسے مامور من اللہ ہادی کی ضرورت تھی جس کی زبردست شخصیت ان تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکے جن کا پیش آنا اس معرکہ میں لازمی تھا۔ دفعتہ قدرت ایزدی کی شان آشکارا ہوئی اور محمد مصطفےٰ نے مسند رسالت پر جلوہ افروز ہو کر ایک مجدد اعظم و مصلح اکبر ہونے کی حیثیت سے ان تمام سچائیوں کا جو ادیان و مذاہب سابقہ میں پہلے سے موجود تھیں اقتباس و التقاط و انتخاب کر کے شیرازہ باندھا اور اس دلکش و دلاویز تالیف کو بنام اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مترجم

[2] یہ ایک اور مضحکہ انگیز الزام ہے جو اسلام پر لگایا جاتا ہے باوجودیکہ وہ لوگ جو اس قسم کی مین میک نکالنے کے عادی ہیں خود بہت بڑے مادہ پرست ہیں اور ان کا بال بال اجزائے و مقناطیسی میں بندھا ہوا ہے جن کے ازلی و ابدی اور ناممکن الفنا ہونے پر انہیں ایسا ہی یقین ہے جیسا اپنی ہستی پر لیکن جب کبھی حیات اخروی کے عذاب و ثواب میں انہیں جسمانی شان نظر آتی ہے خواہ وہ بر سبیل تمثیل ہی کیوں نہ ہو تو ان کا ستون ثقاہت و متانت مرکز ثقل سے ہٹ جاتا ہے اور وہ ایسے بے سروپا اور لغو اعتراضات پر اتر آتے ہیں کہ ہم بے متبسم ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ہم ان لوگوں سے جو بہشت کے اسلامی تصور پر یہ کہہ کر نکتہ چین ہوا کرتے ہیں کہ اس میں ہر طرح کی جسمانی لذتیں پائی جاتی ہیں اور جن کو حوروں غلمانوں کے ذکر سے اس قدر چڑ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آپ کے خرمن تقدس پر برق خاطف گر پڑی یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ خدا اور اس کی تنزیہ و تقدیس کے قائل ہیں تو آخر اس دنیا میں ناز و نیاز اور اس کی متعلقہ لذتوں کے پیدا کرنے سے اس کے دامن تقدس و تنزہ میں کون سا ایسا دھبہ لگ گیا جو عقبی میں حوروں اور غلمانوں کی عدم موجودگی سے چھوٹ جائے گا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اس دنیا میں کچھ اور ہے اور آنے والی دنیا میں کچھ اور ہو جائے گا وہ ایک انوکھی منطق سے کام لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے معترضین اصل حال سے تو بے خبر ہیں لیکن شوق نکتہ چینی قلم کو چین نہیں لینے دیتا۔

شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب حجتہ اللہ البالغہ میں انبیا کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے ان کی عقل و علم کے لحاظ سے خطاب کیا کرتے ہیں۔ اسی خیال کو امام فخر الدین رازی نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ قرآن کا روئے سخن عوام و خواص کی طرف یکساں ہے لیکن چونکہ عوام اکثر امور میں اپنے افتاد طبیعت کے لحاظ سے حقائق کے ادراک سے قاصر ہیں لہٰذا مصلحت یہ تھی کہ ایسے الفاظ میں انہیں مخاطب کیا جائے جو ان کے خیالات و تصورات کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔

قرآن کے ان مقامات کا مطالعہ کرتے وقت جن میں بہشت و دوزخ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں اس حکیمانہ اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان پڑھ اور اکثر جہلا کے غیرنشوونما یافتہ دماغ کے پردہ پر اعمال حسنہ کی جزا کی تصویر اگر کھینچی جا سکتی تھی تو صرف ان نعمتوں اور لذتوں کے تذکرہ سے جن کا احساس یا ادراک ان کے لئے ممکن تھا۔ بہشت کا وہ تصور جس میں حوروں اور غلمانوں اور بہتی ہوئی نہروں اور لہلہاتے ہوئے چمنوں کا عنصر شریک ہے تمثیلی پیرایہ میں عوام کا لانعام کو جاودانی مسرتوں سے روشناس کرنے کا فلسفیانہ ذریعہ ہے۔ ورنہ اس بہشت کا تصور بھی اسلام میں موجود ہے۔ جس میں داخل ہو کر بڑے سے بڑے مشائی یا اشراقی فیلسوف کو بھی یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی طبیعت کسی زمانہ میں اس کی خوشیوں سے اچاٹ ہو جائے گی۔ حیات اخروی کا وہ اصل الاصول اور غایت الغایات جس کے حصول کے لئے اسلام کے حکمائے عظام و صوفیہ کرام نے اپنی عمریں وقف کر دی ہیں لقائے باری تعالیٰ یا وصال ذات ذوالجلال و الجمال ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی تشریح حضور سرور کائنات نے ایک صحابی کے اس استفسار پر کہ بہشت کی ماہیت کیا ہے ان الفاظ میں فرمائی تھی **لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علیے قلب بشر** یعنی بہشت کی لذت وہ لذت ہے جس کا ادراک سامعہ و باصرہ تو ایک طرف رہے تصور و تخیل تک سے نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کا انکشاف قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتا ہے **یاایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الی ربک راضیتہ مرضیتہ** ایک اور مقام پر جناب باری نے لذت نجات کی حلاوت سے حقیقی معنوں میں بہرہ اندوز ہونے والوں کو ان الفاظ میں بشارت دی ہے کہ وہ اخیر فیصلہ والے دن اپنے خدا کے جمال عالم آرا کا مشاہدہ کریں گے۔ اسی طرح ایک نص صریح اس مضمون کی موجود ہے کہ کسی نفس کو اس مسرت ابدی کا علم نہیں ہے جو پوشیدہ طور پر اس غرض سے تیار کی گئی ہے کہ ان اعمال حسنہ کے انعام کے طور پر اس کو مرحمت کی جائے جو اس سے اس دنیا میں صادر ہوں۔ فلسفیانہ اصطلاح میں ان مضامین کو انجذاب یا وصال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ قرآن کا بہشت وہ بہشت ہے جس سے عامی و جاہل عالم و فلسفی اپنے

اپنے مذاق کے لحاظ سے یکساں لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک خداشناس فلسفی اسی کو اپنی خوشیوں کی معراج تصور کرتا ہے کہ اس کی روح اس خاکدان کی قید سے آزاد ہونے کے بعد روح کائنات یعنی ذات باری تعالی میں ضم ہو جائے تو یہ انتہائی خوشی بھی قرآن کے توسل سے اس کو حاصل ہو سکتی ہے اور اگر ایک ادنی درجہ کا دین دار عامی جس کی آرزو صرف اسی قدر ہے کہ حوروں سے ہم کنار ہو کر شراب طہور کے پیالے پیا کرے اور طوبی کے پھل توڑ توڑ کر کھایا کرے تو ڈریپر یا اس کے ہم خیال بزرگوں کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ اس خوشی سے اس بیچارے کو محروم کرنے کے لئے جوڑ توڑ کریں۔ مترجم

ؔ یہ اندازہ اصل سے بقدر ایک لاکھ کے کم ہے۔ اس معرکہ میں مسلمانوں کی فوج چالیس ہزار تھی اور عیسائیوں کی دو لاکھ چالیس ہزار۔ مترجم

ؔ مصنف کو شاید یہ معلوم نہیں کہ امام غزالی کا یہ قول قرآن کی مشہور و معروف آیت لیس کمثلہ شی کی شرح ہے جو علی روس الاشہاد اس الزام کی تردید کر رہی ہے کہ اسلام ایک تجسیمیہ مذہب ہے۔ مترجم

ؔ اسپین کا ایک مورخ تھا جس نے پانچویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا ہے۔ ۴۱۳ء میں اس نے آگسٹائن کی ملاقات کی غرض سے افریقہ کا سفر اختیار کیا۔ اس کی مشہور کتاب "تاریخ عالم" اسی ملاقات کا نتیجہ ہے۔ آگسٹائن نے اس کتاب کی تصنیف کی فرمائش کرتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ اس میں اس بات کو ثابت کرنا چاہئے کہ دولت روما بت پرستی کے زمانہ میں بھی ویسی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں جیسی مسیحیت کے زمانہ میں ہو رہی ہیں۔ کارتھج سے اوروسیس بیت المقدس گیا اور وہاں چند دن تک پلیجیس کی مخالفت میں اس کے حریفوں کا ہم صفیر و ہم آہنگ رہ کر وطن کو لوٹا۔ رستہ میں اسکندریہ پڑتا تھا۔ چند روز یہاں کی بھی سیر کی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب سینٹ سایرل کا سا متعصب اور دشمن علم پادری جس نے ہائی پیشیا کے وحشیانہ قتل سے علم و حکمت کے گلے پر الٹی چھری پھیر دی تھی اسکندریہ کا بطریق تھا۔ اول تو سایرل کا چچا تھیا فیلس ہی کتب خانہ اسکندریہ کی تمام بچی کھچی کتابوں کو برباد کر چکا تھا اور بفرض محال اگر کچھ بچ رہی ہوں تو ضرور رہے کہ ہائی پیشیا کے وحشی قاتل نے انہیں ضائع کر ڈالا ہو۔ اور اس لئے اوروسیس کی اس تاریخی شہادت کی سچائی میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جب اس نے کتب خانہ کو جا کر دیکھا تو اس میں ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ گویا حضرت عمرؓ کی خلافت سے دو سو بیس سال قبل کتب خانہ اسکندریہ عیسائی پادریوں کی جہالت اور تعصب کے ہاتھوں تمام و کمال برباد ہو چکا تھا۔ مترجم

ؔ کتب خانہ اسکندریہ کا بعد حضرت عمرؓ بحکم حضرت اقدس جلایا جانا ایک ایسا الزام ہے جس کی اصل حقیقت کا انکشاف علامہ شبلی کا سحر آفرین قلم کر چکا ہے۔ ہمارے ناظرین میں سے جن صاحب کو اس بحث کی تفصیل مطلوب ہو وہ علامہ ممدوح کی تصنیف "رسائل شبلی" کا بامعان نظر

مطالعہ کریں۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ باوجودیکہ ان تمام براہین و دلائل کے جو اس الزام کے جواب میں پیش کی جا سکتی تھیں ڈریپر نے یہاں خود پیش کر دیا ہے پھر بھی اسے اصرار ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کتب خانہ کے جلا دئے جانے کا حکم ضرور نافذ فرمایا۔ ڈریپر کو اس امر کا اعتراف ہے کہ فتح اسکندریہ کے وقت "سرپیان" یعنی فلیڈلفس کے کتب خانہ کی کوئی کتاب موجود نہ تھی اس لئے کہ تمام کتابیں کچھ تو جولیس سیزر کے عہد میں جل چکی تھیں اور جو باقی بچی تھیں وہ بحکم شہنشاہ تھیوڈوسیس بطریق تھیافیلس کی نگرانی میں منتشر کی جا چکی تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اوروسیس جو ایک مسیحی مورخ ہے اپنے چشم دید حالات کی بنا پر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم کی تعمیل کے بیس سال بعد جب اس نے کتب خانہ کو جا کر دیکھا تو ایک کتاب موجود نہ پائی۔ اس کے علاوہ مصنف ان اندرونی و ذیلی شہادتوں کا بھی مقر ہے جو اس اصولی ثبوت کی موید ہیں۔ مگر باایں ہمہ اس اصرار و استبداد سے کام لے کر جو معقولیت سے کوسوں دور ہے اور جس میں کسی سوفسطائی کی کٹھ حجتی کی شان نظر آ رہی ہے یہ کہے جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے کتب خانہ جلا دیا گیا اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ وہ نوشت و خواند سے عاری تھے اور ان کے چاروں طرف تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا تھا لہٰذا اگر انہوں نے یہ حکم دیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر ڈریپر نے اس مقام پر ایسے جہل مرکب کا ثبوت دیا ہے جس کی ایسے عالم و فاضل شخص سے ہم کو ہرگز توقع نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ کو نوشت و خواند سے عاری اور متعصب و جاہل سمجھنا تاریخ کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ جو شخص عربی میں یدطولیٰ رکھنے کے علاوہ عبرانی زبان میں بھی دستگاہ وافی رکھتا ہو۔ جس نے فقہ یعنی علم اصول قانون جیسے دانش آزما فن کی بنیاد قائم کی ہو۔ جس کی مجتہدانہ عظمت تیرہ سو سال سے آئمہ فن کے دلوں میں جاگزیں ہو۔ جو شعروسخن سے ایک خاص مذاق رکھتا ہو اور اشعار نغزولطیف کے سب سے بڑے نقاد ہونے کی حیثیت سے فنون لطیفہ کے اس شعبہ خاص کا بہت بڑا سرپرست مانا گیا ہو۔ جس کو علم الانساب موروثی طور پر ترکہ میں ملا ہو۔ جس نے تعلیم کو جن مضمون میں کہ یہ لفظ اسلام کے قرون اولیٰ میں مستعمل تھا عام بلکہ ایک حد تک جبری کر دیا ہو۔ جس نے سب سے اول قرآن کے جمع و مدون کیئے جانے کی تحریک کی ہو۔ جس کو قرآن سے "قل رب زدنی علما" اور حدیث سے "اطلبو العلم ولو کان بالصین" کا سبق ملا ہو۔ جو مدینتہ العلم کے خرمن فیوض کا خوشہ چیں اور باب العلم کا ہم چشم و ہم نشین ہو۔ جس کی مسالمت۔ رواداری۔ انصاف۔ سیاست و حکمت شہرہ آفاق ہو اسے جاہل و متعصب کہنا ڈاکٹر ڈریپر ہی کا کام ہے۔

مصنف نے حضرت علیؓ کے اس قول کو کہ "انسان عادات و خصائل میں اپنے آباؤ اجداد سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی اپنے ہمعصروں سے" حضرت عمرؓ کے جہل و تعصب کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ جہالت و تعصب کے حوالی میں زندگی بسر کرنے کے باعث اگر حضرت عمرؓ بھی اپنے معاصرین کی طرح جاہل و متعصب تھے تو پھر انہیں حوالے میں سے حضرت علیؓ کا سا حکیم اور فلسفی کس طرح پیدا ہو گیا جس کی حکمت کا خود ڈریپر کو بھی عتراف ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ مہمات الامور میں حضرت عمرؓ کو صلاح و مشورہ دیا کرتے تھے اور کوئی اہم مسئلہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں حضرت علیؓ کی رائے نہ لی جاتی ہو۔ پس اگر حضرت عمرؓ نے اس کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا حکم دیا جس کا وجود بدلائل قاطع و براہین ساطع متعصب پادریوں اور ان کے حق ناشناس ہم صفیروں کے دماغ ہی میں متمکن ہونا ثابت ہے تو اس الزام میں حضرت علیؓ بھی حضرت عمرؓ کے برابر کے ساجھی ہیں۔ لیکن شاید ڈریپر کو حضرت علیؓ پر بھی جاہل و متعصب ہونے کا الزام لگاتے ہوئے تامل ہو گا۔ مترجم

سلہ کتب خانہ اسکندریہ والے قصہ میں تو ہم نے ثابت کر دیا کہ مبالغہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ پادریوں کی طرف سے ہے لیکن مسیحی مورخ اس واقعہ کی تکذیب و تردید نہ کر سکیں گے کہ حروب صلیبیہ کے جاہل و وحشی سورماؤں نے کتب خانہ طرابلس کو اس وقت جلایا جب کہ اس میں لاکھوں کتابیں جمع تھیں۔ کتب خانہ اسکندریہ کا تو حضرت عمرؓ کے عہد میں سرے سے وجود ہی نہ تھا مگر جب عیسائی سورما طرابلس پر حملہ آور ہوئے تو کتب خانہ طرابلس اپنی پوری علمی شان کے ساتھ موجود تھا۔ یہ واقعہ مسلم و متحقق ہے کہ پندرھویں صدی تک مسیحیت مجنونانہ جہالت اور مجنوطانہ تعصب کی مترادف تھی جس کا خمیازہ علوم و فنون کو رہ رہ کر کھینچنا پڑا بخلاف اس کے مسلمان علم و حکمت کے علم بردار اور ظلمت کدہ تمدن کی شمع تھے۔ ایسی حالت میں اگر وحشی و خونخوار مسیحیوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے کئی لاکھ کتابیں جو مسلمانوں نے جمع کی تھیں جلا دیں تو ان کے حامیوں کا یہ فرمانا کہ کئی لاکھ نہیں بلکہ صرف چند ہزار کتابیں جلائیں واقعہ آتش زنی کی سنگینی اور مسیحیوں کے تعصب و وحشیانہ پن کے اشتداد کو کم نہیں کر سکتا۔ مانا کہ کتب خانہ طرابلس میں کئی لاکھ نسخے نہ تھے بلکہ کئی ہزار تھے لیکن اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے کہ حروب صلیبیہ کے مسیحی سورماؤں نے ان سب کو آگ میں جھونک دیا۔ بجائے کئی ہزار کے اگر کئی لاکھ نسخے ہوتے تو کیا ان کی بے محابا آتش زنی سے بچ جاتے۔ مترجم

سلہ اسلام کی تعریف مولوی سید امیر علی صاحب اپنی کتاب "اسپرٹ آف اسلام" میں بایں الفاظ کرتے ہیں: "اسلام مادہ سلم سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی اطمینان قلب۔ سکون نفس۔ بجا آوری فرض۔ ادائے دین۔ کامل آشتی دامن اور بالاخر اپنے آپ کو اس ذات پاک کے تئیں سونپ دینے کے ہیں جس کے ساتھ رشتہ آشتی و امن قائم کیا جائے۔ جو اسم اس مادہ سے مشتق

ہے اس کے معنی امن تلطف سلامتی اور نجات کے ہیں۔ عام طور پر اس لفظ سے مطلقاً" راضی بہ رضائے الٰہی ہو نامراد لیا جاتا ہے مگر یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کے معنی ہیں نیک بننے کی کوشش کرنا۔ مترجم

۵ؑ کلام مجید میں اگرچہ بکثرت ایسی آیات موجود ہیں جن سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے چنانچہ (۱) لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ (۲) ھو القاھر فوق عبادہ (۳) وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ (۴) قل کل من عنداللہ کا مطلب بادی النظر میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے انسان کو کچھ اختیار نہیں دیا گیا لیکن یہ مطلب ان آیات سے وہی لوگ نکالتے ہیں جو ظاہر بین ہیں اور سطح کے نیچے جانے کی زحمت اپنے دماغ کو نہیں دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کائنات مجموعہ اضداد ہے یعنی ہر نیکی کے لئے ایک بدی کا ہونا لازم ہے ہر بلندی ایک پستی کو چاہتی ہے ہر نور ایک ظلمت کا محتاج ہے غرض دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا تصور اس کی ضد کے بغیر ممکن ہو اسی طرح مسئلہ جبر بھی اپنی ضد یعنی مسئلہ اختیار کا مستلزم ہے۔ یہ فلسفیانہ نکتہ قرآن کی ان بظاہر متعارض مگر بہ باطن متوافق آیات میں مضمر ہے جن میں سے کسی میں اگر یہ کہا گیا ہے کہ تم کسی بات کو نہ چاہو گے جب تک کہ خدا نہ چاہے تو کسی میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ جبرواختیار کی یہ آمیزش اس اٹل اور ازلی قانون کے مقتضیات میں سے ہے جس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے (۱) لاتبدیل لخلق اللہ (۲) خلق کل شی فقدرہ تقدیرا (۳) فلن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا اس سے زیادہ حکیمانہ توجیہ کائنات کے کسی ارادی یا غیرارادی حادثہ کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اسباب و علل کے ایک محکم و متقن سلسلہ کے ذریعہ سے اس مدبراعظم کی ذات پر جاختم ہوتا ہے جو علتہ العلل اور مظاہر عالم کا سبب اولین ہے۔ لیکن مقدرات کے اس جبریہ عنصر میں علتہ العلل نے جس کی حکمت آفرین شان پر "الذی خلق فسوی" گواہ ہے ارادہ انسانی کا اختیاری عنصر بھی ایک خاص حد تک شامل کر دیا ہے جس کا اندازہ "والذی قدرفھدی" سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی رو سے انسان نہ مجبور محض ہے نہ مختار مطلق۔ وہ ان حدود کے اندر جو فطرت انسانی کے ارتقائی عقلی و روحانی و اخلاقی کے لئے مقرر کر دی گئی ہیں اپنے افعال کا مختار ہے لیکن ان حدود سے آگے بڑھنے پر قادر نہیں۔ اسلام کی نسبت یہ سمجھنا کہ اس نے اپنے پیروؤں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کی تلقین کی ہے اور یہ سکھایا ہے کہ اگر مریض کو مرنا ہے تو طبیب سے رجوع کرنا فضول ہے اس لئے سرے سے علاج ہی نہ کرنا چاہئے اس کی تعلیم کا ایک جاہلانہ اور متعصبانہ اندازہ کرنا ہے۔ جس کی نفی نہ صرف قرآن کی آیات بلکہ شارع علیہ الصلوۃ والسلام اور قرون اولی کے ان مسلمانوں کی زندگیاں کر رہی ہیں جن سے زیادہ شریعت کا رازدان اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ جبر و اختیار کے معمے کو معارف دستگاہ مولانائے

روم نے ان سادہ الفاظ میں حل کر دیا ہے۔

گفت پیغمبر بہ آواز بلند برتو کل زانوئے اشتر بہ بند

ہم کو اپنی طرف سے مقدور بھر کوشش کرنی چاہئے اور نتیجہ کے لئے اس لطیفہ غیبی کا منتظر رہنا چاہئے جو مثل بہ حکمت و پابند قانون غیر ممکن التغییر ہے۔ مترجم

لہ خدا کی شان وہ لوگ جو عربی کا ایک حرف تک نہیں جانتے جن کی کل معلومات قرآنی کا ماخذ وہ ذلیل لفظی ترجمے ہیں جو سیل جیسے متعصب اور نااہل پادریوں نے کئے ہیں اس بات کے مدعی ہوں کہ وہ قرآن کے حقیقی معانی کے سمجھنے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔

مصنف کا تو انتقال ہو چکا ہے اس لئے ہمارا روئے سخن ان کی طرف نہیں ہو سکتا البتہ جو لوگ ان کے ہم خیال ہیں ان کی خدمت میں ہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تحریف شدہ انجیل کی طرح قرآن نے اس قسم کا لغو دعوی کہیں نہیں کیا کہ زمین ایک سطح مربع ہے جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں یا یہ کہ زمین غیر متحرک ہے جس پر آسمان ٹکا ہوا ہے یا یہ کہ بہشت آسمان پر ہے اور سب سے اونچے آسمان پر خدا ایک انسان کی شکل میں تخت پر بیٹھا ہے جس کے دونوں طرف پر دار بیل کھڑے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے پہلے ہی دن مذہب اور سائنس کی حدود کو الگ الگ کر دیا تھا۔ رسول کے مبعوث ہونے کا منشا یہ تھا کہ لوگوں کو اخلاق حسنہ سکھائے اور ایک آنے والی زندگی کے حقائق سے آگاہ کرے نہ یہ کہ انہیں جغرافیہ و ہیئت اور فلسفہ و طب کا سبق دیتا پھرے۔ حضورؐ رسالت پناہ نے صاف صاف یہ فرما دیا ہے کہ انتم اعلم بامور دنیا کم۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جابجا ایسی آیات پائی جاتی ہیں جس میں آسمان زمین بہشت عرش کرسی کا ذکر ہے لیکن افلاینظرون الی الارض کیف سطحت سے یہ معنی لینا کہ زمین ایک سطح مربع ہے یا الم نجعل الجبال اوتادا" کی یہ تاویل کرنا کہ پہاڑ زمین میں میخوں کی طرح ٹھکے ہوئے ہیں اور اسے اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیتے۔ یا ثم استوی علی العرش کا یہ مفہوم سمجھنا کہ باری تعالیٰ باعتبار جہت و اشارہ و بلحاظ تحت وفوق سب سے اونچے آسمان پر تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ یا ماتری فی خلق الرحمن من تفاوت فارجع البصرھل تری من فطور کا یہ مطلب سمجھنا کہ آسمان ایک بلوریں گنبد ہے جو بغیر کسی درواز کے اپنی جگہ قائم ہے فن بلاغت کے اس اصول کی گردن پر الٹی چھری پھیرنا ہے جس میں خطابیات کے تفہیمی اثر کا راز چھپا ہوا ہے۔

علامہ شبلی "الکلام" میں تحریر فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ انبیا تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کے سوا اور قسم کے مباحث اور مسائل اور حقائق سے معترض نہیں ہوتے اور اس قسم کے امور کے متعلق کچھ بیان کرتے ہیں تو انہیں کی روایات اور خیالات کے مطابق اور اس میں بھی استعارات اور مجازات سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے

حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ انبیا کے اصول میں سے ایک یہ بات ہے کہ جو امور تہذیب نفس اور سیاست قوی سے تعلق نہیں رکھتے ان میں وہ دخل نہیں دیتے مثلاً" کائنات الجو یعنی بارش گہن ہالہ کے پیدا ہونے کے اسباب- نباتات اور حیوانات کے عجائبات- چاند سورج کی رفتار کی مقدار- حوادث یومیہ کے اسباب- انبیا سلاطین اور ممالک کے قصے وغیرہ- ان چیزوں سے وہ بحث نہیں کرتے- مگر ہاں چند معمولی باتیں جن سے لوگوں کے کان مانوس ہو چکے ہیں اور ان کی عقلوں نے باتوں کو قبول کر لیا ہے اور ان باتوں کو بھی وہ لوگ خدا کی شان اور قدرت کے ذکر میں ضمنی طور پر اجمالاً" بیان کرتے ہیں اور اس میں مجاز اور استعارہ سے کام لیتے ہیں اور اسی اصول کی بنیاد پر جب لوگوں نے آنحضرتؐ سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سبب پوچھا تو خدا نے اس کے جواب سے اعراض کیا اور اس کے بجائے مہینوں کا فائدہ بیان کر دیا چنانچہ فرمایا ویسئلونک عن الاھلتہ قل ھی مواقیت للناس والحج- اکثر لوگوں کا مذاق ان فنون (یعنی ریاضیات وغیرہ) کے اشتغال کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے تو یہ لوگ انبیا کے کلام کو خلاف حقیقت محمل پر محمول کرتے ہیں- مترجم

؎ کیا ڈاکٹر ڈریپر علی رغم آیہ کریمہ "قل رب زدنی علما" ہم کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام مانع اکتساب علم و حکمت تھا؟ کیا وہ اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کی تلوار نے مشرق و مغرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تو اس تحدی کا زور جو "وان کنتم فی ریب مماںزلنا علی عبدنا فاتو بسورۃ من مثلہ وادعو شھداء کم ان کنتم صادقین فان لم تفعلوا فلن تفعلونا تقوالنار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین" کے حرف حرف میں ساری دوایر تھی کم ہو گیا تھا؟ کیا ڈاکٹر ڈریپر حضرت علیؓ کی مداحی کا دم یہی سمجھ کر بھرتے ہیں کہ باوجودیکہ قرآن ادب و انشا اور حکمت و فلسفہ کا مزاحم تھا پھر بھی انہوں نے لوگوں کو ہر طرح کے علمی مشاغل کا شوق بطور خود دلایا؟ کیا ڈاکٹر ڈریپر کے ہم خیال قریباً" ساڑھے تیرہ سو سال کے گزرنے کے بعد بھی کوئی ایسی کتاب دکھا سکتے ہیں جو فصاحت و بلاغت میں قرآن کی ٹکر کی ہو؟ مترجم

؎ ایک یونانی الاصل ریاضی دان تھا جو چوتھی صدی عیسوی کے خاتمہ پر اسکندریہ میں پیدا ہوا- جبر و مقابلہ کے بعض ابتدائی مسائل کی دریافت اس سے منسوب کی جاتی ہے- اس کی قبر کی لوح پر چند اشعار بزبان یونانی کندہ تھے جو ہم تک پہنچے ہیں- ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ۳۳ سال کی عمر میں شادی ہوئی- اس کا بیٹا شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہو کر ۴۲ سال کی عمر میں اس سے چار سال پہلے مرگیا اور اس حساب سے اس کی عمر ۸۴ سال ہوئی- یہ اطلاع جبر و مقابلہ کی ایک شکل میں قلمبند کی گئی ہے- ارسماطیق (علم حساب) پر اس نے ایک کتاب تیرہ مقالوں میں لکھی تھی جس میں سے صرف چھ مقالے اس وقت موجود ہیں- مترجم

چوتھا باب

جنوب میں سائنس کا احیا

نسطوریوں اور یہودیوں کے اثر کی وجہ سے عرب اکتساب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قضاء قدر اور سرنوشت ازلی کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کائنات کی ہیئت ترکیبی کا ان کو صحیح صحیح علم ہو جاتا ہے۔ وہ زمین کی جسامتِ اور شکل کی تحقیق کرتے ہیں۔ ان کے خلفا عظیم الشان کتب خانوں کی بنا ڈالتے ہیں علوم و فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور رصدگاہیں قائم کرتے ہیں۔ وہ فن ریاضی کو ترقی دیتے ہیں الجبرا ایجاد کرتے ہیں اور فن ہندسہ و فن مثلث پر بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ فنون ریاضی و ہیئت کے متعلق قدیم یونانی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں اور ان کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ارسطو کے طریقہ استقرائے تام پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بہت سے دارالعلم قائم کرتے ہیں اور نسطوریوں کی مدد سے موجودہ وضع کے مدارس کھولتے ہیں۔ عربی سیاق و اعداد اور فن حساب کو رواج دیتے ہیں اور ستاروں کی فہرستیں مرتب کر کے ان کے نام رکھتے ہیں۔ موجودہ فنون ہیئت و کیمیا و طبیعات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فلاحت و صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دیتے ہیں۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کا قول ہے کہ میں نے اپنی طول طویل زندگی میں اکثر یہ بات دیکھی ہے کہ انسان عادات و خصائل میں اپنے آباؤ اجداد سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی اپنے ہمعصروں سے۔ رسول عربیؐ کے داماد کا یہ حکیمانہ مقولہ نہایت درست ہے اس لئے کہ گو کسی شخص کے جسمانی حلیہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فلاں نسل سے ہے لیکن اس

کی ترکیب دماغی اور اس لحاظ سے اس کے خیالات کا رجحان ان حوالی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے جن میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔

جب حضرت عمرؓ کے نائب عمرو بن العاص نے مصر کو فتح کر کے عربی سلطنت میں شامل کیا تو اسکندریہ میں اس کی ملاقات یوحنا عرف فلپونس ایک یونانی نحوی سے ہوئی۔ فلپونس ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی محنت پسند کے ہیں۔ رفتہ رفتہ عمرو اور یوحنا میں دوستی ہو گئی اور اس دوستی کے بھروسے پر محنت پسند نے عمرو سے درخواست کی کہ کتب خانہ اسکندریہ کی جو کتابیں حوادث جنگ۔ مرور ہور اور مذہبی تعصب کی پیہم دستبرد سے بچی بچائی باقی چلی آتی ہیں وہ اسے دے دی جائیں۔ عمرو نے اس بارہ میں خلیفہ سے استصواب کیا۔ وہاں سے یہ جواب آیا کہ اگر یہ کتابیں کلام الٰہی یعنی قرآن مجید سے مطابق ہیں تو ان کا رکھنا فضول ہے اور اگر نہیں مطابق ہیں تو ضرررساں ہیں لہٰذا انہیں ضائع کر دو۔ اس فرمان کی بنا پر سب کتابیں اسکندریہ کے حماموں میں تقسیم کر دی گئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے جلنے میں چھ مہینے کی مدت لگی۔

اگرچہ اس واقعہ سے انکار کیا گیا ہے لیکن اس میں مطلق شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم ضرور دیا۔ وہ نوشت و خواند سے عاری تھے ان کے چاروں طرف تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے یہ حکم دیا تو کون تعجب کی بات ہے۔ عمرؓ کے اس فعل نے گویا علیؓ کے قول کی تصدیق کر دی۔

لیکن یہ نہ قیاس کرنا چاہئے کہ وہ کتابیں جو یوحنا سے محنت پسند کو اس درجہ عزیز تھیں وہ کتابیں تھیں جو تاجداران سلسلہ بطلیموسیہ کے مشہور کتب خانہ یا یومینیز شاہ پرگنیس کے کتب خانہ کا سرمایہ افتخار تھیں۔ فلیڈلفس کو کتب خانہ قائم کئے ہوئے ایک ہزار سال کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اس کتب خانہ کی آدھی کتابیں تو جولیس سیزر نے جلا دی تھیں اور باقی اسکندریہ کے پادریوں نے اپنے اہتمام سے ضائع کرا دی تھیں۔ اور سینٹ نے صاف الفاظ میں جن کی کوئی دوسری تاویل نہیں ہو سکتی بیان کیا ہے کہ سینٹ سارل کا چچا تھیا فیلس جب شہنشاہ تھویڈوسیس سے کتب خانہ کی بربادی کا فرمان حاصل کر کے تمام کتابوں کو ضائع کر چکا تو اس کے بیس سال بعد اس نے کتابوں کی الماریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ سب کی سب خالی تھیں اور ان میں ایک کتاب باقی نہ تھی اور اگر بفرض محال یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ایسی وحشیانہ بربادی کے بعد بھی یہ عظیم الشان کتب خانہ بچ رہا تو ہزار سال کی فرسودگی اور شاید تصرف بیجا کے اثر کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تعداد کتب بہت ہی کم

رہ گئی ہو گی۔ اس کے علاوہ یوحنا کو اس کے عرف کی مناسبت سے مستعدی اور مشغولیت کا خواہ کیسا ہی بڑا تمغہ کیوں نہ عطا کیا جائے لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک اکیلے یوحنا کی محنت پسندی کیوں کر پانچ لاکھ کتابوں کی نگہداشت اور اہتمام سے عہدہ برآ ہو سکتی تھی اور کس طرح ایک ادنی درجہ کا غریب نحوی اس عظیم بالشان کتب خانہ کو قائم رکھنے اور چلانے کے مصارف کا متکفل ہو سکتا تھا جس پر بطلیموسیوں کے شاہانہ محاصل کا ایک بیش قرار حصہ صرف ہوا کرتا تھا۔ کتب خانہ کے جلنے کی جو مدت بتائی گئی ہے اس سے بھی کتابوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جھلی کے کاغذ سے زیادہ برے ایندھن کا ہونا ممکن نہیں۔ کاغذ اور پپٹیلا اگرچہ اچھی طرح جل سکتا ہے۔ لیکن ان کتابوں میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جو جھلی پر لکھی ہوئی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکندریہ کے حمامیوں نے دوسرا ایندھن چھوڑ کر چرمی اوراق جلانے پسند کیے ہوں جن کی آنچ جیسی تیز ہو سکتی ہے وہ تو ظاہر ہے البتہ چراند کے ہر طرف پھیل جانے میں کچھ شک نہ تھا۔

پس اس میں شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یا تو یہ سمجھ کر کہ کتابیں کسی مصرف کی نہیں اور یا اس خیال سے کہ ان کے پڑھنے سے لوگ بداعتقاد ہو جائیں گے اس کتب خانہ کے جلانے کا حکم ضرور دیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حروب صلیبیہ کے دوران میں بھی پیش آیا جب کہ عیسائی مجاہدوں نے کتب خانہ طرابلس کو جس کے نسخوں کی تعداد ازراہ مبالغہ تیس لاکھ بیان کی گئی ہے آگ لگا دی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب عیسائی کتب خانہ طرابلس کے پہلے کمرہ میں داخل ہوئے تو انہیں بجز قرآن کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس سے انہوں نے قیاس کر کے کہ باقی کتابیں بھی آن حضرتؐ ہی کی تصانیف ہوں گی تمام کتب خانہ کو آگ میں جھونک دیا۔ ان دونوں قصوں میں کس قدر اصلیت اور بہت کچھ مبالغہ ہے۔ لیکن مجنونانہ تعصب نے ہمیشہ اس قسم کی حرکتوں سے اپنا نام کیا ہے۔ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے جب میکسیکو پر حملہ کیا تو ڈھیر کے ڈھیر ان کتابوں کے جن میں امریکہ کے قدیم تمدن کی داستان بخط تصویر محفوظ تھی کمال وحشیانہ پن سے جلا دئے اور یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی زمانہ نہیں کر سکتا۔ ہسپانیہ کے ایک متعصب پادری زمینز نے غرناطہ کے چوک میں عربی زبان کے اسی ہزار قلمی نسخوں کا ڈھیر لگا کر آگ لگا دی۔ ان میں سے بہت سے نسخے مشاہیر مصنفین زمانہ قدیم کی تصانیف کے عربی تراجم تھے۔

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اسکندر کی ایرانی فتوحات نے فن انجنیری کے متعلق یونانیوں کی قابلیت کو ترقی دے کر فرمانروایان سلسلہ بطلموسیہ کی سرپرستی میں سائنس کے

نشوونما میں حیرت انگیز حصہ لیا۔ یہاں ہم تاریخ کے سبق کو دہرا کر یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عربوں کے فوجی کارناموں سے بھی اسی طرح کے نتائج مترتب ہوئے۔

فاتح مصر عمرو بن العاص اور یوحنا نامی نحوی کی باہمی دوستی صاف ظاہر کرتی ہے کہ عربی دماغ ترقی کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ کعبہ کی بت پرستی سے محمد صلعم کی وحدانیت تک پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ادب و انشا اور فلسفہ و حکمت کے بہارستان کی سیر کے لئے تیار پایا۔ عربوں کی اس ترقی کے اسباب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو دو اثرات نمایاں نظر آتے ہیں یعنی ۱۔ شام میں نسطوریوں کا اثر اور ۲۔ مصر میں یہودیوں کا اثر۔

گذشتہ باب میں ہم نے ان سختیوں کا ذکر کیا ہے جو نسطور اور اس کے پیرووں کو مخالفین کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑیں۔ اگرچہ ان کو طرح طرح کے عذاب دئے گئے اور ان میں سے بہت سے مارے گئے لیکن وحدت باری تعالےٰ کے اصول سے انہوں نے کبھی منہ نہ موڑا۔ اولمپس کے دیوتاؤں اور دیبیوں سے انہوں نے ہمیشہ نہایت سختی کے ساتھ اور قطعی طور پر اباکیا۔ ان کا قول ہے کہ "آسمان کی ملکہ کو ہمارا دور ہی سے سلام ہے۔"

ان خاص مقاصد کی وجہ سے نسطوریوں کو اپنے عرب فاتحوں کے ساتھ مل جانے میں کچھ بھی دقت پیش نہ آئی۔ مسلمان ان کا حد سے زیادہ ادب و احترام کرتے تھے اور سلطنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر انہیں نہایت فراخدلی سے مقرر کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنی امت کو بہ تقید تمام ہدایت کی ہے کہ ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ نسطوریوں کے اسقف اعظم جسویاس کے ساتھ خود آنحضرتؐ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے معاہدے کئے اور آگے چل کر خلیفہ ہارون الرشید نے اپنی سلطنت کے تمام مدارس کا ناظم ایک نسطوری المذہب عالم مبان ماس کو مقرر کیا۔

نسطوریوں کے اثر کے ساتھ یہودیوں کا اثر بھی شامل ہو گیا۔ جب عیسائیت میں بت پرستی کی آمیزش کے آثار شروع ہوئے تو یہودیوں نے مذہب عیسوی میں داخل ہونا ترک کر دیا۔ اور جب عیسائیت میں اقانیم ثلثہ کا عمل ہوا تو یہ مذہبی تبدیلی مطلقاً" موقوف ہو گئی۔ مصر اور شام کے شہروں میں یہودی کثرت سے آباد تھے۔ ایک فقط اسکندریہ ہی میں جب عمرو بن العاص نے اسے فتح کیا ہے چالیس ہزار یہودی ایسے تھے جو حکومت کو خراج ادا کرتے تھے۔ صدیوں تک وقف مظالم و مصائب رہنے کی وجہ سے وہ اپنے عقیدہ وحدت ذات باری میں اور زیادہ راسخ ہو گئے تھے اور بت پرستی کی طرف سے اس قلبی نفرت کا اشتداد اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا جسے وہ اپنے سینہ میں بابل کی اسیری کے زمانہ سے امانت کے

طور پر جگہ دیئے چلے آتے تھے۔ نسطوریوں کے ساتھ شریک ہو کر انہوں نے فلسفہ کی بہت سی یونانی و لاطینی کتابوں کا شامی زبان میں ترجمہ کیا اور اس شامی ترجمہ کا پھر عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان دونوں فرقوں کو اسلامی تمدن کے ساتھ دو مختلف حیثیتوں کا تعلق رہا۔ نسطوریوں نے مسلمان امراء کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ لیا اور یہودی طبیب بن کر ان گھرانوں تک پہنچے۔

ان اثرات سے مسلمانوں کا تعصب کم ہو چلا۔ ان کے اخلاق پسندیدہ ہو گئے ان کے خیالات میں شستگی آگئی۔ جس سرعت سے انہوں نے دولت روما کے صوبوں کو تاخت و تاراج کر ڈالا تھا اسی سرعت سے فلسفہ اور سائنس کی مملکتوں کو مسخر کر لیا اور اسلام کی عامیانہ غلطیوں کو چھوڑ کر سائنس کی حقیقتوں کو تسلیم کر لیا۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں چاروں طرف بت ہی بت بج رہے تھے عربوں کی تلوار خدائے ذوالجلال کے توحد کی حمایت میں چمکی اور تعدد کو مٹا کر رہی۔ اس کامیابی کا سہرا تقدیر کے اس مسئلہ کے سر رہا جس کی تلقین قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے: "کوئی شخص اپنے مقدر کو ٹال نہیں سکتا۔ تقدیر کی ساعت نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔ اگر ہم بروج مشیدہ میں بھی محفوظ ہوں تو موت سے نہیں بچ سکتے۔ خدا نے ہر شخص کی موت کا مقام ازل سے مقرر کر رکھا ہے۔" رسول اللہؐ کا قول ہے کہ "کوئی شخص بھاگ کر اپنی تقدیر سے بچ نہیں سکتا۔ شہسواران قضا و قدر رات کے وقت اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے ہیں----- خواہ تم بستر پر سوتے ہو خواہ میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہو ملک الموت کی آنکھ سے نہیں بچ سکتے۔" حضرت علیؓ جن کی دانش و حکمت کا ذکر ہم پیشتر کر چکے ہیں کہتے ہیں کہ "مجھے یقین ہے کہ معاملات انسانی میں ہمارے انتظام کو دخل نہیں بلکہ خدا کے فیصلہ کو دخل ہے۔" غرض مسلمان وہ ہیں جو راضی برضائے الٰہی ہو کر خدا کے آگے گردن تسلیم جھکا دیں۔ وہ جبر و اختیار میں یہ کہہ کر توافق پیدا کرتے ہیں کہ نقاش قضا نے ہمیں خاکہ کھینچ کر دے دیا ہے اس میں رنگ آمیزی ہم اپنے اختیار اور مرضی سے کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ قوانین قدرت پر غالب آنے کے لئے ہمیں ان کا مقابلہ نہیں بلکہ موازنہ کرنا چاہئے۔

اس مہیب عقیدے نے مسلمانوں کو ان کارہائے نمایاں کے لئے تیار کر دیا جو بظاہر انسانی کوشش کی رسائی سے باہر تھی لیکن جن کو عربوں نے انجام دے کر دکھا دیا۔ اسی عقیدے نے مایوسی کو مبدل بہ رضا و تسلیم کر کے انسان کو امید سے مستغنی ہونا سکھا دیا۔

عربوں میں ایک مثل تھی کہ مایوسی حر ہے اور امید عبد۔

لیکن جنگ میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے صاف طور سے ثابت کر دیا کہ تقدیر ایک بڑی حد تک تابع تدبیر ہے۔ تجربہ سے عربوں کو معلوم ہو گیا کہ دوا سے درد کم ہو سکتا ہے مرہم پٹی کرنے سے زخم بھر سکتا ہے اور جو شخص دم توڑ رہا ہو اور بظاہر اس کے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو طبیب کی مسیحائی سے گویا ازسرنو زندہ ہو سکتا ہے۔ اطبائے یہود قرآن کے مسئلہ تقدیر کی تردید کی زندہ مثال بن گئے۔ رفتہ رفتہ قسمت اور تقدیر کے مسئلہ کی سختی کم ہو گئی اور عام طور پر یہ بات تسلیم کی جانے لگی کہ انفرادی حیثیت سے انسان کے افعال کے نتائج معلل بہ اختیار ہوتے ہیں اور خاص خاص حدود کے اندر جو افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں ان کی ذمہ دار خود اسی کا ارادہ یا مرضی ہوتی ہے۔ لیکن اقوام چونکہ ذاتی یا شخصی طور پر خدا کے آگے اپنے افعال کی جواب دہ نہیں ٹھہر سکتیں بلکہ ان کی اجتماعی حیثیت خدا کے بلاواسطہ احتساب سے بالا ہے لہٰذا وہ قدرت کے غیر تغیرپذیر قانون کے تابع ہیں۔

اس بارہ خاص میں مسیحی اور مسلم اقوام میں بین فرق تھا۔ مسیحی کو معاملات انسانی میں خدا کی مسلسل دست اندازی پر پورا ایمان تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ انتظام کائنات میں قائدہ قانون کوئی چیز نہیں۔ دعاؤں اور التجاؤں سے انسان خدا کو صورت معاملات کے بدلنے پر آمادہ کر سکتا ہے اور اگر خدا کی بارگاہ میں اس کی دعا مقبول نہ ہو تو پھر مسیح یا مریم کی توجہ اس کی مطلب برآری کے لئے کافی ہے اور اگر یہاں سے بھی وہ محروم رہا تو پھر بزرگان دین کی شفاعت یا ان کے تبرکات اور ہڈیوں کا اثر مشیت ایزدی کا ردعمل کر سکتا ہے۔ اگر خود اس کی منت و سماجت یا عجز و الحاح سے کام نہ چلے تو حلقہ کے پادری یا کلیسا کے دوسرے مقدس پیشواؤں کی سفارش خصوصاً" ایسی حالت میں جب کہ اس کی طرف سے کوئی چڑھاوا چڑھایا گیا ہو یا بندھی رقم بطور نذرانہ پیش کی گئی ہو اس کی حاجت روائی کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ غرض مسیحی دنیا کو یقین تھا کہ فوق الانسان ہستیوں پر اثر ڈال کر وہ معاملات دنیوی کے دھارے کو جس رخ میں چاہے بدل سکتی ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کا دارومدار اس اصول پر تھا کہ خدائی مشیت قابل تغیر نہیں ہے انسان کو لازم ہے کہ اس کے آگے تسلیم و رضا کا سر جھکا دے۔ عیسائی کی دعا آلہ جلب منفعت ہوتی تھی جس کے ذریعہ سے وہ بعد عجز و الحاح خدا سے اپنی مرادیں مانگتا تھا اور مسلمان کی دعا ان نعمتوں کا امتنان آمیز شکریہ ہوتی تھی جن سے وہ فائز و بہرہ اندوز ہو چکا تھا۔ دونوں نے گویا دعا کو ہندوؤں

کے گیان اور دھیان کا قائم مقام قرار دے رکھا تھا۔ عیسائی کی نظروں میں ترقی دنیا غیر مربوط حادثوں اور ناگہانی حیرتوں کا ایک سلسلہ تھی۔ مسلمان کے نزدیک اس ترقی میں کچھ اور ہی عالم نظر آتا تھا۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ہر جسمانی حرکت کسی حرکت سابقہ سے وابستہ ہے۔ ہر خیال کسی خیال ماسبق کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ہر تاریخی واقعہ کسی گذشتہ تاریخی واقعہ سے ماخوذ ہے۔ ہر انسانی فعل کسی گذرے ہوئے اور انجام پائے ہوئے فعل کا نتیجہ ہے۔ بنی نوع انسان کی تاریخ میں جو قرنہا قران پر محیط ہے آج تک ایک بھی واقعہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو یکایک ظہور میں آگیا ہو۔ علت و معلول اور سبب و مسبب کے سلسلہ کی ہر کڑی دوسری کڑی سے اس ترتیب و تدریج کے ساتھ ملی ہوئی ہے کہ کہیں فصل نظر نہیں آتا۔ مقدر ایک آہنی زنجیر ہے جس کے حلقے واقعات ہیں۔ ہر حلقہ اسی جگہ نصب ہے جہاں حد و تضاد و قدر نے اسے قائم کر دیا تھا۔ ایک حلقہ بھی اپنی جگہ سے آج تک نہ ہلا ہے اور نہ علیحدہ کیا گیا ہے۔ جب انسان عالم میں آتا ہے تو اسے اس کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ جب وہ یہاں سے رخصت ہو گا تو شاید اپنی مرضی کے خلاف رخصت ہو گا۔ پس کیا وجہ ہے کہ وہ جامہ تسلیم و رضا پہن کر نہایت ٹھنڈے دل سے اپنی قسمت کے فیصلہ کا انتظار نہ کرے۔

انسان کی شخصی زندگی کے تابع مقدر ہونے کے متعلق جب خیالات میں یہ تبدیلی پیدا ہوئے تو دنیا کی ہیت ترکیبی کے بارہ میں بھی خیالات نے پلٹا کھایا۔ قرآن کی رو سے زمین ایک سطح مربع ہے جس کے کناروں پر بڑے بڑے پہاڑ واقع ہیں اور ان پہاڑوں کا یہ دہرا فائدہ ہے کہ ایک تو ان کی وجہ سے زمین اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور دوسرے آسمان ان پر ٹکا ہوا ہے۔ اس وسیع بلوریں گنبد کو جو بغیر کسی فتور یا صدمہ کے اپنی جگہ قائم ہے دیکھ کر ہمیں خدا کی طاقت و حکمت کے لحاظ سے اس کی حمد و ثنا کرنی چاہیئے۔ آسمان کے اوپر بہشت کی بنیاد ہے جس کی سات منزلیں ہیں۔ سب سے اونچی منزل خدا کا مسکن ہے جہاں وہ دیوپیکر انسان کی شکل میں ایک تخت پر بیٹھا ہے اور اس تخت کے دونوں طرف اسی طرح کی ذوالجناح بیل ہیں جیسے قدیم سریانی بادشاہوں کے محل میں ہوتے تھے۔[1]

یہ خیالات کچھ اسلام ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ ہر قوم نے اپنے دماغی نشوونما کے ایک خاص درجہ پر پہنچ کر انہیں وحی آسمانی سمجھا ہے۔ لیکن جو مسلمان زیادہ ترقی یافتہ تھے انہوں نے ان کے بجائے وہ خیالات قائم کر لئے جو ازروئے سائنس درست و صحیح تھے۔ پھر بھی عیسائی ممالک کی طرح اسلامی ملکوں میں بھی حامیان مذہب کی مخالفت کے بغیر یہ ترقی نہ ہو سکی۔ مثلاً جب المامون کو زمین کا کروی الشکل ہونا معلوم ہوا اور اس نے اپنے

مہندسوں اور ہیئت دانوں کو ایک درجہ ارضی کی پیائش کا حکم یا تو علامہ تقی الدین نے جو اس زمانہ کے مشاہیر علمائے دین میں تھے خلیفہ کے اس فعل کو بدعت قرار دے کر ظاہر کیا کہ مسلمانوں کو ایک جھوٹے اور مشرکانہ فلسفہ کی اشاعت سے گمراہ کرنے کی پاداش میں خدا یقیناً" المامون پر عذاب نازل کرے گا۔ لیکن المامون نے اس فتوے کی کچھ پروا نہ کی اور اپنے حکم کی تعمیل کرا ہی کر رہا۔ بحیرہ قلزم کے ساحل پر شنار کا میدان اس پیائش کے لئے تجویز کیا گیا۔ ایک اصطرلاب کی مدد سے دو مقامات پر جو ایک ہی خط نصف النہار پر واقع تھے اور جن کا باہمی فاصلہ پورا ایک درجہ تھا افق سے قطب کے ارتفاع کا اندازہ قائم کیا گیا۔ ان دونوں مقامات کے درمیانی فاصلہ کی جب پیائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ دو لاکھ ہاشمی گز ہے۔ اس حساب سے گویا کل زمین کا دور چوبیس ہزار انگریزی میل ہوا جو صحت سے بہت زیادہ دور نہیں۔ چونکہ زمین کی کرویت اس قسم کی ایک ہی پیائش سے قطعی طور پر مستنبط نہ ہو سکتی تھی لہٰذا خلیفہ نے حکم دیا کہ ایک درجہ کی پیائش کوفہ کے قریب کی جائے۔ شاہی مہندس دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک نقطہ سے مخالف سمتوں میں روانہ ہو کر ایک جماعت نے بجانب شمال اور دوسری نے بجانب جنوب ایک درجہ ارضی کے قوس کی پیائش کی۔ اس پیائش کا نتیجہ گزوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر یہ گز وہی ہیں جو ہاشمی یا شاہی گز کے نام سے مشہور ہیں تو ایک درجہ کے طول کی صحیح مقدار میں اور اس مقدار میں جو انہیں معلوم ہوئی صرف ۳ء۱ میل کا فرق ہے۔ ان پیائشوں سے خلیفہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین کا کروی الشکل ہونا مسلم ہے۔

ہمیں رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ عربوں کا وحشیانہ تعصب کیوں کر اس قدر جلد تحصیل علوم و فنون کی زبردست خواہش کی شکل میں بدل گیا۔ اول اول قرآن ادب و انشا اور حکمت و فلسفہ کا مزاحم تھا۔ آنحضرتؐ نے اسے تمام تصانیف کا گل سرسبد ظاہر کر کے اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت کو اپنی مامور من اللہی کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد بیس سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گذرا تھا کہ وہ تجربہ جو مسلمانوں کو شام ایران ایشیائے کوچک اور مصر میں حاصل ہوا اپنا رنگ لایا اور یہ واقعہ مسلم ہے کہ حضرت علیؓ نے جو اس وقت سریر آرائے خلافت تھے ہر طرح کے علمی مشاغل کا لوگوں کو خود شوق دلایا۔ امیر معاویہ نے جو بانی خاندان بنو امیہ ہیں ۶۶۱ء میں برسراقتدار ہوتے ہی آئین حکومت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ پہلے حکومت انتخابی تھی اب موروثی ہو گئی۔ انہوں نے مدینہ کے بجائے دمشق کو جس کا موقع زیادہ مرکزی تھا دارالخلافہ بنایا اور عیش و عشرت اور

شان و شوکت کی زندگی اختیار کی۔ انہوں نے استداد تعصب کے سلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور علوم و فنون کی سرپرستی شروع کی۔ یہ حیرت انگیز انقلاب تیس سال کے اندر اندر پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایک ایرانی گورنر جب دربار خلافت میں آداب بجا لانے کو حاضر ہوا تو اس نے امیرالمومنین کو مسجد نبوی کی سیڑھیوں پر فقیروں کے ساتھ سوئے ہوئے پایا لیکن چھٹے خلیفہ امیر معاویہ کے دربار میں دول غیر کے جو سفیر باریاب ہوئے وہ خلیفہ کے روبرو ایک عالیشان محل میں پیش کئے گئے جو نقش و نگار سے مزین اور چمنوں اور فواروں سے آراستہ تھا۔

آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد پوری ایک صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ مشاہیر حکمائے یونان کی تصانیف کا ترجمہ عربی زبان میں ہو گیا اور "الیڈ" اور "آڈیسی" جیسی نظموں کو جو بوجہ اپنی بت پرستانہ تلمیحات کے موجب گمراہی تصور کی جاتی تھیں علم دوست اور ہنر پرور لوگوں کے شوق نے شاہی زبان کا لباس پہنا دیا۔ المنصور نے اپنے عہد خلافت ۷۷۵-۷۵۳ء میں حکومت کا مرکز دمشق سے بغداد میں منتقل کیا اور نئے دارالخلافہ کو عروس البلاد بنا دیا۔ اس کا بہت سا وقت علم ہیئت کے مطالعہ اور اس فن شریف کے ترقی دینے میں صرف ہوتا تھا اس کے علاوہ اس نے سلطنت میں جابجا طب اور قانون کے مدارس قائم کئے۔ اس کا پوتا ہارون الرشید ۷۸۶ء بھی اسی کے نقش قدم پر چلا چنانچہ اس کے حکم سے دولت عباسیہ کی ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ لیکن علم و حکمت کا سب سے زیادہ روشن زمانہ جو ایشیا کے لئے سرمایہ صد افتخار و نازش ہے المامون کا عہد خلافت ہے ۸۳۲-۸۱۳ء اس نے بغداد کو سائنس کا مرکز بنا دیا۔ عظیم الشان کتب خانے قائم کئے اور اپنے دربار کو علما و فضلا کی مجلس بنا دیا۔

یہ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق اس وقت تک بھی بدستور قائم رہا جب کہ اندرونی تنازعات و فسادات کی وجہ سے عربی سلطنت تین جداگانہ حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بنی عباس ایشیا میں بنی فاطمہ مصر میں اور بنی امیہ اندلس میں ایک دوسرے کے سیاسی رقیب تو تھے ہی لیکن علم و حکمت اور ادب و انشا کی سرپرستی میں بھی ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ دوسروں پر فوق لے جائے۔

شعر و سخن میں عربوں نے ہر دلچسپ و نتیجہ خیز مضمون پر کتابیں لکھیں۔ ان کو اس امر پر ناز تھا کہ ایک اکیلے عرب نے جس قدر شاعر پیدا کئے ہیں وہ تعداد میں دنیا بھر کے شاعروں سے زیادہ ہیں۔ سائنس میں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اکتساب

میں انہوں نے یورپ کے یونانیوں کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ اسکندریہ کے یونانیوں کی روش کا اتباع کیا۔ ان کی عقل سلیم نے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ سائنس کی ترقی محض تخیل ہی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس ترقی کا صحیح اور یقین ذریعہ صحیفہ فطرت کا عینی مطالعہ ہے۔ وہ حکمت نظری پر حکمت عملی کو ترجیح دیتے تھے یعنی ان کے علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر تھی۔ فن ہندسہ و ریاضیات کو وہ استدلال و استنباط کے آلات تصور کرتے تھے۔ فن جرثقیل۔ توازن ایعات۔ فن مناظرو مرایا پر جو کثیرالتعداد کتابیں انہوں نے لکھی ہیں ان میں یہ دلچسپ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ہر مسئلہ کسی تجربہ یا کسی آلہ مشاہدہ کے ذریعہ سے حل کیا گیا ہے۔ یہی خصوصیت تھی جس نے ان کو فن کیمیا کا موجد بنا دیا جس نے ان سے تقطیر (عرق کھینچنے) تصعید (بخار اڑا کر منجمد کرنے) تسیخ (پگھلانے) اور ترویق (چھاننے) کے آلات ایجاد کرائے۔ جس نے فن ہیئت میں ان کو آلات منقسمہ مثلاً" لبنہ و اصطرلاب سے کام لینے کی ترغیب دلائی۔ جس نے فن کیمیا میں ان سے ترازو کا استعمال کرایا جس کے اصول سے وہ بخوبی واقف تھے۔ جس نے ان سے بغداد اندلس اور سمرقند میں اجسام کے اوزان کی میزانیں اور ہیئت کے نقشے تیار کرائے۔ جس نے ان کو علم ہندسہ۔ علم مثلث۔ علم جبرومقابلہ اور ہندی طریقہ اعداد نویسی میں نئے نئے نکتے پیدا کرنے کے قابل بنایا۔ یہ وہ نتائج ہیں جو ارسطو کے عملی و استقرائی طریقہ کو افلاطون کی خیال آرائی پر ترجیح دینے کی بدولت ان کی کوششوں نے پیدا کئے۔

کتب خانجات عامہ کے قیام و توسیع کے لئے کتابوں کے جمع کرنے میں نہایت اہتمام کیا جاتا تھا۔ خلیفہ مامون عباسی کی نسبت روایت ہے کہ اس کی کوششوں سے صدہا اونٹ جو قلمی کتابوں کے پشتاروں سے لدے ہوئے تھے بغداد میں داخل ہوئے۔ جو معاہدہ اس نے یونانی فرمانروا میکائل ثالث کے ساتھ کیا تھا اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ کا ایک کتب خانہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جو علمی خزانے اس طرح المامون کے ہاتھ آئے ان میں بطلیموس کی اس مشہور تصنیف کا ایک نسخہ بھی تھا جو اس نے سیار و ثوابت کی مہندسانہ ساخت پر لکھی تھی۔ اس کا ترجمہ خلیفہ کے حکم سے فورا" عربی زبان میں کیا گیا اور ترجمہ کا نام المجسطی رکھا گیا۔ جو کتابیں اس طور پر جمع کی گئیں۔ ان کی کثرت تعداد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاہرہ کے کتب خانہ فاطمیہ میں ایک لاکھ نسخے جن کا خط نہایت پاکیزہ اور جلدیں نہایت خوشنما تھیں موجود تھے۔ ان میں سے چھ ہزار پانچ سو نسخے فقط ہیئت اور طب پر تھے۔ اس کتب خانہ کے قواعد کے بموجب ان طالب العلموں کو جو قاہرہ

میں سکونت پذیر تھے کتابیں مستعار مل سکتی تھیں۔ کتب خانہ میں زمین کے دو کرے بھی تھے۔ ایک تو ٹھوس چاندی کا تھا۔ دوسرا پیتل کا تھا۔ پیتل کے کرے کی نسبت مشہور تھا کہ اسے بطلیموس نے بنایا تھا۔ چاندی کے کرے پر تین ہزار دینار لاگت آئی تھی۔ خلفائے اندلس کے عظیم الشان کتب خانہ کے نسخوں کی تعداد رفتہ رفتہ چھ لاکھ ہو گئی۔ اس کی فہرست ہی چوالیس کتابوں پر مشتمل تھی۔ اس شاہی کتب خانہ خاص کے علاوہ اندلس میں ستر سرکاری کتب خانے ایسے تھے جن میں ہر شخص جا کر اپنی معلومات بڑھا سکتا تھا۔ خاص خاص اشخاص کے پاس بعض دفعہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہوتا تھا۔ ایک طبیب کی نسبت روایت مشہور ہے کہ جب سلطان بخارا نے اسے بلا بھیجا تو اس نے وہاں جانے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اس کی کتابوں کی باربرداری کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت تھی۔

ہر بڑے کتب خانہ میں ایک سررشتہ نقل اور ترجمہ کا ہوتا تھا۔ تراجم بھی بسا اوقات بعض اشخاص اپنے ذاتی اہتمام سے مرتب کراتے تھے۔ چنانچہ ایک نسطوری طبیب حنین نامی نے اس قسم کا ایک دفتر بغداد میں قائم کر رکھا تھا ۸۵۰ء۔ یہ محض ارسطو افلاطون بقراط جالینوس اور دوسرے مشاہیر یونان کی تصانیف کے تراجم شائع کرتا تھا۔ تراجم کے علاوہ جدید تصانیف کا بازار بھی ہر طرف گرم تھا۔ تصنیف کا طریقہ یہ تھا کہ دارالعلموں کے حکام اساتذہ کو مقررہ موضوع پر کتابیں لکھنے کے لئے مامور کرتے تھے۔ ہر خلیفہ کے دربار کا وقائع نویس علیحدہ ہوتا تھا۔ قصص و حکایات کے متعلق الف لیلہ جیسی کتابوں کا وجود عربوں کی قوت متخیلہ کا پتہ دیتا ہے۔ قصوں اور افسانوں کے علاوہ انواع و اقسام کے دوسرے مضامین پر بھی کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں مثلاً" تاریخ۔ اصول فقہ۔ سیاست۔ فلسفہ و سیر۔ سوانح عمریاں نہ صرف جلیل القدر اشخاص بلکہ مشہور گھوڑوں اور اونٹوں تک کی لکھی جاتی تھیں۔ کتابوں کی اشاعت میں کسی قسم کی مزاحمت یا ممانعت من جانب حکومت نہ ہوتی تھی اور نہ ان کے مضامین میں مصلحت عامہ کے بہانے سے کسی قسم کی حک و اصلاح کی جاتی تھی۔ البتہ اخیر اخیر میں دینیات کی کتابوں کی اشاعت کے لئے مصنفوں کو سرکاری اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ واقفیت عامہ کے متعلق علمی حوالجات کی کتابیں کثرت سے لکھی گئیں۔ جغرافیہ۔ شمار و اعداد۔ طب۔ تاریخ غرض ہر مضمون کی ایک جامع لغات موجود ہو گئی یہاں تک کہ ان کے ملخصات بھی تیار کر لئے گئے۔ چنانچہ محمد ابو عبداللہ کی تصنیف "دائرۃ المعارف" اس صنعت کی ایک ممتاز مثال ہے۔ کتابوں میں جو کاغذ لگایا جاتا تھا اس کی صفائی اور سفیدی کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا۔ رنگا رنگ روشنائیوں کی تیاری

میں بہت کچھ اہتمام کیا جاتا تھا اور کتابوں کے عنوان کو مطلا و مذہب کرنے اور ان کو طرح طرح کے نقش و نگار سے زینت دینے میں نہایت دیدہ ریزی و ہنر آفرینی اور کمال خوش سلیقگی کا ثبوت دیا جاتا تھا۔

غرض دنیائے اسلام میں علوم و فنون کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ منگولیا۔ ساتار۔ ایران۔ عراق۔ شام۔ مصر۔ شمالی افریقہ۔ مراکش۔ فیض اور اندلس میں کثرت سے مدرسے اور درسگاہیں موجود تھیں۔ دولت روما کا رقبہ باآن ہمہ عظمت و جبروت اتنا نہ تھا جتنا اس عربی سلطنت کا۔ اس عظیم الشان سلطنت کے ایک کنارہ پر تو سمرقند کا مشہور مدرسہ اور رصدگاہ تھی اور دوسرے کنارے پر اندلس کا شہرہ آفاق مینارہ ترصد آسمان سے ہم کلام تھا۔ مسلمانوں کی اس سرپرستی علوم و فنون کا ذکر کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے: "صوبوں کے خودمختار امیر بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں شاہانہ اقتدارات برتتے تھے اور ان کی رقیبانہ مسابقت نے مذاق علمی کی ترویج میں غیرمعمولی حصہ لے کر سائنس کے نور کو سمرقند و بخارا سے لے کر فیض اور قرطبہ تک پھیلا دیا۔ ایک سلطان کے وزیر نے ایک دفعہ ایک لاکھ اشرفیاں اس غرض سے وقف کر دیں کہ اس سرمایہ سے بغداد میں ایک کالج قائم کیا جائے اور اس کالج کے مصارف کے لئے پندرہ ہزار دینار سالانہ کا دوامی عطیہ مقرر کر دیا۔ تعلیم کے فیضان سے عوام و خواص کو یکساں بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔ وزیر کا بیٹا اور ایک ادنی درجہ کے موچی کا بیٹا پہلو بہ پہلو بیٹھ کر استاد سے سبق لیتے تھے۔ طالب العلموں کی تعداد ایک ایک دارالعلم میں چھ چھ ہزار تک پہنچی ہوئی تھی۔ جن کی جماعتوں کو باوقات مختلف تعلیم دی جاتی تھی۔ نادار طلبہ کے لئے معقول وظائف مقرر تھے اور اساتذہ کو بیش قرار تنخواہیں ملتی تھیں۔ ہر شہر میں عربی زبان کی نادر تصنیفات کے نقل اور جمع کرنے کے لئے طالبان علم کا شوق اور اہل دول کا نمود ہر وقت سرگرمی سے مصروف تھا۔" ان مدارس و مکاتب کی نگرانی فراخ حوصلگی کے اقتضا سے بعض دفعہ نسطوریوں اور بعض دفعہ یہودیوں کے سپرد کی جاتی تھی۔ کسی شخص کو کسی خدمت جلیلہ پر سرافراز کرتے وقت حکومت کو یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے مذہبی عقائد کیا ہیں بلکہ محض اس کی علمی قابلیت کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ "خیر الناس من ینفع الناس" کے اصول کو پیش نظر رکھ کر خلیفہ اعظم المامون نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "اہل علم و فضل خدا کے برگزیدہ اور بہترین بندے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اپنے قوائے عقلی و ادارکی کی ترقی کے لئے وقف رکھی ہے۔ وہ اپنے ابنائے جنس کو حکمت و دانش کے نکتے سکھاتے ہیں اس لئے وہ

نظام دنیا کے شیرازہ بند اور محفل کون و فساد کی شمع ہیں۔ اگر ان کی ہدایت چراغ راہ نہ ہو تو اہل دنیا پر اسی جہالت اور وحشیانہ پن کی ظلمت پھر چھا جائے جو پہلے چھائی ہوئی تھی۔"

مدرسہ طبیہ قاہرہ کے طرز عمل کی تقلید نے دوسرے طبی مدارس میں بھی یہ قاعدہ جاری کرا دیا کہ زمانہ تعلیم کے اختتام پر طلبہ کا نہایت سختی کے ساتھ امتحان لیا جائے۔ اور کامیاب ہونے پر انہیں مطب کرنے کی سند دی جائے۔ یورپ کا پہلا طبی مدرسہ وہ تھا جسے عربوں نے اٹلی کے شہر سلرنو میں قائم کیا اور پہلی رصدگاہ جو یورپ کو نصیب ہوئی وہ تھی جو اموی خلفا کی سرپرستی میں بمقام اشبیلیہ (اسپین) قائم ہوئی۔

اگر ہم اس مہتمم بالشان علمی تحریک کی جزئیات سے بحث کریں تو اس کتاب کا حجم حد سے زیادہ بڑھ جائے گا۔ لہٰذا ہم صرف اس اجمال پر اکتفا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے قدیم علوم و فنون مین بہت کچھ اضافے کئے اور نئے نئے علوم ایجاد کئے۔ انہوں نے حساب کے ہندی طریقہ کو رواج دیا جس میں تمام رقوم نہایت خوبصورتی کے ساتھ دس اعداد کے ذریعہ سے اس طرح ظاہر کی جاتی ہیں کہ ہر عدد کی اول تو ایک قیمت مطلق مقرر کر دی گئی ہے اور اس کے بعد ایک قیمت اعتبار ہے جو بلحاظ موقع یا مرتبہ پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ہر طرح کے اندازے کے لئے سہل اور سادہ قاعدے بنا دیئے گئے ہیں۔ جبر و مقابلہ یا بالفاظ دیگر ہمہ گیر ریاضی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے مقادیر غیرمعینہ کی تعیین یعنی ان تعلقات کی دریافت ہو سکتی ہے جو ہر قسم کی مقادیر کے درمیان قائم ہوں خواہ ان مقادیر کا تعلق علم حساب سے ہو خواہ علم ہندسہ سے۔ اس طریقہ کا موہوم سا خیال ڈایوفنٹس کو پیدا ہوا تھا جسے عربوں نے ترقی دے کر اس حد کمال تک پہنچایا۔ جبر و مقابلہ میں محمد بن موسی نے مساوات درجہ چہارم اور عمر بن ابراہیم نے مساوات درجہ سوم کے حل کرنے کا عمل دریافت کیا۔ عربوں ہی کی مساعی سے علم مثلث نے موجودہ شکل اختیار کی۔ انہوں نے اوتاد کے بجائے جس کا اول استعمال ہوتا جب مستوی کو اس فن میں داخل کیا۔ اور اسے ترقی دے کر ایک مستقل فن کی حیثیت عطا کی۔ موسی نے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں علم مثلث کروی پر ایک رسالہ لکھا اور البغدادی کا ایک رسالہ مساحت پر موجود ہے جس میں اس فن کے متعلق یہاں تک داد نکتہ سنجی دی گئی ہے کہ بعض لوگ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اس موضوع پر اقلیدس کا جو مقالہ گم ہو گیا تھا البغدادی کا رسالہ اسی کی نقل ہے۔

علم ہیئت میں انہوں نے نہ صرف ستاروں کی فہرستیں تیار کیں بلکہ اس حصہ آسمان کے نقشے بھی تیار کئے جو ان کے پیش نظر تھا۔ بڑے بڑے ستاروں کے انہوں نے عربی نام

بھی رکھے اور آج کے دن تک یہ ستارے انہیں ناموں سے مشہور ہیں۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے انہوں نے سطح زمین کے ایک درجہ کی پیائش کر کے اس کی جسامت دریافت کی۔ طریق الشمس کا اعوجاج معلوم کیا۔ آفتاب و ماہتاب کی صحیح میزانیں شائع کیں۔ سال کی مدت مقرر کی۔ استقبال اعتدالین کی توثیق و تصدیق کی لیپلیس نے ابتائی کے "رسالہ علم کواکب" کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے اور حاکم بامراللہ خلیفہ مصر ۱۰۰۰ء کے دربار کے مشہور ہیئت دان ابن یونس کی ایک عالمانہ تصنیف کے بعض بچے بچائے اجزا کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں المنصور عباسی کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کے مختلف مشاہدات فلکی مثلاً" کسوف و خسوف۔ نقاط اعتدال لیل و نہار۔ نقاط انقلاب صیفی و مشتوی۔ قران سیارگان و احتجاب کواکب کے نتائج مندرج ہیں۔ ان رصدی نتائج نے نظام عالم کے بڑے بڑے تغیرات پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ہیئت دانان عرب نے آلات ہیئت کی ترکیب و تکمیل پر بہت سا وقت صرف کیا۔ وقت کا اندازہ لگانے کے لئے مختلف قسم کی پانی اور دھوپ کی گھڑیاں ایجاد کیں اور سب سے پہلے اس مقصد کی تکمیل کے لئے "پنڈلم" یعنی رقاص ساعت انہیں نے ایجاد کیا۔

عملی علوم میں جن کا دارومدار تجربہ پر ہے علم کیمیا کی ایجاد کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ انہوں نے اس فن کے بعض نہایت ہی اہم معیار دریافت کئے مثلاً" گندھک کا تیزاب۔ شورے کا تیزاب اور الکحل۔ اس فن سے انہوں مطب میں بھی کام لیا اور سب سے اول ادویات مفردہ و مرکبہ کی قرابا دینیں شائع کیں اور ان میں معدنی نسخہ جات بھی شامل کیے۔ علم جر ثقیل میں انہوں نے گرتے ہوئے اجسام کے قوانین دریافت کئے۔ قوت کشش ثقل کی ماہیت سے بھی وہ نابلد نہ تھے۔ جر ثقیل کی قوتوں کے مسئلہ کا انہیں اچھی طرح علم تھا۔ علم توازن مائعات میں جو ترقی انہوں نے کی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اجسام کے اوزان مخصوص کی میزانیں مرتب کر کے پانی میں اجسام کے ڈوبنے اور تیرنے کے مالہ و ماعلیہ پر انہوں نے مبسوط بحثیں لکھیں۔ فن مناظر و مرایا میں انہوں نے یونانیوں کی اس غلط فہمی کو درست کیا کہ شعاع نور آنکھ سے نکل کر شئی مرئی پر پڑتی ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اس مسئلہ کو رواج دیا کہ شعاع شے سے چل کر آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ واقعہ انعکاس و انعطاف ضیا کی ماہیت کا انہیں پورا علم تھا۔ ابن حزم سے یہ مشہور تحقیقات منسوب ہے کہ شعاع نور کرہ ہوا کو بہ شکل قوس قطع کرتی ہے اور اس سے اس نے یہ ثابت کیا کہ ہم آفتاب و ماہتاب کو قبل طلوع و غروب دیکھتے ہیں۔

اس علمی مستعدی کا اثر اس ترقی میں صاف نظر آتا ہے جو صنعت و حرفت کے متعدد فنون میں جلد جلد ہونی شروع ہوئی۔ فن فلاحت میں آبپاشی کے طریقے پہلے سے بہتر ہو گئے۔ کھاد کا استعمال ہنر اور سلیقہ کے ساتھ کیا جانے لگا۔ چوپایوں کی افزائش نسل کے متعلق قیمتی نکتے معلوم ہو گئے۔ دیہی قوانین کا ضابطہ کاشتکاروں اور مزارعین کے حقوق کے لحاظ سے بہت زیادہ کامل و مکمل ہو گیا۔ جن کھیتوں میں پہلے وہاں کی کاشت نہ ہوتی تھی وہاں اب اس کی لہلہاتی فصلیں نظر آنے لگیں۔ جہاں ایکھ اور قہوہ کا نام و نشان نہ تھا وہاں اب ان کی پیداوار بھی ہونے لگی۔ سلطنت میں جابجا ریشم روئی اور ان کے کپڑوں کے کارخانے قائم ہو گئے۔ قرطبہ اور مراکو میں چرم سازی و کاغذ سازی کا کام شروع ہو گیا۔ معدنوں پر کام ہونے لگا۔ مختلف دھاتیں ڈھلنے لگیں۔ ٹالیڈو میں ایسے ایسے فولادی خنجر اور تلواریں تیار ہونے لگیں کہ ایک دنیا ان کا لوہا مان گئی۔

شاعری اور موسیقی پر عرب فریفتہ تھے۔ ان کا جو وقت فکر معاش سے بچتا تھا ان فنون لطیفہ کی نذر ہوتا تھا۔ شطرنج کا کھیل یورپ نے عربوں سے سیکھا اور قصص و حکایات اور خیالی مضامین کا شوق بھی جو اہل یورپ میں اس قدر پایا جاتا ہے عربوں ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ فن ادب کی ان شاخوں میں جو محض تفریح اور دلبستگی ہی کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ شان ثقاہت و متانت لئے ہوئے ہیں ان کی فکر سلیم داد نکتہ آفرینی دیتی تھی۔ دنیا کی ناپائداری۔ لامذہبی کے نتائج۔ قسمت کی گردش۔ عالم کی ابتدا۔ اس کی میعاد اور اس کا خاتمہ وہ مضامین ہیں جن پر انہوں نے لطیف اور نتیجہ خیز کتابیں لکھی ہیں۔ بعض دفعہ ہمیں تعجب ہوتا ہے جب ہماری نگاہ ایسے خیالات پر جا پڑتی ہے جن کی نسبت ازراہ تفاخر ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان خیالات کے موجد ہونے کا شرف ہمیں کو حاصل ہے۔ مثلاً" ایک مسئلہ ارتقا ہی کو لیجئے جسے ہم اکتشاف جدید سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ کی تعلیم ان کے مدارس میں دی جاتی تھی۔ اور ہم تو خیر پھر بھی اس کے محدود معنی لیتے ہیں۔ وہ ہم سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہوئے تھے اور غیر عضوی اجسام یعنی جمادات تک کو اس کے حیز عمل میں داخل سمجھتے تھے۔ رسائن یعنی کیمیا سازی کا اصلی راز فلزاتی اجسام کے ارتقائے فطری میں مرکوز تھا۔ **الغزانینی** جس نے بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا ہے لکھتا ہے: "جب عوام الناس فلاسفہ طبیعین کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ سونا ایک جسم ہے جو درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے تو انہیں کامل یقین ہو جاتا ہے کہ سونا ایک ایسی چیز ہے جو اور دھاتوں کی شکل یکے بعد دیگرے اختیار کرتا ہوا ایک زمانہ دراز کے بعد اس حالت کمال کو پہنچا ہے یعنی ابتدا میں یہ

سیسہ تھا پھر رانگ ہو گیا اس کے بعد پیتل ہوا پھر چاندی ہوا اور چاندی سے ترقی کر کے سونا بن گیا۔ ان جہلا کو یہ معلوم نہیں کہ فلاسفہ طبیعین کا یہ قول کہ سونا ایک ترقی یافتہ جسم ہے قریب قریب ان کے اس قول کے ہم معنی ہے کہ انسان اپنی فطرت اور ترکیب جسمانی کے لحاظ سے قدرت کی قوتوں کے اعتدال کا مرکز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آدمی پہلے بیل تھا۔ پھر گدھے کی شکل میں تبدیل ہوا۔ پھر گھوڑا بن گیا اس کے بعد بندر کے قالب میں ظاہر ہوا اور سب سے آخر میں انسان بن گیا۔"

پانچواں باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت روح

مسئلہ انفصال و انجذاب

روح کی ماہیت کے متعلق قدیم اہل یورپ کے خیالات۔ یعنی روح جسم کے مشابہ ہے۔

اہل مشرق کے فلسفیانہ خیالات۔ ہندو مذہب اور بدھ مذہب مسئلہ انفصال و انجذاب کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی مذہب ارسطو کا بھی ہے جس کی تقلید پیروان فلسفہ اسکندریہ اور بعد میں یہودی اور عرب کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ اریجینیا کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا تعلق مسئلہ بقا و تناسب قوت کے ساتھ جسم اور روح کے آغاز و انجام کی باہمی مماثلت۔ روح انسانی کا قیاس روح حیوانی پر۔

فلسفہ ابن رشد جو انہیں واقعات پر مبنی ہے اسپین اور سسلی ہوتا ہوا مسیحی دنیا میں پہنچتا ہے۔

فلسفہ ابن رشد کے استیصال کی تاریک اسلام کا اس سے ابا کرنا۔ یہودیوں کے مذہبی طبقہ کی مخالفت۔ پاپائے روما کا اس فلسفہ کے مٹا دینے پر کمر باندھنا۔ "انکویزیشن" (محکمہ احتساب مذہبی) کا اسپین میں قائم ہونا۔ اس محکمہ کے وحشیانہ مظالم اور ان کے نتائج۔ یہودیوں اور عربوں کا اخراج۔ یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی پامالی۔ "ویٹیکن کونسل" کا فیصلہ۔

بت پرست یونانیوں اور رومیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی روح اس کی جسمانی صورت کے مشابہ ہے۔ جسم بڑھتا ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ بڑھ جاتی ہے اور گھٹتا ہے تو گھٹ جاتی ہے۔ غرض تغیرات جسمانی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان مشاہیر عصر کو جنہیں مرنے کے بعد ہیڈیز کے طبقہ سافل میں داخل ہونے کی کارپردازان دنیائے تحتانی کی طرف سے اجازت ملتی تھی اپنے پرانے رفیقوں کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ پیش آتی تھی۔ نہ صرف ان باشندگان عالم عقبیٰ کی جسمانی صورت ہی بدستور قائم رہتی تھی بلکہ اس لباس تک میں جسے وہ اس دنیا میں پہنا کرتے تھے کسی قسم کی تبدیلی نہ واقع ہوتی تھی۔

قدیم مسیحیوں نے جن کے خیالات حیات اخروی اور بہشت و دوزخ یعنی نیکوکاروں اور گناہ گاروں کے مساکن کے متعلق اپنے بت پرست پیش روؤں کے تصورات کے مقابلہ میں بہت زیادہ واضح و نمایاں تھے انہیں قدیم تصورات کو تسلیم کر کے ان پر اپنی طرف سے بہت کچھ حاشیے چڑھا دیے۔ ان کو ذرا شک نہ تھا کہ آنے والی دنیا میں وہ اپنے احباب و اقارب سے اسی طرح مل کر باتیں کریں گے جس طرح اس دنیا میں کرتے ہیں اور ان کی یہ امید فطرت انسانی کے مقتضیات کے لحاظ سے چنداں بیجا نہ تھی اس لئے کہ جب کوئی عزیز دوست ہمیشہ کے لئے جدائی کا جانکاہ داغ دے جاتا ہے تو اس خیال سے کہ دوسری زندگی میں اس سے ہماری ملاقات ہو ہی جائے گی ہمارے دل کو تسکین ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق کہ روح جسم سے جدا ہونے کے بعد روز جزا تک کس حالت میں اور کہاں رہتی ہے صحیح صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے خیالات مختلف تھے۔ ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ روح قبر کے گردوپیش منڈلایا کرتی ہے۔ دوسرا گروہ یہ سمجھتا تھا کہ مرنے کے بعد روح بحالت سراسیمگی و پریشانی فضائے بسیط میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ سینٹ پیٹر بہشت کا دربان ہے۔ اور اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس کو چاہے دروازہ میں گھسنے دے اور جس کو چاہے روک دے۔ وہ انسانوں کی روحوں کو اپنی مرضی سے بہشت میں داخل کرتا ہے یا وہاں سے نکال دیتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اس کے ان اقتدارات کے منکر تھے جس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ جب روز جزا سے پہلے ہی سینٹ پیٹر نے روحوں کو بہشت میں داخل کر دیا یا وہاں سے نکال دیا تو پھر روز جزا کی کیا ضرورت باقی رہی۔ پاپائے گریگوری کے زمانہ کے بعد یہ عقیدہ عام طور پر رائج ہو گیا کہ قید عنصری سے آزاد ہو کر روحیں ایک مقام پر رکھی جاتی ہیں جہاں ان کا

تزکیہ ہوتا ہے یعنی بدوں کو اپنی بدی کی تلافی کا موقع دیا جاتا ہے۔

مردوں کی روحوں کا وقتاً " فوقتاً " زندوں سے آکر ملنا اور اپنے دیرینہ مساکن میں بودوباش اختیار کرنا ایک ایسا خیال ہے جسے یورپ کے تمام ممالک میں ہر زمانہ کے نہ صرف جہلا بلکہ عقلا بھی تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ جاڑے کے موسم میں غروب آفتاب کے بعد دہکتے ہوئے آتشدان کے سامنے بیٹھ کر جب بھوت پریت سایہ کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں تو سننے والوں پر ایک دل کو بھلا معلوم ہونے والا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں اہل روما تین قسم کی ارواح کے قائل تھے۔ یعنی نیکوں کی روحیں' بدوں کی روحیں اور ان لوگوں کی روحیں جن کے اعمال مشکوک تھے۔ اگر اس بارہ میں انسانی شہادت کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ قدیم الایام سے اس قسم کی صدہا روایتیں جن کے راوی نہایت ثقہ اور معتبر سمجھے گئے ہیں اس مضمون کی ہم تک پہنچتی ہیں کہ مردوں کی روحیں یا تو قبرستانوں میں جمع ہوتی ہیں یا ویران قلعوں کے تنگ و تاریک حجروں میں اقامت پذیر ہوتی ہے۔ یا چاندنی رات میں تن تنہا خاموشی کے ساتھ چہل قدمی کیا کرتی ہیں۔

ادھر یورپ میں تو اس قسم کے خیالات مقبول خاص و عام ہوئے لیکن ایشیا میں اس کے برعکس دوسرے قسم کے خیالات جو تخیل کے طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے عام طور پر پھیل گئے۔ پیشوایان مذہب نے سولہویں صدی میں ان کو اگرچہ دبا دیا لیکن ان کا استیصال کلی کبھی نہ ہو سکا۔ خود ہمارے زمانہ میں بھی ان کی اشاعت ایک نہایت وسیع پیمانہ پر یورپ بھر میں اس خاموشی کے ساتھ ہوتی رہی کہ پاپائے روما نے مناسب سمجھا کہ ان کی صاف صاف طور پر قلعی کھول دی جائے۔ چنانچہ پاپا کا دینی فرمان جب "ویٹیکن کونسل" میں پڑھا گیا تو کونسل نے بالاتفاق ان خیالات کو موجب ضلالت و گمراہی قرار دے کر ایک فتویٰ جاری کیا جس میں ان لوگوں کو ملعون ٹھہرایا گیا جو ان کو صحیح سمجھتے ہوں۔ اس فتوے کا ایک فقرہ یہ ہے:

"لعنت ہو اس پر جو یہ کہتا ہے کہ روحانی اشیاء کا انفصال یا خروج ذات باری سے ہوا ہے یا یہ کہ ذات باری اپنے مظاہر کے ذریعہ سے یا نشوونما پانے کے بعد تمام چیزوں کی شکلیں قبول کر لیتی ہے۔" چونکہ روما کی مذہبی کونسل نے ان عقائد کی تکفیر میں اپنے اقتدار کا پورا زور صرف کیا ہے لہٰذا ضرور ہوا کہ ان کے مالہ و ماعلیہ پر تاریخی پہلو سے نظر ڈالی جائے۔

ماہیت ذات باری کے تصورات سے ماہیت روح کے تصورات کا اثر پذیر ہونا لازمی ہے۔ ذات باری کے تصور سے مشرقی ایشیائیوں نے شخصیت کا خیال خارج کر دیا تھا جس کا

لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روح کے متعلق ان کے ہاں مسئلہ انفصال و انجذاب رواج پا گیا۔
ویدانت میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ایک روح تمام کائنات میں ساری ودائر ہے۔ اس روح کل یا خدا کی ماہیت وہی ہے جو روح انسانی کی ہے۔ نہ صرف ویدوں میں بلکہ منو کی سمرتیوں میں بھی یہ دعوی موجود ہے کہ روح شعلہ عقل کل کی ایک چنگاری ہے جو اس سے جدا ہو گئی ہے اور ایک زمانہ موقت کے بعد اس میں پھر مل جانے والی ہے۔ اسی کا نام اصول انفصال یعنی جدائی و انجذاب یعنی ملاپ ہے۔ ویدوں اور سمرتیوں میں روح کی کوئی شکل نہیں مانی گئی۔ مظاہر قدرت کو جن کی رعنائیاں اور رنگینیاں آنکھ اور دل کو لبھاتی ہیں خدا کا محض ایک سایہ تصور کیا گیا ہے۔
ویدوں کے مذہب نے ترقی کرتے کرتے بدھ مذہب کی شکل اختیار کر لی جو بنی نوع انسان کے جزو غالب کا ایمان ہے۔ اس مذہب کو ایک طاقت عالیہ کے وجود کا تو اعتراف ہے لیکن کسی ہستی عالیہ کے موجود ہونے سے انکار ہے۔ بدھوں کا عقیدہ یہ ہے کہ قوت کا وجود اصلی و حقیقی مادہ کو اپنا مظہر بن کر عالم شہود میں لاتا ہے۔ وہ مسئلہ انفصال و انجذاب کے قائل ہیں۔ ایک جلتی ہوئی شمع ان کے نزدیک گویا انسان کی مورت ہے جس میں مادہ مجسم ہو کر قوت کے عمل ارتقا کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر ہم ان سے سوال کریں کہ روح کا کیا حشر ہو گا تو وہ ہم کو یہ الزامی جواب دیتے ہیں کہ جب شعلہ بجھا دیا گیا تو اس کا کیا حشر ہوا اور جب مشعل جلی نہ تھی تو شعلہ کہاں تھا کیا وہ اس وقت معدوم تھا اور اب فنا ہو گیا ہے؟ بدھ مذہب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ذات یعنی انانیت کا خیال جس نے ہمیں عمر بھر دھوکے میں ڈالے رکھا ہے شاید مرتے کے ساتھ ہی تو زائل نہ ہو لیکن رفتہ رفتہ ضرور جاتا رہتا ہے۔ اسی عقیدہ پر مسئلہ تناسخ مبنی ہے۔ شخصیت یا انانیت کے بتدریج مٹنے کے بعد واقعہ انجذاب یعنی عقل کل کے ساتھ روح کا اتحاد ظہور میں آتا ہے۔ اس حالت میں جس کو حالت نروان کہتے ہیں روح پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور یہ ایک ایسا عالم ہے جس میں مادہ فضا اور زمانہ کے اعتبارات کا کہیں نشان نہیں ہوتا۔ جس میں بجھی ہوئی مشعل کا شعلہ چلا گیا ہے اور جس میں انسان پیدا ہونے قبل موجود تھا۔ یہی وہ انجام ہے جس کی انسان کو امید رکھنی چاہیے۔ یعنی وہ حالت ہے جس میں روح قوت کل کی لذت وصال سے بہرہ اندوز ہو کر سرمایہ سرور بے پایان و راحت جاودان حاصل کرتی ہے۔
مشرقی یورپ میں ان خیالات کی ترویج کا پہلا ذریعہ ارسطو ہوا اور آگے چل کر وہ ان کا بانی مبانی سمجھا جانے لگا۔ کتب خانہ اسکندریہ نے اپنے دور آخر میں جو حکما پیدا کیے ان

پر ان خیالات کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ فلو نامی ایک یہودی شہنشاہ کیلیگولا کے زمانہ میں رہتا تھا۔ اس کے تمام فلسفہ کا دارومدار ہی مسئلہ انفصال پر ہے۔ پلاٹینس نے نہ صرف اس مسئلہ سے حقیقت روح انسانی کا معما حل کرنا چاہا بلکہ اقانیم ثلثہ کی گتھی کو بھی اسی کی مدد سے سلجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کا یہ خیال تھا کہ جس طرح نور کی ایک شعاع آفتاب سے نکلتی ہے اور جس طرح شعاع کے اجسام مادی پر پڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اسی طرح باپ سے بیٹا اور بیٹے سے روح القدس نکل سکتی ہے۔ ان خیالات کی بنیاد پر قائم کر کے پلاٹینس نے اس پر ایک مکمل مذہبی عمارت تعمیر کی اور ارباب زہد و ریاضت کو عالم قال سے عالم حال میں آنے کے طریقوں کی تعلیم دے کر یہ بتانا شروع کیا کہ عالم حال وصال عقل کل یا ذات باری کی پہلی منزل ہے اور اس عالم میں روح پر خودفراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فرفوریوس نے بھی انجذاب یا وصال باری کو معاد کے انتہائی مقصد سے تعبیر کیا۔ فرفوریوس ٹائر میں پیدا ہوا تھا۔ روما میں اس نے حلقہ درس قائم کیا اور عیسائیت کے رد میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ یوں تو یوسیبس اور سینٹ جردم نے بھی ان کتابوں کے جواب میں رسائل تصنیف کئے لیکن سب سے بڑی حجت قاطع شہنشاہ تھیوڈوسیس کے جواب میں مضمر تھی جس نے فرفوریوس کی تصانیف کے تمام نسخے ہی جلوا دئے۔ فرفوریوس اپنی ناقابلیت پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے عالم حال میں خدا کے قرب سے چھیاسی سال کی عمر میں صرف ایک دفعہ شرف ہونے کا موقعہ ملا حالانکہ میرے استاد پلاٹینس نے کل ساٹھ برس کی عمر پائی اور اس عرصہ میں چھ مرتبہ وصال باری تعالیٰ کی نعمت سے شرف اندوز ہوا۔ پراکلس نے بھی مسئلہ انفصال و انجذاب کی بنا پر ایک مکمل ضابطہ دینیات مرتب کر کے طریقہ انجذاب سے بہت کچھ بحث کی ہے یعنی آیا روح قالب سے نکلتے ہی فنا فی اللہ ہو جاتی ہے یا کچھ عرصہ تک اپنی ذات کے ادراک میں مقید رہ کر بتدریج وصال کامل حاصل کرتی ہے۔

فتح اسکندریہ کے بعد یہی خیالات مسلمانوں میں پھیل گئے اور انہوں نے بہت جلد خدا اور روح انسانی کے متعلق اپنے تجسیمیہ عقائد کو ادانی و اقاصی کے لئے چھوڑ دیا۔ جب عربی فلسفہ نے ایک مستقل بالذات فن کی حیثیت اختیار کی تو مسئلہ انجذاب و انفصال اس کے معرکتہ الارا مباحث میں شریک ہو گیا۔ ان عقائد کے ترک کر دینے میں جو مسلمانوں کے طبقہ جہلا میں مقبول عام تھے حکمائے اسلام نے ایک بڑی حد تک یہودیوں کا تتبع کیا۔ یہودیوں نے اپنے آباؤ اجداد کی تجسیمیت کو ترک کر دیا تھا اور اس معبود کے بجائے جو

سابق میں معبد کے اندر نقاب اسرار اوڑھے رہا کرتا تھا ایک ایسے خدا کی پرستش شروع کر دی تھی جو عقل مطلق اور طاقت غیرمحدود ہونے کے لحاظ سے کائنات کے ہر رگ و ریشہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اور چونکہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کیوں کر ایک ایسی شے جو دفعتہ عدم سے وجود میں آئی ہو غیرفانی ہو سکتی ہے لہذا وہ اس عقیدہ پر راسخ ہو گئے کہ روح انسانی کا تعلق ایک طرف تو اس ازل سے ہے جس کی کوئی ابتدا نہ تھی اور دوسری طرف اس ابد سے ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

عربوں کی دماغی ترقی کی ہر منزل میں عرب اور یہودی ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی پولٹیکل تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تب بھی یہودی اور مسلمان دوش بدوش نظر آئیں گے۔ شام مصر اسپین جس ملک میں دیکھو دونوں ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ مغربی یورپ نے ان دونوں سے اپنے فلسفیانہ خیالات اخذ کئے اور ان خیالات کو امتداد روزگار نے مسلک ابن رشد کی شکل میں بدل دیا۔ اسلام کو اگر فلسفیانہ رنگ میں دیکھنا چاہو تو ابن رشد کے مذہب کا مطالعہ کرو۔ اہل یورپ عام طور سے ابن رشد ہی کو ان ضلالت آفرین عقائد کا بانی خیال کرتے تھے اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے اسی اعتبار سے اس کو مورد مطاعن و ملامت قرار دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان خیالات کا محض جامع اور شارح تھا اور بس۔ اس کی تصنیفات نے عیسائی دنیا پر دو طرف سے حملے کئے۔ یعنی ایک طرف تو اسپین سے براہ جنوبی فرانس انہوں نے اٹلی کے شمال میں پہنچ کر رستہ میں بہت سے عقائد کو بدل ڈالا۔ اور دوسری طرف سسلی سے روانہ ہو کر شہنشاہ فریڈرک ثانی کی حمایت میں وہ نیپلز ہوتی ہوئیں جنوبی اٹلی میں جا پہنچیں۔

لیکن اس زبردست عقلی حملہ سے مدتوں پہلے یورپ میں بعض مستشرقین بطور خود مشرقی خیالات کی اشاعت میں حصہ لے چکے تھے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم ایک برطانوی حکیم جان اریجینا (۸۰۰ء) کے خیالات درج ذیل کرتے ہیں۔ اریجینا مشائی المذہب تھا اور ارسطو کے فلسفہ کی تعلیم دیتا تھا۔ وہ ازراہ ارادت یونان کے اس نامور فلسفی کے مولد کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ اس کی یہ آرزو تھی کہ فلسفہ اور مذہب میں ان مسیحی پادریوں کے طریقہ مجوزہ کے موافق اتحاد پیدا کیا جائے جو اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے۔

انفسیس نے ایک چٹھی میں جو اس نے شاہ چارلس الملقب بہ اصلع کے نام لکھی ہے اریجینا کے تبحر علمی اور فکر دقیقہ سنج کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنا تحیر ظاہر کیا

ہے: "سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسا وحشی جو دنیا کے دوسرے کنارے سے آیا ہے اور دانشمند و فرزانہ اشخاص کی صحبت سے بے بہرہ ہے کیوں کر بڑے بڑے اوق علمی مسائل کے سمجھنے اور انہیں اس خوبی کے ساتھ ایک غیر زبان میں ترجمہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔" ار یجینا کی تصانیف کا عام مقصد جیسا کہ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں یہ تھا کہ فلسفہ اور مذہب میں اتحاد پیدا کرے لیکن اس موضوع پر قلم اٹھانا تھا کہ پادریوں نے اس پر لے دے شروع کر دی اور اس کی اکثر تصانیف جلا دی گئیں۔ اس کی سب سے مشہور کتاب کا نام "تقسیم قدرت" ہے۔

ار یجینا کا فلسفہ مشاہدہ اور تجربہ کے اس نچوڑ پر مبنی ہے کہ ہر ایک زندہ شے کسی ایسی شے سے پیدا ہوتی ہے جو پہلے زندہ تھی۔ عالم مرئی چونکہ دنیائے حیات ہے لہٰذا لازمی طور پر اس کا انفصال یا خروج کسی وجود اولین سے عمل میں آیا ہے اور وہ وجود خدا ہے جو ہم سب کا پیدا کرنے والا اور محافظ ہے۔ ہر وہ شے جو ہمیں نظر آتی ہے اپنے وجود کو بحیثیت ایک شے مرئی کے اس قوت کے ذریعہ سے قائم رکھتی ہے جو خدا سے ماخوذ ہے اور اگر یہ قوت ہٹالی جائے تو ضرور ہے کہ شے معدوم ہو جائے۔ اس طور پر خدا کے متعلق ار یجینا کا یہ خیال ہے کہ وہ قدرت کے ہر عمل میں علی التوالی و التواتر حصہ لیتا ہے یعنی وہ قدرت کا بچانے والا' قائم رکھنے والا اور سنبھالنے والا ہے۔ اور اس لحاظ سے گویا یونانیوں کی ہمہ گیر روح یا عقل فعال کے مشابہ ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ افراد کی زندگی وجود عام یعنی روح عالم کا ایک جزو ہے۔

اگر وہ قوت جس پر تمام اشیا کے وجود کا مدار ہے ہٹالی جائے تو ان اشیاء کا رجوع اپنے مبداء اصلی کی طرف لازمی ہے یعنی ضرور ہے کہ وہ ذات باری کی طرف راجع ہو کر اس میں ضم یا جذب ہو جائیں۔ اس طور پر کل مظاہر کائنات کا انجام کار عقل فعال میں پیوست ہو جانا لازمی ہے۔ ار یجینا کا قول ہے کہ "جسمانی موت جسم کی اصلی یا ہیت قدیمی کی طرف عود کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ جیسے کہ اصوات فنا ہو کر ہوا میں جا ملتی ہیں جو ان کا مبدا و منشا اور مدار علیہ ہے اور پھر سنائی نہیں دیتیں۔ کسی شخص کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ اس آخری اور انتہائی انجذاب کی حالت میں جو ایک میعاد موقت کے بعد لازمی طور پر ظہور پذیر ہونے والی ہے صرف خدا ہی کی ذات موجود ہو گی۔ بجز اس کے اور کچھ نہ ہو گا۔" ایک اور مقام پر بحث ذات باری میں وہ لکھتا ہے: "میں اسے کل کائنات کا مبداء اول اور علت العلل سمجھتا ہوں۔ تمام وہ اشیاء

جو ہیں اور نیز تمام ایسی اشیاء جو نہیں ہیں۔ مگر ایک زمانہ میں تھیں اسی سے پیدا ہوئیں اسی نے پیدا کیں اور اسی میں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ میں اس کو کل کائنات کی انتہا اور ساعت موقوت خیال کرتا ہوں جس کا ٹلنا ممکن نہیں۔ کائنات کے تصور کی چار شکلیں ہیں۔ ان میں سے دو اشکال یعنی آغاز و انجام کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے اور دو کا تعلق بطور سبب و مسبب یا علت و معلول موجودات ترکیبی یا طبیعی سے۔ باقی اور غیر فانی بجز خدا کے اور کوئی نہیں۔"

عقل کل کی طرف روح کی اس رجعت کو ار یجینا نے جس لفظ سے تعبیر کیا ہے وہ فنا فی اللهی کا مترادف ہے۔ مقام فنا میں داخل ہو کر روح کو اپنے سابقہ تجربے مطلقاً" فراموش ہو جاتے ہیں اور اس کی وہی حالت ہو جاتی ہے جو جسم میں داخل ہونے سے پہلے تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے عقائد کو اہل مذہب کس طرح استحسان کی نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ ار یجنیا پر کلیسا کا عتاب نازل ہوا اور پادری اس کے درپے آزار ہو گئے۔

سب سے اول جس قوم کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ قوت غیر فانی اور ابدی ہے وہ ہندوؤں کی قوم تھی۔ اس حقیقت کا مفہوم اس اصول سے ملتا جلتا ہے جسے علمی اصطلاح میں ہم "تناسب و صیانت قوت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ نظام عالم کا قیام و ثبات بھی اس اصول کی حقیقت کا موید ہے اس لئے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر کائنات کی مجموعی مقدار قوت میں کچھ بھی کمی یا بیشی ہو جائے تو نظام عالم کا شیراہ بکھر جائے۔ پس یہ واقعہ کہ کائنات میں توانائی یا قوت کی ایک معین اور غیر متغیر مقدار موجود ہے ایک علمی حقیقت ہے جس کے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ جو تغیرات ہمیں اس دنیا میں نظر آتے ہیں ان کی وجہ محض اس قوت کی تقسیم ہے۔

لیکن چونکہ روح ایک قوت فعال ہے لہذا ایک بالکل نئی روح کا عدم سے وجود میں آنا اس کا مستلزم ہو گا کہ جو قوت کائنات میں پہلے سے موجود تھی اس میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آج تک جتنے انسان پیدا ہوئے ہیں ہر ایک کی پیدائش کے وقت دنیا کی قوت میں بقدر ہر انسان کی روح کے اضافہ ہوتا رہا اور آئندہ بھی جتنے انسان پیدا ہونے والے ہیں ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسی عمل کا اعادہ ہوتا رہے گا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ قوت کی مجموعی مقدار ہر وقت بڑھتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ اکثر زاہد و مرتاض لوگ اس خیال پر کراہت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قادر مطلق اپنے بندوں کے تلون اور شہوائے نفسانی کا تابع ہے کہ نطفہ کے استقراء

کی کچھ مدت کے بعد اسے جنین کے لئے ایک نئی روح پیدا کرنی پڑتی ہے۔
چونکہ انسان کی شخصیت روح و جسم دو اجزا سے مرکب ہے لہٰذا ایک کے تعلقات دوسرے کے پوشیدہ اور غیرمعلوم تعلقات پر بہت کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ اجزا جن سے جسم نے ترکیب پائی ہے اس عام مادہ سے ماخوذ ہیں جو ہمارے گردوپیش موجود ہے اور مرنے کے بعد اسی مادہ میں جا کر مل جاتے ہیں۔ اس مشاہدہ سے یہ بدیہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا صانع قدرت نے شخصیت انسانی کے مادی حصے کے آغاز و انقلاب و انجام کی شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے ایسا عقدہ تو پیش نہیں کیا جس کے حل کرنے سے ہمیں جسم کے رفیق یعنی روح کے آغاز و انجام کا علم حاصل ہو سکے؟
آؤ دیکھیں ایک بہت بڑے زبردست مسلمان فلسفی امام غزالیؒ (۱۱۱۰ء) کا قول اس بارہ میں کیا ہے:
"خدا نے انسان کی روح کو اپنے نور کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے اور اس قطرے کی خلقت کا منشا یہ ہے کہ جس سمندر سے نکلا تھا آخر کو اسی میں جا کر مل جائے۔ اپنے نفس کو اس خیال لایعنی سے دھوکا نہ دو کہ جسم کے فنا ہوتے ہی روح بھی فنا ہو جائے گی۔ جب تم دنیا میں آئے تھے تو تمہاری شکل کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ چونکہ تمہارا جسم ہلاک ہو گیا ہے لہٰذا روح بھی ہلاک ہو جائے۔ تمہاری روح اس دنیا میں ایک تازہ وارد مسافر کے طور پر آئی ہے اور چند دن کے لئے گویا ایک سرائے میں مقیم ہے۔ اس زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں سے ہماری پناہ خدا کے ہاں ہے۔ سکون جاودانی ہم کو اسی وقت حاصل ہو گا جب ہم وصال جناب باری کی نعمت سے مستفیض ہوں گے اور یہ حالت مطمئنہ جب حاصل ہو جائے گی تو ہم کو وہ راحت ملے گی جس میں رنج کی آمیزش نہیں۔ وہ طاقت نصیب ہو گی جو کمزوری سے مبرا ہے۔ وہ علم حصہ میں آئے گا جو شک سے پاک ہے۔ اور حیات و نور کے اس سرچشمہ ابدی کا دیدار میسر ہو گا جو ہمارا مبداء و منشا ہے۔"
پتھر میں چونکہ مادہ کے ذرات متحجر ہو کر بحالت اعتدال قائم ہیں لہٰذا وہ ہمیشہ تک برقرار رہ سکتا ہے لیکن حیوان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مادہ کی ایک نہر کے مسلسل بہاؤ کی ایک خاص شکل ہے۔ اس کو ادھر غذا ملتی ہے اور ادھر فضلہ خارج ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حیوان ایک آبشار یا ندی یا شعلہ کے مشابہ ہے۔ یعنی آبشار یا ندی یا شعلہ کی طرح ان ذرات کو جس سے یہ مرکب ہے مطلق قرار نہیں کیونکہ یہ ذرات ہر

وقت بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے تسلسل یا حیات کا دارومدار خارجی اجزا کے شمول پر ہے۔ اس کی عمر طبیعی کی ایک میعاد مقرر ہے اور ایک نہ ٹلنے والی ساعت ایسی آتی ہے جب اسے چاروناچار مرنا پڑتا ہے۔

ایک ہی واقعہ کو پیش نظر رکھنے سے فلسفہ روح کا عقدہ مشکل حل ہونا دشوار ہے۔ ہمیں چاہئے کہ جس قدر واقعات سے مدد لے سکیں لیں۔ روح انسانی کی گتھی اس وقت تک پوری طرح سے نہیں سلجھ سکتی جب تک روح حیوانی کی حقیقت پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور نہ کیا جائے۔ ہمیں ڈیکارٹ[1] کے طریقہ سے کام لے کر یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا انسانوں کی روحیں حیوانوں کی روحوں سے کوئی قرابت رکھتی ہیں اور آیا نشوونما کے لحاظ سے ان دونوں کا تعلق ایک ہی سلسلہ سے ہے جس کا حصہ فوقانی روح انسان ہے اور حصہ تحتانی روح حیوان۔ چیونٹی کی فہم و فراست سے نتائج ہم اخذ کریں ان پر بھی ہمیں ایسا ہی غور کرنا چاہئے جیسا انسان کی عقل و بصیرت کے کرشموں پر۔ اعضائے انسان کی تشریح کا علم آج اس درجہ کمال کو پہنچا ہوا نہ ہوتا اگر اس پر علم تشریح اعضائے حیوانات کی روشنی نہ پڑتی۔

بروڈی[2] نے واقعات پر نظر غائر ڈالنے کے بعد یہ دعوی کیا ہے کہ روح انسان اور روح حیوانی کی ماہیت ایک ہے۔ جو شخص کتے کی عادات و خصائل سے اچھی طرح واقف ہے اسے یہ بات ماننی پڑے گی کہ کتا نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اور جب کوئی خطا کرتا ہے تو جانتا ہے کہ اس سے یہ خطا ہوئی۔ بہت سے پالتو جانوروں میں قوت استدلال موجود ہوتی ہے اور وہ حصول مقاصد کے لئے مناسب تدابیر عمل میں لاتے ہیں۔ کون ہے جس نے ہاتھی اور بندر کے ارادی افعال و حرکات کی بے تعداد مثالیں نہیں سنیں اور ان جانوروں کے یہ عاقلانہ افعال کچھ تقلید جامد یا انسان سے میل جول رکھنے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کی فطری سرشت کا لازمہ ہیں اس لئے کہ جنگلی جانور بھی جنہیں انسان کی صحبت کا اتفاق نہیں ہوا اسی قسم کے اوصاف سے متصف پائے گئے ہیں۔ مختلف انواع کے حیوانوں میں ذہنی قابلیت اور عادات و خصائل کے لحاظ سے بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً" کتا نہ صرف بلی کی بہ نسبت زیادہ سمجھدار ہوتا ہے بلکہ اس میں وہ عمرانی و اخلاقی صفات بھی پائی جاتی ہیں جو بلی میں موجود نہیں ہیں۔ کتے کو اپنے آقا سے محبت ہوتی ہے اور بلی کو اپنے گھر سے۔

ڈیوا ریمان کا یہ قول ہمیں نہیں بھولتا: "کارگاہ ہستی کے عجائبات پر ایک ہمہ گیر اور گہری نظر ڈالو۔ اور ننھی سی چیونٹی کے اس دماغ کو دیکھو جو مقدار میں جزو لا یتجزی سے کچھ ہی زیادہ ہو گا۔ مادہ کے اس عجیب ذرہ میں اس روح کو کرشمہ سنج دیکھ کر تم پر رعب

اور حیرت طاری ہو جائے گی جس میں محنت و استقلال۔ اختراع و ایجاد۔ ترتیب و تناسب۔ وفاکشی و جان سپاری اور شجاعت و دلاوری کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر ہیں۔ غور تو کرو کہ چیونٹی کو یہ ترقی کتنے زمانہ میں جا کر نصیب ہوئی ہے۔ بے تعداد نسلوں نے شبانہ روز محنت کی ہے تب کہیں جا کر خدا کی یہ ننھی سی مخلوق اس درجہ کمال کو پہنچی ہے۔"

ہیوبر جس نے چیونٹی کے حالات پر ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز رسالہ لکھا ہے بیان کرتا ہے کہ "اگر تم کسی چیونٹی کے طرز عمل کو اس وقت جب کہ وہ کام کر رہی ہو بغور دیکھو تو تمہیں خودبخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب میں چیونٹیوں کے ایک گروہ کو اپنا گھر بناتے دیکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک داروغہ نے آکر عمارت کا معائنہ کیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ مستریوں نے دیوار کی بلندی جتنی رکھنی چاہئے تھی نہیں رکھی اور چھت ڈالنی شروع کر دی ہے تو اس نے فوراً چھت ادھڑوا ڈالی اور دیواروں کو کافی بلند کرا کے پرانی چھت کے مسالے سے نئی چھت از سر نو ڈلوائی۔" کیا اس بیان کے بعد بھی شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ کیڑے محض کلیں ہیں جن سے تمام افعال بر سبیل اضطرار سرزد ہوتے ہیں۔ مشیت۔ ارادہ۔ اختیار کون سی ایسی صفت ہے جو ان میں نہیں پائی جاتی؟ چیونٹیاں جب اپنی پرانی سہیلیوں کو کئی مہینوں کے بعد دیکھتی ہیں تو انہیں فوراً پہچان لیتی ہیں اور اس ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کا منہ سے منہ ملا کر باتیں کرنا دیکھو۔ اس طریقہ سے یہ بہت سے خیالات ظاہر کر سکتی ہیں۔ یہ طریقہ اظہار خیالات ان کے گھر کے لئے جس کے اندر چاروں طرف اندھیرا گھپ چھایا ہوا ہے ہر طرح سے موزوں ہے۔

اکیلے رہنے والے کیڑوں کی اتنی عمر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کر سکیں لیکن اکٹھے مل کر رہنے والے کیڑوں کی زندگی زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں اخلاقی خواہشیں موجود ہوتی ہیں اور وہ اپنے بچوں کی تربیت اور پرورش خاص اہتمام سے کرتے ہیں۔ یہ ہیچ میرز جاندار جو محنت و استقلال کی زندہ تصویریں ہیں سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ حالانکہ بہت کم آدمی ایسے ہوں گے جو دماغی محنت ایک وقت میں مسلسل چار پانچ گھنٹے سے زیادہ کر سکیں۔

نتائج کی یکسانی اسباب کی یکسانی پر دلالت کرتی ہے اور افعال کی مشابہت اعضا کی مشابہت کو مستلزم ہے۔ ہمارے وہ ناظرین جو جانوروں کی عادات و خصائل سے عموماً اور چیونٹی کے تمدن سے خصوصاً پوری واقفیت رکھتے ہیں اگر ہماری کتاب "یورپ کی دماغی ترقی

کی تاریخ" کا انیسواں باب ملاحظہ فرمائیں گے تو انہیں ملک پیرو واقع امریکا کی وحشی قوم ان کے تمدن کی کیفیت معلوم ہو گی۔ ظاہر ہے کہ چیونٹی ایک ذرہ ناچیز ہے اور انسان اشرف المخلوقات لیکن چیونٹی کے تمدن اور قوم انکا کے تمدن کا موازنہ کرنے کے بعد اور ان خصوصیات رسم و رواج و عادات و خصائل کو میزان تقابل میں تولنے کے بعد جو ان دونوں میں پائی جاتی ہیں ناظرین کو شاید ہم سے اس رائے میں اتفاق ہو گا کہ شہد کی مکھیوں اور بھڑوں اور چیونٹیوں اور پرندوں اور ان تمام چھوٹے درجے کے حیوانات سے جنہیں انسان حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اسے ایک دن یہ سبق سیکھنا ہے کہ خود اس کی حقیقت اور ہستی کیا ہے۔

ڈیکارٹ تمام کیڑوں کو خودبخود چلنے والی کلیں تصور کرتا ہے۔ لیکن یہ خیال بہت کچھ ترمیم کا محتاج ہے۔ کیڑے محض اس اضطراری حرکت کے لحاظ سے تو متحرک بالذات کلیں سمجھے جا سکتے ہیں جو ان کے خیط البطن اور سلحتہ الراس کے اس حصہ سے سرزد ہوتی ہے جن کو ایک ہی وقت میں مختلف احساسات سے اثر پذیر ہونے سے تعلق ہے ورنہ باقی ہر اعتبار سے وہ متحرک بالارادہ اور فاعل مختار ہیں۔

جس مادہ سے اعصاب منفوط مرکب ہیں اس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ حواس کے ذریعہ سے جو نقوش اشیائے خارجی کے اس پر مرتسم ہوں ان کے آثار و باقیات کو محفوظ رکھے۔ اس لحاظ سے سلحتہ الاعصاب کو جو اسی مادہ سے بنا ہے گویا نظام تصور کا محکمہ اندراج نقوش سمجھنا چاہئے۔ نظام عصبی کے عمل میں اس کی وجہ سے زمانہ کا عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے یعنی وہ نقش جو سلحتہ الاعصاب کے موجود نہ ہونے کی حالت میں فوراً منجر بہ ردعمل ہوتا۔ کچھ دیر تک حالت اصلی پر قائم رہتا ہے اور اس قیام کی وجہ سے وہ تمام اہم نتائج مترتب ہوتے ہیں جنہیں بہت سے قدیم و جدید نقوش کے باہمی تعامل نے پیدا کیا ہے۔

کوئی خیال خودبخود نہیں پیدا ہو سکتا۔ ہر عقلی فعل کسی فعل سابق کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک کہ کوئی شے جو پہلے گزر چکی ہے اس کے وجود میں آنے کا باعث نہ ہو چکی ہو۔ دو دماغ جن کی ساخت میں سرمو فرق نہیں اگر یکساں حوالی میں ہوں گے تو ان سے ایک ہی سا خیال پیدا ہو گا۔ اس مشابہت عمل یا یکسانی خیال کو تمیز مشترک کا نام دینا چاہئے جس سے مراد فہم و شعور کی وہ عام قابلیت ہے جو دماغ میں بطور قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ خیال کے پیدا ہونے کی دو جداگانہ حالتیں ہوتی ہیں یعنی

ایک تو دماغ کی وہ حالت جو نقوش یا تصورات ماسبق پر منحصر ہے اور دوسری وہ حالت جس کا دارومدار موجودہ طبیعی حالات پر ہے۔

کیڑوں کے سلسلۃ الراس میں ان نقوش کے آثار کا خزانہ جمع رہتا ہے جو معمولی اعصاب بیرونی پر مرتسم ہوتے ہیں اور باصرہ و شامہ و سامعہ کے ذریعہ سے جو احساسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں وہ ان اعصاب میں رکھی رہتی ہیں۔ دونوں کا تعامل اضطراری حرکات کو مبدل بہ افعال اختیاری کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کیڑوں کو خودبخود حرکت کرنے والی کلوں پر جن میں انتقاش فوری ردعمل کا مستلزم ہے فوقیت حاصل ہے۔

ہر مرکز عصبی کا فعل عام اس سے کہ وہ مرکز ترقی کے درجہ اعلیٰ میں ہو یا ادنیٰ میں ایک اصول حالت کیمیاوی کے تابع ہوتا ہے جسے اکساد سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود انسان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ خون جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے ایک لحہ کے لئے روک دیا جائے تو نظام عصبی کی طاقت زائل ہو جاتی ہے اور اگر کم کر دیا جائے تو مقدار کم شدہ کی مناسبت سے کم ہو جاتی ہے لیکن اگر بڑھا دیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ آکسیجن سے ملی ہوئی نائٹروجن تنفس کے ذریعہ سے پھیپھڑوں میں پہنچائی جائے تو اعصاب کی عملی قوت اسی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدل ما تیحلل کی ضرورت واقع ہوتی ہے اور تکان اور بیداری کے بعد آرام کرنا اور سونا لازمی ہے۔

اشیائے خارجی کے ہر ادراک کے ساتھ دو اصولی خیالات لازمی طور پر وابستہ ہیں۔ یعنی زمان و مکان۔ ان دونوں تصورات کے لئے نظام عصبی میں ابتدا ہی سے جب کہ وہ ناقص و غیر مکمل ہوتا ہے گنجائش رکھ دی جاتی ہے۔ آنکھ سے مکان کا احساس ہوتا ہے اور کان سے زمان کا اور ان دونوں اعضا کی مکمل ساخت نے ادراک زمان و مکان کو اس قدر صحیح کر دیا ہے کہ اگر صرف قوت لامسہ ہی سے کام لیا جاتا تو ہرگز اتنا صحیح ادراک نہ ہو سکتا۔

سلسلۃ الاعصاب کی لوح پر ارتسام نقوش کی کیفیت چند سادہ تجربوں سے واضح ہو سکتی ہے۔ اگر کسی سرد مجلا و آبدار دھات مثلاً" ایک نئے استرے کے پھل پر کوئی شے مثلاً" ایک قرص رکھ دیا جائے اور سانس کی بھاپ دے کر نمی کے خشک ہو جانے کے بعد قرص کو اٹھا لیا جائے تو اگرچہ نہایت غور سے دیکھنے پر بھی استری کی آبدار سطح پر کوئی شکل نظر نہ آئے گی لیکن اگر منہ سے پھر بھاپ دی جائے گی تو قرص کا دھندلا سا سایہ نمودار ہو جائے گا اور یہ عمل ایک دفعہ نہیں بلکہ مکرر کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اگر استرے کو بحفاظت تمام بند

کر کے ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں اس کے پھل کی آب و تاب میں فرق نہ آنے پائے تو کئی مہینے کے بعد جب پھر اس کو منہ سے بھاپ دی جائے گی تو قرص کا سایہ موہوم پہلے کی طرح نظر آنے لگے گا۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناچیز سے ناچیز نقش اس طور پر قائم ہو کر محفوظ رہ سکتا ہے۔ پس ایک ایسی جمادی و غیر عضوی سطح پر ایک امٹ نقش نمودار ہو سکتا ہے تو اس لوح اعصابی پر تو اسے بدرجہ اولی مرتسم ہونا چاہئے جسے صانع قدرت نے تیار ہی اسی مقصد سے کیا ہے۔ کوئی سایہ بھی دیوار پر ایسا نہیں پڑتا جو اپنا مستقل نشان وہاں نہ چھوڑ جاتا ہو اور اگر مناسب تدابیر عمل میں لائی جائیں تو یہ نشان ظاہر ہو سکتا ہے۔ عکسی تصاویر کا عمل اس دعوے کا ثبوت ہے۔ ہمارے احباب و اقارب کی تصویریں اور مناظر قدرت کے نقشے آئینہ عکسی کی ذی الحس سطح پر گو ہمیں آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے لیکن جب مناسب ادویہ کا استعمال کیا جائے تو وہ جھٹ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گویا ایک پری ہے جو ہمارے عمل سے شیشہ میں اتر آتی ہے اور وہ پیکر جمالی جو پہلے جلباب خفا اوڑھے ہوئے تھا چہرے سے نقاب الٹ دیتا ہے۔ ہمارے مخفی سے مخفی خلوت کدہ میں جہاں ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا اور کسی نامحرم کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہمارے تمام افعال و اعمال کے نشانات و آثار موجود ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے کیا ہے اس کی ایک دھندلی سی تصویر سیاہ سایہ کی شکل میں نقش دیوار بنی ہوئی پائی جائے گی۔

اگر کچھ دیر تک پلکیں بند رکھنے کے بعد مثلاً" صبح کو جاگتے وقت ہم یکایک ٹکٹکی باندھ کر کسی روشن چیز کی طرف دیکھتے رہیں اور پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں تو جس غیر محدود تاریکی کا میدان ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہو گا اس میں اس چیز کا سایہ ہمیں نظر آئے گا۔ یہ سایہ کوئی خیالی شے نہ ہو گا بلکہ فی الحقیقت موجود ہو گا اس لئے کہ اصل شے کی جن باریکیوں پر چشم زدن میں ہمیں غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا وہ ہمیں اس سایہ میں نظر آ سکتی ہیں۔ مثلاً" جاگتے وقت جس چیز پر اول اول ہماری نظر پڑی وہ اگر جالی کا پردہ تھا جس میں پھولدار لیس ٹکی ہوئی تھی یا درخت کی شاخیں تھیں جو ہماری خوابگاہ کے دریچہ کے باہر اگا ہوا تھا تو پلکیں بند کرنے کے بعد پردے یا شاخ درخت کی پوری تصویر بلا کم و کاست ہماری آنکھوں میں پھر جائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ تصویر دھندلی ہوتی جاتی ہے اور ایک دو منٹ میں بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر موج خلا میں تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر ہم آنکھ کی پتلی کو حرکت دے کر اس صورت طلسمی کا پیچھا کرنا چاہتے ہیں تو وہ

یک بیک نگاہ سے غائب ہو جاتی ہے۔

مشبکہ یعنی آنکھ کے پہلے پردے پر نقوش کے اس امتداد سے ثابت ہوتا ہے کہ اعصاب منفوط پر خارجی اثرات کا عارضی و آنی ہونا کچھ ضروری و لازمی نہیں ہے۔ آنکھ کے ان نقوش اور عکسی تصاویر کے نقوش میں امتداد و انجلا و انطفا کے لحاظ سے پوری مطابقت پائی جاتی ہے۔ مثلاً" ہم نے میکسیکو کے مناظر و اماکن کی ایسی عکسی تصویریں دیکھی ہیں جن کی نسبت عکاسوں کا بیان ہے کہ شیشہ عکسی پر مہینوں بعد نیویارک میں یہ ادویہ کا عمل کیا گیا اور جب اس سفر طویل اور مدت مدید کے بعد تصویریں شیشہ پر ابھر کر کاغذ پر اتریں تو خط و خال اور نوک پلک کے لحاظ سے اصل اور نقل میں سرمو فرق نہ تھا۔ گویا شیشہ عکسی نے اپنی ودیعت کو پوری طرح سے ادا کر دیا۔ ہمیشہ قائم رہنے والے سربفلک پہاڑوں کا ڈیل ڈول اور ڈاکوؤں کے کسی گروہ کے الاؤ کا کچھ دیر میں غائب ہو جانے والا دھواں کوئی تفصیل ایسی نہ تھی جو تصویر میں رہ گئی ہو۔

ان واقعات کے مشاہدہ کے بعد یہ سوال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آلات حس نے جن نقوش کو خارجی اشیا سے فراہم کیا ہے آیا ان کے آثار جس طرح مشبکہ میں عارضی طور پر قائم رہتے ہیں دماغ میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوتے ہیں؟ کیا قوت حافظہ کے معنی یہی ہیں کہ روح حوادث گذشتہ و واقعات ماضیہ کی ان تصاویر کو جو اس کے سپرد کر دی گئی ہیں مستحضر رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں؟ کیا اس کے نگار خانہ میں جہاں خاموشی کا عالم طاری ہے زندوں اور مردوں کی ننھی ننھی تصویریں اور دیکھے ہوئے مناظر اور آزمائے ہوئے واقعات کے نقشے لٹکے ہوئے ہیں؟ کیا یہ مستقل اور دیرپا نقوش کسی کتاب کے حروف کی طرح محض وہ علامتیں ہیں جو دماغ میں خیال پیدا کرتی ہیں یا اشیائے خارجی کی ایک نہایت ہی چھوٹے پیمانہ پر حقیقی شبیہیں ہیں جن کو خردبین کی مدد سے دیکھ کر ہمیں اتنی سی جگہ میں جو سوئی کے سوراخ سے زیادہ نہیں پورے کنبہ کا مرقع ایک نگاہ میں نظر آ جاتا ہے؟

مشبکہ پر جو خیالی تصاویر نقش ہوئی ہیں وہ دن کی روشنی میں نظر نہیں آ سکتیں۔ اسی طرح وہ تصاویر جو پردہ حس مشترک پر اتری ہوئی ہیں اس وقت تک ہماری توجہ کو اپنی طرف مائل نہیں کرتیں جب تک کہ آلات حس اپنے کام میں چستی اور مستعدی سے مصروف رہ کر نئے نئے نقش حس مشترک کے لئے جمع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب یہ آلات تھک کر سست پڑ جاتے ہیں یا جب ہمیں سخت فکر دامنگیر ہوتی ہے یا جھٹ پٹے کے

وقت ہم بیٹھے ہوئے کسی سوچ میں محو ہوتے ہیں یا جب ہم سو رہے ہوتے ہیں تو یہ مخفی صورتیں اپنے نہاں خانہ سے نکل آتی ہیں اور چونکہ اس وقت ان کا امتیاز بوجہ تقابل و تضاد نمایاں ہو جاتا ہے اس لئے یہ صاف صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بخار کی حالت میں جب ہم پر ہذیان طاری ہوتا ہے یا موت کے وقت جب ہم عالم سکرات میں ہوتے ہیں تو یہ چھپی چھپائی تصویریں ہمارے ساتھ آ کھڑی ہوتی ہیں۔ ہماری زندگی کا ایک تہائی حصہ نیند میں گذرتا ہے اور اس زمانہ میں ہم پر عالم خارجی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سامعہ باصرہ اور دوسرے قوا معطل ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی نہ آنکھ جھپکنے والی اور ہر وقت فکر میں ڈوبی رہنے والی نقاب پوش ساحرہ یعنی روح اپنے کنج تنہائی سے ان تصویروں پر نظر ڈالتی رہتی ہے جو اس نے جمع کی ہیں۔ یہ تصویریں نہ مٹ سکتی ہیں اور نہ ان کا نور گہنا سکتا ہے اور ان کو طرح طرح سے ترکیب دے دے کر وہ اس دلکشا اور حیرت انگیز مرقع کی تیاری کا سامان کرتی ہے جسے خواب کہتے ہیں۔

اس طور پر قدرت نے انسان کی جسمانی ساخت کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا ڈالا ہے کہ بقائے روح اور حیات اخروی کے تصورات بے اختیار اس کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ غیر مہذب وحشی کو بھی جس کی روح پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے عالم رویا میں وہ سہانے جنگل اور دلفریب مرغزار نظر آتے ہیں جو اس کی یاد کا سب سے زیادہ خوشگوار حصہ ہیں۔ ان غیر حقیقی اور موہوم تصاویر سے وہ بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتا ہے کہ وہ سایہ ہیں اس دلکشا حقیقت کا جو اسے ایک آنے والی زندگی میں نظر آئے گی۔ کبھی کبھی خواب میں اسے ان گذرے ہوئے لوگوں کی صورتیں بھی نظر آ جاتی ہیں جن میں سے زندگی کی حالت میں کوئی اس کا دوست رہ چکا ہے اور کوئی دشمن۔ ظاہر ہے کہ عالم خواب کے ان مظاہر کو وہ روح کے وجود و بقا کی محبت قاطع سمجھتا ہے۔ خود ہم بھی جن کی تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر ہے اس قسم کے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور جو نتائج ہمارے غیر مہذب آباؤ اجداد نے ان سے اخذ کئے تھے وہی ہم بھی نکالتے ہیں۔ ہماری اعلیٰ درجہ کی تہذیب و شائستگی جس طرح ہمیں کمزوریوں اور بیماریوں سے نہیں بچا سکتی اسی طرح مقتضیات فطرت کی قید سے بھی آزاد نہیں کر سکتی۔ ان اعتبارات سے روئے زمین کے کل انسان مساوی الحیثیت ہیں۔ ہم خواہ وحشی ہوں خواہ تہذیب یافتہ لیکن اس سے ہم کو کسی طرح مفر نہیں کہ ہماری فطرت فنا اور بقا کی ان حقیقتوں کو جن سے زیادہ مہتم بالشان اور قلب کو مرعوب کرنے والی حقیقت اور کوئی نہیں ہو سکتی ایک نہ ایک

وقت ہمارے سامنے پیش کر کے رہتی ہے۔ ان حقیقتوں کے انکشاف کے لئے فطرت انسانی کسی موزوں موقع کی منتظر رہتی ہے اور یہ موقع اس وقت آتا ہے جب ہم انفراغ یا بیماری کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہماری فطرت اپنا پورا عمل کرتی ہے اور ہم بھی اس وقت اس کی حقائق آموزیوں سے متنبہ ہونے کے لئے پوری طرح تیار ہوتے ہیں۔ اس فطرت کا عمل سب پر یکساں ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک غریب یا امیر جاہل عالم سب برابر ہیں۔ مغرور سے مغرور اور متکبر سے متکبر شخص اس کی سرزنش اور نصیحت سے نہیں بچ سکتا اور مسکین سے مسکین اور عاجز سے عاجز شخص کو بھی حقیقت عقبی کی معرفت کی تسکین سے یہ محروم نہیں رکھتی۔ اس پر کسی کی سازش یا خودغرضی کا جادو نہیں چلتا۔ انسانی کوشش کی خارجی تائید کی اس کے نہ ٹلنے والے اثر کو پرواہ نہیں۔ ہر انسان کے ساتھ خواہ وہ کہیں بھی کیوں نہ جائے یہ برابر سایہ کی طرح لگی رہتی ہے۔ گذشتہ تصورات کے آثار و باقیات سے حیرت انگیز صفائی کے ساتھ عالم عقبی کی آنے والی حقیقتوں کی ناممکن التردید شہادتوں کا استخراج اس کا کام ہے۔ یہ اس سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہے جو ظاہر بین نگاہوں کو خشک نظر آتا ہے۔ اور ان وہمی و خیالی شبیہوں سے جو ظاہر ہوتے ہیں غائب ہو جاتی ہیں ہمارے صورت کردہ ایقان کے لئے ان لعبتوں کو تیار کرتی ہے جو فنا و زوال کی رہین منت نہیں ہیں۔

کیڑے اور کل میں یہ بڑا فرق ہے کہ ایک متحرک بالذات ہے اور ایک متحرک بالارادہ۔ بالفاظ دیگر کل میں خارجی تحریک کے پہنچتے ہی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور کیڑے پر ان تحریکات کا بھی اثر ہوتا ہے جن کا داخلہ دماغ میں موجود سے یعنی جو پہلے سے دماغ پر نقش ہو چکی ہیں۔ حیوانات کے طبقہ اعلی میں اس تجیل نقوش کا عمل زیادہ کامل و مکمل ہوتا ہے اور قوت حافظہ زیادہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی خارجی شکل میں اور اس کے اس نقش میں جو نوع السلعہ پر مرتسم ہو کوئی مشابہت پائی جائے اس لئے کہ اس پیغام تار برقی کے الفاظ میں جو تار گھر میں داخل کیا جاتا ہے اور ان علامات میں بھی تو کوئی مشابہت نہیں ہوتی جن کے ذریعہ سے یہ پیغام ایک مقام سے دوسرے مقام دور دراز تک پہنچایا جاتا ہے۔ علی ہذا القیاس کسی چھپی ہوئی کتاب کے حروف اور ان افعال یا مناظر میں بھی کوئی تطابق شبی نہیں پایا جاتا جن کا اظہار بذریعہ حروف کیا گیا ہے۔ البتہ حروف سے واقعات و مناظر کی تصویر پڑھنے والے کے پردہ ذہن پر صفائی سے اتر آتی ہے۔

آلات حفاظت نقوش سے جو حیوان محروم ہو اس کی حقیقت متحرک بالذات کل سے زیادہ نہیں۔ اس میں قوت حافظہ نہیں ہو سکتی۔ ان آلات کا ابتدائی مواد نہایت ہی بے حقیقت و غیر متیقن ہوتا ہے لیکن اسی مواد سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے یہ آلات درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ترقی کی بڑھتی رفتار کے ساتھ فہم و شعور اور ادراک کی قابلیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ انسان کے آلات تحفظ و تسجیل نقوش منتہائے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اس کے گذشتہ و موجودہ نقوش اس کے لئے دستور العمل کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ تجربہ کو اپنا رہنما قرار دیتا ہے اور اس کے افعال عقل کی ہدایت سے صادر ہوتے ہیں۔

جب کسی حیوان میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ان نقوش کا علم جن کا ذخیرہ اس کے مراکز عصبی میں جمع ہے اسی نوع کے دوسرے حیوان پر منتقل کر سکتا ہے تو ترقی کی ایک بہت بڑی منزل طے ہو جاتی ہے۔ یہ ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ انفرادی زندگی نے اجتماعی یا عمرانی زندگی کی شکل اختیار کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ کیفیات ذہنی کے انتقال کی قابلیت یعنی تعلیم مدنیت کے لئے لازمی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے کیڑے اپنے خیالات کا اظہار ایک دوسرے پر سریع الحس لامسہ روئنگٹوں کے تماس سے کرتے ہیں اور انسان کا ذریعہ اظہار معلومات تکلم ہے۔ بنی نوع انسان اپنے ابتدائی دور یعنی زمانہ جاہلیت میں اپنی معلومات کا اظہار اپنے ابنائے جنس پر صرف باہمی گفتگو کے ذریعہ سے کر سکتے تھے۔ اس طور پر ایک نسل کے افعال اور خیالات دوسری نسل کو ترکہ میں پہنچتے تھے اور اس کے افعال و خیالات پر اپنا اثر ڈالتے تھے۔

لیکن زبانی روایت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ قوت گویائی کی بدولت انسان مل جل کر رہنے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ تمدنی ترقی نہیں کر سکتا۔

قوت گویائی کے سلسلہ ارتقا کا مشاہدہ خالی از دلچسپی نہیں۔ فن تحریر کی ایجاد نے نقوش کے اندراج و تسجیل کو شان وسعت و دوام عطا کی۔ جو نقوش اب تک صرف ایک انسان کے دماغ میں جمع تھے ان سے تمام نوع انسان ہر زمانہ میں مستفید ہونے کے قابل ہو گئی۔ اس قابلیت نے تمدن کو ممکن کر دیا اس لئے کہ تحریر یا کسی ایسے ذریعہ کے بغیر جس سے واقعات کسی نہ کسی شکل میں محفوظ رہ سکیں تمدن کا وجود ممکن نہیں۔

اس فلسفیانہ پہلو سے اگر ہم غور کریں تو ہمیں چھاپے کی ایجاد کی اصلی قدرومنزلت معلوم ہو گی۔ چھاپہ تحریر کے ارتقا کا وہ درجہ ہے جو خیالات کو روز بہ سرعت کے ساتھ شائع کرنے اور انہیں ہمیشہ کے لئے قائم و برقرار رکھنے سے بنی نوع انسان کی ترقی تہذیب

اور اتحاد و ارتباط باہمی کا باعث ہوتا ہے۔

ذرات عصبی کی لوح پر نقوش کے ارتسام اور ان کی تسجیل اور ان کے نتائج کے متعلق جو کچھ میں نے گذشتہ فقروں میں بیان کیا ہے وہ دراصل ان خیالات کا خلاصہ ہے جو میری کتاب "ہیومن فزیالوجی" (ترکیب اعضائے انسانی) میں بوضاحت درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ جن ناظرین کو تفصیل مطلوب ہو وہ اس کتاب کی وہ فصل ملاحظہ فرمائیں جس کا عنوان "بصارت مقلوب یا دماغی بینائی" ہے۔ اس کے علاوہ مقالہ اول کی فصل چہاردہم اور مقالہ دوم کی فصل ہشتم کا مطالعہ بھی خالی از فائدہ نہ ہو گا۔

روح انسانی کی صحیح ماہیت کا اگر سراغ لگ سکتا ہے تو اس کی شکل یہی ہے کہ اس کا مقابلہ روح حیوانی سے کیا جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ وقت طلب ہے اور بہت کچھ وقت اور محنت اس پر خرچ کرنی پڑتی ہے لیکن اس کے نتائج کی صحت میں بھی کلام نہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر کیا ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ مادہ کی طرح روح کا بھی ایک عظیم الشان وجود کائنات کی رگ و پے میں ساری و دواری ہے اور یہ روح ایک بہت بڑے جرمن فلسفی کے قول کے مطابق "پتھروں میں سوتی ہے جانوروں کے قالب میں آ کر خواب دیکھتی ہے اور انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہی جاگ اٹھتی ہے؟" کیا جسم کی طرح جو مادہ سے بنتا ہے روح بھی روحانی وجود سے پیدا ہوتی ہے؟ کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد اپنے اپنے مخارج کو لوٹ جاتے ہیں یعنی جسم مادہ میں جا ملتا ہے اور روح روح میں جا شامل ہوتی ہے؟ اگر حقیقت حال یہی ہے تو پھر ہم وجود انسانی کی تاویل کر سکتے ہیں اور یہ تاویل حقائق علمی کے ساتھ تطابق کلی رکھ سکتی ہے یعنی ہمارا یہ خیال کہ نظام کائنات دائم و قائم اور غیر تغیر پذیر ہے اس تاویل سے باطل نہیں ہونے پاتا۔

عربوں نے دوسری مشرقی اقوام کی تقلید کر کے اس ہمہ گیر روحانی وجود کا نام "عقل فعال" رکھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح مینہ کا قطرہ سمندر سے نکل کر کچھ دیر بعد پھر اسی میں جا ملتا ہے اسی طرح انسان کی روح عقل فعال یعنی خدا سے صادر ہو کر ایک مدت معینہ کے بعد اسی کے ساتھ واصل ہو جاتی ہے۔ اس طور پر مسلمانوں میں مسئلہ انفصال و انجذاب کا ظہور ہوا۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ہندوستان میں ساکی منی نے اس مسئلہ کو ایک صورت میں مسلم الثبوت قابلیت کے ساتھ رواج دے کر مذہب بدھ کا مدار علیہ بنایا۔ اسی مسئلہ کو دوسری شکل میں ابن رشد نے عربوں میں رائج کیا۔ لیکن ساکی منی کا طریقہ تعلیم

ابن رشد کے مقابلہ میں زیادہ استادانہ تھا۔

لیکن یہ رائے شاید زیادہ تر قرین صواب ہو گی کہ اہل یورپ ابن رشد ہی کو اس مسئلہ کا بانی قرار دیتے ہیں اس لئے کہ ان کی نظروں سے وہ سلسلہ اسناد جو ابن رشد کو مسئلہ مذکور کے موجدوں سے ملاتا ہے پوشیدہ تھا۔ یورپ والے چاہے ابن رشد کو کیسی ہی وقعت کی نظر سے کیوں نہ دیکھیں لیکن مسلمانوں نے تقدیم کا سہرا اس کے سر نہیں رہنے دیا۔ وہ ان کے نزدیک محض شارح ارسطو تھا اور اس کی حیثیت ان کے نزدیک اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ مدرسہ اسکندریہ اور اپنے زمانہ تک کے دوسرے فلسفیانہ مسالک کا ناقل تھا۔ ذیل کا اقتباس موسیو رینان کے اس تاریخی مضمون سے ہے جو اس نے فلسفہ ابن رشد پر لکھا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا خیال اس کے فلسفہ کی نسبت وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا۔

اس مذہب (فلسفہ ابن رشد) کے پیرؤوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کا جوہر عقلی یعنی روح جداگانہ طور پر قائم نہیں رہتی بلکہ اس عالمگیر روح یا عقل فعال یا روح کائنات یعنی خدا کی طرف رجوع کر کے اس میں جذب ہو جاتی ہے جس سے ابتدا" اس کا صدور یا خروج یا انفصال ہوا تھا۔

عقل کل یا عقل فعال یا عقل موجود فی الخارج نہ مخلوق ہے نہ اس میں کسی شے کا نفوذ ممکن ہے۔ نہ وہ فساد پذیر ہے۔ نہ اس کی ابتدا و انتہا ہے اور نہ اس میں انفرادی ارواح کی تعداد کی زیادتی سے زیادتی واقع ہوتی ہے۔ وہ مادہ سے بالکل منزہ ہے۔ وہ گویا نظام کائنات کا جوہر یا طاقت ہے۔ عقل فعال کا یہ توحد ابن رشد کے فلسفہ کا اصل اصول ہے اور اسلام کے اصولی و انتہائی عقیدے یعنی وحدت واجب الوجود کے ساتھ توافق و تطابق رکھتا ہے۔

عقل منفرد یا عقل انفصالی یا عقل موجود فی الذہن عقل کل سے صادر ہوئی ہے اور انسان کی روح پر مشتمل ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ عقل فانی ہے اور اس کا خاتمہ جسم کے ساتھ ہو جاتا ہے مگر دوسرے اعتبار سے یہ غیر فانی بھی ہے اس لئے کہ موت کے بعد اس کی رجعت عقل کل کی طرف ہوتی ہے جس میں یہ ضم یا جذب ہو جاتی ہے اور اس طور پر تمام ارواح انسانی کے ہمہ گیر روح میں ملنے سے آخر میں صرف ایک روح یعنی یہی ہمہ گیر روح باقی رہ جاتی ہے جو سب کا مجموعہ ہے۔ زندگی کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں بلکہ اس کی مالک قدرت ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد انتہائی یہی ہے کہ عقل فعال کے ساتھ اس کا

اتحاد شان اکملیت لئے ہوئے ہو۔ یہی اتحاد یا انضمام یا وصال روح کے لئے مایہ سرور جاودانی ہے۔ کاتب تقدیر نے ہماری لوح مقدر کا عنوان سکون و طمانیت قرار دیا ہے اور اسی کے حصول کے لئے ہم کو کوشش کرنی چاہئے۔ ابن رشد کا خیال یہ تھا کہ روح کے جسم سے جدا ہوتے ہی عقل منفرد عقل کل میں جذب ہو جاتی ہے لیکن بدھ مذہب والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ فنائے کامل یعنی نروان کے مقام تک پہنچنے میں روح کو کچھ مدت لگتی ہے اور اس اثنا میں انسان کی شخصیت برقرار رہتی ہے لیکن اس میں انحطاط و زوال شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے بالکل فنا ہو جاتی ہے۔

فلسفہ نے نظام کائنات کی توجیہ کے ہمیشہ دو پہلو اختیار کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک مخصی خدا ہے جس کا وجود سب سے علیحدہ ہے اور اس کا ضمیمہ ایک انسانی روح ہے جسے خدا نے پیدا کیا ہے اور جو حدوث کے بعد غیرفانی ہو جاتی ہے۔ دوم یہ کہ ایک غیر مخصی عقل یا غیر معین خدا ہے جس میں سے روح نکلتی ہے اور ایک مدت مقررہ کے بعد اسی میں جا کر مل جاتی ہے۔ موجودات کی تکوین کے متعلق بھی دو متضاد خیالات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عدم سے وجود میں لائی گئی۔ دوسرے یہ کہ وہ اشکال و صور سابقہ سے نشوونما پا کر موجودہ حالت میں پہنچی۔ مسئلہ پیدائش نظریہ اول سے متعلق ہے اور مسئلہ ارتقا نظریہ ثانی سے تعلق رکھتا ہے۔

اس طور پر عرب فلسفہ کی اسی شاہ راہ پر چلے جس پر اہل چین و اہل ہند غرض مشرق کی تمام قومیں چلی تھیں۔ اس فلسفہ کے معرکتہ الارا مسائل کا انحصار اس واقعہ کے اعتراف پر تھا کہ مادہ اور قوت کو فنا نہیں۔ اس نے جب دیکھا کہ قدرت میں جو بے پایاں ذخیرہ مادہ کا موجود ہے اس سے انسان کا جسم ترکیب پاتا ہے اور فنا ہونے پر اسی میں جا کر مل جاتا ہے تو لامحالہ اسے یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ انسان کی روح بھی عقل کل یا ذات باری تعالیٰ سے صادر ہوتی ہے اور بالآخر اس میں جا کر جذب ہو جاتی ہے۔

مسئلہ انفصال و انجذاب کی فلسفیانہ خصوصیات پر کافی وضاحت کے ساتھ نظر ڈالنے کے بعد ہم اب اس کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ یورپ میں اس مسئلہ نے اندلسی عربوں کی بدولت رواج پایا۔ اسپین وہ مرکز تھا جہاں سے اس کی شعاعیں نکل نکل کر یورپ کے علمی و عقلی حلقوں میں پھیلیں اور اسپین ہی میں اس کا حسرت ناک خاتمہ ہوا۔

خلفائے اندلس نے مشرقی عیش و عشرت کے کل لوازم فراہم کر رکھے تھے۔ ان کے قصر و ایوان شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کے دلفریب باغوں کی

فضائیں دیکھ کر آنکھوں میں طلسمات کا نقشہ پھر جاتا تھا۔ ان کی حرم سراؤں میں ایسی ایسی نازنینیں موجود تھیں جن کا حسن چاند اور سورج کو شرماتا تھا۔ یورپ کی تہذیب آج کے دن بھی اس سلیقہ اس قرینہ اور اس لطافت مذاق سے معرا ہے جو اندلسی عربوں کے پایہ تخت میں اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ ان کے شہروں میں کوئی سڑک ایسی نظر نہ آتی تھی جس پر کنکر کٹے ہوئے نہ ہوں اور جو رات کے وقت قندیلوں سے نہ جگمگاتی ہو۔ ان کے مکانات نقش و نگار سے مزین اور قالینوں کے پر تکلف فرش سے آراستہ ہوتے تھے۔ جاڑوں میں انہیں دہکتے ہوئے تابدان گرم رکھتے تھے اور گرمیوں میں معطر اور معنبر ہوا جو پھولوں کی کیاریوں سے چل کر زمین دو زنلوں میں سے ہوتی ہوئی آتی تھی انہیں خوشگوار ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔ نفیس حمام۔ شاندار کتب خانے۔ کھانا کھانے کے فرحت افزا کمرے۔ پانی اور سیماب کے دلربا فوارے ان کے تمدن کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ ہر شہر اور ہر قریہ میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ بانسری اور چنگ کی تال پر جابجا محفل رقص و نشاط گرم نظر آتی تھی۔ لیکن ان پر لطف صحبتوں میں اس بدمستی و بدتمیزی کا رنگ نظر نہ آتا تھا جو مسلمانوں کے پھوہڑ اور گنوار شمالی ہمسایوں کے جلسوں میں عام طور سے پایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ہاں شراب قطعاً" ممنوع تھی۔ اندلس کی دلفریب چاندنی راتوں کا لطف مسلمان امرا طرح طرح سے اڑاتے تھے۔ کوئی چمن میں بیٹھا ہوا داستان گویوں کے افسانوں سے جی بہلاتا تھا۔ کوئی باغ کی روشوں میں دوست احباب کے ساتھ ٹہلتا ہوا فلسفیانہ مباحث میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ غرض ان کا وقت نہایت لطف سے کٹتا تھا اور اگر کبھی انہیں اس زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کا خیال آتا تھا تو یہ سوچ کہ ان کو تسکین ہو جاتی تھی کہ نیکی کا اجر اسی دنیا میں مل جائے تو عالم عقبی بیکار ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے کبھی نہ گھبراتے تھے بلکہ اس خیال سے دل کو تشفی دے لیتے تھے کہ گو اس دو دن کی زندگی میں ہم محنت اور تکلیف اٹھا رہے ہیں لیکن موت کے بعد جب ہم دوسری زندگی کی سرزمین میں قدم رکھیں گے تو وہ آرام ہمارے حصہ میں آئے گا جس کے بعد کوئی محنت نہیں۔

دسویں صدی میں خلیفہ حاکم ثانی نے اندلس کو فردوس عالم بنا دیا تھا۔ عیسائی مسلمان اور یہودی بے روک ٹوک آپس میں ملتے تھے اور ایک عالمگیر برادری قائم ہو گئی تھی جس کا شیرازہ مساوات سلوک نے باندھ رکھا تھا۔ اس زمانہ کے جن مشاہیر کے نام ہم تک پہنچے ان میں جربرٹ کا نام بھی شریک ہے جو آگے چل کر پاپائے اعظم ہو گیا۔ پیٹر الملقب بہ مقدس اور دوسرے بہت سے عیسائی پیشوایان مذہب بھی اسی عہد کے خرمن فضل و کمال

کے خوشہ چین تھے۔ پیٹر کا بیان ہے کہ میں نے ایسے علما کو یہاں دیکھا جو فن ہیئت کی تحصیل کے لئے برطانیہ سے چل کر آئے تھے۔ ارباب فضل و کمال کا عام اس سے کہ وہ کہیں کے ہوں یا کیسے ہی مذہبی عقائد کیوں نہ رکھتے ہوں نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ خود خلیفہ کے محل میں کتابوں کا ایک بہت بڑا کارخانہ موجود تھا جس میں کاتبوں جلد سازوں اور نقاشوں کی ایک جماعت کثیر ملازم تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے ہر بڑے شہر میں خلیفہ کے گماشتے مقرر تھے جن کا یہی کام تھا کہ جو نادر کتاب ملے فوراً" خرید لیں۔ اس کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں جن کے منقش اوراق اور پر تکلف جلدیں بصارت کے لئے سرمہ کا حکم رکھتی تھیں۔

لیکن ایشیا کے تمام اسلامی ممالک اور نیز افریقہ و اسپین کے ادنیٰ طبقہ کے مسلمان علم کے جانی دشمن تھے۔ جن کا زہد و اتقا ذرا زیادہ بڑھا ہوا تھا اور جنہیں پابندی شرع کا دعویٰ شدومد کے ساتھ تھا انہیں تو خلیفہ المامون تک کی نجات میں شک تھا۔ چنانچہ ان کا یہ قول تھا کہ اس شریر خلیفہ نے ارسطو اور دوسرے یونانی کفار کی تصانیف کو رواج دے کر نہ صرف خلق خدا میں ایک ہل چل ڈال دی ہے بلکہ بہشت اور دوزخ کے وجود کو بھی یہ کہہ کر کہ زمین گول ہے اور ناپی جا سکتی ہے وہمی و خیالی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان لوگوں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ تھی لہٰذا وہ انتظام سلطنت میں بھی دخیل ہو گئے تھے۔

المنصور نے جو حاکم کے بیٹے کو بے دخل کر کے خلافت خود غصب کر بیٹھا تھا۔ خیال کیا کہ اگر میں مذہبی جماعت کا ساتھ دوں گا تو میرے قدم جم جائیں گے۔ لہٰذا اس نے حکم دیا کہ حاکم کے کتب خانہ میں جتنی علمی یا فلسفیانہ کتابیں پائی جائیں سب ضائع کر دی جائیں۔ چنانچہ ہزارہا کتابیں شارع عام پر جلا دی گئیں یا محل کے حوضوں میں ڈبو دی گئیں اور اس طور پر علم و حکمت کا وہ نادر ذخیرہ جو حاکم ثانی کے مذاق سلیم نے سالہا سال کی محنت اور لاکھوں روپیہ کے خرچ سے جمع کیا تھا منصور کی خودغرضی اور جہلا کے تعصب کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ اسی طرح کے ایک درباری انقلاب کے باعث ابن رشد (المتوفی ۱۱۹۸ء) بڑھاپے میں اسپین سے ملک بدر کیا گیا۔ مذہبی جماعت نے فلسفی جماعت پر فتح پائی اور ابن رشد دشمن مذہب قرار دیا گیا۔ تمام اسلامی دنیا میں فلسفہ کی مخالفت کی جانے لگی۔ ایک بھی فلسفی اس زمانہ میں ایسا نہ تھا جسے سزا نہ ملی ہو۔ بعض سزایاب ہوئے بعض جان سے مار ڈالے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیائے اسلام ریاکاروں سے بھر گئی۔

اٹلی۔ جرمنی اور انگلستان میں ابن رشد کا فلسفہ چپکے چپکے پہنچ گیا تھا۔ فرانسکن فرقہ کے پادریوں نے اس فلسفہ کو خاص وقعت کی نظر سے دیکھا اور پیرس کی یونیورسٹی اس کا مرکز بن گئی۔ بہت سے لوگوں نے جنہیں مبداء فیاض سے جو ہر فکر سلیم عطا ہوا تھا اسے تسلیم کرلیا اور اس کا حلقہ اثر وسیع ہو چلا۔ لیکن آخرکار فرقہ ڈامینکن نے جو فرقہ فرانسکن کا رقیب تھا اس کی مخالفت شروع کی۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ ابن رشد کا فلسفہ ذات اور شخصیت کے تصور کو مٹا دیتا ہے جبریہ خیالات کی اشاعت کرتا ہے اور عقول منفردہ کے اختلافات مدارج اور ترقی کی کوئی توجیہ نہیں پیش کر سکتا۔ یہ دعوی کہ کائنات میں صرف ایک عقل کا وجود ہے غلط محض ہے اس لئے کہ اس سے اولیا کی کرامت اور تصرفات روحانی کی نفی ہو جاتی ہے اور انسانوں کے مدارج میں کوئی فرق قائم نہیں رہتا۔ کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ پیٹر کی مقدس اور یہودا کی ملعون روح میں کوئی فرق نہ ہو بلکہ دونوں کا درجہ برابر ہو؟ ابن رشد کا یہ ملحدانہ مسلک پیدائش۔ تائید ایزدی۔ الہام۔ اقانیم ثلثہ۔ استجابتہ دعا۔ ثواب خیرات اور قبولیت استغفار کا منکر ہے۔ حشر اجسام اور بقائے روح کو باطل قرار دیتا ہے اور محض حظ نفس کو موجب سعادت دارین خیال کرتا ہے۔

اسی طرح یہودیوں میں بھی جو اس زمانہ میں صدر نشینان بزم اور اک متصور ہوتے تھے فلسفہ ابن رشد عام طور سے پھیل گیا تھا۔ مشہور یہودی فیلسوف موسی بن میمون نے اس فلسفہ کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور اس کے شاگرد اسے دنیا کے ہر حصہ میں پھیلائے جاتے تھے۔ لیکن دفعتہ یہودیوں کے اس طبقہ نے جس کا میلان مذہب کی طرف تھا اس فلسفہ کی مخالفت بڑے زور و شور سے شروع کی۔ میمون کو پہلے وہ ازراہ فخر "راس العلما۔ فرزانہ دوران۔ مایہ نازش سرزمین مغرب۔ آفتاب ارض مشرق" کا لقب دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ انسانوں میں اس کا درجہ اگر کسی سے کم ہے تو صرف حضرت موسیٰؑ سے۔ لیکن اب انہوں نے کہنا شروع کیا کہ میمون دین ابراہیمؑ چھوڑ بیٹھا ہے۔ پیدائش کے امکان سے منکر ہے۔ دنیا کی ابدیت کا مقر ہے۔ دہریت کے عقائد کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر چکا ہے۔ خدا کو اس کی صفات سے محروم کئے دیتا ہے اور خدا کو خلایا جوف قرار دے کر یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ نہ دعا کو سن سکتا ہے اور نہ اسے انتظام عالم میں دخل ہے۔ مانٹ پلیر بارسلونا اور ٹالیڈو میں یہودیوں کی جو دینی مجلسیں قائم تھیں انہوں نے میمون کی تصانیف کو آگ میں جلا دیا اور اس طور پر فلسفہ ابن رشد کو ایک اور بہت بڑا صدمہ اٹھانا پڑا۔

فرڈیننڈ اور اسابیلا کی فتوحات نے عربوں کی حکومت اندلس کا خاتمہ کیا ہی تھا کہ پاپا نے ان فلسفیانہ عقائد کے استیصال کی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں کیونکہ پیشوایان مذہب عیسوی کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ عقائد یورپ میں مسیحیت کی جڑھ کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

پاپاء انوسنٹ چہارم (۱۲۴۳ء) کے عہد تک ملحدوں کی سزا دہی کے لئے اساقف کی دینی عدالتوں کے علاوہ کوئی خاص محکمہ موجود نہ تھا۔ لیکن جب مذہبی قوت ایک مرکز پر آ گئی تو ایک محکمہ احتساب عقائد بنام "انکویزیشن" قائم کیا گیا۔ اس محکمہ نے جسے پاپا کی صدر عدالت فوجداری کہنا چاہیئے قدیم مقامی عدالتوں کو مٹا کر خود ان کی جگہ لے لی۔ چونکہ اس محکمہ نے اساقف کے اقتدارات سلب کر لئے تھے لہٰذا انہوں نے اسے نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ مگر پاپا کی طاقت کے مقابلہ میں ان کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی بے اثر محض تھی۔ اس نئی عدالت کے مرکز اٹلی۔ اسپین۔ جرمنی اور فرانس کے جنوبی صوبوں میں قائم کیے گئے۔

دنیوی فرمانرواؤں نے "انکویزیشن" کو اپنی ملکی اغراض کی تکمیل کا آلہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ بات دینی فرمانرواؤں یعنی پاپاؤں کو سخت ناگوار گذری اور ہر پاپا نے اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یہ طاقت پادریوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔

فرانس کے جنوبی صوبوں میں "انکویزیشن" کا قیام استیصال الحاد زندقہ کے لئے نہایت موثر ثابت ہوا تھا۔ اریگان کے صوبہ میں بھی یہ عدالت قائم کی جا چکی تھی۔ اب یہودیوں کا قلع و قمع کرنے کی خدمت اس کے سپرد ہوئی۔

قدیم زمانہ میں جب قوم و زیگاتھ کے فرمانرواؤں کا دور دورہ تھا یہودی بہت خوشحال تھے لیکن جب وزیگاتھوں نے ایرئس کا وہ موحدانہ مسلک جس کی تلقین یہودیوں نے کی تھی چھوڑ کر خالص تثلیث پرستی اختیار کی تو یہودیوں کے ساتھ بجائے ترقی کے نہایت سختی کا برتاؤ ہونے لگا اور ان کے بسے ہوئے گھرانے اجڑنے لگے۔ یہودیوں کے لئے نہایت ظالمانہ اور وحشیانہ قوانین وضع کیے گئے۔ چنانچہ ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا گیا کہ ہر ایک یہودی غلام سمجھا جائے گا اور اسے آزادی کا کوئی حق حاصل نہ ہو گا۔ پس مقام تعجب نہیں ہے کہ جب عربوں نے اسپین پر حملہ کیا تو یہودیوں نے دل و جان سے حملہ آوروں کی مدد کی۔ عربوں کی طرح وہ بھی مشرقی نسل سے تھے۔ دونوں کا نسب حضرت ابراہیمؑ سے جو ان

کے مورث اعلیٰ تھے ملتا تھا۔ دونوں خدا کی وحدانیت کے معتقد تھے۔ اور اسی مسئلہ کی حمایت نے ان کے وزیگاتھ آقاؤں کو ان کا دشمن بنا دیا تھا۔

مسلمانوں کے عہد میں یہودیوں کے ساتھ نہایت ہی عمدہ برتاؤ کیا گیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنی دولت اور علم کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ ان میں سے اکثر ارسطو کے مقلد تھے۔ انہوں نے بہت سے مدرسے اور کالج قائم کئے۔ چونکہ ان کے تجارتی تعلقات ہر ملک کے ساتھ تھے لہذا دنیا کے ہر حصہ میں ان کو سفر کرنے کا موقع ملتا رہا۔ علم طب کی تحصیل کا انہیں خصوصیت کے ساتھ شوق تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کے طبیب اور مہاجن ہر جگہ یہودی ہی تھے۔ معاملات انسانی کو فلسفیانہ انتقاد کی نظر سے جانچنے کا شرف صرف انہیں کو حاصل تھا۔ طب اور فلسفہ کے علاوہ وہ ریاضی اور ہیئت میں بھی دستگاہ دانی رکھتے تھے۔ الفانسو کی زیجین انہیں کی مرتب کی ہوئی ہیں اور ڈی گاما کو سفر روئے زمین کا خیال انہیں نے دلایا۔ فن ادب میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ دسویں سے لے کر چودھویں صدی تک وہ انشاپردازی میں یورپ کے استاد سمجھے جاتے رہے۔ سلاطین کے درباروں میں وہ طبیب کی حیثیت سے باریاب ہوتے تھے اور سرکاری خزانوں کے انتظام کے لئے بطور صدر محاسب یا افسر اعلیٰ مامور ہوتے تھے۔

مملکت نیورؔ کے کٹر پادریوں نے عوام الناس کو یہودیوں کے برخلاف بہت کچھ بھڑکایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص نے ان بیچاروں کی ایذا دہی پر کمر باندھ لی۔ ان مظالم سے بچنے کے لئے بہت سے تو بظاہر عیسائی ہو گئے لیکن عیسائیت قبول کرنے کے بعد پھر اپنے آبائی مذہب کی طرف عود کر آئے۔ پاپا کے سفیر متعینہ دربار کیسٹیل نے محکمہ "انکویزیشن" کے قائم کئے جانے پر بہت کچھ زور دیا۔ غریب اور غیر مستطیع یہودیوں پر تو یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ عید الفصح کی تقریب پر واقعہ تصلیب کی تضحیک کے لئے عیسائی بچوں کی قربانی دیتے ہیں اور دولتمند یہودیوں سے یہ جرم منسوب کیا جاتا تھا کہ وہ ابن رشد کے پیرو ہیں۔ ڈامینکن فرقہ کا ایک راہب ٹارکوئی میڈا نامی ملکہ اسابیلا کا پادری تھا۔ اس کی ترغیب سے ملکہ نے پاپا کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ احتساب عقائد کا مقدس محکمہ دولت اسپین میں قائم کرنے کی اجازت اسے عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ نومبر ۱۴۷۸ء میں پاپا کا فرمان صادر ہوا کہ کفر و زندقہ کی سراغ برآری اور استیصال کی غرض سے "انکویزیشن" کی مقدس عدالت قائم کی جائے۔ اس عدالت کی پہلے سال یعنی ۱۴۸۱ء کی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہزار اشخاص اندلس میں زندہ جلائے گئے اور ان کے علاوہ کئی ہزار مردے قبروں سے نکال

کر جلائے گئے اور سترہ ہزار اشخاص کو جرمانہ یا حبس دوام کی سزا دی گئی۔ مظلوم یہودیوں میں سے جس سے بن پڑا جان سلامت لے کر بھاگ گیا باقی تختہ مشق ستم بنائے گئے۔ ٹاکوئی میڈا نے جواب کیسٹیل اور لیان کا صدر محتسب مقرر ہوا داد احتساب وحشیانہ خونخواری سے دی۔ گمنام شکایات کی بنا پر ملزم کو پکڑ بلایا جاتا تھا۔ اس کے مواجہ میں کوئی شہادت نہیں لی جاتی تھی۔ اسے گواہوں پر جرح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اقبال جرم کے لئے ملزم کو شکنجہ میں دے دیا جاتا تھا۔ اور شکنجہ کا جانفرسا عذاب زمین دوز تہ خانوں میں پہنچایا جاتا تھا جہاں سے بیچارے ستم رسیدوں کی چیخ پکار کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ رحم کا منہ اس طرح چڑایا جاتا تھا کہ حکم دے دیا جاتا تھا کہ مجرم کو شکنجہ میں دوسری مرتبہ نہ کسا جائے۔ فیاضی کی نقل اس طرح اتاری جاتی تھی کہ ملزم سے کہہ دیا جاتا تھا کہ آج تمہاری ہڈیوں کا چورا اچھی طرح نہیں ہوا اس لئے کل تک کے لئے شکنجہ کی سزا ملتوی کی جاتی ہے۔ بدنصیب مجرموں کے تباہ شدہ خاندانوں کی مصیبت کا اندازہ کرتے ہوئے دماغ لرزتا ہے۔ لارنٹ نے جو "انکویزیشن" کا مورخ ہے اندازہ لگایا ہے کہ ٹارکوئی میڈا اور اس کے شرکا نے اٹھارہ سال کی مدت میں دس ہزار دو سو بیس اشخاص کو زندہ جلایا۔ چھ ہزار آٹھ سو ساٹھ اشخاص کی مورتیں بنا کر جلائیں اور ستانوے ہزار تین سو اکیس اشخاص کو دوسرے طریقہ سے مختلف سزائیں دیں۔ اس مخبوط الحواس پادری نے انجیل کے عبرانی نسخے جہاں کہیں ملے ضائع کرا دئے اور سیلمینکا میں علوم مشرقیہ کی چھ ہزار کتابیں یہ کہہ کر آگ میں جھونک دیں کہ ان میں یہودی مذہب کی تعلیم مدرج ہے۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ سنتے ہیں کہ پاپا کی حکومت دولت مند یہودیوں سے روپیہ لے کر انہیں "انکویزیشن" کے احتساب سے مستثنیٰ کر دیتی تھی اور تزکرات الغفران کی فروخت سے بہت کچھ روپیہ پیدا کرتی تھی تو ہماری نفرت اور حقارت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

لیکن اس خوفناک ظلم اور وحشیانہ جبر کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بہت کم یہودی ایسے تھے جنھوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر مذہب عیسوی قبول کیا۔ لہٰذا ٹارکوئی میڈا نے اس بات پر زور دیا کہ ہر غیر اصطباغ یافتہ یہودی فوراً ملک بدر کیا جائے۔ حکومت سے اس نے یہ بات بھی منوا کر چھوڑی۔ بتاریخ ۳۰ مارچ ۱۴۹۲ء یہودیوں کے اخراج کے فرمان پر دستخط ہو گئے۔ تمام یہودیوں کو جو اصطباغ یافتہ نہ تھے بلالحاظ عمر یا جنس یا حالت حکم دیا گیا کہ آئندہ جولائی کی آخری تاریخ تک ملک سے نکل جائیں۔ اور اگر واپس آئیں گے تو سزائے موت پائیں گے۔ اس فرمان قہر تو امان کی رو سے اگرچہ وہ اس کے مجاز کئے گئے تھے کہ اپنا مال

اور املاک فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے ساتھ لیتے جائیں لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ یہ قیمت نقدی کی شکل میں نہ ہو بلکہ یا تو سامان تجارت یا ہنڈی کی شکل میں ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی مال یا جائداد کی بازار میں کیا قیمت اٹھ سکتی تھی جن کے سر پر قضائے مبرم کی طرح یہ حکم سوار تھا کہ تین مہینے کے اندر اندر ملک سے نکل جائیں اور ملک بھی وہ ملک جو ان کا زادبوم تھا جہاں وہ پلے اور بڑھے تھے جس میں ان کے آباؤاجداد صدہا سال سے بستے چلے آئے تھے۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ اس مال کو جو جولائی کے مہینے کے بعد کوڑیوں کے داموں بلکہ مفت ملنے والا تھا روپیہ دے کر خریدتا۔ جب بیکس اور مظلوم یہودیوں کی جلاوطنی کی دردناک گھڑی قریب آئی تو ایک طرف تو گلی کوچوں میں ان کے نالہ و بکا کی جگر خراش آوازیں امید اور انصاف کی مرثیہ خوانی کرتی ہوئی ہوا میں رہ رہ کر گونجتی تھیں دوسری طرف ناخدا ترس پادری سڑکوں اور گلی کوچوں میں کھڑے ہوئے اپنی جوش فصاحت کو اس بدنصیب قوم کی سیہ کاریاں اور بداعمالیاں گنانے میں صرف کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ مسیحی تماشائی تک اس دردناک اور زہرہ گداز نظارہ کو دیکھ کر روتے تھے لیکن کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا اس لئے کہ ٹارکوئی میڈا کی قساوت قلبی اس فرمان کی تعمیل کرا کر رہی کہ یہودیوں کو کوئی شخص کسی طرح کی مدد نہ دے۔

جو یہودی اس طور پر جلاوطن ہوئے ان میں سے کچھ تو افریقہ اور کچھ اٹلی چلے گئے۔ جو جماعت اٹلی گئی تھی وہ اپنے ساتھ جہازی بخار کی وبا لیتی گئی جس نے نیپلز کے بیس ہزار باشندوں کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا کر اس جزیرہ نما کو ویران کر دیا۔ کچھ یہودی ٹرکی کو بھی ہجرت کر گئے اور علی ہذالقیاس ان کی ایک جماعت نے انگلستان میں جابودوباش اختیار کی۔ سفر کی گوناگوں مصیبتوں کی تاب نہ لا کر ہزاروں رستہ میں مر گئے جن میں زیادہ تر شیرخوار بچے اور ان کی مائیں۔ کم سن بچے اور سن رسیدہ ضعیف اشخاص تھے۔ بہت سے ایسے تھے جنھوں نے پانی کے میسر نہ آنے سے تشنہ لبی کی حالت میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔

یہودیوں کی اس بیخ کنی کے بعد مسلمانوں کی باری آئی۔ ماہ فروری ۱۵۰۲ء میں ایک فرمان بمقام اشبیلیہ صادر ہوا جس میں اس تمہید کے بعد کہ دشمنان خدا کو ملک سے نکال دینا ہر مسیحی کا مقدس فرض ہے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہر غیر اصطباغ یافتہ عرب جس کی عمر سن شیرخوارگی سے متجاوز ہو مملکت کسٹیل ولیان سے اواخر ماہ اپریل تک ملک سے نکال دیا جائے۔ یہودیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی اپنا مال و متاع فروخت کرنے کی اگرچہ اجازت

تھی لیکن جائداد فروخت شدہ کی قیمت سونے چاندی کی شکل میں ہمراہ لے جانے کی ممانعت تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممانعت کی گئی کہ کوئی مسلمان اسلامی ممالک کو ہجرت نہ کرے اور یہ جتلا دیا گیا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے موت دی جائے گی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی حالت یہودیوں سے بھی بدتر تھی۔ کیونکہ یہودیوں کو تو پھر بھی یہ اجازت دی گئی تھی کہ جہاں ان کے سینگ سمائیں چلے جائیں لیکن مسلمان اس حق سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ ہسپانوی مسیحیوں کی شیطنت آمیز سفاکی اسی حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ یہ تک کہتے ہوئے خدا سے نہ ڈرتے تھے کہ مسلمانوں کی بے غیرتانہ بے دینی کی پاداش میں اگر حکومت ان سب کی گردن مار دے تو کچھ بے جا نہ ہو۔

افسوس مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں عیسائیوں کے ساتھ جس رواداری اور مسالمت کا سلوک کیا تھا اس کا معاوضہ ناسپاس اور حق ناشناس عیسائیوں نے ان کو دیا تو یہ دیا!! مظلوم مسلمانوں کے ساتھ سخت بدعہدی اور بے ایمانی روا رکھی گئی۔ غرناطہ کی اسلامی حکومت نے جب ہتھیار ڈالے تھے تو عیسائیوں سے یہ اقرار صالح لے لیا تھا کہ ان کے تمدنی اور مذہبی حقوق میں کسی طرح کی دست اندازی نہ کی جائے گی۔ لیکن پادری زمنیز کے اغوا پر یہ وعدہ توڑ دیا گیا اور آٹھ سو سال تک آباد رہنے کے بعد مسلمان اس ملک سے نکالے گئے۔

اندلس میں تین مذاہب یعنی عیسائیت موسویت اور اسلام کے پہلو بہ پہلو موجود ہونے سے فلسفہ ابن رشد کو نشوونما پانے کا موقع ملا تھا۔ یہ گویا اسی واقعہ کا اعادہ تھا جو کئی صدی پیشتر روما میں اس وقت پیش آیا تھا جب کہ ممالک مفتوحہ کے تمام دیوتا اور دیویاں پایہ تخت قیصر میں لا کر جمع کر دی گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان کی طرف سے عام بداعتقادی پھیل گئی تھی۔ خود ابن رشد پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اول مسلمان تھا پھر عیسائی ہوا پھر یہودی بنا اور انجام کار دہریہ ہو گیا۔

ازمنہ وسطی میں دو تصانیف اپنے ملحدانہ مضامین کے لحاظ سے شہرہ آفاق تھیں۔ ایک کا نام "دی ایورلاسٹنگ گاسپل" (انجیل لازوال) تھا اور دوسری کا "ڈی ٹرا ئبس امپاسٹاربس" (جماعت کا ذبین)۔ ثانی الذکر کتاب کے مصنف کے متعلق مختلف اقوال تھے۔ بعض لوگ اس تصنیف کو پاپائے جوبرٹ سے منسوب کرتے تھے بعض فریڈرک ثانی سے اور بعض ابن رشد سے۔ چونکہ ڈامینیکن فرقہ کے پادریوں کو ابن رشد سے قلبی عداوت تھی لہٰذا اس زمانہ کے ہر ملحدانہ عقیدہ کو وہ بلا تامل اس کے سر تھوپ دیتے تھے۔

چنانچہ مسئلہ عشائے ربانی کی تحقیر و تضحیک کا ذکر ان کے حلقوں میں جب آتا تھا تو ابن رشد کے نام پر سینکڑوں گالیاں پڑ جاتی تھیں۔ ابن رشد کی تصانیف کا علم مسیحی یورپ کو اول اول تیرھویں صدی کے شروع میں میکائیل اسکاٹ کے تراجم کی وساطت سے ہوا۔ لیکن ایشیا کی طرح یورپ میں بھی اس قسم کے خیالات مدتوں پہلے سے شائع ہو چکے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اریجنیا کا فلسفہ انہیں کس شرح و بسط کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ عربوں پر مذاق فلسفہ سے آشنا ہوتے ہی ان خیالات کا اثر پڑنے لگا تھا اور تینوں خلافتوں کے دارا لعلوم میں یہی فلسفہ رائج تھا۔ اگر ان خیالات پر اس پہلو سے نظر نہ ڈالی جائے کہ عقلی نشوونما کے ایک خاص مقام تک پہنچنے کے بعد ہر انسان کا ان سے خودبخود متاثر ہو جانا یقینی ہے بلکہ ارسطو کو ان کا مبدا و منشا قرار دیا جائے تو تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ہر اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ ان خیالات کی جھلک ہمیں رابرٹ گراسٹٹ۔ راجر بیکن اور اسپائنورا کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ ابن رشد ان خیالات کا موجد نہ تھا بلکہ محض شارح اور مفسر تھا۔ تیرھویں صدی کے یہودیوں کو استاد کی مسند پر صرف شاگرد بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ ارسطو کی جگہ فلسفہ مشائیہ کے شارح اعظم ابن رشد نے لے لی تھی۔ مسئلہ انفصال و انجذاب کے مسیحی ماننے والوں کی تعداد یورپ میں اس قدر بڑھ گئی کہ پاپائے الگزینڈر رابع (۱۲۵۵ء) کو مجبوراً مداخلت کرنی پڑی۔ چنانچہ اس کے حکم سے البرٹس میگنس نے ایک کتاب مسئلہ وحدت عقل کل کے رد میں لکھی۔ اصلیت و ماہیت روح پر بحث کرتے ہوئے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "یہ مسئلہ کہ ایک عقل مجرد اپنے نور سے افراد انسانی کو ان کے پیدا ہونے سے پہلے منور کرتی ہے اور ان کے فنا ہونے کے بعد قائم رہتی ہے ایک قابل نفرین غلطی سے آلودہ ہے۔" لیکن ارسطو کے زندہ جاوید شارح کا سب سے بڑا مخالف سینٹ ٹامس ایکویناس تھا جس نے وحدت عقل کل۔ انکار توفیق ایزدی۔ عدم امکان پیدائش اور اسی قسم کے دوسرے عقائد کو جو ملحدانہ سمجھے جاتے تھے شدومد کے ساتھ تردید اور اپنے ہم صفیروں یعنی ڈامینیکن فرقہ کے پادریوں کی رائے میں گویا ان الحادات کا قلع و قمع کر ڈالا۔ سینٹ ٹامس نے جب اپنے مسیحی بھائی بندوں کو ابن رشد کے عقائد اختیار کرتے ہوئے دیکھا جو اس کی نظر میں مسلمانوں سے بھی بدتر تھا تو اس کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور ڈامینکن پادریوں کے قول کے مطابق اس "فرشتہ خصال عالم جید" نے اپنے مخالف پر وہ نمایاں قلمی فتوحات حاصل کیں جن کی یادگاریں فلارنس اور پائیا کے نقاشوں نے پردہ تصویر پر چھوڑی ہیں۔

ڈا مینیکن پادریوں کے سمند طیش پر یہ خیال تازیانہ باری کرتا تھا کہ فرانسکن فرقہ کے پادری جن سے انہیں رقابت تھی ابن رشد کے عقائد رکھتے تھے۔ چنانچہ ڈینٹی نے جو فرقہ ڈا مینیکن کا طرف دار تھا ابن رشد کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک نہایت خطرناک مذہب کا بانی ہے۔ غرض ابن رشد پر تینوں بڑے مذاہب کی طرف سے متفقہ تکفیر کا فتویٰ جاری کیا گیا اور یہ خطرناک قول اس سے منسوب کیا گیا کہ "تمام مذاہب اگرچہ غالباً" مفید ہیں لیکن ان کے باطل ہونے میں شک نہیں۔" وین کی کونسل میں بالاتفاق یہ قرار پایا کہ اس کی تصنیفات کی اشاعت مطلقاً" روک دی جائے اور تمام عیسائیوں کو ان کے مطالعہ کی ممانعت کی جائے۔ ڈا مینیکن فرقہ کے پادریوں کو "انکوزیشن" کا سا مہیب آلہ ہاتھ آگیا تھا اور ان کے سفاکانہ جبروتشدد سے تمام یورپ کانپ رہا تھا۔ اس زمانہ میں جو بے دینی پھیلی ہوئی تھی اس کا ذمہ دار یہ فرقہ ابن رشد ہی کے فلسفہ کو قرار دیتا تھا۔ لیکن مخالفوں کے مقابلہ میں اس کے طرفداروں کی بھی ایک جماعت موجود تھی۔ نہ صرف پیرس بلکہ شمالی اٹلی کے تمام شہروں میں فرانسکن فرقہ کے عیسائی اس کے پیرو تھے اور کل مسیحی دنیا میں ان مناقشوں کی وجہ سے ایک تہلکہ پڑا ہوا تھا۔

ڈا مینیکن فرقہ کے پادریوں کی زبان ابن رشد کے کافرانہ و ملحدانہ کارناموں کا ذکر سنتے سنتے اٹلی کے نقاشوں اور مصوروں کی نظروں میں وہ بیدینی کی مجسم علامت بن گیا تھا۔ اٹلی کے اکثر شہروں اور قریوں میں روز قیامت اور دوزخ کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ ان میں ابن رشد کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔ چنانچہ پائیا کے ایک اسی طرح کے مرقع میں جہاں حضرت محمدؐ اور اریئس اور دجال کی تصاویر ہیں وہاں ابن رشد بھی موجود ہے۔ ایک اور مرقع میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ابن رشد زمین پر گرا ہوا ہے اور سینٹ ٹامس اس کی چھاتی پر سوار ہے۔ سینٹ ٹامس کی فتح اور ابن رشد کی شکست لازم و ملزوم ہو گئی تھی۔ اٹلی کے مصوروں کی مذہبی تصاویر سولہویں صدی تک ابن رشد کے بغیر مکمل نہ سمجھی جاتی تھیں اور اس کے فلسفیانہ عقائد پیڈوا کی یونیورسٹی میں سترہویں صدی تک بدستور قائم رہے۔

فلسفہ ابن رشد کے اسپین سے اٹھ کر یورپ پر حملہ آور ہونے کی داستان ہم بالاجمال سنا چکے۔ اب صرف اتنا بیان کرنا باقی رہتا ہے کہ فریڈرک ثانی کی سرپرستی میں اس فلسفہ نے سسلی میں بھی سر اٹھایا لیکن اس طرف سے اس کی پیش قدمی زیادہ کامیاب نہ ثابت ہوئی۔ فریڈرک ثانی نے اسے پوری طرح سے تسلیم کر لیا تھا۔ اپنی کتاب "مسملین

کونسچنس" (مسائل سسلی) میں اس نے ابدیت عالم اور ماہیت روح پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان مسائل کے متعلق اس کے تمام شکوک ابن سبعین کے جوابات سے رفع ہو گئے جو دین رشد کا پیرو تھا۔ لیکن فریڈرک ثانی کی یہ آزاد خیالی چند روزہ ثابت ہوئی۔ وہ پاپائے اعظم کی مخالفت کی تاب نہ لا سکا اور اس کے مغلوب ہونے پر اس فلسفیانہ خیالات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اٹلی کے شمالی حصہ میں فلسفہ ابن رشد مدتوں قائم رہا۔ وینس کے طبقہ اعلیٰ میں اس کا اثر یہاں تک تھا کہ ہر وضیع و شریف اس کے اتباع پر مجبور تھا۔ آخرکار کلیسا نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یعنی لیٹرن کونسل نے ۱۵۱۴ء میں یہ فتویٰ صادر کیا کہ جو شخص ان قابل نفرین عقائد کی حمایت کرے گا وہ ملحد و بے دین سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ویٹیکن کونسل نے بھی اپنے گذشتہ اجلاس میں ان عقائد کو مورد سب و شتم ٹھہرایا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام مطاعن و ملاعن کے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ خیالات بنی نوع انسان کے ایک جزو غالب کے نزدیک صحیح ہیں۔

۱؎ فرانس کا سب سے زیادہ مشہور فلسفی ہے جس کے تخیل نے مابعد الطبیعیات پر ایک غیر ممکن المحو نقش چھوڑا ہے۔ عقلیات میں اس کا اصل اصول یہ نکتہ ہے کہ میرے وجود پر میری قوت غور و فکر گواہ ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کی تائید کو وہ موجودات کی حقیقت کی تصدیق کے لئے ضروری نہیں خیال کرتا بلکہ ذہنیات ہی کو حق مطلق کے انکشاف کا ذریعہ اولیٰ سمجھتا ہے۔ ڈیکارٹ کا سن ولادت ۱۵۹۶ء اور سن وفات ۱۶۵۰ء ہے۔ مترجم

۲؎ سر بنجمن کالن بروڈلی انگلستان کا ایک مشہور طبیب ہے جسے فن جراحی سے دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۴ء میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے دربار کا سرجن مقرر ہوا۔ اس کی تاریخ انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۲ء ہے۔ علم الامراض۔ علم الاعصاب اور علم النفس پر اس کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ مترجم

۳؎ فرنسو اہیوبر (المتوفی ۱۸۴۱ء) سوئٹزرلینڈ کا ایک مشہور ماہر علم خواص الاشیاء ہے۔ اگرچہ آخر آخر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا لیکن اپنی بی بی اور ایک وفادار ملازم کی مدد سے اس نے شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کے حالات کے متعلق نہایت قیمتی مواد فراہم کیا اور اپنی معلومات کو ۱۷۹۶ء کو بصورت کتاب شائع کیا۔ مترجم۔

۴؎ الفانسو دہم شاہ لیان و کیسٹیل سے مراد ہے جو ۱۳۵۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ فن ہیئت سے اسے ایک خاص لگاؤ تھا۔ چالیس ہزار اشرفیوں کی لاگت سے اس نے ہیئت کی وہ شہر آفاق زیچیں تیار کرائیں جن کا حوالہ متن میں دیا گیا ہے۔ ان زیچوں کو میڈرڈ کی اکاڈمی نے نظرثانی کر کے ۱۸۰۷ء میں ازسرنو مرتب کیا۔ مترجم

۵ زمانہ سابق میں ایک مستقل بادشاہت تھی۔ آج کل اسپین کا ایک صوبہ ہے جس کی شمالی سرحد فرانس ہے۔ اس کا رقبہ کوئی چار ہزار چوالیس میل ہو گا۔ مترجم

۶ بنی اسرائیل کے فراعنہ مصر کی غلامی سے آزاد ہونے کی خوشی میں جو تہوار یہودی ہر سال مناتے ہیں اس کا نام عید الفصح ہے۔ مترجم

چھٹا باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت عالم

ماہیت عالم کی نسبت مذہبی خیال یعنی زمین چپٹی ہے۔ بہشت اور دوزخ۔ اہل سائنس کا خیال یعنی زمین گول ہے۔ زمین کی جسامت کی دریافت۔ نظام شمسی میں اس کا درجہ اور نظام شمسی کے دوسرے اعضا کے ساتھ اس کے تعلقات۔ کولمبس۔ ڈی گاما اور میکیلین کے تین بڑے بحری سفر۔ سیاحت گرد زمین۔ ایک درجہ کی پیمائش اور رقاص ساعت کے ذریعہ سے کرویت زمین کی تعین۔

کوپرنیکس کے اکتشافات۔ دوربین کی ایجاد۔ گلیلیو "انکویزیشن" کے اجلاس میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اس کی سزایابی۔ سائنس کی فتح کلیسا پر۔

جسامت نظام شمسی کی تحقیق کی کوشش۔ سیارہ زہرہ کے مرور منطقتہ البروج کی بنا پر آفتاب کے زاویہ اختلاف منظر کی تعین۔ کرہ زمین اور انسان کی ہیچ میرزی۔

خیالات دوبارہ جسامت کائنات۔ زوایا سے اختلاف مناظر کواکب۔ برونویہ دعوی کرتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیائیں موجود ہیں۔ محکمہ "انکویزشن" اسے گرفتار کر کے قتل کر دیتا ہے۔

اب ہم ان مباحث کو حیطہ تحریر میں لانا چاہتے ہیں جو فلسفہ کے تیسرے مہتم بالشان مسئلہ یعنی ماہیت عالم کے متعلق پیدا ہوئے۔

اگر ہم صحیفہ قدرت کا مطالعہ بنظر انتقاد نہ کریں۔ تو ہمیں بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ زمین ایک وسیع چپٹی سطح ہے جو قبہ آسمان کو سہارے ہوئے ہے اور یہ قبہ نیلگوں فوقانی و

تحتانی دریاؤں کے مابین حد فاصل ہے۔ اجرام فلکی یعنی آفتاب ماہتاب اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ ان کے قامت کی کہتری اور غیر متحرک زمین کے گرد ان کا حرکت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا درجہ زمین سے بمراتب حقیر اور بدارج کم ہے۔ جو حیوانات روئے زمین پر موجود ہیں ان میں علوشان کے لحاظ سے ایک بھی انسان کا مدمقابل نہیں اور اس لئے اس کا یہ قیاس حق بجانب ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے۔ آفتاب اس مقصد سے پیدا کیا گیا ہے کہ دن کے وقت اسے روشنی پہنچائے۔ چاند اور ستارے اس غرض سے بنائے گئے ہیں کہ اندھیری راتوں میں ان کا اجالا اس کی رہبری کرے۔

مختلف ادیان و مذاہب کی روایات کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم نے ہر منزل عقل و ادراک میں قدم رکھتے وقت مظاہر فطرت کے متعلق یہی تصورات قائم کئے ہیں۔ تمدن کے دور اول میں انسان نے زمین کو اکبرو اعظم موجودات سمجھ کر مرکز کائنات خیال کیا ہے اور انسان کو افضل و اشرف المخلوقات مان کر زمین کی مرکزی ہستی سمجھا ہے۔ اور یہ نتیجہ انسان نے دنیا کو ایک سرسری نظر سے دیکھ کر بلا غور و تعمق ہی قائم نہیں کیا بلکہ مختلف آسمانی صحایف بھی جو وقتاً" فوقتاً" انسان پر نازل ہوئے ہیں من حیث المجموع اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ان الہامی صحایف نے انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ آسمان کے بلوریں گنبد کے اوپر نور لازوال اور عیش مخلد کا ایک عالم ہے جسے بہشت کہتے ہیں۔ اس عالم میں خدا تعالی اور ملایکہ رہتے ہیں اور ممکن ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو بھی یہی جگہ رہنے کو ملے۔ زمین کے نیچے ابدی تاریکی اور عذاب کا مستقر ہے جہاں بدوں کو رکھا جائے گا۔ اس طرح عالم مرئی کے پردہ میں گویا عالم غیر مرئی کی تصویر دکھا دی گئی ہے۔

ترکیب عالم کے اس تصور کی بنا پر بڑے بڑے مذاہب کی عمارتیں قائم کی گئی ہیں اور چونکہ اس کے قیام کے ساتھ بہت سی زبردست مادی اغراض وابستہ تھیں لہذا اس کے استحکام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ جو کوششیں پیروان سائنس کی طرف سے اس کی مسلمہ غلطیوں کی تصحیح کے لئے عمل میں لائی گئیں ان کی مخالفت بعض دفعہ یہاں تک ہوئی ہے کہ خونریزی تک نوبت پہنچی ہے اور یہ مخالفت محض اس خیال سے کی گئی ہے کہ اگر مخالفین کو کامیابی ہوئی تو بہشت و دوزخ کے مواقع کی تعیین کا ستون مرکز ثقل سے ہٹ جائے گا اور اس افضلیت و اکملیت کو جو کائنات کے موضوع اعظم ہونے کے لحاظ سے انسان سے منسوب کی جاتی ہے بہت بڑا صدمہ پہنچے گا۔

لیکن اس قسم کی کوششوں کا عمل میں آنا ایک یقینی اور لازمی امر تھا۔ جب انسان اس مسئلہ پر غور وحوض کرنے کے قابل ہو گیا تو اس کو اس دعوے کے تسلیم کرنے میں تامل ہونے لگا کہ زمین ایک سطح غیر محدود ہے۔ کسی شخص کو اس امر میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جو آفتاب آج ہمارے دیکھنے میں آیا ہے یہ وہی آفتاب ہے جسے ہم نے کل دیکھا تھا۔ اس کے نورانی قرص کا ہر صبح از سرنو نمودار ہونا یہ خیال پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ زمین کے نیچے سے گذرا ہے۔ لیکن اگر یہ خیال صحیح ہو تو وہ دوسرا مفروضہ کہ زمین کے نیچے ہمیشہ تاریکی چھائی رہتی ہے باطل ہوا جاتا ہے۔ غرض آفتاب کا زمین کے نیچے سے ہو کر گزرنا شکل زمین کی کرویت کا خیال کم و بیش وضاحت کے ساتھ ضرور پیدا کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ زمین کا پھیلاؤ سمت تحتانی میں غیر محدود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آفتاب کا نفوذ اس کے جرم میں ممکن نہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی ایسا سوراخ یا منفذ زمین میں موجود ہو جس کی راہ سے آفتاب نکل آتا ہو اس لئے کہ سال کے مختلف موسموں میں اس کے طلوع و غروب کے مقامات مختلف ہوتے ہیں۔ علی ہذا القیاس ستارے بھی زیر زمین مختلف اطراف میں حرکت کرتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ زمین کے نیچے ایک صاف رستہ موجود ہو۔

آیات الہامی کو اس جدید استقرا کے ساتھ تطبیق دینے کے لئے اس قسم کی توجیہات سے وقتاً" فوقتاً" کام لیا گیا جن کی مثال کا سماس انڈو کا پلیو سٹیز کی کتاب "کرسچین ٹاپو گرافی" (جغرافیہ مسیحی) میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ اس کتاب میں جیسا کہ ناظرین کو یاد ہو گا یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ زمین ایک چپٹی سطح ہے جس کے شمالی حصوں میں ایک بہت بڑا پہاڑ واقع ہے۔ آفتاب جب اس پہاڑ کے پیچھے چلا جاتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔

ایک نہایت دور دراز تاریخی زمانہ میں انسان کو کسوف و خسوف کی حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔ چاند گہن کے مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ زمین کا سایہ ہمیشہ مدور ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ سے یہ بدیہی نتیجہ نکلا کہ زمین کی شکل بھی گول ہو گی اس لئے کہ جو جسم ہر حالت میں گول سایہ ڈالتا ہو وہ خود بھی گول ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ دوسرے قراین و دلائل سے بھی جن کو آج کل بچہ بچہ جانتا ہے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی کہ زمین کروی الشکل ہے۔

لیکن شکل زمین کی تعیین اسے اس مسند عظمت سے ہٹا نہ سکی جس پر ظاہر بیں

آنکھوں نے اسے بٹھا رکھا تھا۔ چونکہ وہ بظاہر تمام دوسری اشیاء کے مقابلہ میں بمراتب بڑی نظر آتی تھی اور کسی محسوس ہو سکنے والی شے کی اس کے سامنے کوئی ہستی نہ تھی لہٰذا ظاہر بینوں نے نہ صرف اسے مرکز عالم بلکہ خود عالم تصور کیا۔

اگرچہ ان نتائج نے جو زمین کو کروی الشکل ماننے سے پیدا ہوئے مروجہ مذہبی عقائد پر نہایت گہرا اثر ڈالا لیکن جو نتائج جسامت زمین کی تعیین سے مترتب ہوئے وہ کہیں زیادہ اہم تھے۔ علم ہندسہ کا مبتدی بھی اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ زمین کی جسامت کا صحیح حال سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے غالباً" نہایت قدیم زمانہ میں متعدد کوششیں الماۂ ہیت کی طرف سے ہوئیں جن کے نتائج ضائع ہو گئے ہیں۔ لیکن اتنا ہم کو تحقیق کے ساتھ معلوم ہے کہ ایراتا ستھنیز نے مصر میں اسکندریہ اور سین کے درمیان یہ سمجھ کر کہ سین ٹھیک خط سرطان کے نیچے واقع ہے ایک درجہ ارضی کی پیمائش کی کوشش کی تھی۔ لیکن چونکہ یہ دونوں مقامات نصف النہار کے ایک ہی خط پر واقع نہ تھے' لہٰذا ان کے باہمی فاصلہ کا صرف اندازہ لگا لیا گیا۔ پیمائش نہیں کی گئی۔ اس کے دو صدی بعد پاسیڈونیس نے اسکندریہ اور اوڈس کے درمیان اس قسم کی دوسری کوشش کی۔ سہیل نامی روشن ستارہ مقام ثانی الذکر پر افق کو مس کرتا تھا اور اسکندریہ میں افق سے ساڑھے سات درجہ اونچا تھا لیکن اس مرتبہ بھی ان دونوں مقامات کے درمیان سمندر کا حائل ہونا پیمائش کو مانع آیا اور فاصلہ کا صرف تخمینہ قائم کر لیا گیا۔ بالآخر جیسا کہ ہم سابق میں بیان کر آئے ہیں خلیفہ المامون نے درجہ ارضی کی دو پیمائشیں کرائیں۔ ایک ساحل بحر قلزم پر دوسری عراق عرب میں شہر کوفہ کے قریب۔ ان مختلف تجربوں کا عام نتیجہ یہ نکلا کہ زمین کا قطر سات اور آٹھ ہزار میل کے درمیان ہے۔

جسامت زمین کے اس تخمینہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عظمت و جبروت کے اس درجہ سے جس پر وہ ابھی تک خوش عقیدہ لوگوں کے نزدیک فائز تھی گر گئی اور دینیات میں اس کی وجہ سے ایک ہل چل پڑ گئی۔ اس ہل چل میں ارشارکس متوطن سیماس کی تحقیقات نے بہت بڑا حصہ لیا۔ ارشارکس مدرسہ اسکندریہ کا متبحر ہیت دان تھا جس نے ۲۸۰ ق ء کا زمانہ پایا ہے۔ شمس و قمر کی مقادیر و ابعاد پر اسنے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں وہ اس قابل تعریف مگر ناقص طریقہ کو بوضاحت بیان کرتا ہے جس کے ذریعہ سے اس نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے بھی کئی قرن پیشتر فیثا غورث کے ذریعہ سے ایک نیا خیال ہندوستان سے یورپ میں پہنچ چکا تھا۔ اس خیال کے مطابق آفتاب مرکز کائنات تھا۔

آفتاب کے گرداگرد عطارد۔ زہرا۔ زمین۔ مریخ۔ مشتری اور زحل اپنے اپنے محوروں پر گھومتے ہوئے درجہ بدرجہ گردش کرتے تھے۔ بقول سیسرو نا ئیٹاس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو گردش فلک کی ناقابل خیال سرعت کی وجہ سے جو مشکل پیش آتی ہے وہ رفع ہو جاتی ہے۔

قیاس چاہتا ہے کہ ارسٹارکس کی تصانیف جو کتب خانہ اسکندریہ میں موجود تھی جولیس سیزر کی آتش زنی میں جل گئی ہوں۔ اس کی صرف ایک تصنیف "مقادیر وابعاد و شمس و قمر" جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے دستبرد روزگار سے بچی بچائی ہم تک پہنچی ہے۔

ارسٹارکس نے نظام فیثا غورث کو ایک حقیقت نفس الامری سمجھ کر تسلیم کر لیا۔ آفتاب کا حیرت انگیز فاصلہ اور اس لحاظ سے اس کا عظیم الشان جرم اس اعتراف کا مدار علیہ تھا۔ نظام فیثا غورث نے آفتاب کو مرکز کائنات قرار دے کر زمین کا درجہ بہت ہی گھٹا دیا اور اسے ان چھ توابع کے زمرہ میں شریک کر دیا جن کا کام یہ ہے کہ آفتاب کے گرد گردش کیا کریں۔

لیکن ارسٹارکس نے فن ہیئت کی ایک یہی خدمت نہیں کی۔ یہ دیکھ کر کہ زمین کی حرکت سے کواکب کے ظاہری یا اعتباری مقامات و مواقع پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑتا۔ اس نے یہ استدلال کیا کہ ان کا اور زمین کا باہمی فاصلہ سورج اور زمین کے باہمی فاصلہ سے بھی بدرجہا زیادہ ہے۔ ہیلیس کا قول ہے کہ کائنات کے جلال و عظمت کا صحیح خیال جیسا ارسٹارکس کو تھا ویسا مہندسین زمانہ قدیم میں سے اور کسی کو نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فاصلہ ثوابت کو مدنظر رکھنے کے بعد زمین کی حقیقت ایک ذرہ ناچیز سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے اوپر بجز فضائے بسیط اور کواکب کے اور کچھ نہیں ہے۔

لیکن اجسام فلکی کے مقامات حقیقی و اعتباری کے متعلق ارسٹارکس کے خیالات کو قدما نے تسلیم نہیں کیا بلکہ نظام بطلیموسی جس حیثیت سے کہ اس کی تصریح المجسطی میں کی گئی ہے عام طور پر رائج ہو گیا۔ اس زمانہ کا فلسفہ طبیعی نہایت ناقص و غیر مکمل تھا۔ مثلاً" نظام فیثا غورث پر بطلیموس کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر زمین متحرک ہو تو وہ اور دوسرے لطیف اجسام کو پیچھے چھوڑ جائے۔ اسی لئے اس نے زمین کو مرکز کائنات قرار دے کر یہ ظاہر کیا کہ قمر۔ عطارد۔ زہرہ۔ شمس۔ مریخ۔ مشتری اور زحل درجہ بدرجہ اس کے گرد گھومتے ہیں اور زحل کے مدار کے بعد منطقۃ الثوابت ہے۔ ایک خیال اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ

ٹھوس بلوریں کرے ہیں جن میں سے ایک مشرق سے مغرب کی طرف اور دوسرا شمال سے جنوب کی طرف حرکت کرتا ہے لیکن یہ محض ایک فرضی خیال تھا جو یوڈا کسس کا پیدا کیا ہوا تھا اور اس کا بطلیموس حوالہ تک نہیں دیتا۔

اس لحاظ سے نظام بطلیموسی گویا ارضی المرکز ہے اس نے زمین کا تفوق قائم رکھا اور اس لئے مسیحی یا اسلامی عقائد کو برافروختہ ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بانی کی مسلمہ شہرت اور اس غیر معمولی قابلیت نے جو اس کی تصنیف متعلقہ ساخت آسمانی پر صرف کی گئی ہے۔ نظام بطلیموس کو چودہ سو سال یعنی دوسری سے لیکر سولہویں صدی تک پایہ اعتبار سے ساقط نہ ہونے دیا۔

مسیحی دنیا میں اس زمانہ دراز کا زیادہ تر حصہ ماہیت ذات باری کے مباحث اور مذہبی اقتدارات کے حصول کی غرض سے پادریوں کی رقیبانہ کشمکش میں کٹا۔ مسیحی بزرگان دین کے اجتہاد نے اس عام عقیدہ کے ساتھ شامل ہو کر کہ انجیل جملہ علوم و فنون کی مخزن ہے۔ مشاہدہ و تجربہ اور علمی اکتشافات کا رستہ روک دیا۔ اگر ہیت کے کسی مسئلہ کی تحقیق کا شوق اتفاق سے کسی کو کچھ دیر کے لئے پیدا ہو بھی گیا تو ثوابت و سیار کے مہندسانہ مشاہدہ کے بجائے آگسٹائن یا لکٹنشیس کے سے بزرگواروں کی تصانیف کی ورق گردانی سے سائل کی تشفی کر دی گئی۔ روایت کو درایت پر یہاں تک ترجیح دی گئی کہ عیسائیت نے باوصفیکہ اسے وجود میں آئے ہوئے پندرہ صدیاں گزر چکی تھیں ایک بھی ہیت دان پیدا نہ کیا۔

لیکن اسلام کی حالت اس بارے میں مسیحیت سے بہت بہتر ہے۔ مسلمانوں کے اکتساب علوم و فنون کا دور فتح اسکندریہ کی تاریخ یعنی ۶۳۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کو رحلت فرمائے ہوئے صرف چھ سال کی مدت منقضی ہوئی تھی۔ دو صدیوں کے اندر اندر مسلمان نہ صرف یونان کے حکمائے طبیعین کی تصانیف سے واقف ہو گئے بلکہ ہر علمی مسئلہ کے مالہ وما علیہ پر نظر انتقاد ڈالنے کے قابل ہو گئے جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں اس معاہدہ کی رو سے جو میکائیل ثالث شہنشاہ یونان اور المامون عباسی میں ہوا تھا۔ مامون نے بطلیموس کی تصنیف "سنٹکسس" کا ایک نسخہ حاصل کر کے اس کا ترجمہ المجسطی کے نام سے عربی میں کرایا تھا۔ یہ کتاب ہیئت دانان عرب کے لئے مستشار اعظم بن گئی اور اس کو اپنے علم کی بنا قرار دے کر انہوں نے سائنس کے بعض نہایت ہی اہم مسائل حل کیے۔ انہوں نے زمین کی جسامت دریافت کی۔ ان تمام

ستاروں کی فہرستیں تیار کیں جو اس حصہ آسمان پر نظر آئے جو ان کے مقابل تھا اور بڑے بڑے ستاروں کے نام رکھے جو آج تک تبدیل نہیں ہوئے۔ انہوں نے سال کی صحیح مدت کا اندازہ لگایا۔ انعطاف ضیائے کوبی کے اصول کی تحقیق کی۔ "پنڈلم" (رقاص) والی گھڑی ایجاد کی جن آلات سے ستاروں کی روشنی کا اندازہ کیا جاتا ہے ان کو بہت کچھ ترقی دی۔ یہ اصول دریافت کیا کہ شعاع نور ہوا میں بشکل قوس گزرتی ہے۔ چاند اور سورج کے افق پر نظر آنے کی توجیہہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اجرام قبل از طلوع و بعد ازغروب کیوں نظر آتے ہیں۔ کرہ ہوا کی بلندی کو ناپا اور یہ بلندی اٹھاون میل قرار دی جھٹ پٹے کی اصلی کیفیت اور ستاروں کے جھلملانے کی صحیح وجہ بیان کی۔ یورپ میں اول اول جو رصدگاہ قائم ہوئی وہ مسلمانوں ہی کی بنائی ہوئی تھی۔ اجرام فلکی کے نقل و حرکت کے متعلق ان کی باریک بینی و دقیقہ سنجی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ زمانہ حال کے قابل سے قابل مہندسوں نے ان کے رصدی نتائج سے استناد کیا ہے۔ مثلاً" لیپلیس اپنی کتاب "نظام عالم" میں لبنانی کے مشاہدات کی سند اس امر کے قطعی ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ مرکز آفتاب اور مرکز مدار ارض کا درمیانی فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مسئلہ اعوجاج طریق الشمس اور مشتری و زحل کی عدم مساوات ہائے اکبر کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ابن یونس کے مترتبہ نتائج سے مدد لیتا ہے۔

عقدہ ماہیت عالم کے حل کرنے میں ہیئت دانان اسلام نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ہم نے ان کا عشر عشیر بھی بیان نہیں کیا۔

بہرحال اس زمانہ میں سائنس کو جو کچھ ترقی حاصل ہوئی مسلمانوں کی بدولت ہوئی۔ عیسائی دنیا پر جہل و اوہام کی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ مسیحیوں کو علمی مسائل کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ وہ مجسمہ پرستی۔ گور پرستی۔ عشائے ربانی۔ کرامات اولیا۔ معجزات۔ تصرفات ارواح اور خوش عقیدگی کے اسی طرح کے دوسرے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

اس خواب غفلت سے مسیحی دنیا پندرھویں صدی کے خاتمہ تک بیدار نہ ہوئی۔ اس وقت بھی شوق علم اس کے جاگنے کا باعث نہ ہوا۔ بلکہ اسباب ترغیب کچھ اور ہی تھے یعنی اقوام یورپ میں تجارتی رقابت پیدا ہو گئی اور کولمبس ڈی گاما اور فرڈیننڈ میگیلن کی جہازرانی مسئلہ شکل زمین کے تصفیہ کا اخیر باعث ہوئی۔

مشرقی ایشیا کی تجارت نے ان مغربی اقوام کو جو اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں ہمیشہ مالا مال کیا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس تجارت کا مرکز اٹلی کا شمالی حصہ تھا۔ یہ

تجارت شمال و جنوب دو طرف سے ہوتی تھی اور اس کے مرکز علی الترتیب جنوا۔ اور وینس تھے۔ جنوا سے مال تجارت جہازوں میں بھر کر براہ بحیرہ اسود و بحیرہ خزر ایران کے شمالی ساحلوں پر اتارا جاتا تھا اور وہاں سے اونٹوں پر بار کر کے آگے بھیجا جاتا تھا۔ جنوبی صدر مقام یعنی وینس سے جو مال روانہ ہوتا تھا وہ یا تو شامی اور مصری بندرگاہوں پر اتار کر براہ خشکی اندرون ملک میں بھیج دیا جاتا تھا یا بحیرہ قلزم اور بحر عرب کی راہ سے مشرقی ممالک کی طرف روانہ کر دیا جاتا تھا۔ جن سوداگروں کا صدر مقام وینس تھا انہوں نے دوران حروب صلیبیہ میں ذرائع باربرداری کی بہم رسانی سے بہت بڑی دولت کمائی تھی۔

اہل وینس کی زمانہ شناسی نے ان کے تعلقات کو چونکہ شام اور مصر کی اسلامی دولتوں کے ساتھ بگڑنے نہ دیا تھا لہٰذا ان کو اسکندریہ اور دمشق میں اپنے سفارت خانے قائم رکھنے کی اجازت تھی اور باوجودیکہ ان ممالک میں جدال و قتال کے ہنگامے آئے دن بپا ہوتے رہتے تھے پھر بھی وینس کی تجارت ترقی پر تھی۔ لیکن شمالی شاخ تجارت جس کا صدر مقام جنوا تھا کچھ تو تاتاریوں اور ترکوں کی حملہ آوری اور کچھ ان ممالک کے اندرونی فسادات کی وجہ سے جن میں سے اس کے مال کو گزرنا پڑتا تھا ویران ہو چلی تھی اور وہ وقت قریب آگیا تھا کہ یہ تجارت بالکل ہی مٹ جائے۔

افق ظاہری کی مدور شکل۔ سمندر میں اس کا ڈوبا ہوا نظر آنا۔ جہازوں کا کھلے سمندر میں بتدریج نمودار ہونا اور رفتہ رفتہ غائب ہو جانا یہ تمام ایسے واقعات ہیں جن کے مشاہدہ سے وہ جہازران جن کو مبداء فیاض سے جوہر فکر سلیم عطا ہوا ہے اس نتیجہ کی طرف مائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ زمین کروی الشکل ہے۔ مسلمان مہندسین و فلاسفہ کی تصنیفات نے اس خیال کو مغربی یورپ میں عام طور سے شائع کر دیا تھا لیکن دین مسیحی کے پیشواؤں نے اسے کبھی استحسان کی نظر سے نہ دیکھا اور ان سے بجز اس کے توقع بھی اور کیا ہو سکتی تھی۔ جب جنوا کی تجارت تباہی کے قریب پہنچ گئی تو یہاں کے بعض جہاز رانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر زمین حقیقت میں گول ہو تو ممکن ہے کہ جنوا کا آفتاب تجارت جو لب بام ہے پھر نصف النہار پر چمکتا ہوا نظر آئے۔ اس لئے کہ جو جہاز آبنائے جبل الطارق میں سے ہوتا ہوا بحراوقیانوس کے بیچوں بیچ سمت مغرب ناک کی سیدھ چلا جائے وہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر پہنچ جائے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ اس میں یہ بھی تھا کہ مال تجارت جہازوں کے ذریعہ سے خشکی کے سفر کی محنت شاقہ اور مصارف کثیر کے بغیر منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔

جنوا کے جن ناخداؤں کو یہ خیال پیدا ہوا ان میں کرسٹوفر کولمبس بھی شریک تھا جس کے مقدر میں ایک عظیم الشان حقیقت کا عملی انکشاف لکھا تھا۔

کولمبس بیان کرتا ہے کہ اس مسئلہ کی طرف اس کی توجہ ابن رشد کی تحریرات نے منعطف کی اس کے علاوہ اس کا ایک دوست ٹاسنلی نامی فلارنس کا رہنے والا تھا جس کو فن ہیئت کے مطالعہ کا بدرجہ غایت شوق تھا۔ ٹاسنلی مسئلہ کرویت شکل زمین کا بہت بڑا حامی تھا اور کولمبس کے خیالات پر اس کی تعلیم کا بھی قوی اثر پڑا۔ لیکن جنوا میں کولمبس کی حوصلہ افزائی بہت کم ہوئی۔ کئی سال تک وہ مختلف ممالک کے فرمانرواؤں اور امرا کو اپنے مجوزہ ارادہ کی تکمیل کی سرپرستی پر آمادہ کرتا رہا لیکن اس کی کوششیں رائگاں گئیں۔ اسپین کے پادریوں کو اس کے ارادہ میں کفر اور زندقہ کی ڈراؤنی صورت نظر آئی اور سیلمنکا کی مسیحی کونسل نے اس پر بدعت سیئہ کا فتویٰ لگایا۔ چاروں طرف سے پادریوں کی یہ آوازیں آنے لگیں کہ جو شخص زمین کو گول مان کر اس کے گردا گرد سفر کرنے کی ملحدانہ کوشش کرتا ہے وہ عہد عتیق' عہد جدید' زبور' رسولوں کی پیشین گوئیوں اور سینٹ کریسا سٹم۔ سینٹ آگسٹائن سینٹ جروم۔ سینٹ گریگوری۔ سینٹ بیل اور سینٹ ایمبروز کے نو شتجات و ملفوظات کو جھٹلاتا ہے۔

لیکن اس کی مساعی جمیلہ آخرکار بار آور ہو کر رہیں۔ اسپین کی ملکہ آسابیلا نے اس کی ہمت بڑھائی اور ناخدایان پیلاس کے ایک دولت مند خاندار پنزان نامی نے روپیہ سے اس کی مدد کی۔ اس خاندان کے کچھ لوگ اس کے ساتھ چلنے کے لئے بھی آمادہ ہو گئے۔ شاہ فرڈیننڈ نے اسے تاتار کے خان اعظم کے نام ایک چٹھی اپنے خاص دستخط سے لکھ کر دی اور ایک بحری نقشہ جو ٹاسنلی کے مرتبہ نقشہ کی بنا پر تیار کیا گیا تھا اپنی رہنمائی کے لئے اس نے ساتھ لیا۔ غرض کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہو کر اس نے ۳ اگست ۱۴۹۲ء کو تین چھوٹے چھوٹے جہازوں کے بیڑے کے ساتھ لنگر اٹھایا۔ سوا دو مہینے کے مسلسل سفر کے بعد ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو آدھی رات سے ذرا دیر پہلے اس نے اپنے جہاز کے سلوقیہ سے کچھ فاصلہ پر ایک متحرک روشنی دیکھی۔ دو گھنٹے کے بعد دوسرے جہاز سے توپ کے دغنے کی آواز آئی جو اس بات کی علامت تھی کہ اہل جہاز نے خشکی کو دیکھ پایا ہے۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو جہاز ساحل پر پہنچ گئے اور کولمبس نے نئی دنیا میں قدم رکھا۔

جب وہ یورپ واپس آیا تو سب نے یہی خیال کیا کہ جس ساحل پر وہ لنگر انداز ہوا وہ ایشیا کا مشرقی حصہ تھا اور اس لحاظ سے اس کا سفر علی سبیل النظر کامیاب رہا۔ خود کولمبس کو

مرتے دم تک اسی بات کا یقین رہا۔ لیکن متعدد بحری سفر جو بعد میں کئے گئے ان سے ساحل امریکہ کی عام حدود بہت جلد معلوم ہو گئیں اور جب بلبوا نے بحراعظم جنوبی کو دریافت کیا تو اصل حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا وہ معاً اٹھ گیا اور وہ غلطی رفع ہو گئی جس میں ٹاسکنلی اور کولمبس دونوں کے دونوں مبتلا تھے یعنی مغربی بحری سفر میں یورپ اور ایشیا کا درمیانی فاصلہ اس فاصلہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا جو اٹلی سے خلیج گنی تک جانے میں طے کرنا پڑتا ہے اور یہ سفر کولمبس نے بارہا کیا تھا۔

کولمبس نے اپنے پہلے سفر میں ۱۳ ستمبر ۱۴۹۲ء کو رات کے وقت جب کہ وہ مجمع الجزائر ازورس[2] کے ایک جزیرہ کورود سے ۲/۱ ۲ درجہ مشرق کی جانب تھا یہ بات مشاہدہ کی کہ جہازوں کی کمپاس کی سوئیوں کا رخ حسب معمول مائل بہ شمال و مشرق نہیں ہے بلکہ مائل بہ مغرب ہے جوں جوں جہاز آگے بڑھتے گئے یہ انحراف بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اگرچہ کولمبس ہی پہلا وہ شخص نہیں ہے جس کی نظر اس انحراف پر پڑی لیکن اس میں شک نہیں کہ خط عدم انحراف کو سب سے اول اسی نے دریافت کیا۔ اس سفر سے واپس آتے وقت اس کے برعکس حالت پائی گئی یعنی کمپاس کی سوئی کا مغربی میلان کم ہوتا گیا۔ تاآنکہ اس خط نصف النہار پر پہنچ کر جہاں انحراف باقی نہیں رہتا سوئی کا رخ پھر شمال کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد جوں جوں یورپ کا ساحل قریب آتا گیا سوئی کا مشرقی میلان بڑھتا گیا۔ اس سے کولمبس نے یہ نتیجہ نکالا کہ خط نفی میلان یا عدم انحراف ایک مقررہ جغرافیائی خط ہے جو نصف کرہ مشرقی و نصف کرہ مغربی کے درمیان بمنزلہ حد فاصل ہے۔ جب اسپین اور پرتگال میں مقبوضات خارجہ کے متعلق جھگڑا ہوا تو پاپائے الگزنڈر سادس نے اس نزاع[3] کے تصفیہ کی غرض سے ایک فرمان ماہ مئی ۱۴۹۳ء میں جاری کیا۔ جس میں یہ خط ان دونوں اقوام کے مقبوضات کی دوامی حد فاصل قرار دیا گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خط بتدریج مشرق کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ چنانچہ ۱۶۶۲ء میں لندن کے خط نصف النہار پر منطبق ہو گیا۔

پاپا کے فرمان کی رو سے پرتگال کے مقبوضات کی حدود خط عدم انحراف کا مشرقی حصہ قرار دی گئی تھیں۔ بعض مصری یہودیوں کی زبانی دولت پرتگال کو معلوم ہوا کہ براعظم افریقہ کے گرداگرد جہاز پر سفر کرنا باسانی ممکن ہے۔ اس لئے کہ براعظم مذکور کے منتہائے جنوب میں ایک راس ہے جس کا عبور آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس اطلاع کی بنا پر تین جہازوں کا ایک مختصر سا بیڑا بسر کردگی واسکوڈی گاما ۹ جولائی ۱۴۹۷ء کو پرتگال سے روانہ ہوا اور بتاریخ ۲۰ نومبر راس امید کو قطع کرنے کے بعد ۱۹ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ میں لنگر انداز

ہوا جو ہندوستان کے ساحل پر واقع ہے۔ پاپا کے اس فرمان کی رو سے جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے مشرق کے اس سفر کی بدولت اہل پرتگال کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

راس امید کا چکر کاٹنے سے پہلے واسکوڈی گاما کے جہازوں کا رخ عموماً جنوبی سمت میں تھا۔ بہت جلد یہ بات اہل جہاز کے دیکھنے میں آئی کہ سطح افق سے قطب ستارے کا ارتفاع کم ہو رہا ہے اور خط استوار پر پہنچنے کے بعد تو یہ ستارہ نظر سے بالکل ہی غائب ہو گیا مگر اور ستارے جن میں سے بعض شاندار بروج کی شکل میں تھے نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ یہ وہی ستارے تھے جن کا تعلق نصف کرہ جنوبی کے آسمان سے ہے۔ تمام واقعات سے ان نظری قیاسات کی تائید ہوتی تھی جو شکل زمین کی کرویت کے متعلق قائم کیے گئے تھے۔

ان جدید اکتشافات کے سیاسی نتائج نے پاپائے روما کو گرداب تشویر و تذبذب میں ڈال دیا۔ جن مذہبی روایات اور ملکی مصالح پر پاپا کی حکومت کا انحصار تھا وہ کسی طرح اس کے مقتضی نہ تھے کہ زمین کی کوئی اور شکل بجز شکل مسطح کے جس کا ذکر کتب الہامی میں تھا تسلیم کیا جائے۔ اخفائے واقعات ممکن نہ تھا اور سو فسطائیانہ تاویلیں بیکار تھیں۔ وینس اور جنوا کی تجارت کا چراغ گل ہو گیا۔ یورپ کی شکل تبدیل ہو گئی۔ بحری طاقت ان ممالک سے جو بحر روم کے سواحل پر واقع تھے رخصت ہو گئی اور وہ ملک جو بحر اوقیانوس کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے تھے جہازرانی کے مرکز بن گئے لیکن دولت اسپین نے اپنے تجارتی رقیب کی اس کامیابی کے آگے ہاتھ پاؤں مارے بغیر سر تسلیم خم کرنا گوارا نہ کیا۔ فرڈیننڈ میگیلن نامی ایک اولوالعزم ناخدا نے اراکین دولت سے یہ عرض کیا کہ اگر اس نئی دنیا میں جو اب براعظم امریکہ کے نام سے موسوم ہے کسی نئی آبنائے کا پتہ معلوم ہو جائے تو مغربی سمندروں کو قطع کرنے کے بعد ہندوستان اور "اسپائس آئیلینڈس" (جزائر الافواج) تک پہنچ جانا ممکن ہے اور اگر یہ مہم طے ہو جائے تو پاپا کے فرمان کی رو سے اسپین کو بھی ہندوستان کی تجارت میں اسی قدر حصہ مل سکتا ہے جس قدر پرتگال کو میگیلن کی ان باتوں کو حکومت اسپین نے دل کے کانوں سے سنا اور پانچ جہازوں کی ایک مہم جس کے ساتھ دو سو مہنتیں آدمی تھے اس کی سرکردگی میں ۱۰ اگست ۱۵۱۹ء کو اشبیلیہ سے روانہ کی گئی۔

میگیلن نے سیدھا جنوبی امریکہ کے ساحل کا رخ کیا اور تن بہ تقدیر اس امید پر بڑھا چلا گیا کہ اسے کوئی قدرتی آبی منفذ براعظم میں سے مل جائے گا جس کے ذریعہ سے وہ بحراعظم جنوبی میں داخل ہو سکے گا۔ خط عدم انحراف پر پہنچ کر ہوا چلنی بند ہو گئی اور کامل دو

مہینے دس دن تک بند رہی۔ جہاز کے ملاحوں کو یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں وہ ایسے منطقہ میں نہ چلے آئے ہوں جہاں ہوا کبھی چلتی ہی نہ ہو اور ان کا بیڑا اس خوفناک سمندر کی ساکن و غیر متحرک موجوں سے کبھی پار ہی نہ ہو سکے۔ یہ خوف بغاوت سے مبدل ہو گیا اور جب خدا خدا کر کے ہوا کے جھونکوں نے سمندر کے طلسم خموشی کو توڑا تو جھکڑ چلنے لگا۔ اور ایسا طوفان اٹھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ لیکن سمندر کا سکون' طوفان کا جوش' ملاحوں کی بغاوت۔ اہل جہاز کی بیوفائی اس کی جبین استقلال پر بل تک نہ ڈال سکی۔ ایک سال سے زیادہ کی بحر نوردی کے بعد اس نے وہ آبنائے دریافت کی جو اب اس کے نام سے منسوب ہے۔ اٹلی کا ایک باشندہ پگافٹی جو اس کے ہمراہ تھا بیان کرتا ہے کہ جب میگیلن کی نظر بحر جنوبی یعنی بحرالکاہل کی عظیم الشان پہنائی پر پڑی تو فرط مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اس خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے اس محیط اعظم کے نامعلوم خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے آخر یہاں تک پہنچا دیا۔"

قحط کی شدت کا یہ عالم تھا کہ روٹی کے بجائے اسے چمڑے کے وہ ٹکڑے چبانے پڑے جن کی پھٹے ہوئے بادبانوں میں گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ پانی اسے ایسا پینا پڑا جس میں کیڑے پڑ گئے تھے اور بو آنے لگی تھی۔ اس کے جہاز کے ملاح بھوک سے جاں بلب اور مرض احتراق خون میں مبتلا تھے مگر یہ کوہ وقار شخص جسے زمین کے کروی الشکل ہونے کا کامل یقین تھا ان جان فرسا مصائب سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے جہاز کو برابر سمت شمال و مغرب میں بڑھائے چلا گیا اور چار مہینے تک کسی آبادی پر اس کی نظر نہ پڑی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ بحرالکاہل کی سطح پر اس نے بارہ ہزار میل سے کم مسافت نہ طے کی ہو گی۔ خط استوا سے گزرنے کے بعد اسے قطب ستارہ بھی دکھائی دیا اور آخرکار جزائر لیڈرونس کے ساحل پر اس نے لنگر ڈالا۔ یہاں اس کی ملاقات سماٹرا کے بعض باشندوں سے ہوئی جو قسمت آزمائی کے لئے وطن سے نکلے تھے لیکن افسوس اس کے مقدر میں یہ نہ لکھا تھا کہ اس عظیم الشان بحری مہم کو اپنے ہاتھوں انجام تک پہنچائے۔ انہیں جزائر میں یا تو یہاں کے وحشیوں نے یا خود اس کے ہمراہیوں نے اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد اس کے مددگار سباسٹین ڈلکانو نے جہاز کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور راس امید کا رخ کیا۔ رستے میں جو مصیبتیں اسے جھیلنی پڑیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے راس امید آئی جس سے گزر کر اس نے چوتھی مرتبہ خط استوار کو عبور کیا۔ ۷ ستمبر ۱۵۲۲ء کو تین سال سے زیادہ کے بحری سفر کے بعد اس کا جہاز سین وٹوریا نامی سینٹ بوکر کے بندرگاہ میں جو اشبیلیہ کے

متصل واقع ہے لنگرانداز ہوا۔ اس جہاز کا سفر بنی نوع انسان کی تاریخ میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس لئے کہ زمین کے گرداگرد سفر کرنے کا پہلا شرف اسی کو حاصل ہوا۔

سین وٹوریا مغرب کی سمت میں سفر کرتے رہنے کے بعد اسی نقطہ پر پہنچ گیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ اس سے زیادہ ناممکن التردید ثبوت زمین کے گول ہونے کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اب مسیحیت کو یہ مجال نہ رہی کہ یہ دعوے کرے کہ زمین چپٹی ہے۔ تصور انسطاح ارض انسانی دماغ سے ہمیشہ کے لئے محو ہو گیا۔

میگیلن کے بحری سفر کی تکمیل کے پانچ سال بعد مسیحی دنیا نے تحقیق جسامت ارض کے متعلق پہلی کوشش کی جو ایک فرانسیسی طبیب فرنل کے حصہ میں آئی۔ فرنل نے اول حساب لگایا کہ پیرس میں ارتفاع قطب کس قدر ہے۔ اس کے بعد وہ شمال کی طرف روانہ ہوا تاآنکہ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا۔ جہاں پیرس کے مقابلہ میں ارتفاع قطب ایک درجہ زیادہ تھا ان دونوں مقامات کے درمیان جس قدر فاصلہ تھا اس کی پیائش اس نے اپنی گاڑی کے ایک پہیئے کے چکروں کے ذریعہ سے کی جس کے ساتھ اس نے ایک مقیاس المسافت لگا دیا تھا۔ جب ایک درجہ کا فاصلہ اس طریقہ پر معلوم ہو گیا تو اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین کا دور حسب پیانہ اٹلی بقدر چوبیس ہزار چار سو اسی میل کے ہے۔

اس کے بعد مختلف ممالک میں باحتیاط تمام پیائش کی گئی۔ اسنیل نے ایک درجہ ارضی کی پیائش ہالینڈ میں کی۔ ناروڈ نے لندن اور یارک کے درمیان انگلستان میں پکارڈ نے "فرنچ اکاڈمی آف سائنسز" (مجلس ترقی علوم و فنون) کی سرپرستی سے فرانس میں۔ پکارڈ کی ترکیب یہ تھی کہ مثلثوں کے ایک سلسلہ کے ذریعہ سے دو نقطوں کو باہم ملا کر دائرہ نصف النہار کے اس قوس کو جو ان نقطوں میں حائل ہو ناپ لیا جائے اور اس کا مقابلہ عرض البلد کے اس اختلاف کے ساتھ کیا جائے جو مشاہدات فلکی سے حاصل ہو۔ اتصال نقاط کے لئے جو مقامات اس طور پر تجویز کئے گئے وہ بوائزن اور سرودن تھے۔ اول الذکر نواح پیرس میں واقع ہے۔ اور ثانی الذکر امینس کے قریب۔ اختلاف عرض البلد کی تعیین برج ذات الکرسی کے بعد سمت الراس کے مشاہدہ سے کی گئی۔ پکارڈ کے طرز عمل میں دو امور خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں۔ اول تو اس طریقہ کے عمل میں لاتے وقت جو آلات استعمال کئے گئے ان میں دوربین بھی شامل تھی۔ ثانیاً اس سے جو نتائج مستنبط ہوئے انہوں نے جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہو گا نیوٹن کے لئے اصول کشش ثقل کی ہمہ گیری کا ثبوت بہم پہنچایا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اصول علم الحرکات خصوصاً" ان اصول نے جو نیوٹن کے دریافت کئے ہوئے تھے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ چونکہ زمین ایک جرم دوار ہے لہٰذا اس کی شکل کامل کروی نہیں ہو سکتی بلکہ مثیل کروی یا مسطح الطرفین ہونی چاہئے یعنی ضرور ہے کہ وہ قطبین پر چپٹی ہو۔ اس سے لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک درجہ کا طول خط استوا کے اطراف و جوانب کے مقابلہ میں قطبین کے قریب زیادہ ہونا چاہئے۔

"فرنچ اکاڈمی" نے فیصلہ کر لیا کہ پکارڈ کے عمل کو وسعت دی جائے اور پیمائش کا سلسلہ ہر طرف قائم کر کے فرانس کا ایک ایسا نقشہ تیار کیا جائے جو نسبتہ زیادہ صحیح ہو۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل حیز التوا میں پڑی رہی اور کہیں ۱۷۱۸ء میں جا کر فرانس کی شمالی حد یعنی ڈنکرک سے لے کر جنوبی حد تک کی پیمائشیں ختم ہوئیں۔ ان پیمائشوں کی تاویل اختلاف آرا کا باعث ہوئی۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان پیمائشوں سے کرہ زمین کا مستطیل الطرفین ہونا پایا جاتا ہے لیکن بعض کی رائے اس کے خلاف تھی وہ ان پیمائشوں کو زمین کے مسطح الطرفین ہونے کا ثبوت سمجھتے تھے۔ شکل اول کو عام طور پر نیمبو سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور شکل ثانی کو نارنگی سے۔ اس اختلاف کا تصفیہ کرنے کے لئے حکومت فرانس نے "اکاڈمی" کی مدد سے دو علمی نقائص دائرہ نصف النہار کے ایک ایک درجہ کی پیمائش کے لئے خط استوا اور شمال کی طرف روانہ کئے۔ پہلا نفیفہ پیرو کو گیا اور دوسرا سویڈن و لیپ لینڈ کی طرف دونوں جماعتوں کو بہت کچھ دقتیں اور زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن شمالی جماعت نے جو لیپ لینڈ کو گئی تھی اپنا کام پیرو والی جماعت سے جو نو سال تک اپنے فرائض مفوضہ کی انجام دہی میں مصروف رہی بہت پہلے ختم کر لیا۔ بہرحال دونوں جماعتوں کے نتائج کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ کرہ زمین مسطح الطرفین یعنی قطبین پر چپٹا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس پیمائش کا نہایت وسیع اور صحیح پیمانہ پر بار بار اعادہ ہوتا رہا ہے۔ انگریزوں نے انگلستان اور ہندوستان میں پیمائش کی اور فرانسیسیوں نے اوزان و پیمانجات کے طریقہ مطریہ کو جاری کرتے وقت جو پیمائش کی وہ اپنی دقیقہ سنجی اور موشگافی کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس پیمائش کو ڈلامبر اور مشائن نے ڈنکرک سے شروع کر کے بارسلونا تک پہنچایا اور وہاں سے بایٹ اور اراگو نے اس کے سلسلہ کو جزیرہ فار مٹیرا تک وسعت دی جو منارکا کے قریب واقع ہے۔ اس پیمائش کا طول ساڑھے بارہ درجہ تھا۔

پیائش کے اس بلاواسطہ طریقہ کے علاوہ زمین کی شکل مختلف عروض البلد میں ایک معینہ طول کے رقاص ساخت کے اہتزازات کی اختلاف تعداد سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ان اہتزازات سے اگرچہ نتائج سابقہ کی تصدیق و توثیق ضرور ہوتی ہے لیکن پیائش درجات کے مقابلہ میں ان کے ذریعہ سے زمین کی بیضویت زیادہ بڑھی ہوئی قرار پاتی ہے۔ جوں جوں خط استوا قریب آتا جاتا ہے رقاص کے اہتزاز یا ارتعاش میں آہستگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا فاصلہ زمین کے مرکز سے قطبین کے مقابلہ میں خط استوا پر زیادہ ہے۔

سب سے زیادہ معتبر و موثق پیائش کی بنا پر زمین کی جسامت حسب ذیل اعداد میں ظاہر کی جا سکتی ہے۔

قطر اکبر یا قطر استوائی ۷۹۲۵ میل

قطر اصغر یا قطر قطبی ۷۸۹۹ میل

دونوں کا فرق یعنی انضغاط قطبین ۲۶ میل

یہ وہ نتائج ہیں جو اس بحث سے پیدا ہوئے کہ زمین کی شکل کیسی ہے اور جسامت کس قدر ہے۔ ابھی یہ بحث ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک اور بحث جس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ اہم نتائج وابستہ تھے۔ پیدا ہو گئی۔ یہ بحث اس مسئلہ کے متعلق تھی کہ آفتاب اور دوسرے سیاروں کے مقابلہ میں زمین کا درجہ اور حیثیت کیا ہے۔

پروشیا کے ایک مہندس کوپرنکس نے ۱۵۰۷ء میں ایک کتاب "ادوار اجرام فلکی" کے عنوان سے لکھی تھی۔ جوانی کے زمانے میں اس نے اٹلی کا سفر کیا تھا اور فن ہیئت کی تکمیل کے بعد روما میں ریاضیات کا درس بھی ایک عرصہ تک دیا تھا۔ نظام بطلیموس و نظام فیثا غورث کا بہ امعان نظر مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ نظام ثانی الذکر صحیح ہے اور اس کی تصنیف کا مقصد اسی کی تائید و توثیق تھا۔ چونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے خیالات و حقائق الہامی کی نفی مطلق کرنے کے لحاظ سے اس مورد عتاب کلیسائے عیسوی بنائیں گے۔ لہٰذا اس نے اپنی کتاب کا مقدمہ جس کا روئے خطاب پاپائے پال ثالث کی طرف ہے حزم و احتیاط کی راہ سے معذرت کے پیرائیہ میں اس طرح شروع کیا ہے۔ "میں نے صرف بطور تجربہ اس بات کے تحقیق کرنے کی جرات کی ہے کہ اگر زمین کو متحرک فرض کر لیا جائے تو آیا یہ ممکن ہے کہ اجرام سماوی کی گردش کو جو توجیہات قدما نے کی ہیں ان سے کوئی زیادہ تر معقول توجیہ ہمارے ہاتھ آ جائے۔ قیاسات کے قائم

کرنے کا حق ایک ایسا حق ہے جو دوسروں کو بھی اس سے پہلے عطا کیا جا چکا ہے۔ اور میں نے بھی اس کتاب کی تصنیف میں اسی حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

اس ڈر کے مارے کہ خدا جانے کتاب کے شائع ہوتے ہی کیا آفت اس پر ٹوٹ پڑے اس نے چھتیس سال تک اس کی اشاعت نہ کی اور اسی شش و پنج میں رہا کہ ممکن ہے کہ مصلحت اسی میں ہو کہ جس طرح فیثا غورث اور دوسرے حکما اپنے معلومات کو سینہ بسینہ نقل کرتے چلے آئے ہیں اور ان کے عقائد بجز ان کے خاص خاص احباب کے اور کسی کو معلوم نہیں ہوئے اسی طرح میں بھی اپنے اصول کی تلقین کا حلقہ اپنے دوستوں تک ہی محدود رکھوں اور آئندہ نسلوں تک انہیں بذریعہ روایت ہی پہنچا دوں لیکن آخرکار اپنے دوست پادری شومبرگ کے بے حد اصرار پر اس نے اسے ۱۵۴۳ء میں شائع کیا۔ جب مطبع سے اس کا ایک نسخہ چھپ کر اس کے پاس پہنچا تو وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ کتاب کا حشر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ "انکویزیشن" نے اسے ملحدانہ قرار دیا اور اس حکم امتناعی میں جس کی رو سے اس کتاب کا پڑھنا جرم قرار دیا گیا نظام کوپرنیکس کی نسبت یوں در افشانی کی گئی۔ "یہ وہ باطل فیثا غورثی مذہب ہے جو کتب مقدسہ کی ضد ہے"۔

ہیئت دانوں کا یہ قول بالکل درست ہے کہ کوپرنیکس کی کتاب نے علم ہیئت کی شکل ہی بدل ڈالی۔ اس نے نظریہ شمسی المرکز کے حق میں قول فیصل بن کر آفتاب کو نظام اجرام کا مرکز قرار دیا اس نے ثابت کر دیا کہ ثوابت کا فاصلہ زمین سے اس قدر ہے کہ ہمارا وہم و گمان بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا اور زمین فضائے غیر متناہی میں بمنزلہ ایک چھوٹے سے نقطہ کے ہے۔ نیوٹن پر کوپرنیکس کو یہ تقدیم حاصل ہے کہ اس نے آفتاب قمر اور دوسرے اجرام سماوی میں کشش ثقل کا موجود ہونا تسلیم کیا۔ اگرچہ اس بات کے فرض کرنے سے وہ غلطی میں پڑ گیا کہ اجرام سماوی کی حرکت بشکل دائرہ ہونی چاہئے۔ یہ خیال کوپرنیکس کو دور مریخ کے مشاہدہ سے یہ دیکھ کر کہ مختلف اوقات میں اس کے قطر کا طول مختلف ہوتا ہے پیدا ہوا تھا۔

نظام کوپرنیکس پر اس الزام کے لگانے میں کہ وہ کتب مقدسہ کے الہامی حقائق کی نفی کرتا ہے پیشوایان دین نے غالباً" منطقیانہ استدلال سے کام لیا انہوں نے یہ سوچا کہ اگر زمین کو جواب تک مرکز و مدار کائنات سمجھی جاتی تھی عظمت و جلال کی اس مسند سے نیچے اتار دیا جائے گا اور ایسے کثیر التعداد اجرام فلکی کا وجود تسلیم کر لیا جائے گا جن میں سے

بیشتر اس کے ہم درجہ اور اکثر اس پر فوقیت رکھتے ہیں تو اس کے گویا یہ معنی ہوں گے کہ زمین عنایات ایزدی کی مورد خاص نہیں ہے۔ بیشمار ثوابت میں سے اگر ہر ایک بمنزلہ آفتاب ہو اور اس کے گرد سیارے گھومتے ہوں جن میں ہمارے جیسی مکلف اور ذمہ دار ہستیاں آباد ہوں تو اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ ہم کو تو خیر بعد ہبوط خدا کے بیٹے کی قیمتی قربانی کے کفارہ کے ذریعہ سے نجات مل گئی لیکن ان بیچاروں کا کیا حشر ہوا ہو گا؟ کیا ان میں کوئی ایسی قوم نہیں جو ہماری طرح گناہ میں مبتلا ہوئی ہو یا ہو سکتی ہو؟ اور اگر ہے تو اس کے لئے نجات دہندہ کہاں سے آئے گا؟

۱۶۰۸ء میں ہالینڈ کے ایک باشندے لپرشی نامی نے دریافت کیا کہ اگر بلور کے دو ٹکڑوں کو ایک خاص طریقہ پر باہم ملایا جائے اور ان میں سے دیکھا جائے تو دور کی چیزیں بڑی ہو کر بہت صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی ایجاد کا نام دوربین ہے۔ دوسرے سال فلارنس کے ایک باشندے گلیلیو کو جس نے ریاضیات اور علوم طبیعہ پر کتابیں لکھ کر بہت بڑا نام پیدا کیا تھا۔ یہ واقعہ معلوم ہوا۔ لپرشی کے ایجاد کئے ہوئے آلہ کی ترکیب کا اگرچہ اس کو مطلق علم نہ تھا لیکن اس نے اپنے لئے اسی قسم کا ایک نیا آلہ اپنی ترکیب سے ایجاد کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی ایجاد کو ترقی دی۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں جو دوربین اس نے بنائی اس میں اشیاء تیس حصے بڑی ہو کر نظر آتی تھیں۔ جب اس کے ذریعہ سے اس نے چاند کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سطح قمر پر زمین کی طرح وادیاں اور پہاڑ موجود ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کا سایہ بھی اسے نظر آیا۔ زمانہ سابق میں یہ کہا جاتا تھا کہ عقد ثریا میں پہلے سات ستارے تھے۔ لیکن ایک ستارہ نامعلوم طور پر غائب ہو گیا۔ دوربین لگا کر جب گلیلیو نے اس برج کو دیکھا تو بجائے سات کے چالیس ستارے نظر آئے۔ غرض جس طرف اس کی نظر پڑتی تھی نئے ستارے جو مجرد آنکھ کو نظر نہ آسکتے تھے دکھائی دیتے تھے۔

۷ جنوری ۱۶۱۰ء کی رات کو اس نے تین چھوٹے چھوٹے ستارے ایک خط مستقیم میں سیارہ مشتری کے نزدیک دیکھے اور کچھ دن بعد ایک چوتھا ستارہ اور دیکھا ان ستاروں کو اس نے مشتری کے گرد گردش کرتے ہوئے پایا۔ اور جب اس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر نظام کوپرنیکس کا نمونہ پیش کرتے ہیں تو اس کی خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔

ان عجائبات کا مشتہر ہونا تھا کہ تمام دنیا ادھر جھک پڑی۔ پادریوں کے گھر میں بھی ان انکشافات نے ہل چل ڈال دی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے اس مذہبی اصول کا

اب خدا ہی حافظ ہے کہ کائنات محض انسان کے فائدہ کی غرض سے پیدا کی گئی ہے۔ ممکن نہ تھا کہ وہ بے شمار ثوابت جواب تک نظر سے مخفی تھے انسان کے دل میں یہ خیال نہ پیدا کریں کہ ان کے پیدا کرنے سے خدا کا مقصد یہی نہیں ہے کہ انسان کو شب کے وقت روشنی پہنچائی جائے بلکہ اور ہی کچھ ہے۔

نظام کوپرنیکس پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اگر عطارد اور زہرہ آفتاب کے گرد دور زمین کے اندر گردش کرتے ہوں تو ضرور ہے کہ ان میں قمر کی طرح تبدلات نظر آئیں اور زہرہ میں تو جس کی روشنی اور چمک دمک اس درجہ نمایاں ہے یہ تبدیلیاں اور بھی بین ہونی چاہئیں۔ خود کو کوپرنیکس نے اس اعتراض کی معقولیت کو تسلیم کیا تھا اور اس سے اس کا کوئی شافی جواب نہ پڑا تھا۔ گلیلیو نے جب دوربین لگا کر زہرہ کو دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ تبدلات مترقبہ حقیقت میں موجود ہیں یعنی ایک وقت میں یہ سیارہ ہلال تھا پھر ماہ نیم ماہ ہوا اس کے بعد محدب التنویر ہوا یعنی اس کا تین چوتھائی حصہ روشن ہو گیا۔ اور بالاخر بدر کامل بن گیا۔ کوپرنیکس کے زمانہ سے پہلے یہ خیال تھا کہ سیارے بذات خود روشن ہیں لیکن زہرہ اور مریخ کے تبدلات یعنی مدارج تنویر نے ثابت کر دیا کہ وہ مستنیر ہیں یعنی ان کی تابانی آفتاب کی روشنی کا عکس ہے۔ ارسطو اور اس کے پیروؤں کے اس عقیدے کو کہ اجسام سماوی اجسام ارضی کی طرح فساد پذیر نہیں ہیں۔ گلیلیو کے ان انکشافات نے سخت صدمہ پہنچایا کہ زمین کی طرح چاند میں بھی پہاڑ اور وادیاں ہیں اور آفتاب بے عیب نہیں ہے بلکہ اس کا چہرہ داغدار ہے اور بجائے اس کے کہ وہ شان و وقار کے ساتھ ایک جگہ قرار پذیر ہو اپنے محور کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ نئے ستاروں کے منظر نے بھی اس عقیدے کو بہت کچھ متزلزل کر دیا تھا۔

ان دلفریب دوربینی انکشافات نے اور بہت سی تحقیقاتوں کے ساتھ مل کر نظام کوپرنیکس کی صحت کو پایہ ثبوت پر پہنچا دیا اور کلیسائے عیسوی کی تشویش و اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ادنیٰ درجہ کے جاہل پادری ان انکشافات کو مکر و زور اور فریب والتباس سے تعبیر کرتے تھے۔ بعض کا یہ قول تھا کہ دوربین پر اجسام ارضی کے متعلق تو اعتبار کیا جا سکتا ہے لیکن اجرام سماوی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان اجرام کا جو علم ہمیں بذریعہ دوربین ہوتا ہے وہ محض فریب نظر ہے۔ ایک گروہ ایسے بزرگ پادریوں کا بھی تھا جو یہ ارشاد فرماتے تھے کہ دوربین کی ایجاد ارسطو کے اس قول کی دوسری شکل ہے کہ ستارے روز روشن میں ایک گہرے کنوئیں کی تہ سے نظر آ سکتے ہیں۔

گلیلگو پر اس مقدس برادری نے التباس بدعت الحاد اور زندقہ کا الزام لگایا۔ اس پر علی سبیل ابراء اس نے ایک خط پادری کسٹیلی کے نام لکھا جس میں یہ ظاہر کیا کہ کتب مقدسہ کی تنزیل کا منشا یہ نہیں ہے کہ علمی مسائل میں ان سے استناد کیا جائے بلکہ ان کا مقصد انسان کی اخلاقی رہبری ہے۔ مخالفت کی جو آگ پہلے ہی بھڑک رہی تھی اس پر اس خط نے اور تیل ڈال دیا۔ مقدس محکمہ احتساب عقائد یعنی "انکویزیشن" نے وارنٹ گرفتاری جاری کر کے گلیلیو کو پکڑ بلوایا۔ اس حکم نامہ میں اس پر الزام یہ لگایا گیا تھا کہ وہ اس اصول کی تعلیم دیتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ کتب مقدسہ کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ جب وہ اس دینی عدالت کے اجلاس میں حاضر ہوا تو اس سے کہا گیا کہ اپنے ملحدانہ عقیدہ سے توبہ کرے ورنہ قید کر دیا جائے گا۔ اس کو یہ حکم دیا گیا کہ کوپر نیکس کے اصول کی تائید اور تلقین سے باز آ جائے اور آئندہ کے لئے عہد کرے کہ ان اصول کی حمایت و اشاعت میں حصہ نہ لے گا۔ چونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ سچائی خود بخود ظاہر ہو کر رہتی ہے اور اسے شہدا کی ضرورت نہیں جو اپنی جان اس پر قربان کریں لہٰذا اس نے انکویزیشن کے جابرانہ احکام کی تعمیل کا اقرار کر لیا اور وعدہ کیا کہ جو کچھ اس کو ہدایت کی گئی ہے اس پر عمل کرے گا۔

اس کے بعد سولہ سال تک کلیسا کو چین سے سونا نصیب ہوا۔ لیکن ۱۶۳۲ء میں جب گلیلیو سے نہ رہا گیا تو اس نے اپنی کتاب موسوم بہ نظام عالم شائع کر ہی دی۔ اس کتاب کا مقصد کوپرنیکس کے اصول کی تصدیق و توثیق تھا۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ "انکویزیشن" کے پیادے پھر دوڑے اور اس الزام میں کہ اس نے آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا دعوی کیا ہے اور مکرر "انکویزیشن" کے اجلاس میں حاضر کیا گیا۔ اور اس مقدس عدالت کے صدر نشین نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ملزم نے جرم الحاد و زندقہ کے ارتکاب سے اپنے آپ کو ان تعزیرات کا مستوجب قرار دیا ہے جو اس جرم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسے مجبور کیا گیا کہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اصول حرکت زمین کے قائل ہونے سے توبہ کرے اور اس پر لعنت بھیجے۔ اللہ اکبر! کس درجہ عبرت ناک نظارہ ہے کہ ایک واجب التعظیم بزرگ کو جو علم و فضل میں اپنے اقران و اماثل کا سرتاج ہے موت کی دھمکی دے کر ان واقعات کے انکار پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ جنہیں وہ خود تو صحیح سمجھتا ہے مگر طرہ یہ ہے کہ خود اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تک درست خیال کرتے ہیں۔ اس کے بعد گلیلیو قید میں ڈال دیا گیا جہاں اپنی زندگی کے باقی دس سال اس نے طرح طرح کی

عقوبتوں اور سختیوں کے ساتھ کاٹے اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی لاش تک کو مسیحی قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا گیا۔ اس واقعہ کی یاد سے ہماری آنکھوں میں خون اتر اتر آتا ہے۔ اس عقیدے کے باطل ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے جسے اپنی تائید کے لئے اس قدر مکروفریب اس درجہ سفاکی اور وحشیانہ پن سے کام لینا پڑے۔ وہ عقائد جن کی حمایت "انکوئزیشن" نے اس شدومد کے ساتھ کی تھی آج کے دن تمام مہذب دنیا میں استحقار و استہزاء کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

زمانہ حال کے ایک بہت بڑے مہندس نے اس واقعہ پر نظر انتقاد ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے کہ امرمابہ النزاع اس بحث میں ایسا تھا جس کے ساتھ انسان کو حددرجہ کی دلچسپی ہے۔ اس لئے کہ اس امر کے تصفیہ پر اس کرہ کے مرتبہ اور حیثیت کا انحصار ہے جس میں ہم آباد ہیں۔ اگر زمین کائنات کے وسط میں ایک جسم غیرمتحرک و قائم ہو تو انسان کو یہ حق ہر طرح سے حاصل ہے کہ اپنے آپ کو صانع قدرت کی توجہ کا مہبط اکبر مان لے۔ لیکن اگر زمین کی حقیقت اس سے زیادہ نہ ہو کہ وہ محض ایک سیارہ ہے جو آفتاب کے گرد گھومتا ہے اور نظام شمسی کے ارکان میں بھی اس کا درجہ کچھ بہت زیادہ قابل وقعت نہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ افلاک کی اس غیرمحدود عظمت میں جہاں یہ نظام شمسی بھی بایں ہمہ درخشانی و پہنائی بمنزلہ ایک نقطہ غیرمحسوس کے ہے بالکل ہی غائب ہو جائے گی۔

نظام کوپرنیکس کی مسلمہ کامیابی کا دور تاریخ ایجاد دوربین سے شروع ہوتا ہے۔ اس ایجاد کے بعد زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یورپ کے ہر ہیئت دان نے اس نظریہ کو بطور اصول موضوعہ تسلیم کر لیا کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور زمین اس کے گرد گردش کرنے کے علاوہ اپنی محور پر بھی گھومتی ہے۔ آفتاب کے گرد زمین کے گردش کرنے کے واقعہ کی تصدیق کے لئے اگر کسی مزید ثبوت کی ضرورت تھی تو وہ بریڈلی کے عظیم الشان انکشاف اختلال ثوابت سے بہم پہنچ گیا۔ ثوابت کے اس اختلال کا انحصار کچھ تو حرکت نور کے تدرج یا تسلسل پر ہوتا ہے اور کچھ زمین کی گردش پر۔ بریڈلی کا انکشاف بلحاظ اہمیت استقبال اعتدالین کی دریافت سے کم نہ تھا۔ تدرج حرکت نور کی تحقیقات جو ریمر کی دقت نظر کا نتیجہ ہے اگرچہ اول اول غلط سمجھی گئی۔ چنانچہ فاشینل نے اس کو فریب نظر سے تعبیر کیا اور کیسینی جیسے شخص نے اسے تسلیم نہ کیا لیکن رفتہ رفتہ تمام دنیا نے اس کی صداقت و حقیقت کے آگے سر جھکا دیا۔

اس کے بعد ہیئت دانوں کو ابعاد نظام شمسی کے متعلق صحیح حالات دریافت کرنے کا

خیال پیدا ہوا۔ بلکہ اس مسئلہ کو اگر محدود شکل میں پیش کیا جائے تو یہ کہنا درست ہو گا کہ انہوں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ زمین سے آفتاب کا فاصلہ کس قدر ہے۔

کوپرنیکس کے زمانہ میں مہندسین کا یہ خیال تھا کہ آفتاب کا فاصلہ پچاس لاکھ میل سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بعض کی رائے میں تو یہ اندازہ بھی بہت کچھ مبالغہ آمیز تھا۔ لیکن ٹائیکوبریہی کے ارتصادات پر نظرثانی کرتے ہوئے کپلر نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اندازہ بہت کچھ اضافہ کا محتاج ہے اور آفتاب کا فاصلہ ایک کروڑ تیس لاکھ میل سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتا۔ ۱۶۷۰ء میں کیسینی نے ظاہر کیا کہ یہ اعداد بھی اصل سے بالکل مقارنت نہیں رکھتے۔ اصلی فاصلہ آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل ہے۔ علمائے ہیئت یہ پیشین گوئی کر چکے تھے کہ ۳ جون ۱۷۶۹ء کو سیارہ زہرہ کا مرور روئے آفتاب پر ہو گا اور بعد شمس کے اس اصولی مسئلہ کے حل کرنے میں مرور زہرہ سے جو مدد ملنے والی تھی اس سے بھی وہ ناواقف نہ تھے۔ یورپ کی مختلف سلطنتوں نے قابل تحسین مستعدی سے کام لے کر اس عظیم الشان واقعہ فلکی کے ارتصاد میں سرکاری طور پر مدد دی۔ چنانچہ یورپ میں پچاس ایشیا میں چھ اور امریکہ میں سترہ مقامات رصد بنی کے لئے تجویز کئے گئے۔ انگریزی حکومت نے کپتان کک کو اس مقصد کی تکمیل کے لئے مامور کیا اور اس نے وہ پہلا بحری سفر اختیار کیا جس کی شہرت کبھی نہ مٹے گی۔ کپتان کک کی منزل مقصود اوٹاہیٹ تھی جہاں پہنچ کر اس نے ترصد کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ اس کا سفر پوری طرح سے کامیاب ثابت ہوا اس لئے کہ آفتاب جب طلوع ہوا تو مطلع بالکل صاف تھا اور دن بھر صاف رہا۔ مرور کا وقت صبح کے ساڑھے نو بجے سے شروع ہو کر سہ پہر کے ساڑھے تین بجے ختم ہوا اور کک نے اپنی رصدگاہ سے تمام ارتصادات قابل اطمینان پر انجام دئے۔

لیکن مختلف مقامات کے رصدی نتائج کا جب مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تطابق جو ان سب میں موجود ہونا چاہئے تھا مفقود ہے یعنی کم سے کم فاصلہ ۸ کروڑ اسی لاکھ اور زیادہ سے زیادہ فاصلہ دس کروڑ نو لاکھ میل قرار پاتا ہے اس تفاوت کی تنقید کے لئے مشہور و معروف مہندس انک نے ۲۴۔۱۸۲۲ء میں ان مختلف ارتصادات پر نظرثانی کی اور یہ نتیجہ نکالا کہ آفتاب کا زاویہ اختلاف نظر افقی یعنی اس مثلث کا زاویۃ الراس جس کا قاعدہ نصف قطر ارض ہے اور دونوں ساقین آفتاب پر جا کر ملتی ہیں بقدر ۸۵۷۶ ثانیہ کے ہے اور اس لئے زمین سے آفتاب کا فاصلہ نو کروڑ باون لاکھ چوہتر ہزار میل ہے۔ اس کے بعد انہیں ارتصادات کا تبصرہ ہنس نے کیا اور نتیجہ نو کروڑ سولہ لاکھ انسٹھ ہزار میل نکالا۔ ہنس

کے بعد لیوریر نے اپنے پیشرو کے نتیجہ پر ایک لاکھ میل کا اضافہ کیا۔ ایئری اور اسٹون ایک دوسرے طریقہ سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ فاصلہ آفتاب نو کروڑ چودہ لاکھ میل ہے۔ البتہ اسٹون نے ارتصادات سابقہ کی تنقیح سے یہ رائے قائم کی کہ حقیقی فاصلہ نو کروڑ سترہ لاکھ تیس ہزار میل ہے۔ سب سے آخر میں فوکا اور فیزو نے طبیعی تجربات سے جو سرعت رفتار نور کے اندازہ پر مبنی تھے اور اس لئے بلحاظ نوعیت ان مشاہدات سے بالکل مختلف تھے جن کا انحصار صرور زہرہ پر تھا یہ نتیجہ نکالا کہ فاصلہ آفتاب نو کروڑ چودہ لاکھ میل ہے۔ تاوقتیکہ سال آئندہ ۱۸۷۴ء کے مرور کے نتائج معلوم نہ ہوں یہی تسلیم کرنا چاہئے۔ کہ آفتاب سے زمین کا فاصلہ نو کروڑ بیس لاکھ میل سے کسی قدر کم ہے۔

اس فاصلہ کے معلوم ہو جانے کے بعد نظام شمسی کے ابعاد و مقادیر کا اندازہ آسانی اور صحت کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے۔ صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہو گا کہ نیپچون جو نظام شمسی کا بعید ترین سیارہ معلومہ ہے آفتاب سے بمقابلہ زمین تیس گنا زیادہ دور ہے۔

انہی اعداد کی مدد سے ہم اس مسئلہ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کی قابلیت پیدا کر سکتے ہیں کہ کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ آفتاب پر سے اگر دیکھا جائے تو زمین ایک نقطہ موہوم رہ جاتی ہے گویا خاک کا ایک ذرہ بے مقدار ہے جو اس کی شعاعوں میں رقص کر رہا ہے۔ اگر ناظرین اس بارہ میں زیادہ تر صحیح اندازہ قائم کرنا چاہتے ہوں تو وہ اس کتاب کو نگاہ سے گز بھر کے فاصلہ پر رکھ کر اس کی عبارت کے کسی نقطہ کو دیکھیں۔ یہ نقطہ زمین کی اس سطح سے جو دیکھنے والے کو آفتاب پر سے نظر آئے گی۔ مقدار میں کئی سو حصہ بڑا ہے۔

پس کیا حقیقت ہو سکتی ہے ایک ایسے جزو و مقراطیسی ایک ایسے ذرہ بے مقدار کی اس ان گنت دنیاؤں کی غیر محدود کائنات میں جس کی پہنائی کا اندازہ کرتے ہوئے دماغ دیوانہ ہو جاتا ہے؟ اگر یہ ذرہ ناچیز اپنی جگہ سے ہٹا بھی دیا جائے بلکہ معدوم بھی ہو جائے تاہم کوئی فرق موجودہ حالت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیا ہستی ہے ان انسانی اجزائے لاتیجزی کی جو دس ارب سے بھی زیادہ کی تعداد میں اس قریب نہ نظر آنے والے ذرہ خاک پر آباد ہیں جن میں سے لاکھوں صفحہ روزگار سے ایسے مٹیں گے کہ گویا ان کا کبھی نام و نشان ہی نہ تھا؟ کیا حقیقت ہے انسان کی یا اس کے رنج و راحت کی؟

جب نظام کوپرنیکس کے اصول کی عام طور سے اشاعت ہوئی تو موافقین و مخالفین سبھی نے اس پر طرح طرح کے اعتراض کئے۔ چنانچہ ایک اعتراض ہالینڈ کے مشہور ہیئت

دان ٹائکو براہی نے بھی کیا جو دراصل ارسٹارکس نے فیثاغورث کے مذہب پر کیا تھا یعنی اگر زمین حقیقت میں سورج کے گرد گھومتی ہو تو مناظر ثوابت کی سمت میں تغیر پیدا ہونا چاہئے ایک وقت خاص میں ہم کو بقدر دور زمین کے قطر کی مسافت کے افلاک کے ایک مقام معینہ سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے بہ نسبت اس قرب کے جو ہمیں چھ مہینے پہلے حاصل تھا لہٰذا ثوابت کی ہیئت اعتباری پر اس قرب و بعد کا اثر پڑنا چاہئے اور ان کے مناظر میں تغیر واقع ہونا چاہئے یعنی جوں جوں ہم ان کے قریب آتے جائیں وہ جدا جدا نظر آنے چاہئیں اور جوں جوں ہم اس سے دور دور ہوتے جائیں وہ آپس میں ملے ہوئے نظر آنے چاہئیں یا باصطلاح ہیئت ان ستاروں کا سالانہ زاویہ اختلاف منظر ہونا چاہئے۔

کسی ستارہ کا زاویہ اختلاف منظروہ زاویہ ہے جو ان دو خطوط کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے جو اس سے علی الترتیب سورج اور زمین کی طرف کھینچے جائیں۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں زمین سے سورج کا فاصلہ بہت کم خیال کیا جاتا تھا۔ اگر اس وقت یہ معلوم ہوتا جیسا کہ اب معلوم ہے کہ یہ فاصلہ نو کروڑ میل سے بھی زیادہ ہے یعنی دور زمین کا قطر اٹھارہ کروڑ میل سے اوپر ہے۔ تو اعتراض متذکرہ بالا بلاشبہ نہایت قوی سمجھا جاتا۔

اس اعتراض کا جواب ٹائیکو کو یہ دیا گیا کہ چونکہ اجرام سماوی کا زاویہ اختلاف منظر اسی نسبت سے گھٹتا جاتا ہے۔ جس نسبت سے کہ ان کا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے لہٰذا ممکن ہے کہ کوئی ستارہ اس قدر دور دراز فاصلہ پر ہو کہ اس کا زاویہ اختلاف نظر محسوس و معلوم ہی نہ ہو سکے۔ یہ جواب آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ ثوابت کے زوایائے اختلاف منظر کا معلوم ہونا آلات پیائش زوایا کی ترقی پر منحصر تھا اور جب اس قسم کے آلات ایجاد ہو گئے تو ان زاویوں کی پیائش آسان ہو گئی۔

ستارہ الفا قنطورس جو ثوابت میں سب سے زیادہ نزدیک خیال کیا جاتا ہے نصف کرہ جنوبی کا ایک روشن دہرا ستارہ ہے۔ اس کا زاویہ اختلاف منظر جو بقدر ۹؍۰ ثانیہ کے ہے سب سے پہلے ہنڈرسن اور مکلیر نے بمقام راس امید ۳۳-۱۸۳۲ء میں دریافت کیا تھا اس حساب سے گویا یہ ستارہ ہم سے آفتاب کی بہ نسبت دو لاکھ تیس ہزار گنا زیادہ دور ہے اس کی سطح سے اگر آفتاب کو دیکھا جائے تو خواہ قرص آفتاب دور زمین کے مساوی ہی کیوں نہ ہو یعنی اس کا قطر خواہ اٹھارہ کروڑ میل ہی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ محض ایک نقطہ دکھائی دے گا یہ ستارہ اور اس کا ہمزاد اپنے مشترک مرکز ثقل کے گرد اکیاسی سال میں گھومتا ہے جس

سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا متفقہ جرم آفتاب کے جرم سے کم ہے۔

ستارہ ۶۱ سگنی کا تعلق ثوابت طبقہ سارس سے ہے۔ یہ ستارہ بھی دہرا ہے۔ اس کا زاویہ اختلاف منظر جوبیل نے ۱۸۳۸ء میں دریافت کیا تھا ۳۱ر ا ثانیہ کے قریب ہے۔ اس حساب سے اس کا فاصلہ سطح زمین سے آفتاب کے فاصلہ کی بہ نسبت پانچ لاکھ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ ستارہ اور اس کا ہمزاد اپنے مشترک مرکز ثقل کے گرد پانچ سو بیس سال میں گھومتا ہے۔ ان دونوں کا متفقہ وزن تقریباً" وزن آفتاب کے ایک ثلث کے مساوی ہے۔

ستارہ سیرئیس جو اپنی چمک دمک کے لحاظ سے آسمان میں سب ثوابت سے زیادہ نمایاں ہے۔ الفا قنطورس سے بھی چھ حصہ زیادہ دور ہے اس کا قطر غالباً" ایک کروڑ بیس لاکھ میل ہے اور جو نور کی شعاعیں اس کے جرم سے نکلتی ہیں وہ تابانی و درخشانی میں سورج کی روشنی سے دو سو حصہ زیادہ ہیں لیکن دوربین میں سے دیکھنے پر بھی اس کا قطر ناپا نہیں جا سکتا بلکہ وہ ایک نہایت چمکتی ہوئی چنگاری کی شکل میں نظر آتا ہے۔

پس ثوابت نہ صرف بلحاظ ظاہری عظمت کے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ باعتبار جسامت اصلی بھی ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آلہ اسپکٹروسکوپ (مقیاس الوان نور منشور) سے معلوم ہوتا ہے ترکیب کیمیاوی و طبعی کے لحاظ سے بھی ان میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ آلہ ان تغیرات کے ظاہر کرنے سے جو ثوابت کی شعاع نور کی قابلیت انکسار و انحراف میں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کے دوران عمر کی کیفیت پر بھی روشنی ڈال رہا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قریب ترین ستارہ ہم سے اتنا دور ہے کہ اس کے فاصلہ کی پیائش کرنا قریباً" محال ہے لیکن ہمارے قیاس کی یہ ابھی پہلی منزل ہے۔ کائنات فلکی میں ایسے ثوابت بھی ہیں جن کی روشنی کی شعاعوں کو ہماری زمین تک پہنچنے میں ہزاروں بلکہ شاید لکھوکھا سال کی مدت صرف ہوئی ہے۔ جب خود ہمارے ہی نظام شمسی کی حدود ہماری بڑی سے بڑی دوربین کی رسائی سے باہر ہیں تو ان نظامات کا تو ذکر ہی کیا جو ان حدود سے پرے واقع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں خاک کے ذروں کی طرح فضا کے میدان نامتناہی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

کیا یہ عظیم الشان اجرام جن میں سے ہزاروں لاکھوں کا فاصلہ ہم سے اس قدر دور ہے کہ مجرد نگاہ دوربین کی مدد کے بغیر ان کو دیکھ تک نہیں سکتی اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ہم ان کی روشنی سے مستفید ہوں؟ اور جیسا کہ ہمارے پیشوایان دین ارشاد فرماتے ہیں

کیا ان روشن و تابناک کواکب کی تخلیق کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ انسان کو روشنی پہنچائیں؟ کیا ان کے جرم کی عظمت اور جسامت کی پہنائی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس طرح ان میں سے ہر ایک قوت کا مرکز ہے اسی طرح اس کی حرکت کا بھی مرکز ہونا چاہئے؟ بہ الفاظ دیگر کیا ان کا وجود اس امر پر دال نہیں ہے کہ وہ شموس ہیں جن میں سے ہر ایک جداگانہ نظام عالم کا مبداء تکوین[8] ہے؟

ابھی ان واقعات کا علم بہت ہی ناقص تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس علم کا وجود سرا پردہ تخیل سے باہر نہ نکلا تھا کہ اٹلی کے ایک باشندے گارڈینو برونو نامی نے جو کوپرنیکس کی وفات کے سات سال بعد پیدا ہوا ایک کتاب کائنات اور دنیاؤں کے عدیم النہایت ہونے پر لکھی چند کتابیں اور بھی اس کی تصنیف سے ہیں۔ مثلاً "ایونگ کا نور سیشن آن ایش وڈ نسڈے" (اسماء اربعا الرماو) جس میں نظام کوپرنیکس کی حمایت کی گئی تھی اور "دی ون سول کاز آف تھنگز" (وحدت علت العلل) ان تصانیف پر ایک اور رسالہ کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جو اس نے علی سبیل التمثیل لکھا اور ۱۵۸۴ء میں شائع کیا۔ اس رسالہ کا نام "دی اکسپلشن آف دی ٹرنفنٹ بیسٹ" (فتح مند وحشی کا اخراج) تھا۔ اس کے علاوہ ہیئت دانوں کی آئندہ نسلوں کے لئے اس نے ایک جدید ستارے کے متعلق اپنے مشاہدات فلکی کو سپرد قلم کیا۔ یہ ستارہ ۱۵۷۲ء میں دفعتہ" برج فوات الکرسی میں نمودار ہوا اور اس کی تابانی و درخشانی روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ باقی تمام کواکب اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ یہ ستارہ روز روشن میں بھی صاف نظر آتا تھا۔ ۱۱ نومبر کو اس کی چمک زہرہ کے منتہائے درخشندگی کے برابر ہو گئی۔ مارچ ۱۵۷۳ء میں اس کا شمار ثوابت طبقہ اولین میں ہونے لگا۔ چند مہینے تک اس نے مختلف رنگ بدلے اور مارچ ۱۵۷۴ء میں غائب ہو گیا۔

کپلر کے زمانہ (۱۶۰۴ء) میں جو ستارہ دفعتہ برج ثعبان میں نمودار ہوا تھا ابتدا" زہرہ سے بھی زیادہ درخشاں تھا۔ اس نے ایک سال سے زیادہ عمر پائی اور پھر ارغوانی زرد سرخ مختلف رنگ بدلتا ہوا فنا ہو گیا۔

ابتدا" برونو کا یہ قصد تھا کہ اپنی زندگی کلیسا کی خدمت گزاری کے لئے وقف کر دے چنانچہ ڈامینیکن فرقہ کے راہبوں میں وہ داخل بھی ہو گیا تھا لیکن مسئلہ عشائے ربانی اور مسئلہ حبل بلاونس یعنی امکان استقرار عمل بحالت دوشیزگی پر غور کرنے سے اس کا یہ ایمان مبدل بہ شکوک ہو گیا۔ چونکہ اس نے اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی لہٰذا اسے بہت جلد پیشوایان دین کا مورد عتاب ہونا پڑا اور ان کے پنجہ عقوبت سے بچنے کے

لئے اول سوئٹزرلینڈ پھر فرانس پھر انگلستان پھر جرمنی میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن "انکویزیشن" کے خونخوار تازی کتے جن کی قوت شامہ بلا کی تیز تھی برابر اس کے پیچھے لگے رہے۔ اور آخر جب وہ اٹلی واپس آیا تو اس کا کھوج لگا کر رہے۔ وینس میں وہ گرفتار کیا گیا اور پیامبی کے جیل خانہ میں چھ سال تک اس سختی سے قید رکھا گیا کہ نہ اسے لکھنے کے لئے قلم دوات کاغذ دیا جاتا تھا نہ پڑھنے کے لئے کوئی کتاب دی جاتی تھی اور نہ اس کے کسی دوست کو اجازت تھی کہ اس قید تنہائی میں آ کر گھڑی دو گھڑی کے لئے اس سے ملے اور اس کا غم غلط کرے۔

برونو نے زمانہ قیام انگلستان میں لقد و عوالم پر لکچر دئے تھے اور اپنی سب سے زیادہ مشہور کتابیں بزبان اطالوی تصنیف کی تھیں۔ پادری یہ دیکھ دیکھ کر اور بھی کھسیانے ہوتے تھے کہ وہ جہاں جاتا تھا ان کی ریاکاری اور بدباطنی کی پردہ دری کرتا تھا اور علے روس الاشہادیہ کہتا پھرتا تھا کہ اہل مذہب کے تشکک پر ماہنت اور منافقت کا ملمع چڑھا ہوا ہے ان کے ظاہر اور باطن میں بعد المشرقین ہے اور ان کے عقائد زور و التباس اور نفاق دریا کی اس متزلزل بنا پر قائم ہیں جسے اخلاق حسنہ یا ایمان بالغیب چھو کر بھی نہیں گیا ہے۔

"اسماء اربعاء الرماد" میں اس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ تنزیل کا مقصد سائنس کی تعلیم ہرگز نہیں ہے بلکہ اس سے محض اخلاق کی ہدایت مقصود ہے۔ اناجیل مقدسہ ہیئت یا طبیعات کے مسائل کے متعلق ذریعہ استناد نہیں ہو سکتیں۔ خصوصاً ان کی یہ تعلیم تو بالکل ہی غلط اور ناقابل قبول ہے کہ زمین ایک سطح مستوی ہے جو ستونوں پر قائم ہے اور آسمان ایک قبہ جامہ ہے جو فردوس کا صحن ہے۔ برونو کہتا ہے کہ ان پادر ہوا تاویلات کو پس پشت ڈال کر ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ کائنات غیرمحدود لامتناہی ہے جو منیر و غیر شفاف دنیاؤں سے معمور ہے اور ان دنیاؤں میں سے اکثر آباد ہیں۔ ان مسائل پر غور کرتے کرتے وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ابن رشد کے خیالات حقیقت سے دور نہیں ہیں۔ ضرور ہے کہ ایک ایسی عقل کل موجود ہو جس نے اس تمام کائنات میں جان ڈال رکھی ہے۔ اور جس کا یہ عالم ظاہری محض ایک رشحہ یا مظہر ہے۔ اس عقل کی قوت اس کائنات ظاہری کی تکوین و قیام کا باعث ہے اور اگر یہ قوت ہٹ جائے تو تمام چیزیں معدوم ہو جائیں۔ اسی حاضر و ناظر اور ساری دوائر عقل کل کا نام خدا ہے جو تمام چیزوں میں خواہ وہ زندہ نظر نہ بھی آتی ہوں موجود ہے اور ہر شے میں ترکیب پذیر ہونے اور زندگی قبول کرنے کی صلاحیت ہر وقت پائی جاتی ہے۔ پس خدا تمام موجودات کی علت واحد اور اس کا مدار حلیہ ہے۔

اس لحاظ سے فلاسفہ میں برونو کا درجہ ابن رشد اور اسپائینوزا کے بین بین ہے اسپائینوزا کا یہ مذہب تھا کہ خدا اور کائنات ایک ہی وجود کے دو مختلف نام ہیں۔ ہر واقعہ قدرت کے ایک غیر تغیرپذیر قانون کے اقتضا سے مجبوراً پیش آتا ہے اور خدا بشکل کائنات موجود فی الاصل غیر متغیر اور غیر ممکن الاندفاع توانائی کے اقتضا سے لازمی حرکات یا افعال کا ایک سلسلہ پیدا کرنے میں ہر وقت مصروف ہے۔

پیشوایان مذہب کے مطالبہ پر برونو وینس سے روما کو منتقل کیا گیا اور اس الزام کی پاداش میں کہ وہ ملحد ہی نہیں بلکہ راس الملاحدہ ہے "انکویزیشن" کے محبس میں قید کیا گیا۔ سب سے بڑا الزام اس پر یہ تھا کہ وہ تعداد عوالم جیسے ناپاک مسئلہ کا قائل ہے جو کتب مقدسہ کے سیاق اور آیات الہامی خصوصاً ان آیات سے تناقض کلی رکھتا ہے جنہیں انسان کی سبیل نجات سے تعلق ہے۔ دو سال تک قید کاٹنے کے بعد وہ حاضر عدالت کیا گیا اور حکام عدالت نے اس پر فرد قرارداد جرم لگا کر اسے مسیحی برادری سے خارج کر دیا اور جب مقدس عدالت کے اس حکم کی تعمیل سے اس نے ازراہ عنایت شرافت نفس انکار کیا کہ اپنے گناہ سے توبہ کرے تو کار فرمایان قضا و قدر یعنی حکام "انکویزیشن" نے اس سفارش کے ساتھ اسے دنیوی حکام کے سپرد کر دیا کہ "اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے" عدالت "انکویزیشن" کے اس خوفناک فقرہ کا مطلب ایسے موقعوں پر یہ ہوا کرتا تھا کہ مجرم کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چونکہ برونو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے دشمن اگرچہ اس کے جسم کو فنا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے خیالات کی اشاعت کو نہیں روک سکتے۔ لہٰذا اس نے اپنے ججوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے اس فیصلہ کو سن کر میرے لب پر اس خوف کا عشر عشیر بھی طاری نہیں ہوا جو خود تمہارے دل میں اس کے صادر کرتے وقت پیدا ہوا ہو گا۔ اس فیصلہ کی تعمیل ۱۶ فروری ۱۶۰۰ء کو ہوئی اور برونو زندہ جلا دیا گیا۔

ان بے شمار شہدا کے مصائب و نوایب کی یاد ہمارے دلوں میں رحم و ہمدردی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی جنہیں محض اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے فریق مخالف کے تعصب کے ہاتھوں آگ میں جلنا پڑا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کو آخری وقت میں جب کہ اس کی روح بصد درد و کرب جسم سے علیحدہ ہو رہی تھی ایک بہت بڑی زبردست طاقت کا سہارا تھا۔ ان کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس دنیا میں گو ان کی زندگی مصیبت سے کٹی اور عقبی کی دہلیز پر قدم رکھتے وقت بھی انہیں گرفتار عذاب الیم ہونا پڑا لیکن دوسری دنیا میں

پہنچتے ہی ان کا رنج مبدل بہ راحت ہو جائے گا اور ان کی تکالیف لذت ہائے جاودانی سے تبدیل ہو جائیں گی۔ موت کی بھیانک اور اندھیری وادی میں سے گزرتے وقت شہید کو کم از کم یہ اطمینان قلب تو میسر ہوتا ہو گا کہ ایک رحیم و شفیق نظروں سے پوشیدہ ہستی اس کی رہنما بن کر اسے ابدی زندگی کی روشنی اور پر فضا منزل میں صحیح و سلامت لے جائے گی۔ لیکن برونو اس سہارے سے بھی محروم تھا۔ وہ فلسفیانہ عقائد جن کی خاطر اس نے اپنی جان دی اس کے لئے کسی طرح موجب تسکین و تشفی نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے ضرور تھا کہ مرتے دم تک اس کو اپنی قوت بازو ہی پر بھروسہ ہو اور وہ کسی کی تائید سے سروکار نہ رکھے۔ کیا اس بے یارومددگار شخص کی استقامت عزم کو دیکھ کر جو تن تنہا ایک تاریک مکان میں اپنے خونریز اور بے درد ججوں کے سامنے محض اس اصول کی تائید کے لئے بے دھڑک کھڑا ہوا ہے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے۔ ہمارا جی بے اختیار اس کی تعریف کرنے کو نہیں چاہتا! اس ڈراونے کمرے میں نہ کوئی الزام لگانے والا موجود ہے نہ گواہ حاضر ہے نہ وکیل نظر آتا ہے۔ بلکہ محکمہ مقدس کے صرف کارندے ہیں جو سیاہ لباس پہنے دبے پاؤں موت کے سایہ کی طرح نقل و حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نیچے کے زمین دوز حجروں میں شکنجہ رکھا ہوا ہے اور مجرموں کو انواع و اقسام کے عذاب دینے کے شیطانی آلات اور ان آلات کے سفاک استعمال کرنے والے پاس ہی موجود ہیں۔ ملزم سے صرف اس قدر کہا جاتا ہے کہ اس کی نسبت ملحدانہ عقائد رکھنے کا قوی شبہ ہے۔ پس کیا وہ اس بات تیار ہے کہ اپنے قصور کا اعتراف اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے لیکن جن عقائد کو وہ صحیح سمجھتا ہے ان سے وہ نہ ابا کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے بلکہ پہلے کی طرح اپنے ایذا دہندوں سے کہتا ہے کہ دل میں تم بھی انہیں باتوں کے قائل ہو جن کو صحیح سمجھنے کی پاداش میں اس وقت تم مجھے سزا دے رہے ہو۔ ایک تو تصویر کا یہ رخ ہے جس میں شرافت نفس۔ ہمت مردانہ۔ استقامت۔ غیر متزلزل اور اعتصام بالحق کے خط و خال صاف صاف نظر آ رہے ہیں۔ تصویر کا اگر دوسرا رخ دیکھنا منظور ہو تو تاریخ عالم کی پندرہ صدی پہلے کا ایک ورق الٹو۔ سردار کاہن کیافس کے مکان کا ایک کمرہ ہے انگیٹھی میں آگ دہک رہی ہے۔ مرغ صبح اذان دے رہا ہے۔ اور خداوند خدا حسرت بھری نگاہوں سے پلٹ کر پطرس کی طرف دیکھ رہے ہیں" (لوقا باب بست ودوم آیت ۶۱) خدا کی شان ہے کہ کلیسا کو برونو کے ساتھ اس طرح کے سلوک کرنے کا حق جس کی بدولت حاصل ہوا وہ خود پطرس کی ذات ہو!!

لیکن شاید وہ دن قریب آ رہا ہے جب کہ آئندہ نسلیں پادریوں کے اس گناہ عظیم کا

کفارہ ادا کریں گی اور برونو کا مجسمہ کلیسائے سینٹ پیٹر واقع روما میں نصب ہو کر بے نقاب کیا جائے گا۔

لہ جہاز کے اگلے حصہ میں ایک مرتفع مقام کا نام جہاں سے ناخدا کو حد نظر تک سب کچھ دکھائی دے سکتا ہے۔ مترجم

؎ بحراوقیانوس شمالی میں پرتگال سے کوئی آٹھ سو میل جانب مغرب واقع ہے۔ اس مجمع الجزائر میں کل نو جزیرے ہیں۔ مجموعی رقبہ ایک ہزار میل اور آبادی کوئی تین لاکھ نفوس ہو گی۔ دارالحکومت کا نام انگرا ہے جو جزیرہ ٹرسیرا میں واقع ہے۔ ان جزائر میں بہت سے آتش فشان پہاڑ ہیں جن کی وجہ سے آئے دن اتلاف جان و مال ہوتا رہتا ہے۔ آب و ہوا نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے چنانچہ جو لوگ امراض صدر میں مبتلا ہوتے ہیں وہ بغرض تبدیل آب و ہوا و تکمیل صحت یہیں جاتے ہیں۔ انگور' نارنگیاں اور نیبو میووں میں اور گیہوں اور مکی اناج میں یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ اہل کارتھج کو ان جزائر کا علم ہو چکا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں سے کارتھج کے سکے برآمد ہوئے ہیں۔ علی ہذا القیاس مسلمان جہازرانوں کے یہاں آنے کی بھی بکثرت شہادت بہم پہنچ سکتی ہے۔ مترجم

؎ فرانسیسی اندازہ یہ تھا کہ ایک مطر قلب سے خط استوا تک کے درمیانی فاصلہ کا ایک لاکھواں حصہ ہو۔ یہ اندازہ تو عنداللہ تحقیق غیر صحیح ثابت ہوا لیکن پھر بھی دوسرے اندازوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہونے کے باعث عام طور سے فاصلہ کا یہی پیمانہ علمی مقاصد کے لئے استعمال ہونے لگا ایک مطر ۳۹٫۳۷۰۷۹ انچ کے مساوی ہے۔ مترجم

؎ اٹلی کا ایک مشہور ہیئت دان جسے لوئی چاردہم شاہ فرانس نے رصدگاہ پیرس کا مہتمم مقرر کیا تھا۔ مترجم

؎ تازہ ترین اکتشافات نے اس اندازہ میں کسی قدر ترمیم کی ہے اور اس وقت کہ ۱۹۰۹ء ہے مہندسین عالم کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ سورج کا فاصلہ زمین سے نو کروڑ انیس لاکھ میل ہے۔ مترجم

؎ دوربین میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ثوابت مضاعف ہیں۔ اس کی توجیہ اول اول اس طرح کی گئی تھی کہ ممکن ہے کہ وہ ثوابت تقریباً" اسی خط مستقیم پر واقع ہوں جس پر زمین واقع ہے اور اس لئے بظاہر دہرے نظر آتے ہوں مگر مسلسل ارتصادات سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ یہ دہرے ثوابت آپس میں اسی طرح مربوط و منوط ہوتے ہیں جس طرح ارض و قمر اور ایک کوکب دوسرے کوکب کے گرد جو اس کا ہم زاد ہے ایک وقت معینہ میں گھومتا ہے۔

مترجم

۴؎ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان شموس بازغہ کا فاصلہ زمین سے کس قدر ہو گا۔ مترجم

۵؎ علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب "الکلام" میں ایک مقام پر یورپ کے تمدن کے مہمات اصول پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ وہ اعلیٰ ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے تمتع اٹھائے" یہ لکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے قرآن مجید نے اس اصول کی تعلیم کی اور ان آیات کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش فرماتے ہیں۔

(۱) لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

(۲) وسخرلکم ما فی السموت وما فی الارض جمیعا۔

ہمیں ڈر ہے کہ ڈریپر اور اس کے ہم خیال مولانا کے اس دعوے کو بلاترمیم تسلیم کرنے میں متامل ہوں گے۔

کائنات سے اگر مولانا کی مراد کرہ ارض سے ہے تو یقیناً" انسان اس خیال میں حق بجانب ہے کہ اعلے ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے تمتع اٹھائے۔

لیکن اگر کائنات کے مفہوم میں ان کروڑوں روشن و تابناک دنیاؤں کو بھی داخل کرتے ہیں جن کے وجود پر جناب باری کی عظمت و حکمت بے پایاں گواہ ہے اور جن کا ثبوت انسان باوجود اپنی بے بضاعتی کے دینے پر قادر ہو گیا ہے تو ڈریپر کے اس سوال کا معقول جواب شاید پیش نہ کیا جا سکے گا کہ کیا ان دنیاؤں کا جو ہم سے اس قدر فاصلہ پر ہیں کہ مجرد نگاہ بلامدد دوربین انہیں دیکھ تک نہیں سکتی بجز اس کے اور کوئی منشا نہیں کہ ہم ان سے تمتع اٹھائیں اور ان کے نور سے مستیز ہوں؟

قرآن مجید میں جو صرف کرہ ارض کے باشندوں کی اخلاقی رہبری کے لئے نازل کیا گیا ہے اور جس کا روئے سخن صرف ان عقیل و فہیم ہستیوں کی طرف ہے جو نظام شمسی کے اس تیسرے رکن پر آباد ہیں یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا گیا کہ کائنات فلکی کا منشا بجز انسان کو فائدہ پہنچانے کے اور کچھ نہیں ثوابت و سیار کی تخلیق سے اور جو مقاصد جناب باری کے پیش نظر ہوں گے وہ تو بجز اس کے اور کون جان سکتا ہے لیکن اگر ان میں سے بعض کا ذیلی و ضمنی مقصد یہ بھی ہو کہ کرہ ارض کے مکین ان کے نور سے مستیز ہوں تو اس سے دوسرے مقاصد کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس عام فہم پیرایہ میں جو جناب باری انسان کے دل میں اس جذبہ احسان مندی و شکرگزاری کے برانگیختہ کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے جو عبد کو معبود کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے اس نے کہیں تو یہ کہا ہے کہ چاند سورج اور ستارے تمہیں روشنی دیتے ہیں کہیں یہ کہا ہے کہ خدا نے

کائنات سماوی کو تمہارا تابع کر دیا ہے۔ لیکن ان الفاظ کی حکمت آفرین جامعیت پھر بھی اس قابل اعتراض دعوے کی گرد سے اپنے دامن کو کمال وقیقہ رسی کی راہ سے بچا گئی ہے کہ کائنات فلکی کا منشا بجز انسان کے افادہ کے اور کچھ نہیں۔ وسخر لکم مافی السموات سے یہی مراد نہیں ہے کہ وہ تمام اجرام روشن و تاریک جو فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بلحاظ سودمندی انسان کے تابع کر دئے گئے ہیں بلکہ ان الفاظ کا صریح مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو وہ عقل وقیقہ سنج عطا فرمائی ہے جس کی بدولت اسے اس کائنات کے پوشیدہ اسرار معلوم ہو گئے جہاں وہ جسم کے ساتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ تسخیر جسمانی ہی نہیں ہوتی بلکہ عقلی و ذہنی بھی ہوتی ہے اور یہی اس کا درجہ کمال ہے۔ کیا دوربین کے ذریعہ سے الفا قنطورس کا اکتشاف کچھ کم تسخیر آسمان ہے جو ہم کو یہ دعوی کرنے کی ضرورت ہو کہ یہ شمس بازغہ جس کی روشنی ہماری مجرد نگاہ کو بمشکل نظر آتی ہے اس غرض سے ہمارا تابع کیا گیا ہے کہ ہم کو روشنی پہنچائے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ مترجم

۹ اگر ہم کو یقین ہو کہ وہ خدا کی ہستی کا منکر تھا تو ہم ہرگز اس کے معترف نہیں ہو سکتے۔ انسان ضعیف البیان کا جس کی حقیقت اس عالم لامتناہی کی بے پایانی میں ایک جزو لا تیجزی سے زیادہ نہیں ہے عقل غیر محدود پر جس کے کرشمے ہر وقت اس کی نظر کے سامنے ہیں بھروسہ نہ کر کے اپنی عقل محدود پر تکیہ کئے رکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ باغی اور سرکش ہے اور بغاوت اور سرکشی سے کسی کو بھی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ لیکن برونو جیسا کہ خود مصنف کو اعتراف ہے دہریہ نہ تھا۔ وہ خدا کی ہستی کا قائل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خدا کو بشکل اقانیم ثلثہ نہ مانتا ہو لیکن وہ اس کا قائل تھا کہ ایک ایسی عقل کل ضرور موجود ہے جس نے اس تمام کائنات میں جان ڈال رکھی ہے اور جس کا یہ عالم ظاہری محض ایک رشحہ یا مظہر ہے وہ اسی عقل کو تمام موجودات کی علت واحد تو مانتا تھا۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو وہ خدا کا منکر نہیں سمجھا سکتا اور اس لئے ہمیں من قال لا الہ الا اللہ فدخل الجنہ اس کی نجات میں شک نہیں۔ مترجم

۱۰ یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے حواری پطرس نے جو مسیحی دنیا میں سینٹ پیٹر کے لقب سے ملقب ہے کمال کور نمکی ویزدان ناشناسی کی راہ سے اپنے آقا سے اعراض کیا تھا۔ پطرس کو آپ کی وفاداری کا بڑا دعویٰ تھا اور جب آپ نے ایک دفعہ اس سے کہا کہ تو میرا منکر ہو گا اور اس پر اپنی خیرخواہی جتانی چاہی تو آپ نے کہا کہ ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ چنانچہ یہ قول سچ ہو کر رہا۔ جب حضرت مسیحؑ یہودیوں کے معاندانہ اغوا سے رومی عدالت کے سامنے لائے گئے اور پطرس سے جو بطور گواہ حاضر تھا دریافت کیا گیا کہ تو اس شخص کو جانتا ہے تو ان حضرت نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ تعجب ہے کہ باوجود اس کے نصرانیت میں پطرس کا اتنا بڑا مرتبہ کیوں ہے۔ مترجم

ساتواں باب

نزاع دربارہ عمر زمین

بائبل کی رو سے زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہونا اور اس کا ایک ہفتہ کی مدت میں بنایا جانا- پادریوں کے علم التاریخ کا انبیاء سلف کی عمروں پر مبنی ہونا- بائبل کے مختلف نسخوں میں مختلف تخمینوں کی وجہ سے تناقض-

قصہ طوفان نوح روئے زمین کا ازسرنو آباد ہونا- مینارہ بابل- اختلاف السنہ- انسان کی قدیمی زبان-

کیسینی کا یہ اکتشاف کہ سیارہ مشتری مسطح الطرفین ہے- نیوٹن کا یہ اکتشاف کہ کرہ ارض مسطح الطرفین ہے- اس اکتشاف سے اس نتیجہ کا استخراج کہ زمین نے حرکات کے سانچے میں ڈھل کر موجودہ شکل اختیار کی ہے- اجار آبی کی طبقات الارضی تحقیقات سے اس نتیجہ کی تصدیق آثار اجسام ذوی الاعضا سے اس نتیجہ کی مزید توثیق-

زمین کی عمر کا اندازہ کرنے میں مدت ہائے مدید کے تسلیم کرنے کی ضرورت- مسئلہ پیدائش کی جگہ مسئلہ ارتقا لے لیتا ہے- اکتشافات دربارہ قدامت انسان-

کائنات کے پیمانہ زمان و مکان کا غیرمحدود ہونا- زمین کی عمر کی بحث میں افراط و تفریط سے احتراز-

کائنات میں جو درجہ کرہ ارض کو حاصل ہے اس کی حقیقت کا اعتراف ایک طول و طویل کشمکش کے بغیر نہ ہو سکا- کلیسا نے اس کی مخالفت میں ناخنوں تک کا زور لگایا اور اپنے عقائد کے برقرار رکھنے کی کوشش میں لوگوں کو سزائے موت تک دی- لیکن اس کی تمام کوششیں رائگاں گئیں- نظام کوپرنیکس کی تائید میں ناممکن التردید شہادتوں کا انبار لگ گیا- آخر کار تمام دنیا نے بالاتفاق اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ آفتاب اس نظام کا جس کو انسان سے تعلق ہے مرکزی جرم ہے اور زمین کا شمار ان سیاروں میں ہے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں اور ان میں بھی زمین سب سے بڑی نہیں ہے-

چونکہ اس بحث کا سبق کلیسا کو نہ بھولا تھا لہٰذا جب مسئلہ عمر عالم کی جدید بحث پیش ہوئی تو پادریوں نے اس شدید مخالفت کا اظہار نہ کیا جو پہلی بحث کے وقت ان کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کلیسا کی روایات کے ایوان میں اس نئی بحث نے پھر تزلزل ڈال دیا لیکن پیشوایان دین کی رائے میں یہ حملہ سختی میں پہلے حملہ کی بہ نسبت بمراتب کم تھا۔ چنانچہ حامیان مذہب اس موقع پر یہ کہتے ہوئے پائے گئے کہ زمین کو اس کے تخت عظمت و جلال سے نیچے اتار دینا تو یہ معنی رکھتا ہے کہ حقائق الہامی کی بنیاد میں سرنگ لگا دی جائے البتہ تاریخ تکوین عالم پر بحث کرنے کیا جازت خاص حدود کے اندر دی جا سکتی ہے۔ لیکن اہل مناظران حدود سے بہت جلد تجاوز کر گئے اور اس لئے یہ جدید بحث بھی ویسی خطرناک ہو گئی جیسی پہلی بحث ثابت ہوئی تھی۔

تکوین عالم کے مسئلہ کے متعلق فلاطون نے اپنی کتاب "ٹامئیس" میں فریق مقابل کو حسب ذیل مشورہ دیا تھا:

"مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اور آپ جو آخر انسان ہیں اس امر کو ذہن نشین رکھیں کہ روایات مذہبی کے احتمالات میں مزید تفحص سے احتراز کرنا ہی اولیٰ ہے۔"

لیکن اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس مشورہ پر کاربند ہونا ناممکن نہ تھا۔ سینٹ آگسٹائن کے زمانہ سے سائنس کے ہر مسئلہ کی سند کتب مقدسہ میں ڈھونڈی جانے لگی تھی اور اہل مذہب نے آیات انجیل سے تاریخ اور جغرافیہ کے ایسے ایسے خیالی نکات کا استخراج کیا تھا جنہوں نے حقیقی علم کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکائے تھے۔

ہم اس مقام پر پادری صاحبوں کی ان تاریخی و جغرافیائی معلومات کا جن کا دارومدار آیات انجیل پر ہے صرف سرسری سا حوالہ دینے پر اکتفا کریں گے۔ ان کی خصوصیات ایسی ہیں جن کے پہچاننے کے لئے زیادہ تفصیل و وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ انجیل میں یہ لکھا ہوا تھا کہ دنیا چھ دن میں بنائی گئی اور ساتویں دن جو یوم الست ہے خدا نے آرام لیا اور ایک دن خدا کے نزدیک بمنزلہ ایک ہزار سال کے ہے لہٰذا مقدس مورخوں نے یہ استدلال کیا کہ دنیا کی عمر کل سات ہزار سال کی ہو گی جس میں سے چھ ہزار سال تو مصیبت میں کٹیں گے اور ایک ہزار سال کا زمانہ عیش و راحت اور سکون و اطمینان میں بسر ہو گا۔ عام طور سے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت کے وقت دنیا کی عمر چار ہزار سال تھی لیکن یورپ سنین عالم کے مطالعہ کی طرف سے اس درجہ غافل اور بے پروا تھا کہ ۵۲۷ء سے پہلے اسے سن عیسوی کے قائم کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ اس زمانہ میں

روما کے ایک پادری ڈایونیسیس اکسیگوئس کو یہ فروگذاشت محسوس ہوئی اور اس نے بجائے عام بت پرستانہ سن کے موجودہ عیسوی سن کو رواج دیا۔

قدیم ترین واقعات عالم کے سنین کا اندازہ لگانے میں ان تخمینوں سے کام لیا گیا جو زیادہ تر انبیائے سلف کی عمروں پر مبنی تھے اور اس طور پر اعداد میں جو نواقص پیدا ہوئے ان کی تطبیق میں بے حد دقتیں پیش آئیں۔ فن انتقاد سے تو اس زمانہ کے اصحاب جس میں سے ہمیں بحث ہے مطلقاً بیگانہ تھے اور اسی لئے حضرت موسیٰؑ کو ان صحائف کا حامل تسلیم کر لیا گیا جو ان سے منسوب ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت موسیٰؑ ان صحائف کے مصنف تھے تو اس اجتماع ضدین کی کیا تاویل ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے واقعات کے راوی ہیں جن میں سے اکثر ان کی ولادت سے دو ہزار سال قبل پیش آ چکے تھے۔ تورات کا ہر حصہ بادی النظر میں الہامی نہ سمجھا جا سکتا تھا اس لئے کہ اس کو تحریف سے بچانے کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی تھی۔ مختلف نسخوں میں جو زمانہ کی دست برد سے بچ بچائے باقی چلے آتے تھے بہت کچھ اختلاف تھا۔ مثلاً" سامری نسخہ میں پیدائش یعنی آفرینش عالم سے طوفان تک کا زمانہ ایک ہزار تین سو سات سال درج تھا عبرانی نسخہ میں یہ مدت ایک ہزار چھ سو چھپن سال تھی۔ حالانکہ نسخہ سبعینیہ میں یہی مدت دو ہزار دو سو تریسٹھ سال مذکور تھی۔ نسخہ سبعینیہ میں پیدائش سے حضرت ابراہیمؑ تک کا زمانہ عبرانی نسخہ کے مقابلہ میں ڈیڑھ ہزار سال زیادہ تھا۔ لیکن اس اندازہ میں ان سب کا اتفاق تھا کہ واقعہ طوفان پیدائش سے تقریباً" دو ہزار سال بعد پیش آیا اور اس پر جب اور دو ہزار سال گزر گئے تو حضرت مسیحؑ تولد ہوئے۔ جن لوگوں نے اس مضمون کی اچھی طرح سے چھان بین کی تھی ان کا یہ قول تھا کہ حضرت مسیحؑ کی تاریخ ولادت کے بارے میں ایک سو بتیس مختلف اقوال موجود ہیں اور ایسی حالت میں کتب مقدسہ کے شمار و اعداد پر پورا بھروسہ کرنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ اس لئے کہ مختلف نسخوں کے اختلافات ظاہر کر رہے ہیں کہ خدا نے خود صحیح نسخہ کی حفاظت نہیں کی نہ کوئی ایسا نشان یا علامت موجود ہے جس سے انسان کو معلوم ہو سکے کہ فلاں نسخہ صحیح اور غیر محرف ہے۔ وہ نسخے بھی جنہیں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ایسی ایسی غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں جن کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً" نسخہ سبعینیہ میں درج ہے کہ میتھوسیلا طوفان کے بعد بھی بقید حیات موجود تھا جو ایک صریح غلطی ہے۔

یہ خیال عام طور سے پھیلا ہوا تھا کہ دنیائے قبل طوفان میں سال تین سو ساٹھ دن کا

ہوتا تھا اور دائرے کو تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کرنے کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ لیکن جب طوفان آیا تو آفتاب کی حرکت میں تغیر واقع ہو گیا اور سال کی مدت بقدر پانچ دن اور چھ گھنٹے کے بڑھ گئی۔ بعض پیشوایان دین کی یہ رائے تھی کہ دنیا کا یہ عظیم الشان واقعہ ۲۱۵۶ء آفرنیش عالم میں نومبر کی دوسری تاریخ کو پیش آیا۔ ڈاکٹر وہسٹن جن کی وقت نظری اور دقیقہ سنجی کو اس تاریخ میں تھوڑی سی غلطی محسوس ہوئی۔ ازراہ غایت تدقیق و تحکیم فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کی اصلی تاریخ ۲ نومبر نہیں بلکہ ۲۸ نومبر ہے۔ بعض بزرگواروں کا یہ خیال تھا کہ طوفان سے پہلے قوس قزح دیکھنے میں نہیں آئی تھی بلکہ طوفان کے فرو ہونے کے بعد اول اول بطور ایک آسمانی نشان کے ظاہر کی گئی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کشتی نوح سے باہر آنے کے بعد آدمیوں کو گوشت کھانے کی اجازت ملی اور طوفان سے پہلے انسان نباتات خور تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ طوفان کی وجہ سے روئے زمین پر کوئی نمایاں جغرافیائی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی ان معلومات کے بھروسے پر جو انہیں قبل طوفان حاصل تھیں زمین کو اپنے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ یعنی یورپ یافث کو دیا۔ ایشیا سام کو اور افریقہ حام کو۔ چونکہ انہیں امریکا کے وجود کا علم نہ تھا اس لئے اس کے ازسرنو آباد کرنے کی کوئی گنجائش نہ نکالی۔ حضرتؑ نوح کے ان سعادتمند فرزندوں نے اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل بسرو چشم کی اور دل میں مطلق یہ ہراس لائے بغیر کہ جن خوفناک ویرانوں میں ہم جا رہے ہیں وہاں ہو کا عالم چھایا ہوا ہے اور طوفان کی وجہ سے جو دلدلیں پیدا ہو گئی ہیں وہ خشک بھی نہیں ہونے پائیں اپنے اپنے مفوضہ مقبوضات میں نو آبادیاں قائم کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

ستر سال میں ایشیائی خاندان کے بال بچوں کی تعداد بڑھ کر کئی سو ہو گئی یہ سب کے سب دشت نوردی و بادیہ گردی کرتے ہوئے مسوپوٹیمیا میں جا پہنچے تھے۔ جہاں انہوں نے کسی مصلحت سے جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ ایک مینارہ تعمیر کرنا شروع کیا جس کی چوٹی کو وہ آسمان تک پہنچانا چاہتے تھے۔ یوسیبئس رقم طراز ہے کہ اس مینارہ کی تعمیر کا کام چالیس سال تک جاری رہا۔ اس وقت خدا نے دفعتاً ان کی زبانوں میں اختلاف پیدا کر دیا اور وہ مجبوراً مینارے کا کام چھوڑ کر روئے زمین پر منتشر ہو گئے۔ سینٹ امبروز فرماتے ہیں کہ اس اختلاف السنہ کا باعث انسانی طاقت نہ تھی اور آریجن کا قول ہے کہ فرشتے بھی اس اختلاف کی تکمیل نہ کر سکے بلکہ خود خدا نے اس قوم کی زبانوں کو بدل ڈالا۔

اختلاف السنہ کی بنا پر علماء مذہب نے انسان کی ابتدائی زبان کے متعلق عجیب و غریب

قیاس آرائیوں سے کام لیا ہے۔ ایک گروہ ایسے علما کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ حضرت آدمؑ کی زبان مطلقاً" اسما پر مشتمل تھی اور یہ اسما واحد الہجا تھے۔ جب اسمائے کثیر الہجا کی اشاعت و ترویج ہوئی تو زبان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگواروں نے یہ رائے قائم کرتے وقت ان متعدد مکالمات کو نظرانداز کر دیا جن کا ذکر کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ چنانچہ خدا نے حضرت آدمؑ اور سانپ نے حضرت حواؑ سے جو گفتگو کی اس کی روئداد تورات میں تمام و کمال مندرج ہے۔ اس گفتگو میں کلمہ کی سبھی اقسام و اصناف پائی جاتی ہیں۔ بہرحال یہ امر متفق علیہ تھا کہ انسان کی ابتدائی زبان عبرانی تھی اور جن اصول پر پادریوں کے علوم و فنون کا انحصار تھا ان کی رُو سے یہی مناسب بھی تھا۔

کلیسائے یونان کے پادریوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جب اختلاف زبان کی وجہ سے اقوام میں تفرقہ پڑا تو بابل کی آبادی بہتر قوموں میں منقسم ہو گئی اور اس اندازہ سے سینٹ آگسٹائن کو بھی اتفاق ہے۔ لیکن عقل سلیم کو اس تخمینہ کے صحیح تسلیم کرنے میں جن دقتوں کا سامنا تھا وہ اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ہکفرڈ نے اپنی قابل قدر کتاب میں جو "عالم کی تواریخ پاک و نجس کا مقابلہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے متذکرہ بالا تمام مباحث پر نظر انتقاد ڈالتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ان بہتر اقوام میں سے ہر ایک کی آبادی مرد عورت بچے سب ملا کر اکیس بائیس نفوس سے زیادہ کسی حالت میں نہ ہو سکتی تھی۔

شہور و عوام کے اس تاریخی تخمینہ میں جو انبیاء اولیائے سلف کی عمروں پر مبنی تھا سب سے زیادہ قابل غور بات ان بزرگوں کی عمروں کی غیر معمولی اور فوق العادت طوالت تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ طوفان نوح سے پہلے مزاج کائنات میں دائمی اعتدال پایا جاتا تھا۔ باغ عالم میں ہر وقت بہار جلوہ گر رہتی تھی اور قدرت کے انقلابات و تغیرات مفقود تھے۔ لیکن طوفان کے بعد پیمانہ عمر بقدر نصف کے خالی ہو گیا اور صاحب زبور کے زمانہ میں انسان کی عمر کا اوسط اور بھی گھٹ کر ستر سال تک پہنچ گیا جو آج کے دن تک قائم ہے۔ چونکہ طوفان کے وقت زمین کا محور اپنی جگہ سے ٹل گیا لہٰذا موسموں میں سختی پیدا ہو گئی اور صیف و شتا پر شمال کے اشتداد کو طوفان کے واقعہ ہائلہ کی ان ہمہ گیر بلاؤں نے اور زیادہ بڑھا دیا جن کی وجہ سے سطح زمین ایک وسیع دلدل بن گئی اور خون میں احتراق اور اعصاب میں استرخا پیدا ہو گیا۔

انبیائے سلف اور قرون اولیٰ کے شیوخ قبائل کے عمروں کی حیرت انگیز طوالت سے جو

مشکلات استقرا کو پیش آتی تھیں ان سے بچنے کے لئے بعض علماء دین نے تاویل کا یہ پہلو اختیار کیا کہ کتب مقدسہ میں جن سنین کا ذکر کیا گیا ہے وہ شمسی سال نہ تھے بلکہ قمری سال تھے اس تاویل نے ان بزرگواروں کی عمر کو اگرچہ آج کل کی مدت حیات کے برابر کر دیا اور ایک مشکل رفع ہو گئی لیکن ایک دوسری بہت بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ پانچ چھ سال ہی کی عمر میں وہ سن بلوغ کو پہنچ کر صاحب اولاد بھی ہو گئے۔

پیشوایان کلیسا نے مقدس سائنس کو جن معارف و حقائق کا منبع قرار دیا ہے ان کا التفاظ ذیل کے مہمات المسائل کی شکل میں کیا جا سکتا ہے۔

(۱) تاریخ پیدائش یعنی تکوین عالم کو کچھ بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا یعنی ظہور مسیح علیہ السلام سے یہی کوئی چار پانچ ہزار برس پہلے (۲) عالم کو پیدا کرنے میں چھ معمولی دنوں کی ایک مدت صرف ہوئی (۳) طوفان عالم گیر تھا اور جو حیوانات اس کی تباہی سے بچے وہ ایک کشتی کے ذریعہ سے محفوظ رہے (۴) حضرت آدم پیدائش کے وقت اخلاق اور عقل میں کامل تھے لیکن اس پایہ عقل و اخلاق سے انہیں گناہ نے گرا دیا اور ان کی اولاد و احفاد کو ان کی معصیت و ہبوط میں شریک ہونا پڑا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض مسائل ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو کلیسا کی فہرست عقائد میں شامل ہیں۔ ان میں سے دو مسائل ایسے تھے جن کی حقیقت پر پیشوایان دین عیسوی کو اصرار کئے بغیر مفر نہ تھا۔ اول یہ کہ آفرینش عالم کو کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ مسیحیت کی بقا کے لئے یہ عقیدہ لازمی تھا اس لئے کہ آفرینش کا زمانہ جس قدر بعید ہو گا اسی قدر خدا کے عدل و انصاف کو ثابت کرنے کے لئے زیادہ قوی دلائل کی ضرورت عائد ہو گی جس نے بنی نوع کے ایک حصہ کثیر کو اس کی قسمت کے حوالہ کر کے نجات کی نعمت صرف انہیں چند نفوس کو بخشی جو ظہور مسیح کے بعد یعنی عالم کے دور آخر میں پیدا ہوئے۔ مسیحیت کا دوسرا رکن اعظم یہ تھا کہ حضرت آدم پیدائش کے وقت انسان کامل تھے۔ یہ عقیدہ مسئلہ ہبوط و مسئلہ نجات کی تاویل کے لئے نہایت ہی ضروری تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ علمائے دین عیسوی ہر اس کوشش کی مخالفت پر مجبور تھے جو اس بات کے ثابت کرنے کے لئے عمل میں لائی جائے کہ زمین کی ابتدا ایک ایسی دور دراز زمانہ میں ہوئی جس کا بعد زبونی کش تعین نہیں ہے اور مسلمانوں کے ابن قیاس کو وہ کسی طرح بہ نظر استحسان نہ دیکھ سکتے تھے کہ انسان طبقہ سافل کی اشکال حیوانی کی ترقی یافتہ صورت ہے یعنی قرنہا قرن تک بتدریج نشوونما پا کر موجودہ درجہ کو پہنچا ہے۔

عبارت مذکور الصدر جن مہملات و لغویات و اضداد سے معمور ہے ان سے اس مقدس سائنس کی حقیقت روز روشن کی طرح آشکار ہے۔ اور عجب نہیں کہ ہمیں بھی وہی رائے ظاہر کرنی پڑے جو بیچارے ڈاکٹر بکلنڈ نے جن کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے اس علم پاک کے نواقص میں شانِ توافق و معقولیت پیدا کرنے کی بے سود کوششوں کے بعد مجبوراً" ان الفاظ میں ظاہر کی ہے کلیسا کے پیشوایان قرون اولی کی نسبت ہم سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نیکوکاری میں شک نہیں لیکن ان کی معلومات تبحر سے عاری تھیں[12]۔

روایات مقدسہ کی رو سے خدا زمین کی ترکیب و تنظیم کی بلاواسطہ علت ہے۔ روایات مذکور کو آفرینش عالم میں علل ثانیہ کی مداخلت سے انکار ہے۔

علم ترکیب کائنات کا زمانہ کیسینی کے اس دوربینی اکتشاف سے شروع ہوتا ہے کہ سیارہ مشتری کرہ نہیں ہے بلکہ ایک مسطح القطبین جرم بیضوی ہے۔ علم الحرکات و الحیل نے ثابت کر دیا کہ اس قسم کی شکل ایک مادہ قابل الجبل کی گردش کا لازمی نتیجہ ہے اور گردش جس قدر زیادہ تیز ہو گی اسی قدر جرم دوار کے قطبین زیادہ مسطح ہوں گے بالفاظ دیگر اس کے استوائی حصے باہر کو زیادہ نکلے ہوئے ہوں گے۔

علم الحرکات ہی کے اصول کی بنا پر نیوٹن نے حکم لگایا تھا کہ کسی قدر ترمیم کے ساتھ زمین کی بھی اسی طرح کی شکل ہونی چاہیے۔ منطقہ استوائیہ کا انتاد اندلاع یعنی پچک کر باہر کو نکلا ہوا ہونا استقبال اعتدالین کا باعث ہے جس کے دور کی تکمیل پچیس ہزار آٹھ سو اڑسٹھ سال میں ہوتی ہے اور اسی اندلاع سے محور زمین کا اہتزاز پیدا ہوتا ہے جسے بریڈلی نے دریافت کیا تھا۔ اس سے پہلے ایک مقام پر ہم لکھ چکے ہیں کہ زمین کا قطر استوائی قطر قطبی سے بقدر چھبیس میل کے زیادہ ہے۔

زمین کی تسطیح قطبین سے دو واقعات منکشف ہوتے ہیں اول یہ کہ وہ زمانہ سابق میں جابل و لین یعنی بصورت خمیر رہ چکی ہے دوئم یہ کہ وہ حرکت کے سانچے میں ڈھلی ہے اور اس لحاظ سے گویا اس کی ترکیب میں کسی علت ثانیہ نے حصہ لیا ہے۔

قوانین حرکات و حیل کا یہ اثر کرہ زمین کی ترکیب خارجی و ظاہری ہی میں نمایاں نہیں ہے یعنی اس اثر نے اس کے قطبین کی تسطیح اس کی بیضویت اور اس کی حرکت دواری ہی میں حصہ نہیں لیا بلکہ اگر ان اجزا کا معائنہ کیا جائے گا جن سے زمین مرکب ہے تو یہی اثر ان میں بھی نظر آئے گا۔

اگر ہم احجار آبی کے طبقہ کو جانچیں تو معلوم ہو گا کہ اس کا دل کئی میل کا ہے لیکن

اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان چٹانوں کے التمام و انطباق کا عمل بہت آہستہ آہستہ ہوا ہے۔ جس مادہ سے یہ چٹانیں مرکب ہیں وہ قرنہاقرن پہلے کے اجزائے ارضی کی تحلیل و تشعیث سے حاصل ہوا ہے جنہیں نالوں اور ندیوں کے بہاؤ نے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے ازسرنو تہ بہ تہ جما دیا۔ اس قسم کا عمل تحلیل و انطباق ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے لیکن تاوقتیکہ مدت ہائے مدید منقضی نہ ہو جائیں کوئی نمایاں اثر اس سے مترتب نہیں ہو سکتا۔ پانی کی روانی کے عمل سے مٹی کے اجزائے تحلیل شدہ کی جو تہ کسی دریا کے دہانہ پر جم جاتی ہے اس کی موٹائی ایک صدی میں چند انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پس اسی قسم کی جس تہ کی موٹائی کئی ہزار گز ہو اس کے انطباق میں کس قدر زمانہ صرف ہوا ہو گا؟

مصر کے ساحل کی ہیئت ترکیبی کا علم انسان کو دو ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے سے ہے۔ اس زمانہ میں ان اجزائے ارضی نے جنہیں دریائے نیل کی موجیں اپنے ساتھ بہا لاتی رہی ہیں اس ساحل میں ایک نمایاں اضافہ کر کے بحر روم کو کچھ دور پیچھے ہٹا دیا ہے۔ لیکن مصر کا تمام شمالی حصہ اسی طرح سمندر کو پاٹ پاٹ کر بنا ہے۔ دریائے مسیسپی کے دہانے کے قریب خلیج میکسیکو کا ساحل تین سو سال سے ماہرین فن طبقات الارض کے پیش نظر ہے لیکن اس مدت میں خط ساحل نے کوئی نمایاں پیش قدمی نہیں کی حالانکہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب کہ اس دریا کا دہانہ سینٹ لائیس کے قریب موجودہ مقام سے سات سو میل کے فاصلہ پر تھا۔ مصر و امریکا ہی پر کچھ موقوف نہیں۔ تمام ممالک میں دریا انچ ۲ انچ خشکی کو تری میں بڑھائے ہوئے چلے جاتے ہیں اور ان کی آہستگی عمل اور اس عمل کے عظیم الشان آثار سے ہم وثوق کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس عمل تراکم اجراف و انطباق طبقات کے لئے اور مدیدہ و قرون بعیدہ کا انقضا لازمی ہے۔

یہی نتیجہ ہم کو اس وقت بھی نکالنا پڑتا ہے جب ہم جھیلوں کے پاٹے جانے پانی کے قطران سے اجزائے کلیہ یعنی چونے اور کھاد کے متحجر ہونے۔ بارش کے عمل سے کہساروں کے حل ہو ہو کر بہنے۔ سمندروں کی موجوں کے تھپیڑوں سے ساحل کے کٹنے سنگلاخ ٹیکروں کی بنیادوں میں پانی کے سرنگ لگانے اور بادوباراں کے اثر سے چٹانوں کے فرسودہ ہونے پر غور کرتے ہیں۔

تراکم اجراف سے انجار آبی کے جو پرت تلے اوپر جم گئے ان کے انطباق کی سطح ضرور ہے کہ ابتدا میں تقریباً" افقی السمت ہو۔ لیکن کثیر التعداد طبقات یا تو کسی ایسے بطش شدید

کی وجہ سے جس کا ظہور باوقات مختلفہ ہوا اور یا تدریجی حرکت کے باعث زوایائے مختلف المیلان بناتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان عظیم الشان اعوجاجات و انحرافات کی اصلی وجہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ ان طبقات کے ترکیب پذیر ہونے کے لئے اس قدر مدت مدید کا گزرنا لازمی ہے۔ جس کے ادراک سے فہم قاصر ہے۔

ویلز کے ان طبقات ارضی کا عمق جن سے پتھر کا کوئلہ بر آمد ہوتا ہے بتدریج قعر زمین میں غرق ہوتے ہوئے بارہ ہزار فٹ ہو گیا ہے اور نواسکو تیا میں ان طبقات کا دل چودہ ہزار پانچ سو ستر فٹ ہے۔ دھنسنے کا یہ عمل اس آہستگی اور مواظبت سے ہوا کہ ہر طبقہ کے درخت تلے اوپر جون کے نون کھڑے ہوئے ہیں اور چار ہزار پانچ سو پندرہ فٹ کی موٹائی میں سترہ طبقے اس قسم کے گنے جا سکتے ہیں۔ درختوں کی عمر کا اندازہ ان کی جسامت سے ہو سکتا ہے چنانچہ بعض کے تنے کا قطر چار فٹ ہے۔ دھنستی ہوئی زمین کے ساتھ ساتھ جب درخت بھی آہستہ آہستہ زمین میں ساتے گئے تو ان کے گرد وہ پودے اگتے گئے جنہیں اصطلاح فن طبقات الارض میں "کیلیمائٹ" (ذنب الفرس) کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پودے غرق شدہ درختوں کی طرح درجہ بدرجہ ہر طبقہ میں پائے جاتے ہیں۔ سڈنی کے طبقہ زغالی میں انسٹھ دبے ہوئے جنگل تلے اوپر کھڑے ہوئے ہیں۔

بحری گھونگوں کی سیپوں کو برا عظموں کے اندرونی حصہ کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دیکھ کر علمائے مذہب اپنی تصانیف میں یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ان سیپوں سے طوفان نوح کی ہمہ گیری کی حجت قاطع بہم پہنچتی ہے۔ لیکن جب علم طبقات الارض کے مسائل صحت کے ساتھ معلوم ہونے لگے تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ زمین کے خول بیرونی میں وہ طبقات جو آب شیریں کے عمل سے بنے ہیں ان طبقات کے ساتھ جنہیں آب شور نے بنایا ہے علی التوالی و التسلسل کسی کتاب کے اوراق کی طرح ملے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہی طوفان ان مختلف مظاہر کا باعث نہیں ہو سکتا بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی قطعہ زمین اپنی سطح کے تدریجی تغیرات اور اپنے جغرافیائی حوالی کی تبدیلیوں سے کبھی تو بالکل خشک تھا کبھی آب شیریں کے تلے ڈوب گیا اور کبھی آب شور کے نیچے آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی کہ ان تغیرات و انقلابات کی تکمیل کے لئے ہزاروں لاکھوں سال کی مدت مطلوب ہے۔

قدامت ارض کی اس شہادت پر جو اس کے طبقات کی وسعت۔ عمق اور تنوع سے ماخوذ تھی ان زبردست شہادتوں کا اضافہ ہو گیا جو اس کے آثار متحجرہ پر مبنی تھیں۔ زمین

کے ہر طبقہ کی عمر جب متحقق ہو گئی تو اس بات کا ثبوت دینا آسان ہو گیا کہ نباتی و حیوانی ہر طرح کے اجسام ذوی الاعضا نے قدیم ترین اشکال سے لے کر جدید ترین اشکال تک بتدریج ترقی کی ہے اور وہ نباتات و حیوانات جو ہمارے زمانہ میں سطح زمین کی آبادی کا باعث ہیں ان کثیر التعداد اشکال نباتی و حیوانی کا محض ایک جزو حقیر ہیں جو بہ زمانہ سابق عالم ہستی میں آ چکی ہیں۔ یعنی اگر ایک نوع اس وقت زندہ ہے تو ہزارہا انواع فنا ہو چکی ہیں۔ اگرچہ طبقات ارض سے متحجرات کے جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان میں سے حیوانات کی بعض انواع اپنی خصوصیات مخصوصہ کے لحاظ سے اس درجہ نمایاں ہیں کہ ہماری زبان پر دور حیوانات مفصلیہ (بے ریڑھ کی ہڈی کے جاندار) دور ہوام الارض (زمین پر رینگنے والے وہ جاندار جو ریڑھ کی ہڈی رکھتے ہیں) دور ذرات الثدی (دودھ پلانے والے جاندار) کی اصطلاحیں چڑھ گئی ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہر نئی نوع یک بیک نمودار ہو گئی تھی۔ ہر نوع کا ظہور بتدریج دور سابق میں ہوا اور اپنے دور میں جو اس کے نام سے منسوب و مخصوص ہے منتہائے نشوونما پر پہنچ کر وہ بتدریج دور آئندہ میں معدوم ہو گئی۔ فوری پیدائش یعنی کسی شے کا یک بیک کامل و مکمل صورت میں نمودار ہو جانا خارج از امکان ہے۔ ہر وجود کمال آہستگی سے اپنا چولا بدلتا ہے اور ایک سابقہ شکل سے ترقی کرتا ہوا موجودہ شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کے لئے بھی ایک بہت بڑے طویل و مدید زمانہ کا اقتضا لازمی ہے۔ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے یعنی جس زمانہ سے تاریخ کی روشنی انسان کے تمدن پر پڑی ہے۔ اس قسم کے انبدال یا استحالہ یا نشوونما کی کوئی بین مثال ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی۔ علی ہذا القیاس انعدام نوع کی کوئی تاریخی مثال دیتے ہوئے بھی ہم کچھ بہت زیادہ وثوق ظاہر نہیں کر سکتے لیکن ان قرون و ادوار میں جنہیں حقائق طبقات الارض سے تعلق ہے صدہا ہزارہا کون و فساد اور ارتقا و انعدام پیش آ چکے ہیں۔

چونکہ انسان کا تجربہ تبدیل ہیئت یا ارتقا کی کسی مثال پر حاوی نہیں ہے لہٰذا بعض اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس قسم کا تبدل یا ترقی خارج از امکان ہے۔ اور حیوانات و نباتات کی مختلف نوعیں علیحدہ علیحدہ پیدا کی گئی ہیں۔ لیکن ان اصحاب کو یہ تو سوچنا چاہئے کہ ہر نوع کا ایک نوع سابقہ سے بہ تبدیل و ترمیم اعضا ترقی پا کر درجہ کمال پر فائز ہونا اس کے مقابلہ میں زیادہ قرین دانش ہے کہ وہ نوع یک بیک عدم سے وجود میں آ جائے۔ یہ قول بھی کچھ بہت زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کبھی انسان نے کسی نوع کے کسی فرد کو ارتقا کا چولا بدلتے ہوئے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ شاید وہ لوگ جن سے اس ادعا کو

نسبت ہے اس امر کی طرف سے خالی الذہن ہیں کہ آج تک کسی شخص نے اپنی آنکھ سے یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ کوئی جسم ذوی الاعضا بغیر کسی مورث کے خودبخود اور یک بیک پیدا ہو گیا ہو۔

آفرینش کے ان افعال سے جو بغتتہً صادر ہوں اور جن میں مغائر للقانون ہونے کے علاوہ کوئی ربط نہ پایا جاتا ہو۔ گو قدرت ایزدی ظاہر ہوتی ہو لیکن اجسام ذوی الاعضا کو وہ غیر منقطع سلسلہ جو طبقات قدیمہ تحتانیہ کے متحجرات سے لے کر طبقات جدیدہ فوقانیہ تک پھیلا ہوا ہے اور جس کا ہر ایک حلقہ ایک حلقہ ماسبق سے معلق اور ایک حلقہ مابعد کا سہارا ہے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ جاندار ہستیوں کا وجود میں آنا ایک مقررہ ضابطہ کے تابع ہے اور یہ وہ ضابطہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ قانون ہزاروں لاکھوں سال سے اپنا عمل کر رہا ہے۔ لیکن آج تک اس میں کوئی تغیر اور کوئی رکاوٹ نہیں واقع ہوئی۔[1]

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے اس شہادت کے ایک حصہ کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے جس سے مسئلہ عمر زمین پر بحث کرتے وقت ہمیں سابقہ پڑنا ضرور ہے۔ علمائے فن طبقات الارض کی متصل و مسلسل کوششوں نے اس شہادت کا اتنا بڑا انبار جمع کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے کئی ضخیم جلدیں مطلوب ہیں۔ یہ شہادت ان تمام احجار کے اجزائے ترکیبی و ہیئت کذائی کا ماحصل ہے جن میں سے بعض تو آبی ہیں یعنی پانی کے عمل سے بنے ہیں۔ بعض آتشی ہیں یعنی جوف زمین کے کھولے ہوئے خارج شدہ مادے سے مرکب ہیں اور بعض مستحیلہ ہیں یعنی حرارت اور دباؤ کے متفقہ عمل سے ترکیب پذیر ہوئے ہیں۔ طبقہ احجار آبی کے متعلق یہ تحقیقات کی گئی ہے کہ اس کی موٹائی کس قدر ہے۔ اس کے مختلف پرتوں کا میلان کس سمت میں ہے۔ ہر ایک پرت دوسرے پرت پر بے ڈھنگے پن سے کس شکل میں قائم ہے۔ وہ طبقات جو آب شیریں کے عمل سے بنے ہیں ان طبقات کے ساتھ جن میں آب شور کا اثر پایا جاتا ہے کس طرح ملے ہوئے ہیں۔ تعریہ و تحلیل کے بطی العمل اسباب نے مادہ ارضی کے کوہ پیکر انباروں کو کیوں کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے وسیع و عریض جغرافیائی رقبوں کی شکل تبدیل کر دی ہے۔ براعظموں کی سطوح میں ابھرنے اور دھنسنے کی وجہ سے کس طریقہ پر نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے یعنی ان کے سواحل کیونکر تو سمندر میں غرق ہو گئے ہیں اور یا خشکی میں بہت دور اندر تک چلے گئے ہیں۔ حیوانات و نباتات کے حال سے بھی علم طبقات الارض کی شہادتوں کو بحث ہے یعنی اس مسئلہ پر نظر کی گئی ہے کہ ہر دور میں کون کون سی حیوانی اور نباتی شکلیں موجود تھیں اور کیونکر نہایت

ترتیب و تسلسل کے ساتھ اجسام ذوی الاعضا یعنی نباتات و حیوانات کا سلسلہ عالم ابداع کے مبہم و موہوم نقطہ آغاز سے ہمارے زمانہ تک پہنچا ہے۔ حشیش متحجر سے جس کی اصل ہر صورت میں نباتات ذایل ہے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نہ صرف زمین کے کرہ ہوا ہی میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں بلکہ موسم میں بھی ہمہ گیر انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ بعض دوسرے واقعات متعلقہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ روئے زمین کی حرارت میں بھی مدوجزر ہوتا رہا ہے۔ یعنی بعض زمانوں میں حرات کا اوسط بہت بڑھ گیا ہے اور بعض میں قطبین کی برف کے تودے موجودہ براعظموں کے ایک بہت بڑے حصہ پر چھا گئے ہیں۔ چنانچہ ان ادوار کو ازمنہ زمہریر یہ کہتے ہیں۔

ماہرین فن طبقات الارض کا ایک گروہ جس کی دلائل کا مدار علیہ نہایت زبردست شہادت ہے یہ رائے پیش کرتا ہے کہ کل جرم ارض ابتدا میں ایک جسم گداختہ یا سیال تھا بلکہ شاید فرط حرارت سے بحالت و خان تھا۔ لاکھوں قرنوں کے گزرنے کے بعد تبخیر کے ذریعہ سے اس کی حرارت کا اشتداد کم ہوتا گیا تاآنکہ اس کے مزاج میں موجودہ اعتدال پیدا ہوا۔ علم ہیئت کے مشاہدات خصوصاً" نظام شمسی کے اجرام سیار کے حالات اس تاویل کی تائید و توثیق کرتے ہیں۔ بعض دوسرے واقعات سے بھی اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے مثلاً" اوسط کثافت ارض کی کمی۔ زیادتی عمق قعر زمین کی نسبت سے حرارت کا ازدیاد کھولتے ہوئے مادہ کا آتش فشاں پہاڑوں اور دراڑوں کی راہ سے اخراج۔ احجار آتشی و مستحیلہ کا وجود۔ ان طبیعی تغیرات کی تکمیل کے لئے جو علمائے طبقات الارض کی اس جماعت کے پیش نظر ہیں بے انتہا صدیاں مطلوب ہیں۔

لیکن نظام کوپرنیکس کے حقائق کا اعتراف اس ضرورت کا مستلزم ہے کہ زمین کی ابتدا و سرگزشت کے واقعہ پر انفرادی حیثیت سے نظر نہ ڈالی جائے۔ ضرور ہے کہ اس واقعہ پر بحث کرتے وقت اس نظام یا خاندان کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے جس کا کرہ زمین ایک رکن ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنی بحث کو نظام شمسی تک بھی محدود نہیں کر سکتے۔ اس بحث میں ہمیں ثوابت کی دنیاؤں کو بھی شریک کرنا چاہئے اور چونکہ اس برتراز قیاس فاصلہ کی غرابت سے ہمارا دماغ اب مانوس ہو چکا ہے جو ان ثوابت کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے لہذا ہم ان کی تکوین کے زمانہ میں بھی بعد کے اس عنصر کے اعتراف کے لئے آمادہ ہیں جس کی پیمائش محالات سے ہے۔ کائنات میں ایسے ایسے کواکب بھی موجود ہیں جو ہم سے اس قدر دور ہیں کہ باوجودیکہ روشنی اس تیزی سے حرکت کرتی

ہے پھر بھی ان کی شعاع نور کو ہم تک پہنچنے میں کئی ہزار سال کا زمانہ صرف ہوا ہے جس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کو وجود میں آئے ہوئے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم کئی ہزار سال کی مدت تو ضرور منقضی ہوئی ہو گی۔

علمائے طبقات الارض جب بالاتفاق تسلیم کر چکے کہ تاریخ تکوین ارض بہت زیادہ توسیع کی محتاج ہے تو یہ کوششیں ہونے لگیں کہ اس تاریخ کو معین کیا جائے۔ ان کوششوں میں سے بعض اصول ہیئت پر مبنی تھیں اور بعض اصول طبیعیات پر۔ مثلاً" سب سے آخری دور زمہریریہ سے اس وقت تک کی مدت کے دریافت کرنے کی غرض سے جو تخمینہ مرکز مدار ارض و مرکز آفتاب کے درمیانی فاصلہ کی معلومہ تبدیلی کی بنا پر قائم کیا گیا ہے اس کا ماحصل دو لاکھ چالیس ہزار سال ہے۔ اگرچہ اس عام اصول کے صحیح ہونے میں شک نہیں کہ ازمنہ طبقات الارض کی مدت عسیر الاحصا ہے لیکن اس قسم کے تخمینے ایسے غیر یقینی قیاسات پر مبنی ہیں کہ وہ کسی طرح موثق و معتبر نہیں ٹھہر سکتے۔

تاہم اس مسئلہ کے مالہ ماعلیہ پر علمی پہلو سے نظر ڈالنے کے بعد اس میں تو مطلق شک نہیں رہتا کہ علمائے مذہب نے صحیفہ موسیٰ سے جن واقعات کا استقصا کیا ہے وہ ناقابل تسلیم ہیں۔ اگرچہ اکتشافات جدیدہ و واقعات محققہ کے ساتھ واقعات الہامی کو تطبیق دینے کی متواتر کوشش کی گئی ہے لیکن وہ لاحاصل ثابت ہوئی ہے۔ تورات کا زمانہ حد سے زیادہ قلیل ہے۔ ترتیب ظہور مخلوقات بالکل خلاف واقعہ ہے اور خدا کی طرف سے جو مداخلت ہوئی ہے اس میں شان انسانی معمول سے زیادہ اپنی جھلک دکھا رہی ہے اور اگرچہ مسائل زیر بحث ان خیالات سے توافق و تطابق رکھتے ہیں جو انسان کے دماغ میں اس وقت پیدا ہوئے تھے جب اس کو اول اول صحیفہ فطرت کی ورق گردانی سے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا شوق پیدا ہوا لیکن ان کو زمین کی ہیچ میرزی اور کائنات کی عظمت و شان کے موجودہ تصورات سے مطلق ربط نہیں۔

حال کے طبقات الارضی اکتشافات میں سے ایک اکتشاف خصوصیت کے ساتھ ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ یعنی ان طبقات میں جن کو اگرچہ طبقات الارضی اعتبار سے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری لیکن تاریخی اعتبار سے ایک عرصہ دراز منقضی ہو چکا ہے۔ انسانی جسم کے ڈھانچہ اور انسانی صنعت کے آثار پائے گئے ہیں۔

انسان کے آثار متحجرہ یعنی اس کے جسم کے ڈھانچ اور کھردرے یا ترشے ہوئے مجلا پتھر اور ہڈی اور نحاس (کانسی) کے اوزار یورپ میں غاروں، سنگریزوں کے تودوں اور حشیش

متحجر کے طبقوں میں پائے گئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اس زمانہ میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا اور جنگل کے جانوروں اور مچھلیوں کے شکار سے قوت بسری کرتا تھا۔ جو تحقیقات حال میں کی گئی ہے اس سے اس واقعہ کی صریح شہادت بہم پہنچتی ہے کہ انسان دور ثالثہ میں بھی موجود تھا اور جنوبی ہاتھی پتلی تھوتھنی والے گینڈے اور عظیم الجثہ دریائی گھوڑے کا ہمعصر تھا۔ بلکہ شاید دور ثالثہ الوسطی کے مشہور داڑھوں میں تھن رکھنے والے فیل نما حیوان "مسطودان" کا بھی معاصر تھا اور یہ وہ حیوان ہیں جن کی نسلیں معدوم ہو چکی ہیں۔

دور ثالثہ کے اختتام پر بوجہ ان اسباب کے جو ابھی تک متحقق نہیں ہوئے زمین کے نصف کرہ شمالی کی حرارت میں غیر معمولی کمی واقع ہو گئی۔ یعنی منطقہ حارہ سے وہ منطقہ بارہ ہو گیا اور تابستان کی جگہ برفستان نے لے لی۔ ایک مدتہ ممتہ کے بعد حرارت پھر بڑھ گئی اور برف کے وہ پہاڑ جو سطح زمین پر دور دور چھا گئے تھے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد پھر حرارت میں کمی ہو گئی اور تودہ ہائے برف آگے بڑھ آئے۔ لیکن اس مرتبہ انہوں نے زیادہ پیش قدمی نہ کی۔ اب دوررابعہ کا آغاز ہوا اور موسم بتدریج بدلتا ہوا موجودہ حالت پر پہنچ گیا۔ تراکم اجراف کے عمل کو جو پانی کی مدد سے برابر جاری تھا طبقات آبی کے انطباق کے لئے ہزارہا صدیوں کی ضرورت تھی۔ قرون رابعہ کے اوائل میں خرس کہفی۔ اسد کہفی۔ فرس البحر ذوعنصرین۔ کرگدن مشبک المناخر اور فیل شعرانی (میمتھ) کی نسلیں زندہ تھیں۔ ان کوہ پیکر ہاتھیوں کے کثیر التعداد غول جنگلوں میں آباد تھے اور ان کے پنپنے کے لئے نصف کرہ شمال کا موسم نہایت موزوں تھا۔ رفتہ رفتہ برفانی بارہ سینگوں گھوڑوں بیلوں اور ارنے بھینسوں کی نسلیں ترقی کر گئیں اور قدرت کو جس کا دسترخوان پہلے صرف ایک اکیلے فیل شعرانی کے لئے وقف تھا اب اتنے بہت سے مہمانوں کی تواضع کرنی پڑی۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ روز افزوں حرارت کے باعث فیل شعرانی معدوم ہو گیا۔ وسط یورپ سے برفانی بارہ سینگا رخصت ہو کر اقطاع شمالی کی طرف جہاں زیادہ سردی تھی چلا گیا۔ اس کا نقل مکان قرون رابعہ کے خاتمہ کی علامت ہے۔

پس روئے زمین پر انسان کے ظاہر ہونے کی تاریخ سے لے کر اب تک بہت سے قرون گزرے ہیں جن کی میعاد بیرون از قیاس اور برتراز احصا ہے۔ ان قرون ممتدہ میں انقلابات آب و ہوا اور تغیرات انواع حیوانات ان بطی الاثر اسباب سے ہوتی ہے جو آج کے دن بھی اپنا عمل برابر کر رہے ہیں۔ شمار و اعداد سے ہم ان مدت ہائے دراز و ازمنہ

بعیدہ کا اندازہ ہرگز نہیں کر سکتے۔

یہ امر پایہ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ انسان کی ایک نسل جو قوم باسک[5] سے مشابہت رکھتی ہے زمانہ حجریہ جدید میں روئے زمین پر آباد تھی۔ اس زمانہ میں جزائر برطانیہ کی سطح اسی طرح زیر انقلاب تھی جس طرح فی زمانہ جزیرہ نمائے اسکنڈینیو یا متغیر ہو رہا ہے۔ اسکاٹ لینڈ ابھر رہا تھا اور انگلستان دھنس رہا تھا۔ طبقہ ثانیہ الثالثہ جدید کے زمانہ میں وسط یورپ شکاریوں اور ماہی گیروں کی ایک وحشی نسل سے آباد تھا جو اسکیمو نسل سے ملتی جلتی ہے۔

ریت مٹی اور خس و خاشاک کے ان انباروں میں جو اسکاٹ لینڈ کو دور زمہریریہ جدید سے ترکہ میں پہنچی ہیں انسان اور ہاتھی کے متحجرات پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں یعنی جب یورپ کا بہت بڑا حصہ برف کے ان تودہ ہائے عظیم سے ڈھک گیا تھا جو قطب شمالی سے کھسکتے ہوئے جنوبی ممالک کی طرف بڑھ آئے تھے اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اتر کر میدانوں میں چھا گئے تھے۔ حیوانات کی بے شمار انواع برف اور یخ کے اس طوفان میں تباہ ہو گئیں لیکن انسان بچ رہا۔

قدیم وحشیانہ حالت میں جب انسان پھل پھلاری جنگل کی جڑی بوٹیوں اور گھونگوں پر زندگی بسر کرتا تھا اسے ایک بات ایسی معلوم تھی جس کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اس کا متمدن و مہذب ہو جانا لازمی تھا یعنی اسے آگ جلانی آتی تھی۔ سطح زمین کے بالائی پرت کے ان مقامات میں جہاں کھودنے پر حشیش متحجر کا ایندھن نکلتا ہے ابھی تک انسان کے آثار پائے جاتے ہیں اور اس کے اوزاروں سے اس کا تاریخی زمانہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ سطح زمین سے تھوڑی دور پر کانسی کے اس سے کچھ نیچے ہڈی یا سینگ کے اس سے بھی نیچے ترشے ہوئے مجلا پتھر کے اور سب سے نیچے کھردرے ان گھڑ پتھر کے اوزار پائے جاتے ہیں۔ جن طبقات میں سے یہ اوزار برآمد ہوئے ہیں ان میں سے بعض کا زمانہ کسی طرح چالیس پچاس ہزار سال سے کم نہیں ہے۔

فرانس اور دوسرے ممالک میں ماہرین فن طبقات الارض نے جن غاروں کا معائنہ کیا ہے ان میں سے ازمنہ حجریہ کے اوزار مثلاً کلہاڑیاں۔ چھریاں۔ برچھوں اور تیروں کے پھل۔ دانیھان اور ہتھوڑے برآمد ہوئے ہیں۔ ان گھڑ پتھر کے زمانے یعنی عہد حجریہ قدیم کا تبدیل ہو کر ترشے ہوئے پتھر کے زمانے یعنی عہد حجریہ جدید میں ضم ہو جانا بہت ہی آہستگی کے ساتھ عمل میں آیا۔ یہ تبدیلی کتے کے پالے جانے کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوئی گویا یہ وہ دور تھا جب انسان نے شکاری زندگی شروع کی یہ دور بھی ہزاروں ہی صدیوں تک رہا۔

نیزوں کے پھلوں سے اس امر کی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ انسان نے کہاں ایجاد کر لی تھی اور مدافعانہ طرز ماند و بود سے ترقی کر کے معارضانہ طریقہ زندگی اختیار کر لیا تھا۔ خاردار پیکانوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قوت ایجاد روبہ ترقی تھی۔ ہڈی اور سینگ کی نکیلی پھالیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جانوروں کے علاوہ انسان چھوٹے جانوروں بلکہ شاید پرندوں کا بھی شکار کرنے لگ گیا تھا۔ ہڈی کی سیٹیوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے شکاری بھی ہوتے تھے یا کم از کم اس کا کتا تو ضرور اس کا رفیق ہوتا تھا۔ سنگ خارا کی راپنیون سے پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے لباس کے لئے چمڑے کا استعمال کرنے لگ گیا تھا اور بھدے ٹوچنوں اور سوئیوں سے لباس کی سلائی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے چھدی ہوئی سیپیوں سے جو چوڑیوں اور مالاؤں کے لئے کام میں لائی جاتی تھیں۔ آرائش جسمانی کے مذاق کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ آلات رنگ سازی کا وجود تلوین و توشیم بدن پر گواہ ہے اور اعلیٰ مرتبہ کے ظاہر کرنے والے عصا تمدن کی تکوین و تنظیم کی علامات ہیں۔

ان قدیم انسانوں کی صنعت و دستکاری کا پہلا نمونہ ہمارے لئے نہایت ہی دلچسپی کا موجب ہے۔ ہاتھی دانت کے ٹکڑوں اور ہڈی کی تختیوں پر انہوں نے ان جانوروں کی بھدی تصویریں کھینچی ہیں جو ان کے زمانہ میں موجود تھے۔ اسی طرح ان جانوروں کی مورتیں بھی ان کی سنگ تراشی اور کندہ کاری کی ابتدائی کوشش کو ظاہر کرتی ہیں۔ زمانہ قبل تاریخ کی ان تصویروں میں جو بعض صورتوں میں اصلیت سے کچھ بہت زیادہ مغائر نہیں ہیں فیلان شعرانی ار برفستانی بارہ سینگوں کی لڑائی کا نظارہ دکھایا گیا ہے۔ ایک تصویر میں ایک آدمی مچھلی کا شکار برچھے سے کر رہا ہے۔ ایک اور تصویر میں چند برہنہ آدمی دکھائے گئے ہیں جو ہاتھ میں بھالے لئے شکار کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فقط انسان ہی وہ حیوان ہے جو اشکال خارجی کے انتقاش کی قابلیت رکھتا ہے اور آگ کا استعمال کر سکتا ہے۔

گھونگوں کے ٹیلوں میں جو ہڈیوں اور سیپیوں سے مرکب ہیں اور جن میں سے بعض بہت بڑے بڑے اور ازمنہ نحاسیہ سے بھی پہلے کے ہیں اور پتھر کے اوزاروں سے معمور ہیں ہر جگہ آگ کے استعمال کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ ٹیلے اکثر تو موجودہ سواحل سے ملحق ہیں لیکن بعض صورتوں میں سمندر کے ساحل سے چالیس چالیس پچاس پچاس میل ادھر خشکی میں ہٹ آئے ہیں۔ ان کے اجزائے ترکیبی اور محل وقوع سے پایا جاتا ہے کہ ان کا زمانہ دودھ پلانے والے معدوم چوپایوں سے بعد لیکن پالتو جانورں سے پہلے کا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان ٹیلوں میں سے بعض کی عمر کسی طرح ایک لاکھ سال سے کم نہیں

ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے آب دوز اماکن یعنی ان جھونپڑیوں میں جو جھیل کے اندر لکڑی کے موٹے موٹے لٹھے گاڑ کر درختوں کی ٹہنیوں کے گھونتنے سے بنائی جاتی تھیں کچھ اوزار پائے گئے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھونپڑیاں ازمنہ حجریہ میں بننی شروع ہوئیں اور ازمنہ نحاسیہ تک قائم رہیں۔ ازمنہ نحاسیہ کے جو آثار موجود ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ انسان نے اس دور میں مزارعانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ علمائے طبقات الارض نے اپنی آسانی کے لئے انسان کے زمانہ ترقی تمدن کو جن ادوار میں تقسیم کر لیا ہے ان کا آغاز و انجام معتین ہوا اور بنی نوع انسان کے کل افراد ہر دور کو ایک ساتھ طے کرتے گئے۔ امریکہ کی خانہ بدوش وحشی اقوام زمانہ حجریہ کی وادی سے اب باہر نکل رہی ہیں۔ بہت سے مقامات میں ابھی تک یہ لوگ ایسے تیروں سے مسلح نظر آتے ہیں جن کے پھل پتھر کے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ان میں سے بعض نے گورے رنگ کی مہذب اقوام سے لوہے بندوق اور گھوڑے کا استعمال سیکھا۔

غرض جس قدر تحقیقات اب تک ہوئی ہے اس سے یہ بات بلاامکان تردید ثابت ہوتی ہے کہ انسان آج سے کئی لاکھ سال پہلے کرہ زمین پر آباد تھا۔ مخفی نہ رہے کہ ان تحقیقات کو کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا اور جغرافیائی حدود کے لحاظ سے بھی اس کا دائرہ عمل بہت تنگ ہے۔ ان مقامات میں ابھی تک کوئی انکشاف نہیں کیا گیا جن کی نسبت عقل سلیم گواہی دیتی ہے کہ انسان اولین کا مسکن یہیں ہو گا۔

اس طور پر ہم چھ ہزار سال کی اس مدت سے جو پادریوں کا مبلغ تاریخ ہے قرنوں اور جگوں پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ دور زمہریریہ جدید یعنی یورپ کی گذشتہ تبرید کا زمانہ کسی طرح ڈھائی سال سے کم نہیں ٹھہر سکتا اور انسان کا اس زمانہ سے بھی پہلے دنیا میں موجود ہونا ثابت ہے لیکن ایک فقط یہی عظیم الشان حقیقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے بلکہ ہم کو اس واقعہ کا بھی خواہی نخواہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انسان سے بھی پہلے حیوانی زندگی موجود تھی اور ہر جسم ذوی الاعضا نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ ارتقا پذیر ہوا۔

ایک طرف تو روایت کو اصرار ہے کہ ہمارے جد امجد باغ عدن میں جامہ اکملیت زیب تن کئے ہوئے فردوس کی لذتوں سے بہرہ اندوز تھے اور دوسری طرف درایت علی روس الاشہاد انسان اولین کی بے بسی اور بے کسی اور وحشیانہ حالت کا ثبوت دے رہی ہے۔

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

روایت کے اس ادعا نے مسئلہ ہبوط آدم کو جو چرکا لگایا ہے اس سے ممکن نہیں کہ وہ جانبر ہو سکے۔

ہم نے اس فصل کے موضوع کو پیرایہ ترتیب تاریخی سے اس لئے عاری کر دیا ہے کہ مسئلہ ماہیت عالم کے متعلق جو کچھ ہمیں کہنا تھا اس کے مالہ و ماعلیہ سے ہمیں مختلف مقامات پر بحث نہ کرنی پڑے۔ ورنہ مسئلہ عمر زمین مسئلہ معیار حق و صدق سے مدتوں بعد چھڑا یعنی "رفاریشن" (اصلاح کینسہ) کے بعد اس مسئلہ پر بحث ہوئی کہ حق کی ماہیت کیا ہے بلکہ ہمیں یوں کہنا چاہئے کہ یہ بحث انیسویں صدی تک چھڑی رہی۔ اس بحث میں فریقین نے غیر معمولی اعتدال سے کام لیا چنانچہ اس پر مناقشہ کے مناظرہ کا لفظ زیادہ موزوں طور پر صادق آتا ہے۔ علم ہیئت کی مخالفت جس معاندانہ و منتقمانہ شان کے ساتھ کی گئی تھی علم طبقات الارض کو اس سے سابقہ نہیں پڑا اور اگرچہ علمائے طبقات الارض نے کرہ زمین کی بے انتہا قدامت کے تسلیم کئے جانے پر زور دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ جن اعداد کے ذریعہ سے عمر زمین کا اندازہ قائم کیا گیا ہے وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ جن ناظرین نے اس فصل کو توجہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے ان اعداد کے عدم تطابق کو نظر انداز نہ کیا ہو گا۔ جن کا حوالہ جابجا دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اعداد تدقیق و تحکیم سے عاری ہیں لیکن اس دعوے کی تائید ان سے پھر بھی بخوبی ہوتی ہے کہ زمین نہایت قدیم ہے اور ان کی بنا پر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عالم کا پیمانہ زمان اس کے پیمانہ مکان کا جواب ہے۔

---

[1] اس کے مقابلہ میں قرآن مجید کو دیکھو جس کا ایک ایک حرف ایک ایک لفظ ایک ایک سطر کسی تحریف ترمیم یا تغییر کے بغیر وہی ہے جس کا القا حضور سرور کائنات پر ہوا تھا اور جس کو دست برد روزگار سے بچانے کا وعدہ خداوند جل و علے نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔ "وانا له لحافظون"۔ مترجم

[2] مصلحت ظاہر ہے بجز اس کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ کہ آئندہ جب طوفان آئے تو کشتی کی ضرورت نہ پڑے بلکہ یہ لوگ مینارے کی چھت پر جا پناہ لیں۔ مترجم

[3] ڈاکٹر شکفرڈ کے اس خیال کو خان بہادر مولانا اکبر حسین صاحب الہ آبادی نے ازراہ ستم ظریفی ذرا زیادہ تعمیم کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا ہے

کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ ہیں خوب شخص
یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

مترجم

؎ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی صنعت و حکمت کا جو ثبوت اس ضابطہ غیر ممکن التغیر سے ملتا ہے وہ کسی ایسے فعل سے ہرگز نہیں بہم پہنچ سکتا جس میں تلون آمیز جبروت کی مثال پائی جاتی ہو۔ دنیا کے ترقی یافتہ مسلک یعنی اسلام نے اسی خیال کو بار بار ان الفاظ میں ظاہر کر کے حقیقت قدرت ایزدی کے چہرہ سے پردہ اٹھایا ہے۔ لاتبدیل لخلق اللہ۔ لن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا۔ مترجم

؎ اسپین کا وہ وسیع علاقہ جو کوہستان پرینیز کے جنوب و مغرب میں واقع ہے صوبہ باسک کہلاتا ہے جس کا رقبہ تین ہزار مربع میل اور آبادی پانچ لاکھ ہو گی۔ اس صوبہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ایک قدیم نسل کے لوگ جو باسک کے نام سے موسوم ہے آباد ہیں۔ ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ اسپین میں قوم کلٹ کے آ کر آباد ہونے سے قبل پورے جزیرہ نما میں ایک قوم بستی تھی جس کا نام آئبیری تھا چنانچہ اسپین کو آئبیریا اسی لئے کہتے ہیں۔ باسک انہیں آئبیریوں کی نسل سے ہیں۔ اس نسل کا تعلق اقوام کے اس خانوادہ سے تھا جو آریہ اقوام کے ظہور سے پہلے یورپ میں آباد تھیں۔ باسک قوم کی زبان جو آریہ زبانوں کے عنصر کی آمیزش سے بالکل پاک ہے غالباً" تورانی الاصل ہے۔ تمدن جدید کا اثر اس قوم پر کچھ کچھ اب پڑنے لگا ہے۔ ورنہ پچاس سال ادھر تک ان کی زندگی نیم وحشیانہ تھی۔ مترجم

؎ اسکیما اس وحشی نسل کا نام ہے جو شمالی امریکہ کے منطقہ باردہ میں گرین لینڈ اور لبریڈار کے ساحلوں اور دوسرے برفستانی علاقوں میں آباد ہے۔ اگرچہ اس ساحلی علاقہ کا طول پانچ ہزار میل سے کم نہ ہو گا۔ لیکن اس کی آبادی اپنی شکل صورت۔ عادات و اطوار۔ رسم و رواج۔ بول چال اور روایات و خیالات کے اعتبار سے آپس میں بہت کچھ مشابہ ہے اور دنیا میں دوسری کوئی قوم نہ ہو گی جس کا خون اس درجہ خالص اور بلا آمیزش ہو اور جس کی قومی خصوصیات میں بیرونی اثرات نے اتنا کم تغیر پیدا کیا ہو۔ یہ لوگ ہزارہا سال سے ایک ہی طرح رہتے سہتے چلے آئے ہیں۔

ان کی زندگی کا دارومدار دریائی بچھڑوں اور دوسرے دودھ پلانے والے بحری جانوروں اور مچھلیوں پر ہے ان جانوروں کی چربی ان کی عام غذا ہے جس کی وجہ سے وہ سردی کی سختی جھیل سکتے ہیں اور ان کا لباس بھی انہیں جانوروں کے چمڑے کا ہوتا ہے۔ دریائی بچھڑوں اور مچھلیوں اور دوسرے جانوروں کے شکار میں انہیں ایسی مہارت ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لباس اور غذا کے علاوہ اپنی زندگی کی باقی تمام ضرورتوں کو بھی انہیں جانوروں کے ذریعہ سے پورا کرتے ہیں۔ ان کی ہڈیوں سے شکار کے لئے ہتھیار بناتے ہیں۔ ان کی نسوں سے تاگے اور ڈوری کا کام لیتے ہیں۔ ان کی بے پہیے کی برف پر چلنے والی گاڑیاں بھی جن کے آگے کتے جوتے جاتے ہیں۔ ہڈیوں کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ دس دس بارہ بارہ کنبوں کے جرگے ایک جگہ آباد ہوتے ہیں۔ جاڑوں کے موسم میں جہاں یہ جرگے رہتے ہیں وہی ان کا اصلی گھر ہے۔ کیونکہ گرمی کے موسم میں وہ خانہ بدوش بن جاتے ہیں اور ادھر ادھر پھرتے ہیں۔ اس زمانہ میں علاوہ دریائی بچھڑے مچھلی وغیرہ کے

شکار کے وہ برفانی بارہ سینگے کا بھی شکار کرتے ہیں اور تھوڑی بہت تجارت بھی کرتے ہیں جو تبادلہ اجناس کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ جاڑے کی آمد آمد کے ساتھ وہ اپنے قشلاق کو لوٹ جاتے ہیں۔ اگرچہ گوشت وہ کچا بھی کھاتے ہیں لیکن عام دستور یہ ہے کہ گوشت ایک پتھر کی ہنڈیا میں جو ایک چراغ کے اوپر لٹکا دی جاتی ہے ابال لیا جاتا ہے اس چراغ میں تیل دریائی بچھڑوں اور ویل مچھلیوں کی چربی کا ہوتا ہے اور بتی کائی کی ہوتی ہے۔ گرمی کا موسم وہ خیموں میں بسر کرتے ہیں جو کھالوں کو سی کر تیار کر لئے جاتے ہیں اور جاڑوں میں گھروں کے اندر رہتے ہیں جن کی ساخت حالات مقامی کا پتہ دیتی ہے یعنی یا تو پتھر اور گھاس پھوس کے ہوتے ہیں یا پتھر اور ہڈیوں یا بہہ کر آئی ہوئی لکڑیوں کے یا یخ کی اینٹوں کے جو تلے اوپر اس ترکیب سے چن دی جاتی ہیں کہ ایک گنبد نما جھونپڑا بن جاتا ہے۔ اسکیما قوم کا مذہب بت پرستی کی ایک شکل ہے۔ وہ ایک بہت بڑی ہستی عالیہ پر ایمان رکھتے ہیں جس کا نام ان کی زبان میں تورنارسک ہے اس کے علاوہ وہ کئی محافظ دیوتاؤں کے قائل ہیں جن کا نام اسکیمائی اصطلاح میں تورنات ہے۔ ان کے اس سلسلہ ارادت میں تیسرا درجہ بعض انسانوں کو حاصل ہے جو اگاکوت کہلاتے ہیں اور فوق القدرت عقل و قوت سے متصف ہیں ان کا عالم عقبیٰ پر بھی ایمان ہے یہ عالم ان کے عقیدہ کی رو سے دو طبقوں میں منقسم ہے۔ فوقانی و تحتانی طبقہ فوقانی گنہگار اور بدقسمت روحوں کا ٹھکانا ہے جو ہمیشہ سردی سے ٹھٹھرتی رہتی ہیں اور جنہیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ طبقہ تحتانی کا موسم گرم ہے اور اس میں غذا بافراط میسر آتی ہے۔ یہ طبقہ خوش نصیب روحوں کا مسکن ہے۔ اسکیما متواضع خوش اخلاق ملنسار اور مہمان نواز ہوتے ہیں اور ان کی خاندانی زندگی نہایت اچھی طرح سے بسر ہوتی ہے۔ مساوات جائداد کا اصول عام طور سے ان میں رائج ہے اور ایک جرگہ جو معاش پیدا کرتا ہے ان میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ موجودہ تمدن نے ان کے حال پر اتنی عنایت کی ہے کہ شراب اور دوسرے فواحش کی معرفی ان سے نہیں کرائی اور یہی وجہ ہے کہ اب تک یہ قوم بدستور قائم ہے ورنہ امریکہ اور آسٹریلیا کی قدیم نسلوں کی طرح ان کا بھی کبھی کا صفایا ہو گیا ہوتا۔ مترجم

آٹھواں باب

نزاع درباره معیار حق

فلسفہ قدیمہ کا یہ دعوی ہے کہ انسان کے پاس احقاق حق کا کوئی ذریعہ نہیں۔

قدیم مسیحیوں میں عقائد کے اختلافات۔ کلیسائی کونسلیں ان اختلافات کے مٹانے کی بے سود کوششیں کرتی ہیں۔ حجت معجزہ و محبت ابتلا کی ترویج۔

پاپائے روما طریقہ اعتراف سری کو جاری کرتا ہے اور محکمہ احتساب عقائد کو اپنا آلہ اقتدار بناتا ہے اور اختلافات عقائد کے رفع کرنے کے لئے وحشیانہ مظالم پر اتر آتا ہے۔

قیصر جسٹینین کے مجلہ القوانین کی دریافت اور قانون دیتیہ کے نشوونما کا اثر نوعیت و ماہیت شہادت پر۔ قانون شہادت میں روایت کی شان نمودار ہونے لگتی ہے۔

"اصلاح کینسہ" کی بدولت ہر انسان کو اپنی عقل اور سمجھ کے لحاظ سے رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ کلیسائے رومن کیتھولک دعوی کرتا ہے کہ حق و صدق کا معیار خود کلیسا ہے۔ فہرست کتب محرمہ کے اجرا سے وہ کتابوں کے مطالعہ کی ممانعت کرتا ہے اور حکم امتناعی کی خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع و قمع سینٹ برتھا لوسیو کے قتل عام کے سے ذرائع سے کرتا ہے۔

پراٹسٹنٹ مذہب تورات کو معیار حق تسلیم کرتا ہے۔ تورات کی موثوقیت پر نظر انتقاد ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محرف ہے۔ سائنس کی رو سے معیار حق انکشافات فطرت ہیں۔ پراٹسٹنٹ

کے نزدیک یہ معیار کتب مقدسہ میں موجود ہے اور رومن کیتھولک
کی رائے میں پاپائے معصوم اس کا مورد و مہبط ہے۔

ایک موقع پر جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے صفحہ تاریخ پر بخط جلی لکھے جانے کا استحقاق رکھتا ہے روما کے ایک گورنر نے بیتاب ہو کر یہ سوال کیا کہ حق کسے کہتے ہیں۔ لیکن اس الوہیت مآب شخص نے جو گورنر کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور جس سے یہ استفسار کیا گیا تھا جواب میں کچھ نہ کہا۔ شاید خموشی ہی اس سوال کا بہترین جواب تھی۔

یہ سوال بارہا پہلے بھی کیا گیا تھا لیکن بے فائدہ اور آج تک اس کا اعادہ رہ رہ کر ہو رہا ہے۔ مگر بے سود۔ کسی شخص سے اس کا شافی جواب آج تک بن نہیں پڑا۔

جب افق یونان پر صبح علوم و فنون کی روشنی نمودار ہوئی اور قدیم مذہب کی ظلمت کافور ہونے لگی تو اس ملک کے متقی و پرہیزگار اور فطین و فہیم شخص دماغی یاس کی حالت میں مبتلا ہو گئے۔ انکساغورث فرط حسرت و تاسف سے کہتا ہے "کوئی چیز معلوم نہیں ہو سکتی کسی حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھ سکتا۔ کوئی امر یقینی نہیں ہو سکتا۔ قوائے حسیہ محدود ہیں قوائے عقلیہ کمزور ہیں۔ حیات مستعار قلیل ہے۔" زنوفیز کا دعوی ہے کہ ناممکن ہے کہ ہم حق بات کو بھی یقینی تصور کریں۔ پارمینائڈیز کا قول ہے کہ انسان کی دماغی ساخت ہی ایسی نہیں ہے کہ وہ حق مطلق کی تحقیق کر سکے۔ امپیڈاکلیز کی رائے ہے کہ ضرور ہے کہ کل فلسفہ اور مذاہب ناقابل اعتبار ہوں اس لئے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی معیار نہیں جس سے ہم ان کو جانچ سکیں۔ دی مقراطیس کا بیان ہے کہ حقائق بھی ہمارے ذہن میں تیقن کا القا نہیں کر سکتے۔ انسانی تحقیقات کا انتہائی نتیجہ یہ نکتہ ہے کہ انسان علم مطلق سے روشناس ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا اور اگر حقیقت اس کی مٹھی میں بھی ہو تاہم اس کو اس کی موثوقیت پر یقین نہیں ہو سکتا۔ فیرو ہمیں یہ صلاح دیتا ہے کہ چونکہ ہمارے پاس حق و باطل کا کوئی معیار نہیں ہے اس لئے ہمیں ہر شے کی نسبت اظہار رائے میں تامل کرنا چاہئے۔ اس فیلسوف نے اپنے شاگردوں کو تشکک کی اس حد تک تلقین کی تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم کوئی دعوی نہیں کرتے بلکہ یہ دعوی بھی نہیں کرتے کہ ہم کوئی دعوی نہیں کرتے۔ اپیکورس نے اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیا تھا کہ حق کی تکشف ہرگز عقل کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔ آرسیسیلیس کو معلومات حسیہ و عقلیہ دونوں سے انکار تھا اور اس نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ اسے کسی شے کا علم نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی لاعلمی کا بھی علم نہیں۔ غرض جس عام نتیجہ پر فلسفہ یونان پہنچا تھا وہ یہ تھا چونکہ حواس کی شہادت

نقطہ اتصال نقیضین ہے لہٰذا ہم حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے اور عقل اس درجہ ناقص ہے کہ ہم کسی فلسفیانہ نتیجہ کی صحت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔

قیاس چاہتا ہے کہ ایسے موقع پر ایک ایسا مدلل و مبرہن صحیفہ آسمانی منجانب اللہ انسان پر نازل ہو کہ شک و شبہ کا خاتمہ ہو جائے اور کسی شخص کو اس سے یا رائے اختلاف و مقاومت نہ ہو۔ یونان کے ایک فلسفی نے جس کی مایوسی اپنے ہمصفیروں کی بہ نسبت ذرا کم تھی ایک دفعہ یہ کہنے کی جرات کی تھی کہ دو مختلف الاشکال مذاہب کا ایک ساتھ موجود ہونا اور ملہم من اللہی کا دعوی کرنا دونوں کے بطلان پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادی و مرئی اشیا تک کی نسبت انسان ایک رائے بمشکل قائم کر سکتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ ایک ہی پہلو سے ان اشیاء کو نہ دیکھے پھر مابعد الطبیعیات کا ٹھکانا ہی کیا۔ حضرت مسیح کے ظہور سے تین سو سال پہلے اگر فلسفہ اختلاف و ارتیاب کی جولان گاہ تھا تو آپ کی وفات کے تین سو سال بعد مذہب بھی اسی کشش و پیچ میں مبتلا تھا۔ پائی شیرز کا اسقف ہلاری اپنے مشہور و معروف مضمون میں جو اس نے نائسیا کی کونسل کے انعقاد کے وقت لکھا تھا ایک مقام پر کہتا ہے۔

"یہ واقعہ جس قدر افسوسناک ہے اسی قدر خطرناک بھی ہے کہ لوگوں کی جتنی رائیں ہیں اتنے ہی مذاہب ہیں۔ جتنی خواہشیں ہیں اتنے ہی عقائد ہیں اور جس نسبت سے ان میں عیوب پائے جاتے ہیں اسی نسبت سے ان کے اسباب کفر و الحاد کا شمار ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم من مانے عقائد قائم کر لیتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے ان کی تاویل کر دیتے ہیں۔ ان دیکھے اور ان بوجھے اسرار و رموز کی تاویل و تفسیر کے لئے ہم آئے دن نئے مذہب تراشا کرتے ہیں۔ ہم اپنے کئے پر پچھتاتے ہیں۔ پچھتانے والوں کی حمایت کرتے ہیں جن کی حمایت کرتے ہیں انہیں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ دوسروں کے عقائد کا باوجود ان عقائد کے پیرو ہونے کے ابطال کرتے ہیں اور اپنے عقائد کو بھی باوجودیکہ دوسرے لوگ ان کے پیرو ہیں جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ غرض اسی طرح باہم دست و گریبان ہو کر ہم آپس میں ایک دوسرے کی تخریب و تباہی کا باعث ہو رہے ہیں۔

یہ محض لفظ ہی لفظ نہیں ہیں' بلکہ اس خود ملامتی سے بوئے حقیقت آتی ہے اور وہ اشخاص جو اس زمانہ کی کلیسائی تاریخ سے واقف ہیں۔ اس کا مفہوم پوری طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ جودو کرم اور خیروبرکت کے مسلک ہونے کے لحاظ سے جب مسیحیت کا پہلا جوش فرو ہو گیا تو نزاع و نفاق نے اپنا جھنڈا آ گاڑا۔ مسیحی مورخین کا بیان ہے کہ دوسری صدی

عیسوی کے آغاز کے ساتھ ایمان و عقل مذہب و فلسفہ انتقاد تفلسف میں جنگ چھڑ گئی۔ ان اختلافات و تنازعات کے اندفاع اور احقاق حق کی غرض سے مجالس مشاورت کا انعقاد ہونے لگا جنہوں نے بالاخر مجالس عمومیہ کی شکل اختیار کر لی۔ ایک عرصہ دراز تک ان مجالس کے اقتدارات مشورہ دہی کی حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ لیکن جب چوتھی صدی میں مسیحیت مسند شہنشاہی پر جلوہ افروز ہوئی تو ان مجالس کے احکام کی تعمیل لازمی ہو گئی اور احکام کا نفاذ بزورِ حکومت ہونے لگا۔ اس واقعہ نے کلیسا کی کایا ہی پلٹ دی۔ مجالس عمومیہ یعنی مسیحیت کی پارلیمنٹیں جن میں دنیا بھر کے گرجاؤں کے عہدہ دار بطور ارکان شریک ہوتے تھے شہنشاہ کے حکم سے منعقد ہوتی تھیں۔ وہ اصالتہ برائے نام ان مجالس کی خدمت صدارت انجام دیتا تھا اور امور مابہ النزاع کا تصفیہ کرتا تھا گویا وہ مسیحی دنیا کا پاپا ہوتا تھا۔ مشیم مورخ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تیسی عہدوں میں جاہلوں اور عامیوں کے مامور ہونے کو کوئی چیز مانع نہ آ سکتی تھی۔ وحشی اور بے علم جماعت جو علم و فضل کو عموماً" فلسفہ کو خصوصاً" دشمن زہد و اتقا خیال کرتی تھی بڑھتی جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ نا۔سیا کی کونسل یعنی مجلس عمومی میں جہالت اور بے ربطی خیالات کی جو شان علی الخصوص ان بزرگواروں کی تقریر اور دلائل میں پائی جاتی ہے۔ جنہوں نے اس کونسل کے فیصلہ کو بہ نظر استحسان دیکھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ باوجود اس وسیع اثر کے جو اس کونسل نے مسیحی دنیا پر ڈالا ہے تبصرہ نگاران عہد قدیم کو نہ تو اس بارے میں اتفاق ہے کہ اس کونسل کا انعقاد کب اور کس مقام پر ہوا اور نہ یہی ٹھیک معلوم ہے کہ اس کے ارکان کی تعداد کس قدر تھی اور صدر نشین کونسل کونسا بطریق تھا اس کے مشہور و معروف فیصلہ جات کو سپرد قلم کرنے کی زحمت تک گوارا نہ کی گئی یا اگر کی بھی گئی ہو تو وہ روئداد بہ ضبط تحریر ہم تک نہیں پہنچی۔ زمانہ حال کے مدبرین کی اصطلاح میں کلیسا نے اس زمانہ میں جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ "ریاستہائے جمہوری متحدہ" کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کونسل کے فیصلہ کا انحصار کثرت رائے پر ہوتا تھا اور اس کے لئے ہر طرح کی سازشیں اور افتراپردازیاں اور دغابازیاں عمل میں لائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ دربار شاہی کی خواتین کے رسوخ بلکہ ارتشا بلکہ دھینگا مشتی تک سے کام لیا جاتا تھا۔ نا۔سیا کی کونسل کو حیزالتوا میں پڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان سب لوگوں نے جنہیں کسی کی رو و رعایت مدنظر نہ تھی بالاتفاق یہی رائے قائم کی کہ مذہبی معاملات میں معیار حق و صدق قائم کرنا اس قسم کی مجلسوں کے بس کا روگ نہیں۔ فریق مغلوب کو کوئی حق ایسا حاصل نہ تھا جس کا

فریق غالب کو پاس ہو۔ بہت سے نیک نفس اور راست کردار اشخاص نے جب یہ عذر پیش کیا کہ ایسی کثرت رائے جس میں ان وکلا کی آرا کا عنصر غالب شریک ہو جن کا حق رائے دہندگی مسلم نہ ہو کسی طرح حق مطلق کا ذریعہ تعین نہیں ہو سکتا تو ان کے عذر کو بحقارت نظرانداز کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کونسل پر کونسل منعقد ہونے لگی جن کے متباین اور متناقض نے مسیحی دنیا کو حیران و پریشان کر دیا۔ ایک فقط چوتھی ہی صدی میں تیرہ کونسلیں ایریس کے مخالف پندرہ کونسلیں اس کے موافق اور سترہ کونسلیں ان لوگوں کی تائید میں منعقد ہوئیں جن کے عقائد ایریس سے ملتے جلتے تھے۔ گویا کل پینتالیس کونسلوں کا انعقاد اس ایک مسئلہ کے تصفیہ کی غرض سے ہوا۔ ان کونسلوں کے اراکین کے طرز عمل پر یہ واقعہ روشنی ڈالتا ہے کہ جس قوت کا فریق غالب نے بیجا استعمال کیا تھا اسی سے فریق مغلوب بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔

جس مورخ کی بے تعصبانہ تحریر سے ہم نے اوپر انتقاط کیا ہے اسی کا یہ بھی بیان ہے کہ چوتھی صدی میں عیسائی دوبلا کی سنگین غلطیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اول یہ کہ دھوکا دینا اور جھوٹ بولنا داخل حسنات ہے بشرطیکہ اس سے کلیسا کی اغراض کو کوئی فائدہ پہنچے دوم یہ کہ اگر کافی سرزنش اور زجروتوبیخ کے بعد بھی کوئی شخص اپنی مذہبی لغزشوں پر اڑا رہے تو وہ مستوجب سزائے قانونی و عقوبت جسمانی ہے۔

جب ہم ان امور پر جنہیں عوام اس زمانہ میں معیار حق سمجھتے تھے نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بے اختیار تعجب ہوتا ہے۔ کسی مسئلہ کی حقیقت کی سب سے بڑی دلیل ان شہدا کی تعداد ہوتی تھی جنہوں نے اسے سچ مانا ہو یا وہ معجزے یا کراماتیں اس کی صحت پر گواہ ہوتی تھیں۔ جو اس کی تائید میں پیش کی جا سکیں یا ارواح خبیثہ یا مجانین یا اشخاص آسیب زدہ کا اقبال اس کی سچائی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سینٹ امبروز کو جب کبھی پیروان ایریس سے مناظرہ کا اتفاق ہوا تو ان بزرگوار نے جھٹ سے آسیب زدہ اشخاص کو پیش فرما دیا۔ جنہوں نے بعض مسیحی شہدا کے تبرکات کی صورت دیکھتے ہی یہ پکارنا شروع کیا کہ نائیسیا کی کونسل کا مسئلہ اقانیم ثلثہ برحق ہے۔ لیکن پیروان ایرئس بھی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ انہوں نے سینٹ امبروز پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ان خبیث گواہوں کو بہت بڑی رشوت دے کر جھوٹی شہادت دینے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ عدالتیں بھی اس زمانہ میں قائم ہو چلی تھیں جن میں ابتلا کا طریقہ جاری کیا گیا تھا۔ یعنی ملزم کے خطاوار یا بے خطا ہونے کا فیصلہ اسے انواع و اقسام کی جسمانی آزمائشوں میں ڈال کر نتیجہ کے لحاظ سے منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔

چھ صدی تک یہ عدالتیں ملزم کی گنہگاری یا بے گناہی کا ثبوت آب سرد۔ مبارزت۔ جلتی آگ اور صلیب کے گوناگوں ذرائع تحقیقات سے دیتی رہیں۔

شہادت کی ماہیت اور اس کے قوانین کے متعلق اس جہالت اور لاعلمی کی بھی کوئی حد ہے ملزم پانی کے تالاب میں پھینک دیا جاتا ہے اور وہ یا تو ڈوب جاتا ہے یا تیرنے لگتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ جلتی ہوئی لوہے کی ایک سلاخ تھما دی جاتی ہے جس سے وہ یا تو جل جاتا ہے یا بچ رہتا ہے۔ جس مبازر کو اس نے اجرت دے کر اپنی طرف سے لڑنے کے لئے منتخب کیا ہے وہ یا تو مغلوب ہو جاتا ہے یا غالب آتا ہے۔ وہ اپنے بازوؤں کو صلیب کی شکل میں اس شخص کی بہ نسبت جس نے اس پر الزام لگایا ہے کم دیر تک پھیلائے ہوئے رکھ سکتا ہے یا زیادہ دیر تک۔ لیکن انہیں آزمائشوں کے نتائج کے لحاظ سے کسی علت منسوبہ کے متعلق اس کی قصورواری یا بے قصوری مسلم قرار پاتی ہے۔ کیا یہی طریقے معیار حق و راستی ہو سکتے ہیں؟

ایسی حالت میں مقام تعجب نہیں کہ یورپ میں صدہا سال تک جھوٹی کرامتوں کا بازار گرم رہا اور یہ وہ کرامات ہیں جو انسان کی عقل و تمیز کے لئے باعث ننگ و عار ہیں۔

لیکن وہ دن جو نہ ٹل سکتا تھا آخر آ پہنچا۔ وہ ادعا اور وہ عقائد جو اس قسم کی نامعقول شہادت پر مبنی تھے اس بے اعتباری کی خاک میں مل گئے جس کا پیوند خود یہ شہادت ہو چکی تھی۔ جب تیرہویں صدی شروع ہوئی تو چاروں طرف تشکک اور بداعتقادی کی ہوا چلنے لگی۔ اول اول اس بداعتقادی سے پادریوں کا طبقہ متاثر ہوا اور اس کے بعد یہ بہ سرعت تمام عوام الناس میں پھیل گئی۔ پادریوں نے اپنے تشکک کی بھڑاس "انجیل لازوال" کی سی کتابوں کی تصنیف کر کے نکالی اور عوام الناس "کیتھرسٹ" "وللنسیز" اور "پٹروبرشن" کے سے فرقوں میں متفرع ہو گئے۔ ان سب کو اس امر میں اتفاق تھا کہ مذہب مسلمہ و مروجہ اغلاط و اوہام کا ایک مجموعہ بے ربط ہے۔ پاپا نے عیسائیوں پر جو جبری حکومت قائم رکھی تھی وہ ناجائز اور ظالمانہ ہے اور روما کا یہ دعوی کہ پاپائے روما دنیا کا احکم الحاکمین ہے اور کسی بادشاہ یا قیسں یا دینی و دنیوی حکمران کو کوئی جائز مذہبی یا سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ پاپا ہی کا عطا کیا ہوا نہ ہو بالکل بے بنیاد اور حقوق انسان کے لئے بمنزلہ غاصبانہ و دستبرد کے ہے۔

بیدینی کے اس سیلاب کی روک تھام کے لئے پاپائے روما کی حکومت نے دو محکمے قائم کئے۔ (۱) انکوئزیشن "یعنی محکمہ احتساب عقائد اور (۲) محکمہ اعتراف سری ثانی الذکر تفتیش

اور سراغ برآری کا ذریعہ تھا اور اول الذکر سزا دہی کا۔

عام الفاظ میں "انکویزیشن" کا مقصد یہ تھا کہ تخویف و ترہیب کے ذریعہ سے مذہبی اختلافات کا استیصال کیا جائے اور بدعت و زندقہ کو نہایت خوفناک سزاؤں کے تصور سے وابستہ کر دیا جائے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ ارباب "انکویزیشن" ہی کو بدعت و زندقہ کی تعریف و تعیین کا اختیار حاصل ہو۔ اس طور پر معیار حق محکمہ "انکویزیشن" کے ہاتھ آ گیا اور پاپا کی طرف سے یہ محکمہ مجاز کیا گیا کہ "ان ملاحدہ و زندقہ کی نسبت بعد سراغ برآری تجویز مناسب صادر کرے جو شہروں مکانوں تہ خانوں جنگلوں غاروں اور کھیتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔"

اغراض مذہبی کے تحفظ کی اس خدمت کی انجام دہی میں اس محکمہ نے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ ۱۴۸۱ء سے لیکر ۱۸۰۸ء تک اس نے تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں اور اشخاص سزایاب میں سے تقریباً بتیس ہزار نفوس زندہ جلا دیئے گئے اول اول جب علامہ خلائق کو اس کی وحشیانہ سزاؤں کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی جرات اور مجال نہ تھی تو بسا اوقات ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ امرا اہل قلم قسیس راہب اور ہر طبقہ کے عوام الناس الزام عائد ہوتے ہی بلا اس کے کہ انہیں اپیل کا موقع دیا جائے اسی دن مار ڈالے جاتے تھے ارباب فکر و دانش کی جدھر نظر پڑتی تھی انہیں بھیانک اور ڈراؤنی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کوئی شخص بلاخوف سزایابی آزادانہ رائے کے اظہار پر قادر نہ تھا۔ "انکویزیشن" کا طرز عمل ایسا خوفناک اور مہیب تھا کہ پکلیا ریسائی کا یہ فقرہ ہزارہا نفوس کی صدے بازگشت بن گیا تھا۔ "ممکن نہیں کہ کوئی شخص مسیحی ہو اور اطمینان سے اپنی موت مرے۔"

"انکویزیشن" نے جنوبی فرانس کے عیسائی فرقوں کا تیرھویں ہی صدی میں خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کی غدارانہ سفاکی نے اٹلی اور اسپین میں پرالسٹنٹ مذہب کو بیخ دین سے اکھاڑ پھینکا۔ مذہبی امور کے علاوہ اس نے پولیٹکل شورش کے فرو کرنے کی خدمت بھی خود ہی انجام دینی شروع کی۔ نکولس ایمیرک جو حکومت اریگان کا پچاس سال تک صدر محتسب رہا اور جس کا انتقال ۱۳۹۹ء میں ہوا۔ اپنی کتاب "روئیداد محکمہ احتساب عقائد" میں اس محکمہ کے ہیبت انگیز اور کپکپا دینے والے مظالم کی داستان قلم بند کر گیا ہے۔

یہ محکمہ جو مسیحیت بلکہ بنی نوع انسان کے لئے موجب ننگ و عار ہے۔ مختلف ممالک میں مختلف حیثیتوں سے قائم تھا پاپائے روما نے اس کے جابرانہ اور مطلق العنان اختیارات

قائم رکھ کر بالآخر قدیم تسیسی محکمہ جات احتساب کو موقوف کر دیا اور وہ اختیارات جو ہر اسقف کو بزمانہ سابق اس بارہ میں حاصل تھے چھین کر اپنے اقتدارات میں ضم کر لئے۔ اس طرح محکمہ "انکوئزیشن" براہ راست پاپا کی ماتحتی میں آ گیا اور پاپا ہی کے کارندے اور گماشتے اس کو چلانے لگے۔

چوتھی لیٹرن کونسل ۱۲۱۵ء کے فیصلہ نے "انکوئزیشن" کے قتدارات میں ایک خوفناک اضافہ کر دیا یعنی یہ بات ہر شخص کے فرائض میں باضابطہ طور پر داخل کر دی گئی کہ اپنے حلقہ کے پادری کے سامنے اپنے تمام افعال و اعمال کا اعتراف کیا کرے۔ اس کا نام طریقہ اعتراف سری ہے۔ اس طریقہ کی بدولت جس حد تک کہ خانگی زندگی کو تعلق تھا محکمہ "انکوئزیشن" ہمہ بین و ہمہ دان ہو گیا۔ کوئی شخص اپنے آپ کو مامون و مصئون نہ تصور کر سکتا تھا۔ حلقہ کے پادری کو یہ قدرت حاصل تھی کہ اس کی بی بی یا ملازموں کے خفیہ سے خفیہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ دلی راز بہ طریقہ جرح یا بر سبیل جبر دریافت کرے اور اس لحاظ سے بی بی اپنے خاوند اور نوکر اپنے آقا کے گویا جاسوس بنا دیئے گئے تھے۔ اس خوفناک عدالت کے سامنے وہ پکڑ بلایا جاتا تھا اور اس سے صرف اسی قدر کہا جاتا تھا کہ کلیسا کو تمہارے عقائد نہایت مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔ کسی الزام لگانے والے کا نام ملزم کو نہیں بتایا جاتا تھا بلکہ یہ کمی انگوٹھے کو پچی کرنے والے پیچ۔ بدن کو تاننے والے رسے۔ پاؤں کی ہڈیوں کو چورا چورا کرنے والے بوٹ۔ انگلیوں کو توڑنے والے فانے اور دوسرے عقوبت آفرین شکنجوں سے بہت جلد پوری کر دی جاتی تھی اور خواہ وہ معصوم ہوتا تھا خواہ خاطی ہر حالت میں اسے جرم کا اعتراف کرتے ہی بنتی تھی۔

لیکن باوجود ان تمام اقتدارات کے "انکوئزیشن" کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب ملاحدہ و زنادقہ اس کی تاب نہ لا سکتے تھے تو اس سے بچنے کے لئے سو سو طرح کے حیلے نکالتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تشکک اور بداعتقادی کا تمام یورپ میں چپکے چپکے عمل دخل ہو گیا۔ لوگ ذات باری تعالے۔ بقائے روح انسانی اور اختیار ارادہ بشری کے منکر ہو گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ انسان جبر مطلق کی مدافعت نہیں کر سکتا اور ان مقدرات سے جن کا دل ہا دل اس کے چاروں طرف چھایا ہوا ہے کسی طرح گریز نہیں۔ اس قسم کے خیالات خموشی کے ساتھ ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے دلوں میں گھر کر گئے جو تسیسیت کے مظالم سے تنگ آ کر مجبور تھے کہ اس مایوسانہ تخیل کی آڑ میں پناہ لیں۔ "ولڈ نسیر" فرقہ کے پیرو باوجود ان انواع و اقسام کی سختیوں کے جو ان کی بیخ کنی کے لئے عمل میں لائی گئیں اس خیال کی

اشاعت میں کامیاب ہو کر رہے کہ کلیسائے روما قسطنطین کے عہد کی پاکیزگی اور تقدس سے کوسوں دور جا پڑا ہے۔ انہوں نے تذکرہ غفران کی فروخت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی اور یہ ظاہر کیا کہ اس ذریعہ مغفرت نے دعا روزہ اور خیرات کا تقریباً" خاتمہ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مرے ہوؤں کی روحوں کے لئے دعائے مغفرت کرنا ایک فعل عبث ہے اس لئے کہ وہ بہشت و دوزخ میں پہلے ہی داخل ہو چکے ہوں گے۔ اگرچہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ فلسفہ یا سائنس مسیحیت یعنی اتقائے خالص کی اغراض کے منافی ہے پھر بھی اسلامی تصانیف جو اس زمانہ میں اندلس میں رائج تھیں ہر طبقہ کے لوگوں کے عقائد پر اپنا زبردست اثر ڈال رہی تھیں۔ یہ اثرات ہم کو ان فرقوں میں صاف صاف نظر آتے ہیں جو اس زمانہ میں قائم ہو چلے تھے چنانچہ فرقہ "ابناء بنات حریت" کا یہ عقیدہ تھا کہ "کائنات کا خروج ذات باری تعالے سے ہوا ہے اور بالاخر اسی ذات میں اس کا انضمام ہو جائے گا۔ نفوس ناطقہ انسانی جناب باری کے اجزا ہیں اور کائنات ہی بحیثیت مجموعی خدا ہے۔ یہ وہ خیالات ہیں جو بجز ترقی یافتہ دماغوں کے اور کہیں نہیں سما سکتے۔ اس فرقہ کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے اکثر خوشی خوشی "انکوئزیشن" کی آگ میں جل گئے مگر زبان پر اف اور ماتھے پر بل تک نہ لائے پادریوں نے ازراہ عناد اس فرقہ پر یہ الزام لگا کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیا کہ آدھی رات کے وقت اس فرقہ کی عورتیں اور مرد برہنہ ہو کر تاریک کمروں میں جاتے ہیں اور وہاں حظ نفسانی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں" اسی قسم کے الزام جیسا کہ ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہے روما کی رنگین مزاج سوسائٹی نے قدیم مسیحیوں پر بھی لگایا تھا۔

ابن رشد کے فلسفہ کا اثر ان فرقوں میں سے اکثر کے عقائد میں صاف نظر آتا تھا۔ مسیحی نقطہ نظر سے اس اسلامی مسلک کا لازمی نتیجہ یہ زندیقانہ عقیدہ تھا کہ ارکان مسیحیت کا حاصل بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ روح انسانی ذات باری تعالی میں واصل ہو جائے۔ خدا اور کائنات کو آپس میں وہی تعلق ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ہے۔ صرف ایک عقل واحد و منفرد کا عالم میں وجود ہے اور بنی نوع انسان کی روحانی و عقلی مستعدی کی ذمہ دار ایک ہی روح ہے۔ جب اصلاح کنیسہ کا زمانہ قریب آیا اور "انکوئزیشن" کے معیطروں نے ابن رشد کے اطالوی پیروؤں کے عقائد کی تفتیش شروع کی تو انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ فلسفیانہ اور مذہبی حقیقت میں ایک بون بعید ہے۔ ممکن ہے کہ ایک بات ازروئے فلسفہ برحق ہو لیکن ازروئے مذہب باطل ہو۔ یہ وہ تمریری حیلہ تھا جسے "لیٹرن کونسل" نے

پاپائے لیودہم کے زمانہ میں ناجائز قرار دیا۔
لیکن باوجود اعتراف سری و احتساب عقائد کے یہ بد عتیانہ رجحان بدستور قائم رہے۔ اس قول کی صداقت میں شک نہیں کہ اصلاح کینسہ کے وقت یورپ کے مختلف مقامات میں ایسے بہت سے لوگ چھپے ہوئے تھے جنہیں مسیحیت سے قلبی عداوت تھی۔ ان خانہ براندازان مذہب میں پامپونیٹیس کی طرح اکثر تو پیروان ارسطو تھے۔ باڈن وبلیس اور مانٹین کے مانند بہت سے فلاسفہ اور بذلہ سنج نکتہ دان تھے اور لیودہم بمبو اور برونو کے مثل بہت سے آزادخیال اطالوی تھے۔
کراماتی شہادت گیارھویں اور بارھویں صدی میں پایہ اعتبار سے ساقط ہو چلی۔ اندلس کے مسلمان فلاسفہ کے مطاعن و مضاحک سے متاثر ہو کر بہت سے روشن خیال پادری قائل ہو گئے کہ اس قسم کی شہادت کی حقیقت ایک خیال ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں۔ ۱۱۰۳ء میں بہ مقام امالفی جسٹینین کے مجلۃ القوانین کا مکمل نسخہ برآمد ہوا جس نے لوگوں کے دلوں میں علم اصول قانون روما کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا اور قانونی یا فلسفیانہ شہادت کی نوعیت کے متعلق لوگوں کی معلومات زیادہ وسیع ہو گئیں۔ ہیلم نے اس نسخہ کے برآمد ہونے کے مشہور و معروف واقعہ کو کسی قدر شبہ کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن اس امر کا اس کو بھی اعتراف ہے کہ فلارنس کے کتب خانہ "لارنشین" میں جو نسخہ مجلۃ القوانین کا موجود ہے صرف ایک وہی ایسا نسخہ ہے جو پوری پچاسوں جلدوں پر متضمن ہے۔ غرض مجلۃ القوانین کی دریافت کے بیس سال بعد گرشین نامی ایک راہب نے مختلف پاپاؤں کے فرامین۔ کونسلوں کے فیصلہ جات بزرگان و علمائے کلیسا کے ملفوظات ایک کتاب میں جس کا نام "ڈیکریٹم" (فتاوی) ہے جمع کئے۔ چنانچہ یہ کتاب قانون دینیہ پر سب سے زیادہ قدیم تصنیف ہے۔ اس کے بعد کی صدی میں پاپائے گریگوری نہم نے "ڈیکرٹیل" (کتاب الاوامر) پانچ حصوں میں شائع کی اور بانیفیس ہشتم نے ان پر ایک حصہ کا اور اضافہ کیا۔ اس کے بعد گریگوری سیزدہم نے "کلیمنٹاین کانسٹیٹوشنز" (دساتیر کلیمنٹ) کتاب الاوامر کی ساتویں جلد اور "اے بک آف انسٹیٹوشنز" (کتاب الآئین) کو ایک جگہ جمع کر کے کارپس جیورس کینانیسائی" (مجموعہ قوانین دینیہ) کے نام سے ۱۵۸۰ء میں شائع کیا۔ قانون شرعی کو وصیت نامجات ولایت یتامیٰ نکاح اور طلاق پر قابو پانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ بہت بڑا اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔
کراماتی شہادت کے انکار اور اس کے بجائے قانونی شہادت کے قیام سے اصلاح کینسہ

کی ساعت بہت قریب آگئی۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ کنٹربری کے لاٹ پادری انسلم کا مقرر کیا ہوا یہ قاعدہ مسیحی دنیا میں نافذ تھا کہ ہم کو پہلے بے سوچ سمجھے بے دیکھے بھالے یقین کر لینا چاہئے اس کے بعد ہمیں اختیار ہے کہ اپنے یقین کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس قاعدہ پر اس وقت عمل درآمد ہونا ممکن نہ تھا۔ کجیٹن نے لوتھر سے کہا تھا کہ تجھ کو اس بات پر ایمان لانا چاہئے کہ یسوع مسیح کے خون کا ایک قطرہ کل بنی نوع انسان کے کفارہ ذنوب کے لئے کافی ہے۔ باقی جس قدر خون باغ میں اور صلیب پر گرا وہ پاپائے روما کو ترکہ میں ملا تاکہ اس نجات کی روشنائی سے تذکرات الغفران لکھے جا سکیں۔ اگر اگلا سا زمانہ ہوتا تو لوتھر کو اس قول کی صداقت کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہ ہوتا۔ مگر اب آزادی خیال کی ہوا چلنے لگی تھی۔ اور بزم دماغ میں شمع دانش جلنے لگی تھی۔ کجیٹن کی ہرزہ سرائی کو اس دلیر جرمن راہب نے استحقارو استکراہ کی نظر سے دیکھا اور اگر کجیٹن اپنے دعوے کی تائید میں ہزار معجزے اور کرامتیں بھی پیش کرتا تب بھی وہ اس کو تسلیم نہ کرتا۔ معصیت پر خط عفو کھینچنے کے لئے تذکرۃ الغفران کی فروخت کے ناپاک اور شرمناک طریقہ کی ابتدا ان اساقف نے کی تھی جنہیں اپنی اوباشیوں اور عیاشیوں کے لئے جب اور کسی طریقہ سے روپیہ نہ ملتا تھا تو مسیح کے گلے کی کالی بھیڑوں کے ہاتھ پروانہ مغفرت ہی بیچ بیچ کر روپیہ وصول کرتے تھے جن قسیسوں اور راہبوں کو اس سودمند تجارت سے ہاتھ رنگنے کی ممانعت تھی وہ تبرکات ہی کے جلوس نکال کر اپنی جیبیں بھرتے تھے یعنی جو شخص بغرض حصول ثواب ان تبرکات کو چھونا چاہتا تھا اس سے ایک خاص رقم بطور نذرانہ رکھوا لیتے تھے۔ حضرت پاپا کا مالی قافیہ بہت تنگ ہوا اور آپ نے دیکھا کہ تذکرات الغفران کے بیوپار میں بہت بڑا فائدہ ہے تو آپ نے اساقف کو حق تذکرہ فروشی سے محروم کر کے اس حق کا استعمال اپنی ذات کے لئے مخصوص کر دیا اور اپنے گماشتے اور کارندے تذکرہ فروشی کے لئے جابجا مقرر کر دئے۔ اس گماشتگی اور کارندگی کے لئے زیادہ تر گدائی پیشہ طبقوں کے راہبوں کا انتخاب ہوتا تھا۔ ان طبقوں میں مسابقت اور رقابت کا بازار بہت جلد گرم ہو گیا۔ ہر طبقہ فخریہ اعلان کرتا تھا کہ چونکہ ہمارا اثر آسمانی دربار میں زیادہ ہے اور مقدس مریم عذرا اور دوسرے اولیائے کرام کی جناب میں ہمیں زیادہ تقرب حاصل ہے اس لئے ہمارے تذکرے عفو و غفران کا زیادہ موثر ذریعہ ہیں۔ خود لوتھر پر جس کا تعلق طبقہ آگسٹائن کے راہبوں سے تھا یہ بہتان باندھا گیا کہ جب ۱۵۱۷ء میں پاپائے لیودہم اسی ذریعہ سے سینٹ پیٹر کے گرجا کی تعمیر کے لئے روپیہ جمع کر رہا تھا تو بجائے اس کے کہ بخشش کے

پروانوں کی فروخت کا ٹھیکہ لوتھر کی برادری کو دیا جاتا ڈامنیکن فرقہ کے راہبوں کو دے دیا گیا۔ جس کی وجہ سے لوتھر نے ناراض ہو کر کلیسا سے قطع تعلق کر لیا۔ "اصلاح" کے ابتدائی ایام میں خود لیو بھی اس الزام کو صحیح تصور کرتا تھا۔

اس طور پر واقعہ "اصلاح" کی فوری محرک فروخت تذکرات الغفران ہوئی لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ سبب اصلی بھی جو اس کشمکش کی روح و رواں تھا ظاہر ہو گیا۔ حقیقی بحث جس پر اس تمام جدوجہد کا دارومدار تھا یہ تھی کہ آیا انجیل کی حقیقت کا دارومدار کلیسا پر ہے یا کلیسا کی حقیقت کا دارومدار انجیل پر ہے؟ بالفاظ دیگر معیار حق کا ماخذ ہے تو کونسا ہے؟

واقعہ اصلاح کنیسہ کی مشہور و معروف جزئیات اور ان خونریز لڑائیوں کی تفصیل جو اس کی وجہ سے یورپ میں مدتوں چھڑی رہیں۔ ہم اس مقام پر سپرد قلم کرنا ضروری نہیں خیال کرتے لوتھر کا وٹمبرگ[؟] کے گرجا کے دروازے پر ۹۵ مسائل نصب کرنا اور اس جرم کی جواب دہی کے لئے روما میں طلب کیا جانا۔ اس کا پاپا کو یہ لکھ بھیجنا کہ آپ اس وقت حقیقت حال سے خالی الذہن ہیں جب آپ کو پوری کیفیت معلوم ہو گی تو جو جرم مجھ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ جرم نہ رہے گا بلکہ ایک حقیقت نفس الامری سمجھا جائے گا۔ اس پر بدعت اور زندقہ کا الزام لگایا جانا اور اس کا ایک عام کونسل میں اپیل دائر کرنا۔ مسائل مطہر۔ عشائے ربانی۔ اعتراف سری و غفران ذنوب کی پیچ در پیچ بحثوں میں سے اصلی بحث یعنی ذاتی رائے کے اظہار کے استحقاق کا چھٹ کر نکل آنا۔ ۱۵۲۰ء میں لوتھر کا مسیحی جماعت سے خارج کیا جانا اور اس کے جواب میں اس کا فرمان اخراج اور نیز مجموعہ خواتین دینیہ کو یہ کہہ کر کہ اس کا مقصد بجز ملکی و دیوانی اقتدارات کے استیصال اور پاپائے روما کی شوکت و سطوت کے اعتلا کے اور کچھ نہیں جلا ڈالنا۔ اس دانشمندانہ حیلے سے اس کا جرمنی کے متعدد رئیسوں کو اپنا ہم خیال بنا لینا۔ مجلس شاہی میں جو بمقام ورمس منعقد ہوئی اس کا طلب کیا جانا اور اپنے عقائد سے تائب نہ ہونا۔ ورٹبرگ کے قلعہ میں اس کا کچھ مدت کے لئے روپوش ہونا اور اس عرصہ میں اس کے عقائد کا اطراف و اکناف ملک میں پھیلنا اور سوئٹزرلینڈ میں زوئنگلی کی کوششوں سے اصلاح کنیسہ کی ایک جداگانہ تحریک کا بارور ہونا۔ تحلیل طل و تشعیث نحل کے اس اصول کا جو تحریک اصلاح میں مضمر تھا اہل جرمنی و سوئٹزرلینڈ کی باہمی رقابت کا باعث قرار پانا۔ بلکہ سوئٹزرلینڈ میں زوئنگلی اور کیلون کی سرکردگی سے دو مخالف گروہ پیدا کر دینا۔ ماربرگ' اسپائرس اور آگسبرگ کی مجلسوں کا ان

اختلافات و نزاعات کے مٹانے کی کوشش میں ناکام رہنا اور مصلحان جرمنی کا بمقام اسمال کالڈسیاسی اتحاد قائم کر کے اصلاح کو سیاسی رنگ میں رنگ دینا۔ پیروان لوتھر و پیروان کیلون کی باہمی نزاعات سے روما کو اپنے نقصانات کی تلافی کی امید بندھنا۔ یہ تمام واقعات ایسے ہیں جن کی جزئیات کا اعادہ اس مقام پر غیر ضروری ہے۔

لیو کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ لوتھر کی پیدا کی ہوئی تحریک فروخت تذکرات الغفران کے منافع کی بابت چند شوریدہ سر اور دنیادار پادریوں کا جھگڑا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں بہت زیادہ اندیشہ ناک اور نتیجہ خیز اسباب چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس نے پوری پاپائی قوت کو باغی جماعت کی سرکوبی پر صرف کرنا شروع کیا۔ پاپائے روما کے اس جوڑ توڑ نے وہ خوفناک اور تباہ کن لڑائیاں چھڑوائیں جنہوں نے سالہا سال تک یورپ میں قتل و خونریزی کا ہنگامہ بپا کئے رکھا اور مسیحی اقوام میں ان عداوتوں کا بیج بو دیا جن کو نہ عہدنامہ وسٹفیلیا مٹا سکا اور نہ ٹرنٹ کی کونسل ہی باوجود اٹھارہ سال کے مسلسل بحث و مباحثہ اور افہام و تفہیم کے فرد کر سکی۔ واقعہ سینٹ برتھالومیو ۱۵۷۲ء نے جس میں فرانسیسی پراٹسٹنٹوں کا قتل عام ہوا یورپ بھر کو مبہوت و سراسیمہ کر دیا اور کیا پراٹسٹنٹ کیا رومن کیتھولک سب کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ غدارانہ بدعہدی اور وحشیانہ خونریزی کے لحاظ سے یہ واقعہ تاریخ عالم میں اپنی مثال آپ ہے[۵۵]۔

پاپائے روما نے مخالفین کی بیخ کنی کے لئے سبھی طرح کے جتن کئے۔ خانہ جنگیوں کی آگ بھڑکانے کے لئے ہیزم کشی کی۔ قتل عام کرا دیے۔ اہل خلاف کو چن چن کر مروا ڈالا لیکن ان مایوسانہ کوششوں سے کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ٹرنٹ کی کونسل کی جدوجہد بھی بیکار گئی۔ اس کونسل کے انعقاد کا منشا بظاہر اگرچہ یہ تھا کہ کلیسائے عیسوی کے عقائد کی اصلاح و توضیح و تحکیم و تعین کرنے اور احیاء تادیب سے پیشوایان دین عیسوی کی اخلاقی اور علمی حالت کو سدھارے لیکن ارکان کونسل کے انتخاب میں یہ چالاکی کی گئی تھی کہ عنصر غالب اطالوی اور اس لحاظ سے پاپا کے زیراثر تھا۔ اسی لئے ممکن نہ تھا کہ پراٹسٹنٹ فرقہ اس کونسل کے فیصلوں پر کاربند ہو۔

اصلاح کنندہ کا لب لباب یہ مسئلہ تھا کہ بائبل ہر مسیحی المذہب شخص کی ہدایت کے لئے کافی و مکتفی ہے اور یہی مسئلہ تمام پراٹسٹنٹ کلیساؤں کے مسلمات میں داخل ہو گیا۔ روایت کی بنا منہدم ہو گئی اور یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ ہر شخص کو بذات خود مذہبی معاملات میں رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ غرض یہ خیال عام طور پر پھیل گیا کہ حق و باطل

میں تمیز کرنے کا رستہ آخر انسان کے لئے کھل گیا ہے۔

کتب مقدسہ سے استہداد و استناد کرنے کا جو اصول اس طور پر قائم کیا گیا اس کا تعلق خالص مذہبی یا اخلاقی معاملات ہی سے نہ تھا بلکہ فلسفیانہ حقائق کا انکشاف اور رموز فطرت کا انکشاف بھی اسی اصول کی حد عمل میں داخل تھا۔ بہت سے لوگ تو اس بارے میں اسپیفینس کے نقش قدم پر چلے جس نے بزمانہ قدیم یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بائبل میں معدنیات کے بھی تمام اصول و فروع شامل ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اہل اصلاح کسی علم کو رواداری کی نظر سے نہ دیکھ سکتے تھے جو کتاب پیدائش کے ساتھ تطابق کلی نہ رکھتا ہو۔ ان میں سے اکثر بزرگواروں کی یہ رائے تھی کہ اتقاو دینداری علم و حکمت سے جدا ہوئے بغیر کبھی سرسبز نہیں ہو سکتی۔ ٹرٹلین اور سینٹ آگسٹائن کا یہ قدیم مہلک اصول موضوعہ کہ بائبل ان تمام معلومات کا مجموعہ اور خلاصہ ہے جو انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں یا اسے فائدہ پہنچا سکتی ہیں ابھی تک سختی کے ساتھ قائم تھا۔ لوتھر اور ملنکتھان نے جو اصلاح کینسہ کے بانی مبانی تھے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ فلسفہ کو کلیسا کی سرحد سے خارج کر دیا جائے۔ لوتھر کا بیان تھا کہ ارسطو کی تصانیف کا مطالعہ بے سود محض ہے۔ ارسطو پر سب و شتم کا اس نے جو جھاڑ باندھا ہے وہ صنعت تبرا کی ایک انوکھی صنف سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس ضمن میں یوں گر افشانی فرمائی ہے۔ "اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ ملعون ابدی و شقی ازلی یعنی ارسطو بڑا خناس ہے۔ افترا پردازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ خیثانہ ہزرہ سرائی کے فن کا موجد ہے۔ سرگردہ شیاطین ہے۔ فلسفہ کا ایک حرف نہیں جانتا۔ جھوٹا ہے۔ فریبی ہے۔ دغاباز ہے۔ بھتنا ہے۔ بکرا ہے۔ نفس پرست ہے۔ عیاش ہے۔" فلاسفہ طریقہ مشائیہ لوتھر کے نزدیک "ٹڈیاں ہیں۔ رینگنے والے کیڑے ہیں۔ مینڈک ہیں۔ جوئیں ہیں۔" ان فلاسفہ کو وہ جس نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ اگرچہ کیلوں نے ان خیالات کا بوضاحت اعادہ نہیں کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ بھی اس بارے میں لوتھر ہی کا ہمصفیر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ اصلاح کا سائنس کے سر پر ذرا سا بھی احسان نہیں ہے۔ سائنس کو ابھی ایک بہت کڑی منزل کا سامنا تھا۔ یعنی وہ اپنے پاؤں تو رات کی اس چادر کے مطابق پھیلانے پر ابھی تک مجبور تھا جو طول میں پروکرسٹیز کے ضرب المثل والے فولادی پلنگ سے کم نہ تھی نہ۔"

مسیحیت کی تاریخ میں سب سے زیادہ نامبارک وہ دن ہے جب کہ اس نے اپنے آپ کو سائنس سے علیحدہ کر لیا۔ اس نے آریجن کو جو اس زمانہ ۲۳۱ء میں کلیسا کی طرف سے

سائنس کا بہت بڑا وکیل اور سرپرست تھا مجبور کیا کہ اسکندریہ چھوڑ کر قیصریہ چلا جائے۔ اس کے بعد پیشوایان دین عیسوی صدہا سال تک اس کوشش میں مصروف رہے کہ حقیقت اشیا کی تاویل بذریعہ آیات انجیل کریں لیکن اس کوشش میں جو ناکامیاں انہیں نصیب ہوئیں ان کی پردہ دری تیسری سے لیکر سولھویں صدی تک کی تاریخ عالم کر رہی ہے۔ قرون متوسطہ کی ظلمت کا باعث یہی مہلک طرز عمل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس تاریکی میں ہمیں کہیں کہیں روشنی کی ایک جھلک سی نظر آ جاتی ہے یعنی فریڈرک ثانی اور الف نسو دہم جیسے مشاہیر کے قابل قدر کارناموں سے ہماری نگاہ دوچار ہوتی ہے جنھوں نے وسیع الخیال و آزادہ روی کے بلند مینارہ پر کھڑے ہو کر ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ تمدن کو علم و فضل کی کس قدر احتیاج ہے اور جن کو اس وادی لق ودق میں بھی جہاں پادریوں کی تاریک خیالی کے باعث جہالت اور تعصب کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اس ضرورت کا احساس ہو گیا تھا کہ سائنس ہی انسان کی معاشرت کی اصلاح کر سکتا ہے لیکن ان چند نفوس کی کوششوں سے کیا ہو سکتا تھا۔ اکیلا سورما چنا بھاڑ پھوڑنے سے رہا۔

اختلاف رائے ابھی تک ایک ایسا جرم سمجھا جاتا تھا جس کی پاداش میں سزائے موت دی جاتی تھی۔ جب کیلون نے سرویٹس کو جنوا میں زندہ جلوا دیا تو ہر شخص سمجھ گیا کہ جابرانہ ایذا رسانی کے سانپ کا سر ابھی نہیں کچلا گیا۔ سرویٹس کا جرم صرف اسی قدر تھا کہ اس کے عقائد فلسفیانہ تھے یعنی اس کا خیال یہ تھا کہ مسیحیت کے اصلی عقائد نائسیا کی کونسل کے انعقاد سے پہلے ہی مٹ چکے تھے۔ روح القدس روح عالم کی طرح تمام کائنات میں ساری دوائر ہے اور خاتمہ کائنات پر مسیح کے ساتھ وہ جوہر ذات باری میں جس سے اس کا صدور ہوا تھا ضم ہو جائے گی۔ اس عقیدے کی پاداش میں سرویٹس کو دہمی آنچ پر کباب کی طرح بھون ڈالا گیا۔ ایسی حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ پراٹسٹنٹ فتوے اور اس کیتھولک فتوے میں کچھ بھی فرق ہے جس کی رو سے ونینی کو ۱۶۲۹ء میں حکام محکمہ اخنساب عقائد نے بمقام ٹولوز اس علت میں زندہ جلا دیا کہ اس نے کتاب "ڈایا لاگز کنسرننگ نیچر" (مکالمات درباره حقائق فطرت) تصنیف کی تھی۔

چھاپے کی ایجاد اور کتابوں کی اشاعت سے وہ خطرات پیدا ہو گئے جن کے آگے "انکوزیشن" کے مظالم کی کوئی ہستی نہ تھی۔ ۱۵۵۹ء میں پاپائے پال چہارم نے محکمہ ترتیب فہرست کتب محرمہ قائم کیا جس کے حالات ہم ایک مورخ کے الفاظ میں حسب ذیل قلمبند کرتے ہیں؟ "اس محکمہ کا فرض یہ ہے کہ کتب و مسودات مقصود الاشاعت کی جانچ پڑتال کر

کے یہ فیصلہ کرے کہ آیا عامہ خلایق کو ان کے مطالعہ کی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ ان کتابوں میں جن میں بے شمار غلطیاں نہ ہوں بلکہ بعض مفید و نتیجہ خیز حقائق پائے جائیں ایسی اصلاح کرے جس سے وہ عقائد کلیسا کے مطابق ہو جائیں۔ ان کتابوں کو جن کے اصول ملحدانہ و زندیقانہ ہوں ممنوع الاشاعت قرار دے اور ملحدانہ تصانیف کے مطالعہ کا خاص حق خاص خاص اشخاص کو عطا کرے اس محکمہ کے ارکان مجلس انتظامی کا اجلاس بعض دفعہ بمواجہ پاپائے اعظم لیکن عموماً" کرڈینال کے محل میں بصدارت کرڈینال موصوف ہوتا ہے اس کے اختیارات محکمہ احتساب عقائد کے اقتدارات سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ اس لئے کہ اس کو نہ صرف انہیں کتابوں کی اشاعت میں دست اندازی کرنے کا اختیار حاصل ہے جن میں رومن کیتھولک مذہب کے مخالف عقائد مندرج ہوں بلکہ ان تصانیف کی اشاعت بھی اس کے دائرہ اقتدار سے باہر نہیں جن کا موضوع فرائض و وجوب اخلاق۔ انضباط تادیبات کلیسا اور صیانت مقاصد خلق اللہ ہو۔ اس محکمہ کی وجہ تسمیہ ملحدانہ تصانیف اور ان کے مصنفین کے اسما کی فہرست ہے جو بہ ترتیب حروف تہجی اس کے حکم سے تیار کی جاتی ہے۔"

فہرست کتب محرمہ میں اول اول ان کتابوں کا نام درج تھا جن کا مطالعہ ناجائز قرار دیا گیا تھا لیکن جب اس سے کام نہ نکلا تو یہ قید لگا دی گئی کہ ہر اس کتاب کا مطالعہ ممنوع ہے جس کے پڑھنے کی صریح اجازت نہ دی گئی ہو۔ اس بے باکانہ و شوخ چشمانہ حکم کا مقصود یہ تھا کہ بجز ان معلومات کے جن کو اغراض کلیسا کے ساتھ تطابق و توافق ہو اور کسی قسم کا علم لوگوں میں پھیلنے نہ پائے۔

اس سے واضح ہو گا کہ کلیسائے مسیحی کی دو حریف جماعتیں یعنی پراٹسٹنٹ و کیتھولک باوجود باہمی رقابت کے اس امر میں متفق و متحد تھیں کہ بجز ان علوم کے جو ان کی رائے میں کتب مقدسہ کے نقیض نہ ہوں اور کسی علم کو مسالمت اور رواداری کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ کیتھولک فریق کی قوت کا چونکہ ایک مرکز موجود تھا اس لئے جہاں اس کی حکومت قائم تھی وہ اپنے فیصلہ کی تعمیل بہ جبر کرا سکتا تھا اور فہرست کتب محرمہ کے نفاذ میں حکومت کے زور سے کام لے سکتا تھا لیکن پراٹسٹنٹ فریق کا اثر مختلف اقوام میں پھیلا ہوا تھا اور اس کی قوت مختلف المرکز تھی۔ لہٰذا وہ کوئی ایسی نتیجہ خیز کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ اس کا طرز عمل یہ تھا کہ مجرم کو راندہ درگاہ کلیسا قرار دے کر اسے برادری سے خارج کر دیا جائے اور یہ طریقہ شاید دوسرے طریقہ کی بہ نسبت کچھ کم موثر نہ تھا۔

ہم ابواب سابق میں ظاہر کر چکے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں اوائل عیسائیت ہی سے تخالف چلا آتا تھا۔ اس تخالف کے کرشمے ہمیں ہر صدی میں نظر آتے ہیں۔ عجائب خانہ اسکندریہ کی بربادی اسی کا نتیجہ تھا۔ ار یجینا اور وکلف کی فلسفیانہ روشن خیالی میں اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ تیرھویں صدی کے ملاحدہ و زناوقہ کا تورات کے بیان پیدائش کو فرط استحقار سے لغو و مہمل قرار دینا اسی کا کام تھا۔ لیکن کہیں کوپر نیکس کپلر اور گلیلیو کے زمانہ میں جا کر اس آہنی زنجیر کے حلقوں نے جو سائنس کے پاؤں میں عیسائیت نے ڈال رکھی تھی مشق کشتی شروع کی۔ کلیسا کی سیاسی قوت ہر ملک میں بہت کچھ گھٹ گئی تھی اور سربر آوردگان کلیسا دیکھ رہے تھے کہ وہ ریتلی زمین جس پر مسیحیت کے عالیشان محل کی بنیاد قائم تھی اس کے پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے۔ جبروتعدی کے ساتھ مخالفین کی بیخکنی کرنے کا طریقہ جو زمانہ سابق میں بہ کچھ کارگر ثابت ہوا تھا اب بیکار و بے اثر تھا۔ اکادکا فلاسفروں کا آگ میں جلا دیا جانا بجائے اس کے کہ اس کی اغراض کے لئے مفید ثابت ہوتا اور الٹا موجب نقصان ہو رہا تھا۔ ہیئت کے دنگل میں جب مذہب عیسوی خم ٹھونک کر اترا تو اس کا مدمقابل ایک اکیلا گلیلو تھا لیکن اس یکہ و تنہا پہلوان نے اس اڑنگے پر لا کر ایسی پٹخنی دی کہ اس کا سارا زعم باطل ہو کر خاک میں مل گیا اور جب نیوٹن کی غیرفانی تصنیف شائع ہوئی تو باوجودیکہ لا بنٹز نے یورپ بھر میں پکار کر کہہ دیا کہ نیوٹن نے خدا سے اس کے بعض بڑے بڑے اوصاف چھین کر طبعی مذہب کی جڑ کھوکھلی کر دی ہے لیکن کلیسا ایسی سٹی بھولا کہ اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

نیوٹن کے زمانہ سے لے کر آج کے دن تک اس دریا کا پاٹ جو معتقدات کلیسا اور مسلمات سائنس کے درمیان حائل ہے روزبروز زیادہ چوڑا ہوتا چلا آیا ہے۔ کلیسا نے یہ دعوی کیا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز اور اجرام کائنات میں سب سے بڑا جسم ہے۔ اور آفتاب ماہتاب اور ستارے اس کے تابع ہیں۔ اس کا یہ دعوی علم ہیئت نے باطل کر دیا۔ اس نے نہایت وثوق کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ روئے زمین پر ایک عالمگیر طوفان چھا گیا تھا جس کے فرو ہونے پر صرف وہی حیوانات زندہ رہے جو کشتی نوح میں موجود تھے۔ علم طبقات الارض نے اس کے اس دقیانوسی طلسم کو بھی توڑ دیا۔ اس نے بڑے شدومد سے اس عقیدے کی تلقین کی تھی کہ اول اول صرف ایک انسان موجود تھا جو کوئی سات آٹھ ہزار سال پہلے جسمانی و اخلاقی کمال کی حالت میں پیدا کیا گیا مگر اس پایہ کملیت سے بوجہ اپنے گناہوں کے گر گیا۔ علم الانسان نے اس کے اس ادعا کی بھی قلعی کھول دی اور ثابت

کر دیا کہ انسان لاکھوں سال سے کرہ زمین پر آباد ہے اور اس کی ابتدائی حالت وحشیانہ پن میں جنگل کے درندوں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ بہت سے بھلے لوگوں نے جن کی نیت کے اچھے ہونے میں شک نہیں کوشش کی ہے کہ کتاب پیدائش کے بیانات کو سائنس کے انکشافات سے تطبیق دیں لیکن ان کی کوشش سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مسیحیت اور سائنس کا اختلاف اتنا بڑھا کہ اس پر مخالفت کا اطلاق ہونے لگا اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ ان حریفوں میں سے ایک کو ہار ماننی پڑے۔

جب صورت واقعات یہ ہے تو کیا ہم کو یہ استحقاق حاصل نہیں ہے کہ اس کتاب کو جو دوسری صدی عیسوی سے حقائق ملیہ کے معیار کے طور پر پیش کی جا رہی ہے بہ نظر انتقاد دیکھیں اور اس کے دعوائے ملہم من اللہی کو جانچیں جس کتاب کا دعوی ایسا بڑا اور درجہ اتنا اونچا ہو اسے اپنی یہ حیثیت برقرار رکھنے کے لئے انسان کے ناقدانہ تبصرہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

مسیحیت کے ابتدائی دور میں بہت سے سربرآوردہ پیشوایان کلیسا کو تورات کی پہلی پانچ کتابوں کے مصنف کی شخصیت کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات دامن گیر تھے۔ قلت گنجائش اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس مقام پر ان واقعات و دلائل کو بہ تفصیل درج کریں جو آج تک اس بارے میں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں اور ایک بہت بڑا ذخیرہ اس کے مالہ و ماعلیہ کے متعلق جمع ہو گیا ہے۔ ناظرین کو اگر اس بحث سے دلچسپی ہو تو وہ تقدس ماب و فضیلت انتساب پادری پریڈو کی کتاب "دی اولڈ اینڈ نیو ٹسٹمنٹ کنکٹڈ" (ربط عہد و عتیق و جدید) ملاحظہ فرمائیں جو اٹھارہویں صدی کی انشاپردازی کی ایک قابل قدر یادگار ہے۔ پادری کولنزو نے بھی حال میں اس مضمون پر شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ فقرات ذیل سے اس بحث کی موجودہ کیفیت پوری طرح سے واضح ہو گی۔

کہا یہ جاتا ہے عہد عتیق کی پہلی پانچ کتابوں کو حضرت موسی نے خدا کے الہام سے قلمبند کیا۔ پس اس لحاظ سے کہ یہ نسخہ خدا کا تصدیق کیا ہوا اور لکھوایا ہوا ہے ضرور ہے کہ نہ صرف سائنس اسے صحیح و موثق تسلیم کرے بلکہ تمام دنیا اس کی موثوقیت کی معترف ہو۔ لیکن اس موقع پر یہ سوال ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کون شخص تھا جس نے تورات کی نسبت ایسا بڑا دعوی کیا یا وہ کون سی ایسی بات ہے جس کی بنا پر یہ دعوی قابل قبول ہو سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ خود یہ کتاب تو اس ادعا سے عاری ہے۔ کسی مقام پر

بھی اس میں یہ دعوے نہیں کیا گیا کہ اس کا مصنف ایک شخص واحد ہے اور کہیں بھی یہ کفر آمیز تحدی اس میں موجود نہیں ہے کہ یہ کتاب خدا کا کلام ہے۔

بنی نوع انسان کی سریع الاعتقادی پر یہ دست تصرف کہیں دوسری صدی عیسوی میں جا کر دراز کیا گیا۔ اس دعوے کی ابتدا اعلی طبقہ کے مسیحی فلاسفہ سے نہیں ہوئی بلکہ ان جوشیلے پادریوں سے ہوئی جن کی تحریرات ثابت کر رہی ہیں کہ وہ تبحر علمی سے عاری اور فن تنقید سے نا آشنا تھے۔

دوسری صدی سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں مسلم الثبوت قابلیت کے مسیحی و یہودی علما ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے ان دعاوی کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان علما کا فیصلہ خود تورات کی اندرونی شہادت پر مبنی ہے جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف زیادہ نہیں تو دو مصنفین سے تو ضرور منسوب کی جا سکتی ہے اور ان دونوں کا نام الوہیم و یہودا ہے۔ ہپفلڈ نے یہ دعوی کیا ہے کہ یہودائی قصہ کی عبارت سے جابجا اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ کسی اصلی نسخہ کی نقل ہے اور الوہیمی قصہ سے بالکل جدا ہے۔ جن دو ماخذوں سے یہ قصے لئے گئے ہیں وہ کئی ایک اعتبار سے متضاد و متبائن ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عہد عتیق کی پہلی پانچ کتابیں عبرانی نسخوں یا عبرانی بائبل کے مطبوعہ نسخوں میں کہیں بھی حضرت موسی سے منسوب نہیں کی گئیں اور نہ انہیں نسخہ سبعینیہ یا ترجمہ لاطینی ہی میں "صحف موسی" کہا گیا ہے بلکہ یہ نام انہیں جدید تراجم ہی میں دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ تورات کے منزل الیہ صرف حضرت موسی ہی نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ کی وفات کا واقعہ بھی اس میں مذکور ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تورات اس واقعہ کے کئی سو سال بعد قلمبند کی گئی اس لئے کہ اس میں ان واقعات کے حوالے موجود ہیں جو یہودیوں میں سلسلہ فرمانروائی کے قیام کے بعد پیش آئے۔

وہ شخص بڑا ہی بے باک ہے جو تورات کو خدا کا الہامی کلام سمجھتا ہے اس لئے کہ اس مین ایسے ایسے اضداد و نواقض اور امور غیر حادی و غیر ممکن بھرے پڑے ہیں جن کا خدائے پاک کے کلام میں پایا جانا ممکن نہیں اور یہ وہ اضداد و نواقض ہیں جن کی حقیقت کا انکشاف جرمنی اور انگلستان کے بہت سے متقی و راسخ الاعتقاد علما کر چکے ہیں۔ ان تنقید نگاروں نے فیصلہ کیا ہے کہ کتاب پیدائش ایک قصہ ہے جس کا ماخذ سنی سنائی فرضی روایات ہیں۔ مصر سے بنی اسرائیل کا خروج تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ تورات کی

پانچوں کتابیں پایہ اعتبار تاریخی سے ساقط اور غیرموسوی الاصل ہیں۔ اس میں ایسے ایسے خلاف قیاس متضاد اور متناقض امور درج ہیں جو کل توراۃ کی تغلیط و تکذیب کے لئے کافی ہیں اور ایسے ایسے عیوب و اسقام پائے جاتے ہیں جو اگر زمانہ حال کی کسی تاریخی تصنیف میں موجود ہوں تو اس کے اعتبار کو فوراً زایل کر دیں۔

ہنگسٹنبرگ نے ایک کتاب اس بحث میں لکھی ہے کہ تورات اصلی ہے یا محرف اس میں وہ ایک مقام پر لکھتا ہے۔ "ہر تاریخی تصنیف جس مین التباس و تدلیس سے کام لیا گیا ہو ضرور ہے کہ کبھی نہ کبھی اجتماع ضدین کی الجھن میں پڑے اگر تورات اصلی نہیں ہے تو لامحالہ اس کا بھی یہی حشر ہونا چاہئے۔ اگر تورات بلتس اور محرف ہے تو یہ تاریخی واقعات اور قوانین اس میں مذکور ہیں وہ ظاہر ہے کہ مختلف زمانوں میں وضع کئے گئے ہیں اور کئی صدیوں کے دوران میں مختلف اشخاص نے انہیں سپرد قلم کیا ہے۔ جس کتاب کا طرز تصنیف یہ ہو اس کا اضداد و نواقض سے معرا ہونا ممکن نہیں اور کوئی شخص جو بعد میں اسے بہ تصرف شائع کرے خواہ وہ کیسا ہی قابل کیوں نہ ہوں اضداد کے نشانات پوری طرح سے ہرگز نہیں مٹا سکتا۔"

عبارت مندرجہ بالا پر اس قدر اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ عزرا نے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو کتاب عزرا نبی باب دوم آیت ۱۴) کہ اس نے پانچ دوسرے اشخاص کے ساتھ مل کر تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو چالیس دن کی مدت میں لکھا وہ بیان کرتا ہے کہ جب یہودی بابل میں قید تھے تو ان کی مقدس کتابیں جلا دی گئی تھیں۔ اس کے بعد اسنے تورات کے قلمبند کئے جانے کی مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ اور ظاہر کیا ہے کہ آفرینش عالم سے لیکر اس وقت تک جتنے واقعات پیش آئے تھے ان سب کو اس نے سپرد قلم کیا۔ شاید اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ کتاب عزرا منجملہ اسفار محرقہ ہے لیکن اس کے جواب میں یہ الزامی استفسار کیا جا سکتا ہے کہ کیا اس دعوے کی موید ایسی براہین و دلائل ہیں جو موجودہ فن تنقید کے حملہ کی تاب لا سکتی ہیں؟ مسیحیت کے ابتدائی دور میں جب کہ قصہ ہبوط آدم مسیحیت کے ارکان میں داخل نہ تھا اور مسئلہ کفارہ تدقیق و تحکیم کے اس درجہ کو نہ پہنچا تھا جس پر اسے بالاخر انسلم نے پہنچا دیا پیشوایان کلیسا کو اس امر کا عام طور سے اعتراف تھا کہ بظن غالب عزرا نے تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو حسب بیان خود حقیقتاً" تصنیف کیا چنانچہ سینٹ جروم کہتا ہے۔ "تم خواہ یہ دعوی کرو کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں موسیٰ نے لکھیں خواہ یہ کہو کہ عزرا نے ان کتابوں کو ازسرنو قلمبند کیا مجھے اس پر کوئی

اعتراض نہیں" علے ہذا القیاس کلمنس اگزنڈرینس کا قول ہے کہ جب بخت نصر نے یہودیوں کو قید کر رکھا تھا اور تورات کا نسخہ ضائع کر دیا گیا تھا تو عزرا نبی نے الہامی طاقت سے اسے از سرنو قلمبند کیا۔ آئرنس کو بھی اس قول کے ساتھ اتفاق ہے۔

کتاب پیدائش کے پہلے دس باب سائنس کے ساتھ تعلق رکھنے کے اعتبار سے تورات کے دوسرے مقامات کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہیں۔ ان ابواب میں جن واقعات کا ذکر ہے وہ مختلف مصنفین کی روایات کے ناتمام اجزا سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تدقیق و تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو ان سب میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش صحرائے عرب میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی تھی بلکہ دریائے فرات کے کنارے تصنیف کی گئی تھی۔ اس میں بہت سے کلدانی محاورات اور سریانی مختصیات موجود ہیں مثلاً کوئی مصری بحرہ روم کی نسبت یہ نہ لکھے گا کہ یہ سمندر مغرب کی سمت میں واقع ہے لیکن سریانی ضرور لکھے گا اس کے علاوہ اگر کتاب پیدائش کو ایک تھیٹر فرض کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تھیٹر کے پردے اور باقی سب سلان مصری الاصل نہیں ہے۔ بلکہ سریانی مصنوعات ہے پیدائش کے پہلے دس ابواب میں جو داستان مندرج ہے وہ ان قصوں سے ملتی جلتی ہے جو سریانی سلاطین کی خشتی کتابوں کی شرخی الخط عبارت میں لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مریانی آثار قدیمہ کے ماہروں کا بیان ہے کہ ایک روایت جو طوفان سے تعلق رکھتی ہے برآمد ہو بھی چکی ہے۔ اور عجب نہیں کہ باقی روایات بھی اسی طرح آگے چل کر دبے دبائے کھنڈروں میں سے نکل آئیں۔

پیدائش زمین و آسمان۔ باغ عدن۔ ماوطین کے خمیر سے مرد اور مرد کی ایک پسلی سے عورت کی تخلیق۔ سانپ کا اغوا۔ تسمیہ حیوانات۔ ملا ئکہ۔ شعلہ زن تلوار۔ طوفان اور کشتی۔ آب طوفان کا ہوا کے چلنے سے خشک ہو جانا۔ مینارہ بابل کی تعمیر۔ اختلاف السنہ یہ تمام وہ روایات ہیں جو عزرا کو سریانی کتبوں اور تحریروں سے بہم پہنچی تھیں۔ کتاب پیدائش کے گیارہویں باب میں وہ دفعتہ و بغتۃ یہودیوں کی تاریخ کہنی شروع کر دیتا ہے گویا یہاں پہنچ کر اس کی تاریخ عالم ختم ہو جاتی ہے اور وہ صرف ایک خاندان یعنی نسل سام کے حالات کی تفصیل کے لئے اپنے قلم کو وقف کر دیتا ہے۔

ڈیوک آف آرگل نے اپنی کتاب پرائمیول مین "انسانی اولین" میں اس تحدید پر قلم اٹھا کر معانی کے پھول یوں برسائے ہیں۔ "سام کے خاندان کا شجرہ نسب ہمارے لئے بجز اسما اعلام کی ایک فہرست کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ ایک ایسا شجرہ ہے جس میں منجملہ ان

کروڑوں انسانی خانوادوں کے جو اس وقت روئے زمین پر پہلے سے آباد تھے صرف گنتی کے چند خاندانوں کی سلسلہ بہ سلسلہ نسب شماری کی گئی ہے۔ بجز اس ترتیب نسبی کے اور کچھ نہیں بتایا گیا اور اس ترتیب کا مسلسل و مکمل ہونا بھی یقینی نہیں ہے۔ ہمیں یہ مطلق نہیں بتایا گیا کہ اس سیاہ پردے کے پیچھے کیا ہے جس پر یہ چند نام کسی فانوس خیالی کے نقوش کی طرح گزرتے ہوئے دکھا دئے گئے ہیں لیکن باہیں ہمہ یہ پردہ کچھ کچھ دیر کے لئے اٹھ جاتا ہے اور ہمیں ان عظیم الشان واقعات کی شکلیں دکھائی دے جاتی ہیں جن کا عمل مدت ممتد سے جاری ہے۔ یہ شکلیں بالکل دھندلی اور مدھم ہیں اور ان کی صرف پرچھائیں ہی نظر آتی ہے۔ ان کی حرکت کا رخ بھی ہم کو صاف صاف محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ آوازیں سنائی دے رہی ہیں جو کان میں بہت سی امواج آب کے شور کی طرح پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

ہیفلڈ نے اس بارہ میں حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے جس کے ساتھ ہمیں پورا اتفاق ہے۔ "یہ تحقیقات کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں مختلف تصانیف سے تالیف کی گئی ہیں نہ صرف عہد عتیق کے تاریخی مقامات کی تاویل یا مناسب ہو گا اگر یوں کہا جائے کہ کل الہیات و تاریخ کی تاویل کے لئے نہایت ہی ضروری ہے بلکہ فن انتقاد و ادب کی تاریخ میں بھی اس سے زیادہ یقینی اور موثق تحقیقات کا ہونا ممکن نہیں۔ جو فریق کوچہ تنقید سے نابلد ہے وہ خود کیسی ہی تاویلات باردہ عذرات رکیکہ کیوں نہ پیش کرے لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ جب تک انتقاد کے اصول قائم ہیں اس وقت تک اس تحقیقات کے مسلم الثبوت ہونے میں کوئی رخنہ نہیں پڑ سکتا۔ نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی کی جس بلندی پر صدیوں کی تدقیق و تحکیم کے بعد ہم آج پہنچے ہیں اس پر چڑھ کر اگر کوئی غیر متعصب اور حقائق آشنا شخص اس تحقیقات پر نظر ڈالے گا تو ممکن نہیں کہ وہ اس کے نتائج سے متاثر نہ ہو۔"

ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم ان صحایف سے ابا کریں؟ کیا اس امر کا اعتراف کہ باغ عدن کے ہبوط کی داستان ایک فرضی روایت ہے مسیحیت کے سب سے زیادہ مقدس و متقن عقیدے یعنی کفارہ کے مسائلہ کو نیست و نابود نہیں کر دیتا؟

ہمیں چاہئے کہ ٹھنڈے دل سے اس حقیقت پر غور کریں۔ مسیحیت کو قرون اولیٰ میں جبکہ وہ دنیا کو اپنا حلقہ بگوش بنا رہی تھی یا مسخر کر رہی تھی اس عقیدہ کا یا تو مطلق علم نہ تھا یا تھا تو اس قدر تھا کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ٹرٹلین نے اپنے جواب میں جہاں مسیحیت کے اور ارکان گنائے ہیں وہاں مسئلہ کفارہ کا کہیں ذکر نہیں کیا

جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اگر ان کو اس مسئلہ کا علم تھا بھی تو اس کے نزدیک یہ مسیحیت کے اصول میں شمار ہونے کے قابل نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کفارہ کے مسئلہ کو اول اول فرقہ اوریہ کے اہل بدعت نے رواج دیا۔ اسکندریہ کے طبقہ مقالین کو اس کا اعتراف نہ تھا۔ پیشوایان کلیسا نے کبھی اس پر زور نہ دیا۔ جس پادری نے کفارہ کو راس العقاید بنا دیا وہ انسلم تھا۔ فلوجوڈئیس لکھتا ہے کہ قصہ ہبوط محض ایک تمثیل ہے۔ آریجن کی رائے میں واقعہ ہبوط ایک رمز مجازی ہے۔ شاید بعض پراٹسٹنٹ کلیساؤں پر معقولیت کے ساتھ مباننت و منافضت کا الزام لگایا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ اسے ایک لحاظ سے مجازی اور ایک لحاظ سے حقیقی تصور کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم ان کے ہم آہنگ ہو کر یہ تسلیم کر لیں کہ سانپ سے کنایتہ شیطان مراد ہے تو کیا کل قصہ ایک استعارہ میں تحلیل نہ ہو جائے گا؟

افسوس ہے کہ کلیسائے عیسوی نے تورات کی حمایت کی بلا کو خود بلا کر اپنے گلے لگا لیا ہے اور اس کی صریحی اضداد و اغلاط کی ذمہ داری برضاو رغبت خود اپنے اوپر عائد کر لی ہے۔ اس کتاب کو برحق ثابت کرنے کی کوشش بصورت امکان یہودیوں کے لئے چھوڑ دی جانی چاہئے تھی کہ انہیں کی یہ کتاب ہے اور انہیں سے عیسائیوں تک پہنچی ہے۔ زیادہ تر افسوس اس بات کا ہے کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں جو اپنے اسقام و نقائص کی وجہ سے زمانہ حال کے انتقادی عملوں کی تاب نہ لا سکتیں۔ سائنس کے حق میں بمنزلہ قول فیصل سمجھی گئیں۔ مخفی نہ رہے کہ ان کتابوں کی قلعی کھولنے والے مخالفین و معاندین نہیں ہیں بلکہ ایسے ایسے صاحب زہد و ورع علمائے مسیحی ہیں جن میں سے بعض کی جلالت قدر مسلم ہے۔

پراٹسٹنٹ کلیساؤں نے تو کتب مقدسہ کو معیار حق قرار دیا لیکن کیتھولک فرقہ کے لوگ اس زمانہ میں بھی پاپائے روما کے معصوم ہونے کے قائل ہیں شاید یہ کہا جائے گا کہ اس عصمت کا اطلاق صرف اخلاقی یا مذہبی امور پر محدود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دینی اور دنیوی امور کا خط فاصل کس مقام پر کھینچا جائے گا؟ معرفت مطلق یعنی ہمہ دانی کا عصر چند خاص خاص مسائل پر نہیں ہو سکتا ایسی معرفت کی نوعیت ہی کل اشیاء کے حقائق کے ادراک کی متلزم ہے اور اس لحاظ سے عصمت عن الخطا ہمہ دانی کی مترادف ہے۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اطالوی مسیحیت کے اصولی عقائد کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ پاپائے روما کا خاطی ہونا ممکن نہیں۔ ہمارے لئے یہ

ضرور نہیں ہے کہ منطق کی اس شکل کی غیر فلسفیانہ نوعیت پر بیٹھے ہوئے غور کیا کریں۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ اور پاپاؤں کے سوانح عمری کی تنقید اس شکل کو مسخ کیے دیتی ہے۔ تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ غلطیاں اور خطائیں دکھائی دیتی ہیں جن سے انسان کی سرشت مرکب ہے اور پاپایان روما کی بر کے مطالعہ جب ہم کو اتفاق ہوتا ہے تو بدکاری اور بے غیرتی کی داستان پڑھنے میں آتی ہے۔

ممکن نہ تھا کہ روشن خیال اور بالغ نظر کیتھولک عقیدہ عصمت پاپاوی کو بلا چوں و چرا تسلیم کر لیں۔ جن لوگوں کو اس عقیدے کے تسلیم کرنے میں تامل ہے ان کی نارضامندی وسعت و اشتداد کے لحاظ سے روبہ ترقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عقیدہ فطرت انسانی سے اس درجہ مغائرت رکھے گا اس کا یہی حشر ہو گا۔ بہت سے کیتھولک ایسے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ عصمت اگر فی الاصل موجود ہے تو بجز مجالس عمومیہ مسیحیہ کہ اس کا وجود اور کہیں نہیں۔ لیکن واضح رہے کہ خود ان مجالس کو بھی اتفاق اجماعی کی نعمت ہمیشہ نصیب نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ بہت سے لوگوں کو فراموش نہیں ہوا کہ کونسلوں نے پاپایان روما کو معزول بھی کیا ہے اور ان کے ہفوات و شطحیات کی نسبت مخالف تجاویز بھی صادر کی ہیں۔ پراٹسٹنٹوں کا یہ سوال بے وجہ نہیں ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کلیسا عصمت کی صفت سے متصف بھی ہے؟ اس امر کی کیا شہادت ہے کہ کلیسا کے اغراض و مقاصد کی حفاظت کسی کونسل میں منصفانہ اور واجبی طور پر کی گئی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ احقاق حق قلت رائے پر منحصر نہ ہو بلکہ کثرت رائے پر مبنی ہو؟ کیا یہ بات اکثر دیکھنے میں نہیں آئی کہ ایک فرد واحد کی حقیقت شناسی صحیح رائے کے قیام کا باعث ہوتی ہے اور باقی تمام لوگوں نے اسے جھوٹا سمجھ کر اور اس کو ایذائیں پہنچا کر آخرکار مجبوراً" اسی کی رائے کو صحیح تسلیم ہے اور کیا تمام بڑے بڑے انکشافات کی تاریخ یہی نہیں ہے؟

سائنس کو ان حریفوں میں مصالحت کرنے سے کچھ سروکار نہیں۔ اس کا یہ کام نہیں ہے کہ اس امر کا فیصلہ کرتا پھرے کہ اہل مذہب کو معیار حق بائبل کی آیات میں ڈھونڈنا چاہیے یا مجالس عمومیہ مسیحیہ کے فیصلہ جات میں پاپائے روما کے فرامین میں وہ صرف اس حق کا مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح اس نے دوسروں کو اپنا معیار خود قائم کرنے کی اجازت دے رکھی ہے اسی طرح اسے بھی اپنا خاص معیار قائم کر لینے دیا جائے اگر وہ غیر تاریخی روایات کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے یا اس ادعا پر کہ کثرت رائے ذریعہ احقاق حق ہے مطلق اعتنا نہیں کرتا یا انسان کے دعوائے عصمت کی تنقید کو واقعات آتیہ کے سپرد کر دیتا ہے تو

خود اپنے ساتھ بھی اسی سردمہری اور غیر جذبہ داری سے پیش آتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ مسئلہ کشش ثقل یا مسئلہ ارتعاش نور واقعات سے توافق نہیں رکھتا تو وہ بلا تامل ان مسائل سے قطع تعلق کر لے اس کا سرچشمہ الہام کتاب فطرت ہے جس کے اوراق ہر وقت ہر شخص کے مطالعہ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ یاران نکتہ دان کے لئے اس کی صلاعام ہے۔ اپنے اصول کی اشاعت کے لئے وہ نہ کسی انجمن کی حمایت کا محتاج ہے نہ کسی جماعت کی قصیدہ خوانی کا رہین منت ہے اس کی وسعت غیرمحدود اور اس کا مرور بے پایان ہے اور اسی لئے انسان کا استکبار و تعصب اس کے ساتھ سازوباز نہیں کر سکا۔ زمین پر ہر شاندار اور خوبصورت چیز میں اس کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور آسمان پر اس کی داستان شموس بازغہ و نجوم لامعہ کے نورانی حروف میں لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔

---

[1] جرمنی کا ایک متوسط درجہ کا شہر ہے جو دریائے الب کے داہنے کنارے پر واقع ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۵۱۷ء کو لوتھر نے اس شہر کے گرجا کے دروازے پر وہ مشہور استفتا کیلوں سے جڑ دیا جس کے ۹۵ مسائل نے مسیحی دنیا کو رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ دو فرقوں میں تقسیم کرنے کی بنیاد رکھی۔ لوتھر اس گرجا میں دفن ہے۔ ۱۸۵۸ء میں گرجا کے دروازے بدل دئے گئے اور کانسی کے نئے دروازے لگائے گئے۔ جن میں ۹۵ مسائل کھدے ہوئے ہیں۔ مترجم

[2] پاپا کا فرمان لوتھر نے ونبرگ میں جس مقام پر بتاریخ ۱۰ دسمبر ۱۵۲۰ء جلایا تھا وہاں شاہ بلوط کا ایک سالخوردہ درخت کھڑا ہے جو اس لحاظ سے اصلاح کینسہ کی پرانی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ مترجم

[3] یہ قتل عام جو ڈیڑھ مہینے تک جاری رہا اور جس میں پچاس ہزار پراٹسٹنٹ مارے گئے ۲۴ اگست ۱۵۰۲ء کی شام کو شروع ہوا جو ایک مسیحی بزرگ سینٹ برتھائیمو کے عرس کی تاریخ ہے اس زمانہ میں چارلس نہم فرانس کا بادشاہ تھا لیکن حکومت کی باگ اصل میں اس کی ماں ملکہ کیتھرائن ڈمیکی کے ہاتھ میں تھی جو تعصب کی پتلی اور جبر و بے عنوانی کی زندہ تصویر تھی۔ کیتھولک فریق نے کیتھرائن کی شہ پا کر یہ منصوبہ گانٹھا کہ پراٹسٹنٹوں کے سرداروں کو جمع کر کے قتل عام کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کے ساتھیوں کا قلع و قمع کیا جائے۔ اس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لئے طرح طرح کے جوڑ توڑ کئے گئے۔ کیتھرائن اپنی بیٹی کی شادی نیویر کے فرمانروا شاہ ہنری سے جو پراٹسٹنٹ تھا کرنے پر رضامند ہو گئی اور شادی کی تقریب پر تمام بڑے بڑے پراٹسٹنٹ امرا واعیان کو دعوت دی گئی۔ جب یہ سب پیرس میں جمع ہو گئے تو آدھی رات کے وقت شاہی محل سے گھنٹہ بجا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قتل عام شروع ہو۔ چنانچہ کیتھولک تلواریں لے کر اٹھے اور جس پراٹسٹنٹ کو جہاں پایا ذبح کر ڈالا۔ کشت و خون کا یہ ہنگامہ پیرس تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مملکت فرانس میں جہاں جہاں پراٹسٹنٹ موجود تھے لکڑی کی طرح کاٹ ڈالے گئے۔

پاپائے گریگوری سیزدہم اس وقت جلوہ افروز مسند قدس و عصمت تھے۔ اس قتل عام کی خبر جب آپ کو پہنچی تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا اور گرجا میں جا کر شکرانہ کی نماز پڑھی اور اس مبارک واقعہ کی یادگار میں ایک تمغہ تیار کرایا جو مومنین پاک یعنی پراٹسٹنٹوں کے قاتلوں کو عطا فرمایا گیا۔ مترجم

؁ پروکرسٹیز ایک یونانی ڈاکو ڈمسٹیز نامی کا عرف تھا "پروکردو" ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی کھنچاؤ یا تناؤ کے ہیں۔ پروکرسٹیز اسی سے مشتق ہے یہ نام اس ڈاکو کو اس لئے دیا گیا تھا کہ جو مسافر اس کے ہتھے چڑھ جاتا تھا اسے ایک فولادی پلنگ پر لٹا دیتا تھا اور بدنصیب مسافر کا قد اگر پلنگ سے چھوٹا ہوتا تھا تو اس کے جسم کو شکنجہ میں یہاں تک کھینچتا تھا کہ وہ پلنگ کے برابر ہو جاتا تھا اور اگر بڑا ہوتا تھا تو اس بیچارے کی ٹانگیں اسی نسبت سے کاٹ ڈالا کرتا تھا۔ اسی لئے "پروکرسٹیز کے پلنگ" سے استعارتاً ناجائز زیادتی یا کمی مراد لی جانے لگی۔ مترجم

؁ ایک جرمن عالم جو ۱۸۲۴ء میں یونیورسٹی برلن میں الہیات کا پروفیسر تھا۔ مترجم

؁ ساتویں صدی قبل مسیح میں آسور بنی پال اسیریا کا ایک بادشاہ تھا۔ اس کا پایہ تخت شہر نینوا تھا جس کے کھنڈر مستشرقین یورپ کی انتھک کاوشوں کو ایک قدیم تمدن کی عبرت ناک داستان سنا رہے ہیں۔ اسور بنی پال کے محل میں ایک عظیم الشان خشتی کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانہ کے جو اجزاء برآمد ہوئے ہیں ان میں چند اینٹوں پر کسی قدیم سامی زبان میں ایک روایت مندرج ہے جس کے واقعات طوفان نوح سے ملتے جلتے ہیں۔ سریانی آثار کے ماہروں نے بالاتفاق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جو روایت ان اینٹوں پر لکھی ہوئی ہے وہ کسی قدیم تر تصنیف کی نقل ہے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے دو ہزار سال قبل یہ روایت اسیریا میں زبان زد خاص و عام تھی اس روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"کئی ہزار سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ مسوپوٹیمیا میں ایک شہر آباد تھا جس کا نام سرپک تھا۔ اس سر میں مسی سدرا نامی ایک شخص رہتا تھا ایک رات اس شخص نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ عالم خواب میں اسے معلوم ہوا کہ عنقریب ایک بڑا طوفان آیا چاہتا ہے اور اسے اشارہ یہ ہوا کہ فوراً ایک جہاز بنانا شروع کرے جس میں طوفان کے نمودار ہونے کی خبر پاتے ہی وہ اپنے خاندان اور احباب و اقارب سمیت کچھ پالتو اور کچھ جنگلی جانور اور کچھ نباتات کے بیج لے کر سوار ہو جائے اور تباہی سے بچ جائے۔ مسی سورا نے جاگتے ہی اس اشارہ غیبی کے مطابق عمل کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک مضبوط عرشہ کا جہاز تیار کیا جس کو اندر اور باہر قیر سے لیس دیا گیا۔ اس کے بعد اس جہاز کو پانی میں چلا کر دیکھ لیا گیا کہ دریا کی موجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں اور جب اطمینان ہو چکا تو ضروری سامان معاش جہاز پر بار کر دیا گیا اور ایک ہوشیار و معتبر ناخدا مقرر کیا گیا۔

"آخر طوفان کی آمد آمد کی موعودہ خبر مسی سدرا کو دی گئی اور وہ اپنے بال بچوں اور اعزا و

اقربا سمیت کشتی میں سوار ہو گیا۔ اس نے احتیاط کی راہ سے کشتی کا دریچہ بند کر لیا اور نس ہیا کو جو ناخدا تھا عرشہ پر چھوڑ دیا کہ جس طرح بن پڑے طوفان کا مقابلہ کرے۔ اس کے بعد بادوباراں کا طوفان شروع ہوا۔ مینہ موسلا دھار برسنے لگا۔ زمین کے چشمے پھٹ پڑے ملک پانی میں غرق ہو گیا۔ ہوا کے تھپیڑوں سے موجیں بلند ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ زمین آسمان و ہندکار بادل سب ایک ہو گئے۔ چھ دن اور سات رات تک جھکڑ چلتا رہا اور مینہ برستا رہا۔ لیکن کشتی سلامت رہی۔ آخر ساتویں دن طوفان تھما اور ہی سدرا عرشہ پر گیا۔ دیکھا تو چاروں طرف پانی ہی پانی تھا اور انسانوں اور جانوروں کی لاشیں موجوں پر تیرتی پھرتی تھیں۔ اپنی قوم اور ملک کی یہ تباہی دیکھ کر ہی سدرا بہت رویا۔ بہت دور نزیر کے پہاڑ نظر آئے کشتی ان کی طرف چلائی گئی اور اس کا پیندا اونچی زمین پر جا کر ٹک گیا۔ جب اور سات دن گزر گئے تو ہی سدرا نے ایک فاختہ چھوڑی جو کوئی اڈا نہ پا کر لوٹ آئی۔ اس کے بعد ابابیل اڑائی گئی وہ بھی خشکی کے موجود نہ ہونے سے واپس آ گئی۔ سب سے آخر میں ایک کوا چھوڑا گیا۔ اس سیانے پرندے نے یہ معلوم کر لیا کہ طوفان تھم گیا ہے اور پانی پایاب ہو گیا ہے اس لئے وہ کشتی کے قریب تو آیا مگر اندر نہ داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر ہی سدرا نے باقی کے جنگلی جانوروں کو چھوڑ دیا جو چاروں طرف منتشر ہو گئے اور خود اپنے کنبہ اور دوستوں سمیت ایک پہاڑ کی چوٹی پر جو پاس ہی تھا چڑھ گیا جہاں اس نے اپنی سلامتی کے شکرانہ میں دیوتاؤں کو قربانی دی۔" (ہی سدرا کی داستان از پروفیسر ہکسلے مندرجہ رسالہ نائنٹینتھ سنچری بابت ماہ جون ۱۸۹۱ء)

ہی سدرا کا یہ قصہ طوفان نوح کی روایت سے اس قدر مشابہ ہے کہ قیاس یہی چاہتا ہے کہ دونوں قصے ایک ہوں اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ طوفان وادی فرات میں واقع ہوا اور حضرت نوح بھی اسی سرزمین میں مبعوث ہوئے تھے تو اس قیاس کو مزید تقویت ہوتی ہے کہ نوح اور ہی سدرا ایک ہی شخص کے دو مختلف نام ہیں یا ممکن ہے کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہو اور ہی سدرا کی سرگزشت نوحؑ کو پیش آئی ہو۔ پروفیسر ہکسلے نے اس مضمون میں جس کا ہم نے حوالہ دیا ہے بدلائل قاطع ثابت کر دیا ہے کہ ہی سدرا والا طوفان مقامی تھا عالمگیر نہ تھا۔ جن حضرات کو ان دلائل سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو وہ مضمون متذکرہ کا مطالعہ فرمائیں۔ پس اگر ہی سدرا اور نوحؑ ایک نہ ہوں تو طوفان نوح بھی جو ہی سدرا کے طوفان سے بعد میں آیا ہو گا ضرور ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے صرف مقامی ہو۔

ان خلاف عقل قیاسات کی ذمہ دار تورات ہے کہ طوفان عالمگیر تھا جس نے روئے زمین کے حیوانات و نباتات کو تباہ کر دیا اور حضرت نوحؑ کے تینوں بیٹوں نے زمین کو ازسرنو آباد کیا۔ اصل قصہ کی حقیقت جو عزرا نبی کو غالباً" کسی سریانی ماخذ سے ملا ہے صرف اسی قدر ہے کہ حضرت نوحؑ یا جو کچھ بھی ان کا دوسرا نام ہو اس مصیبت سے پیش از پیش آگاہ ہو گئے جو ان کی قوم میں بشکل طوفان آنے والی تھی اور ایک کشتی تیار کر کے مع اپنے قبائل و رفقا کے اس میں سوار ہو گئے اور

اس طور پر تباہی سے بچ گئے۔ جب تورات میں تحریف شروع ہوئی تو اس قصہ پر محرفین کی سریع الاعتقادی اور اوہام پرستی نے بہت کچھ لاطائل و لایعنی اضافے کر دیے۔

قرآن مجید میں بھی قصص و حکایات موجود ہیں لیکن باوجودیکہ ان کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ ان قصوں کے پڑھنے والے ان سے محض ایک اخلاقی سبق بہ پیرایہ تمثیل حاصل کریں پھر بھی اس دوراز کار اور پادر ہوا مبالغہ کے عنصر کو ان سے نہایت احتیاط کے ساتھ خارج کر دیا ہے جو آج کل یورپ کے طعن و تضحیک کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے تورات اہل سائنس کی نظروں میں لغویات و مزخرفات کے ایک مجموعہ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی۔

واقعہ طوفان نوح کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید تورات کی تصدیق کرتا ہے لیکن صرف اس حد تک جس حد تک کہ حقیقت نفس الامری کو تعلق ہے۔ وہ اس کے تحریفی مقامات کا مصدق بن کر جائز نکتہ چینی کا نشانہ نہیں بنا۔ اس نے یہ کہہ کر کہ "لقد ارسلنا نوحا" الی قومہ فقال یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ" صاف بتا دیا ہے کہ حضرت نوحؑ صرف اپنی قوم یا امت کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے کل دنیا کی رہبری کے لئے مامور نہ ہوئے تھے اور اس لئے طوفان کا عذاب ان کے جھٹلانے کی پاداش میں عالمگیر نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی توضیح ایک دوسرے مقام پر اس طرح کی گئی ہے۔ فکذبوہ فانجیناہ والذین معہ فی الفلک واغرقنا الذین کذبوا بآیتنا انہم کانوا قوما" عمین جس سے ثابت ہے کہ صرف وہی لوگ تباہ ہوئے جنہوں نے آیات ربانی کو جو بوساطت نوح علیہ السلام نازل کی گئی تھیں جھٹلایا۔ کشتی کے بنائے جانے حضرت نوح اور ان کے اہل ایمان پیروؤں کے اس پر سوال ہونے اور طوفان کے فرو ہونے پر کشتی کے ایک اونچے مقام پر جا ٹھہرنے اور ان سب لوگوں کے بچ جانے کا واقعہ قرآن میں بہ تفصیل درج ہے لیکن یہ تفصیل ایسی نہیں ہے جو تورات کی تفصیل کی طرح خندہ و آفرین ہو۔ مترجم

نواں باب

نزاع دربارہ انتظام عالم

انتظام عالم کے تصور کی دو حیثیتیں ہیں۔ اول بذریعہ توفیق ربانی دوم بذریعہ قانون شق اول کا تعلق پیشوایان مذہب سے۔ شق ثانی کی ترویج کا مختصر بیان۔

کپلر وہ قوانین دریافت کرتا ہے جو نظام شمسی پر محتوی ہیں۔ پاپائے روما اس کی تصانیف کی تکفیر کرتا ہے۔ ڈاؤنسی فلسفہ حرکات و حیل کی بنا ڈالتا ہے۔

گلیلیو علم تحریک الاجرام کے اصولی قوانین دریافت کرتا ہے۔ نیوٹن اجسام سماوی کی حرکات کو ان قوانین کے غیر اطلاق میں لا کر ثابت کرتا ہے کہ نظام شمسی کی عنان نظم و نسق مہندسانہ جبر کے ہاتھ میں ہے۔ ہرشل ثابت کرتا ہے کہ کل کائنات اسی قانون کی تابع فرمان ہے۔ مسئلہ ضبابتہ النجوم النجوام اس پر ستابین کے اعتراضاف۔

اس امر کا ثبوت کہ ترکیب ارضی و نشوونما سے سلسلہ نباتی و حیوانی تابع قانون ہے۔ نباتات و حیوانات کا ظہور بذریعہ پیدائش نہیں ہوا بلکہ بذریعہ ارتقا۔

حکومت قانون کا ثبوت انسانی جماعتوں کے تاریخی حالات اور نیز افراد انسانی سے بہم پہنچتا ہے۔

اصلاح یافتہ کلیساؤں میں سے بعض اس خیال کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ تسلیم کر لیتی ہیں۔

طریقہ نظم و نسق عالم کی دو تاویلیں کی جا سکتی ہیں یا تو ہر واقعہ خدا کی دست اندازی و

مداخلت سے پیش آتا ہے اور یا غیر متبدل و غیر متغیر قانون کا عمل انتظام دنیا کا ذمہ دار ہے۔

قسیسوں کاہنوں اور مذہب کے پیشواؤں کا رجحان ہمیشہ پہلی تاویل کی طرف ہو گا اس لئے کہ ان کی دلی تمنا یہی ہے کہ عبادت گزار کی دعا اور لطیفہ غیبی کے درمیان ان کی حیثیت حاجب یا شفیع کی سمجھی جائے۔ اس تاویل کی اہمیت کو لطیفہ غیبی کی نوعیت کے تعین کا دعوے اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ مسیحیت سے پہلے رومائے بت پرستوں کے مذہب میں کاہنوں کا فرض یہ ہوتا تھا کہ غیب دانی یا شگون شناسی کے ذریعہ سے یا جانوروں کے رودوں کو دیکھ کر یا دیوتاؤں کی استمالت و رضاجوئی کے لئے بھینٹ چڑھا کر واقعات آئندہ کی نسبت حکم لگائیں۔ جب مسیحیت کا دور آیا تو رازداران شریعت کا پایہ قدرت اس سے بھی اونچا ہو گیا یعنی پادریوں نے یہ دعوی پیش کر دیا کہ ہم اپنی سفارش یا شفاعت کے زور سے معاملات عالم کے انضباط و انقیاد میں حصہ لے سکتے ہیں۔ آفات و بلیات کو ٹال سکتے ہیں۔ تمغات دینوی کا انعام دلوا سکتے ہیں۔ معجزے اور کرامتیں دکھا سکتے ہیں بلکہ قانون قدرت تک کو بدل سکتے ہیں۔

پس کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس مسئلہ کو کہ کائنات کا انتظام غیر متغیر قانون کے تابع ہے بہ نظر استحسان دیکھیں۔ اس مسئلہ سے ان کی شان میں بٹہ لگتا تھا۔ ان کی وقعت میں فرق آیا جاتا تھا۔ ایسا خدا ان کے نزدیک نہایت ہی مہیب و مکروہ تھا جس پر انسان کی التجاؤں اور منتوں کا مطلق اثر نہ ہو سکے۔ جس کی سردمہری و بے اعتنائی اسے بندہ کے خضوع و خشوع پر ملتفت نہ ہونے دے اور جو جبروتقدیر کی خوفناک بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہو۔

لیکن اجرام سماوی کی باقاعدہ حرکات ہر زمانہ میں ارباب بصیرت کے دل پر ایک گہرا اثر ڈالے بغیر نہ رہیں۔ آفتاب کا طلوع و غروب دن کی روشنی کا بڑھنا اور گھٹنا۔ قمر کا کمال و زوال۔ موسموں کا اوقات مقررہ پر نمودار ہونا۔ سیاروں کی نپی تلی حرکت۔ یہ اور اسی قسم کے ہزارہا نشانات اگر قدرت کے باقاعدہ و غیر متغیر عمل کے کرشمے نہیں تو کیا ہیں۔ جو لوگ ابتدا" اس نتیجہ پر پہنچے ان کے دل میں شاید کسوف و خسوف کے مشاہدہ سے یہ سوچ کر خدشہ پیدا ہوا ہو کہ قدرت کی روش مستمرہ میں یہ ناگہانی اور نامعلوم تفرقہ کیسا لیکن کسوف و خسوف کے تکرار اور اس تحقیقات نے کہ ان کے اوقات ظہور کی نسبت حکم ناطق لگایا جا سکتا ہے۔ یہ خدشہ مطلقاً" مٹا دیا ہو گا۔

فلکیات کی نسبت ہر قسم کی پیشین گوئیوں کا انحصار اس واقعہ کے اعتراف پر ہے کہ

قوانین قدرت کے عمل میں آج تک نہ کوئی مداخلت یا تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو گی۔ سائنس دان فلسفی کا دعوی ہے کہ دنیا کی جو حالت کسی ساعت معینہ میں پائی جائے گی وہ حالت ساعت ماسبق کا بلاواسطہ نتیجہ اور حالت ساعت مابعد کی بلاواسطہ علت ہو گی۔ قانون اور بخت جبر اضطراری کے محض دو مختلف نام ہیں۔

کوپرنیکس کی وفات کے کوئی پچاس سال بعد جان کیپلر ساکن ورٹمبرگ نے سیاروں کے ابعاد و اوقات اور سرعت رفتار و اشکال ادوار کی تحقیقات شروع کی۔ کیپلر اس مسئلہ کا قائل تھا کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور اس کو یقین واثق تھا کہ آفتاب کے گرد جو سیارے گھومتے ہیں ان کی گردش کو آپس میں ربط و تعلق ہے اور اگر ان گردشوں کی صحت کے ساتھ جانچ کی جائے تو جن قوانین کی یہ حرکات تابع ہیں وہ معلوم ہو سکتے ہیں۔ کپلر نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ٹائکوبراہی اور دوسرے ہیئت دانوں کے جو جو ارتصادات و مشاہدات فلکی اس کے ہاتھ آئے انہیں ان اندازوں کے ذریعہ سے جانچا جو مختلف قیاسات پر مبنی تھے اور اگر کوئی قیاسی اندازہ مشاہدات کے مطابق نہ ثابت ہوا تو اسے خارج کر دیا۔ کپلر کو جو محنت اس کام میں اٹھانی پڑی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ سوچتے سوچتے اور حساب لگاتے لگاتے میری یہ حالت ہو گئی کہ قریب تھا کہ میں دیوانہ ہو جاؤں۔ آخر اس محنت کا اسے ثمرہ ملا اور ۱۶۰۹ء میں اس نے اپنی کتاب حرکات سیارہ مریخ۔" شائع کی۔ اس کتاب میں حرکات مریخ کو اس نے اس قیاس کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی تھی کہ سیارے آفتاب کے گرد اس وضع میں گردش کرتے ہیں کہ ان کی حرکت سے ایک کامل دائرہ بن جاتا ہے جس کا مرکز آفتاب ہوتا ہے اور سیارہ دوار اس دائرہ کے محیط پر اپنے مرکز کو رکھ کر اپنے محور پر گھومتا ہوا آفتاب کے گرد دورہ کرتا ہے۔ لیکن بعد میں کپلر کو معلوم ہوا کہ (۱) سیاروں کا مدار مستدیر نہیں ہے بلکہ اہلیلجی الشکل ہے جس کا ایک مرکز آفتاب ہوتا ہے[1] اور (۲) سیارہ سے بجانب آفتاب جو خط متحرک کھینچا جائے اس کی جیبیث میں فضا کا جو منطقہ آتا ہے اسے سیارہ کی زمانہ گردش سے برابر کی نسبت ہوتی ہے[2]۔ یہ دونوں اصول اب کپلر کے پہلے اور دوسرے قانون کے نام سے موسوم ہیں۔ آٹھ سال بعد کپلر نے تیسرا قانون دریافت کیا جس نے آفتاب اور سیاروں کے اوسط درمیانی فاصلہ اور ان کے زمانہ گردش کے باہمی تعلقات کی تعیین کر دی۔ اس قانون کے الفاظ یہ ہیں۔ "گردش کے زمانے کا مربع اوسط فاصلہ کے مکعب سے برابر کی نسبت رکھتا ہے[3]۔" اس قانون کا اعلان کپلر نے اپنی کتاب "خلاصہ نظام کوپرنیکس" میں جو ۱۶۱۸ء میں شائع ہوئی کیا تھا

اور یہ بات ثابت کی تھی کہ اقمار مشتری اسی قانون کے تابع ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جو قوانین نظام شمسی کے اعضائے رئیسہ کی حرکات کبیرہ پر حاوی ہیں انہیں کا اطلاق اس کے حواشی کی حرکات صغیرہ پر بھی ہوتا ہے۔

کپلر کے اکتشافات سے قانون غیر متغیر کا جو لازمی تصور پیدا ہوتا ہے اور نظریہ ارضی المرکز کے مقابلہ میں نظریہ شمسی المرکز کا جو ثبوت ان سے بہم پہنچتا ہے وہ پیشوایان کلیسا کو برافروختہ کئے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ محکمہ ترتیب فہرست کتب محرمہ نے جب نظام کوپرنیکس کی تکفیر ان الفاظ میں کی کہ اس کی تعلیم کتاب مقدس کے مخوا کی نقیض ہے تو کپلر کے "خلاصہ" کو بھی ممنوع الاشاعت قرار دیا۔ اسی موقع پر کپلر نے وہ عذر پیش کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس متاقرانہ اعتذار کے الفاظ یہ ہیں: "حرکت ارض و استقرار شمس کے متعلق کوپرنیکس کے مسائل اسی سال سے کسی قسم کی مخالفت یا مزاحمت کے بغیر زیر اشاعت ہیں۔ اس لئے کہ مسائل طبیعیہ پر بحث کرنا اور خدا کی صنعت و حکمت کے چہرے سے پردہ اٹھانا جائز قرار دیا گیا تھا۔ لیکن آج جب کہ ان مسائل کی حقیقت کی تائید میں وہ شہادت بہم پہنچی ہے جو کلیسا کے ارباب حل و عقد کو معلوم نہ تھی تو کائنات کے نظام ترکیبی کی صحیح ماہیت کی اشاعت کی ممانعت کی جاتی ہے!!"

کپلر کے معاصرین میں سے کسی کو بھی اس کے دوسرے قانون کی صحت کا یقین نہ تھا اور نیوٹن کی کتاب "پرنسپیا" کے شائع ہونے سے پہلے کسی نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین کپلر کا فلسفیانہ مفہوم اس زمانہ میں کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ خود ان نتائج سے بے خبر تھا جو آگے چل کر لامحالہ ان سے نکلنے والے تھے۔ اس کی غلطیاں بتا رہی ہیں کہ یہ نتائج اس کے ذہن سے کوسوں دور تھے۔ مثلاً اس کا خیال یہ تھا کہ سیارہ ایک نفس ناطقہ کا جو مدرک کلیات و جزئیات ہے مظہر و مہبط ہے۔ اور پانچوں بڑے سیاروں کے ادوار کی مقادیر علم ہندسہ کے مجسمات خمسہ کے ساتھ نسبت رکھتی ہیں۔ ابتداء وہ یہ سمجھتا تھا کہ سیارہ مریخ کا دور بیضوی الشکل ہے لیکن کہیں مدتوں کی دماغ سوزی کے بعد جا کر اسے اس عظیم الشان حقیقت کا علم ہوا کہ یہ شکل اہلیلجی ہے۔ اس خیال کی بنا پر کہ اجرام سماوی فساد و زوال سے منزہ ہیں ارسطو کا یہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ان کی حرکات کامل الاستدار ہیں اور بجز حرکات مستدیر کے اجرام سماوی میں اور کسی قسم کی حرکت نہیں پائی جاتی۔ کپلر تلخی کے ساتھ شکایت کرتا ہے کہ یہ عقیدہ "اس زمانہ کا چور ہے"۔ اس کی فلسفیانہ جسارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس عقیدہ کو جسے لوگ صدیوں سے بلاچوں و چرا

تسلیم کرتے چلے آئے تھے اس نے یک بیک پس پشت ڈال دیا۔

بعض اہم مسائل میں کپلر کی رائے نیوٹن پر سبقت لے گئی ہے اور کپلر الفضل للمتقدم کا مصداق قرار پاتا ہے۔ مثلاً" اصول کشش ثقل کے متعلق صحیح صحیح خیالات اول اسی نے ظاہر کئے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ مادہ کا ہر ذرہ اس وقت تک حالت سکون میں رہتا ہے جب تک کوئی دوسرا ذرہ اس سکون میں خلل انداز نہ ہو۔ پتھر کی ایک سل اگر زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو زمین اس سل کو اور بھی زیادہ قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اجسام ایک دوسرے کی طرف اپنے ثقل کی مناسبت سے حرکت کرتے ہیں۔ زمین میں اور چاند میں جو فاصلہ ہے وہ چون برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے تو زمین چاند کی طرف اگر اس میں سے بقدر ایک حصہ کے بڑھے گی تو چاند باقی ترپن حصے طے کرے گا۔ کپلر یہ بھی دعوی کرتا ہے کہ سمندر میں مدوجزر کشش قمر کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور سیاروں کی وجہ سے ضرور ہے کہ حرکات قمر کے تناسب میں خلل پیدا ہو۔

ہیئت کی ترقی کے تین دور قرار دئے جا سکتے ہیں۔ دور اول اجرام سماوی کی اعتباری یعنی ظاہری حرکات کے مشاہدات و ارتصادات سے تعلق رکھتا ہے۔ دور ثانی میں ان کی حقیقی حرکات خصوصاً" سیاروں کی گردش کے قوانین کی تکشیف ہوتی ہے اس دور کو کوپرنیکس اور کپلر کے کارناموں نے نمایاں کر دیا۔ دور ثالث ان قوانین کے اسباب کی تحقیق کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ نیوٹن نے پایا۔

دور ثانی کا ترقی کر کے دور ثالث ہو جانا علم تحریک اجسام کے ارتقا پر مبنی ہے جو عہد ارشمیدس یعنی مدرسہ اسکندریہ کی مستعدی کے زمانہ سے جامد و ساکن تھا۔

مسیحی یورپ میں لیونارڈو ڈاونسی سے پہلے جو ۱۴۵۲ء میں پیدا ہوا فلسفہ حرکات و حیل کی طرف کسی نے توجہ نہ کی تھی۔ سائنس کے احیا کا سہرا لارڈ بیکن کے سر نہیں ہے بلکہ ڈاونسی کے سر ہے۔ بیکن نہ صرف ریاضیات سے بے بہرہ تھا بلکہ مسائل طبیعیہ کی تحقیقات میں ہندسہ و ریاضی کے استعمال کو غیر مفید خیال کرتا تھا۔ اس نے نظام کوپرنیکس کے تسلیم کرنے سے ازراہ استحقار انکار کیا ہے اور اس پر لغو و مہمل اعتراضات کئے ہیں۔ ادھر تو گلیلیو اپنے مہتم بالشان دوربینی اکتشافات کی سرحد پر پہنچا ہوا تھا۔ ادھر بیکن یہ شکوک ظاہر کر رہا تھا کہ علمی تحقیقات میں آلات سے کام لینا سودمند نہیں ہو سکتا۔ طریقہ استقرائیہ یعنی جزئیات سے کلیات کے استدلال کا طریقہ اس سے منسوب کرنا تاریخ کے سبق کو بھلا دینا ہے۔ اس کا فلسفہ عملی اعتبار سے ذرا بھی مفید ثابت نہیں ہوا اور کسی شخص کے دل

میں ان تخیلات سے استفادہ کرنے کا خیال تک نہیں پیدا ہوا۔ بجز انگریزی ناظرین کے بیکن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ڈاونسی کے حالات سے ہم آگے چل کر زیادہ مفصل بحث کریں گے۔ اس مقام پر ہم صرف اس قدر لکھنا کافی خیال کرتے ہیں کہ اس کی جو تصانیف مسودہ کی شکل میں ابھی تک موجود ہیں ان میں سے دو تو میلان کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور ایک پیرس میں ہے۔ پیرس والا نسخہ نپولین اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ ڈاونسی کے ستر سال بعد ولندیز مہندس اسٹیومینس پیدا ہوا جس کی کتاب اصول توازن و اعتدال پر ۱۵۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چھ سال بعد گلیلیو کا رسالہ علم الحرکات شائع ہوا۔

اٹلی کے اس نامور شخص کی بدولت علم الحرکات کے دو تین اصولی قوانین دریافت ہوئے جو قوانین حرکت کے نام سے موسوم ہیں۔ ان قوانین کی دریافت سے جو نتائج مترتب ہوئے وہ نہایت ہی اہم ہیں۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ حرکات مسلسل مثلاً" حرکات اجرام سماوی قوت کے دوامی استعمال و اتلاف ہی سے قائم رہ سکتی ہیں۔ لیکن گلیلیو کے قانون اول نے ظاہر کر دیا کہ ہر جسم حالت سکون یا حالت حرکت بخط غیر منحرف پر قائم رہتا ہے تاوقتیکہ کوئی خلل انداز قوت اسے اس حالت کے بدلنے پر مجبور نہ کرے۔ اس ابتدائی اصول کا صحیح طور سے سمجھ لینا طبیعی ہیئت کے اصولی واقعات کے افہام کے لئے لازمی ہے۔ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سطح زمین پر تمام حرکات جلد ختم ہو جاتی ہیں لہٰذا ہم یہ بادی النظری نتیجہ نکالتے ہیں کہ سکون اجسام کی فطری و جبلی حالت ہے۔ پس اگر ہم کو اطمینان ہو جائے کہ ہر جسم سکون و حرکت دونوں میں سے کسی کے ساتھ مبالات نہیں رکھتا بلکہ ہر حالت پر برابر قائم رہتا ہے تاوقتیکہ کوئی مخالف قوت مخل نہ ہو تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے اپنی معلومات میں کس قدر ترقی کی ہے۔ اس قسم کی خلل انداز قوتیں جن سے عام حرکات پر اثر پڑتا ہے رگڑ اور اندفاع ہوا ہیں۔ جب یہ قوتیں موجود نہ ہوں گی تو حرکت استمراری ہو گی۔ چنانچہ اجرام سماوی جو فضائے بسیط میں حرکت کر رہے ہیں ایک حال پر متداماً" متحرک ہیں۔

قوتوں کی مقدار میں خواہ کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو ان کا عمل بالاشتراک و بالاتفاق اس طور پر ہو گا کہ گویا ایک ہی قوت اپنا اثر دکھا رہی ہے دوسری غیر موجود ہے۔ مثلاً" جب کسی توپ کے منہ سے گولا زمین پر گرا دیا جاتا ہے تو وہ بوجہ کشش ثقل کے اثر کے سطح زمین تک ایک خاص وقت میں پہنچتا ہے لیکن اگر اسی گولے کو توپ میں بارود بھر کر

چھوڑا جائے تو اگرچہ اب یہ ایک ثانیہ میں کئی ہزار فٹ کا فاصلہ طے کر جائے گا لیکن کشش ثقل کا اثر اس پر اب بھی بعینہ وہی ہو گا جو پہلے تھا۔ قوتوں کی آمیزش سے کوئی انحطاط یا کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ہر طاقت نے اپنا اثر مخصوص دکھا دیا ہے۔

سترہویں صدی کے نصف آخر میں بوریلی۔ ہوک اور ہائینس کی تصانیف نے اس بات کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا کہ حرکات متدیر کی توجیہ گلیلیو کے قوانین کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔ بوریلی نے اقمار مشتری کی حرکات پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک مرکزی قوت کے عمل سے کیوں کر حرکت متدیر پیدا ہو سکتی ہے۔ ہوک نے ظاہر کیا ہے کہ ایک خارجی مرکزی کشش حرکت مستقیم کو امالہ دے کر حرکت متدیر بنا سکتی ہے۔

۱۶۸۷ء وہ تاریخ ہے جو نہ صرف یورپین سائنس بلکہ انسان کی دماغی ترقی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ یعنی اس سال نیوٹن کی بے مثل اور زندہ جاوید کتاب "پر نیپیا" شائع ہوئی۔

اس اصول کی بنا پر کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی مقدار کی نسبت مستقیم اور اپنے فاصلہ کے مربع کی نسبت معکوس سے کھینچتے ہیں۔ نیوٹن نے ثابت کر دیا کہ اجرام سماوی کی تمام حرکات کی معقول اور شافی وجہ بیان کی جا سکتی ہے اور کپلر کے قوانین یعنی حرکات اہلیجی فضائے طے نمود اور نسبت وقت و مسافت کے متعلق اسی اصول کو مدنظر رکھ کر پیش از پیش حکم لگایا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ نیوٹن کے معاصرین کو حرکات متدیر کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔ یہ تو ایک صورت خاص تھی یعنی اس کا تعلق مشتری کے توابع کی حرکات سے تھا لیکن نیوٹن کی عقل دقیقہ سنج نے اشکال حرکت کے عام مسئلہ کو حل کر دیا۔ جس میں حرکات متدیر و اہلیجی و قریب البیضوی و بعید البیضوی گویا مخروطات کی کل حرکات کی خاص خاص صورتیں شامل تھیں۔

متدربہ لے مہندسوں نے بیان کیا تھا کہ گرتے ہوئے اجسام کا رخ زمین کے مرکز کی طرف ہوتا ہے۔ نیوٹن نے ثابت کر دیا کہ ایسا ہونا لازمی ہے اس لئے کہ کسی کرہ کے کل اجزائے ترکیبی کی کشش کا عام اثر ایسا ہی ہے کہ گویا ان سب کا نقطہ اتصال اس کا مرکز ہے۔

اس مرکزی قوت کو جو اجسام کے ہبوط کی تعیین کرتی ہے کشش ثقل کا نام دیا گیا۔ اس وقت تک بجز کپلر کے اور کسی کو یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ اس قوت کی حد اثر کہاں تک ہے۔ نیوٹن نے سوچا کہ ممکن ہے کہ اس قوت کا عمل چاند پر بھی ہوتا ہو اور یہی وہ قوت ہو جو چاند کو خط مستقیم سے منحرف ہو کر زمین کے گرد گردش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

قانون مربع معکوس کی بنا پر یہ اندازہ لگانا آسان تھا کہ آیا کشش زمین گردش قمر کے بدیہی نتیجہ کی علت کافی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جسامت زمین کی پیائش کو جو نتائج اس وقت بہم پہنچ سکتے تھے ان کے ذریعہ سے نیوٹن کو یہ معلوم ہوا کہ انحراف جرم قمر صرف تیرہ منٹ فی دقیقہ ہے حالانکہ اگر مسئلہ کشش ثقل صحیح ہو تو یہ انحراف پندرہ فٹ ہونا چاہئے۔ لیکن جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ پکارڈ نے ۱۶۶۹ء میں ایک درجہ ارضی کی پیائش زیادہ صحت اور تدقیق کے ساتھ کی جس نے جسامت زمین اور اس لحاظ سے فاصلہ قمر کا اندازہ بدل دیا۔ ۱۶۷۹ء میں جب بعض مسائل متعلق پر "رائل سوسائٹی" میں مباحثہ ہو رہا تھا تو نیوٹن کی توجہ اس اندازہ کی طرف منعطف ہوئی۔ چنانچہ وہ پکارڈ کے عمل کی نقل لے کر گھر آیا اور اپنے پرانے کاغذات نکال کر از سرنو حساب لگانے میں مشغول ہوا۔ جب وہ نتیجہ کے قریب پہنچا تو اسے ایسی گھبراہٹ ہوئی کہ نتیجہ کے استخراج کے لئے اسے مجبوراً" اپنے ایک دوست کی مدد لینی پڑی۔ یہ نتیجہ حسب امید برآمد ہوا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ چاند کا اپنے مدار پر قائم رہنا اور زمین کے گرد گھومنا کشش ثقل ارضی کی قوت کا نتیجہ ہے۔ غرض کپلر کے اس خیال کی جگہ کہ اجرام ساوی عقول عالیہ کے مرکز ہیں ڈیکارٹ کے اس خیال نے لے لی کہ فضا میں اثیر یعنی جوہر لطیف کی لہریں اٹھ رہی ہیں جن کے زور سے اجرام ساوی حرکت کرتے ہیں اور ڈیکارٹ کے خیال کے بجائے نیوٹن کا اصول قوت مرکزی قائم ہو گیا۔

اسی قوت کشش ثقل کی وجہ سے زمین اور باقی تمام سیارے آفتاب کے گرد شکل اہلیلجی بناتے ہوئے گردش کرتے ہیں اور ان میں جو اختلال واقع ہوتا ہے اس کا باعث وہ عمل ہے جو ایک سیارہ کے جرم کا ثقل دوسرے سیارہ پر کرتا ہے۔ اگر ثقل اجرام کی مقدار اور ان کا فاصلہ معلوم ہو تو اختلال کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ زمانہ مابعد کے مہندسوں نے اس کی شکل معکوس بھی دریافت کر لی۔ یعنی اگر کیفیت اختلال معلوم ہو تو جرم ذوالاختلال کا موقع اور ثقل معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سیارہ یورینس کا اپنے قیاسی موقع سے منحرف ہونا سیارہ نیپچون کے اکتشاف کا باعث ہوا۔

نیوٹن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قوانین تحریک اجسام کو اجرام ساوی کی حرکات سے تطبیق دی اور اس بات پر زور دیا کہ سائنس کے قیاسات کی تصدیق و توثیق مشاہدہ و محاسبہ کی موافقت کے ذریعہ سے کرنی چاہئے۔

جب کپلر نے اپنے تین قوانین کا اعلان کیا تو پیشوایان کلیسا نے انہیں مذموم و ناروا

قرار دیا۔ نہ اس لئے کہ وہ غلط تھے بلکہ کچھ تو اس لئے کہ ان سے نظام کوپرنکس کی تائید ہوتی تھی اور کچھ اس لئے کہ کسی غیر متغیر قانون کی مشیت ایزدی و توفیق ربانی کا مزاحم سمجھنا خلاف مصلحت ہے۔ دنیا ایک تماشاگاہ سمجھ لی گئی تھی جس میں خدا کی مرضی ہر روز اپنے کرشمے دکھاتی رہتی تھی اور یہ امر جناب باری کی جلالت و جبروت کے منافی سمجھا گیا تھا کہ اس کی مشیت کسی قاعدے یا قانون کی پابند ہو۔ پادریوں کی طاقت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دعویٰ تھا کہ وہ اپنے رسوخ و اثر سے خدا کے عزائم علی الاطلاق کو فسخ کر سکتے ہیں۔ یعنی دمدار ستاروں کی نحوست کا اثر کم کر سکتے ہیں۔ دھوپ نکلوا سکتے ہیں۔ مینہ برسوا سکتے ہیں۔ کسوف و خسوف کو رکوا سکتے ہیں۔ سیل قدرت کے بہاؤ کا رخ بدل سکتے ہیں اور ہر طرح کے معجزے اور کرامتیں دکھا سکتے ہیں۔ اسی طریقہ سے گھڑی کی سوئی نے رجعت قہقری کر کے پیچھے کی طرح چلنا شروع کر دیا تھا اور آفتاب و ماہتاب چلتے چلتے آسمانوں کے وسط میں رک گئے تھے۔

نیوٹن کے زمانہ سے ایک سو سال پہلے ایک بہت بڑا مذہبی و سیاسی انقلاب ہوا تھا جو اصلاح کینسہ کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ اس انقلاب کی بدولت خیال انسانی کو کامل آزادی تو میسر نہیں ہوئی تھی لیکن قسیسیت کے قدیم پرزے بہت کچھ ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اصلاح یافتہ ممالک میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نیوٹن کی تصانیف کا مذہبی پہلو سے تخلیہ کرے اور پادری بھی نہ چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں خوامخواہ دخل دیں۔ اول اول پراٹسٹنٹ فرقہ کی توجہ اپنے بہت بڑے دشمن یعنی کیتھولک فرقہ کی سازشوں کا توڑ کرنے میں بٹی رہی اور جب اس طرف سے اطمینان ہوا اور اصلاح کے وہ شاخسانے جن کا پھوٹنا لازمی تھا نکلنے شروع ہوئے تو پراٹسٹنٹوں کی توجہ حریف و رقیب کلیساؤں پر مبذول ہو گئی۔ "لوتھرن" "کیلونسٹ" "اسکوپیلئن" اور "پرسبٹرئن" فرقوں کو اپنے مذہبی جھمیلوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ نیوٹن کے مہندسانہ اکتشافات پر اپنا وقت ضائع کرتے۔

غرض ان فرقوں کے باہمی فسادات نیوٹن کے مہتم بالشان نظریہ کے لئے ذریعہ قوت بن گئے۔ تکفیر و تخلیہ تو کجا کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور یہ نظریہ چپکے چپکے پوری قوت پکڑ گیا۔ اس کا فلسفیانہ مفہوم ان عقائد کے مقابلہ میں جو ان فرقوں کا مابہ النزاع تھے بدرجہا زیادہ نتیجہ خیز تھا۔ اس نے نہ صرف آفتاب کو اپنے نظام کا مرکز تسلیم کر کے کپلر کے قوانین کی صحت کا اعتراف کیا بلکہ ثابت کر دکھایا کہ پادریوں کی مخالفانہ دلائل خواہ کیسی ہی قوی کیوں نہ ہوں لیکن آفتاب ضرور ہے کہ ہمارے نظام کا مرکز ہو اور کپلر

کے قوانین مہندسانہ لزوم یا جبر کا نتیجہ ہیں۔ ناممکن ہے کہ یہ قوانین وہ نہ ہوں جو ہیں۔
اس کل بحث سے بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ نظام شمسی کی حرکات میں ربانی مداخلت خلل انداز نہیں ہوتی بلکہ اس کے نظم و نسق کی عنان اس غیرمتبدل و غیرمتغیر قانون کے ہاتھ میں ہے جو بجائے خود مہندسانہ جبر کا نتیجہ ہے۔
ہرشل اول نے دوربین سے جو مشاہدات کئے ان کی بنا پر اسے یقین ہو گیا کہ فضائے فلکی میں بہت سے دہرے ستارے بھی موجود ہیں۔ دہرے سے مراد یہی نہیں کہ وہ اتفاقیہ طور پر ایک ہی خط نگاہ پر واقع ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ طبعاً" ایک دوسرے کے ساتھ مربوط و منوط ہیں اور ایک ستارہ دوسرے ستارے کے گرد گھومتا ہے۔ ہرشل ثانی نے ان مشاہدات کو جاری رکھا اور بہت کچھ وسعت دی۔ برج نبات النعاش کبریٰ کے دہرے ستارے کے اہلیلجی مدار کی ماہیت سیویری نے دریافت کی تھی اور یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس کے کامل دور کی مدت سوا اٹھاون سال ہے۔ ایک اور دہرے ستارے کے حالات ہنڈ نے دریافت کئے تھے۔ اس کا نام کارونا (اکلیل النور) ہے اور اس کے دور کا زمانہ سات سو چھتیس سال ہے۔ ان شموس جوزائی کی حرکات دواری کا اہلیلجی الشکل ہونا صاف بتا رہا ہے کہ قانون کشش ثقل نظام شمسی کی حدود سے بھی بہت پرے نافذ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جہاں تک دوربین پہنچتی ہے قانون کی عملداری نظر آتی ہے۔ ڈلبرٹ نے "انسائیکلوپیڈیا" (دائرۃ المعارف) کے دیباچہ میں لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ کائنات محض ایک واقعہ واحد یا بالفاظ دیگر ایک حقیقت عظمیٰ ہے۔
پس ان تمام واقعات سے کیا ہم کو یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ شموس و کواکب کو خدا نے پیدا کیا اور اپنی مشیت علی الاطلاق سے ان کو ایسے قوانین کے تابع کر دیا جن کے تحت میں اس مشیت کا اقتضا تھا کہ یہ اجرام حرکت کریں؟
یا اس امر کے باور کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود ہے کہ شموس بازغہ کے یہ نظام کسی حکم غیروجہ کی بنا پر معرض وجود میں نہیں آئے بلکہ قانون کا عمل ان کے وجود میں آنے کا باعث ہوا ہے؟
لیپلیس کی تحقیقات کے بموجب نظام شمسی میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔
تمام سیارے اور ان کے اقمار جن اشکال اہلیلجی میں حرکت کرتے ہیں ان کی اہلیلجیت اس قدر کم ہے کہ ان پر تقریباً" دائرہ کی تعریف صادق آتی ہے۔ تمام سیارے ایک ہی سمت میں اور تقریباً" ایک ہی سطح پر گردش کرتے ہیں۔ اقمار اور سیاروں کی گردش کا رخ ایک ہی

ہے۔ آفتاب سیاروں اور ان کے اقمار کی گردش محوری و گردش دوری کا رخ ایک ہی ہے اور اس گردش کی سطوح میں بہت کم تفاوت ہے۔

ممکن نہیں کہ موافقت و مطابقت کی اتنی بہت سی صورتیں محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہوں۔ کیا یہ امر روز روشن کی طرح آشکارا نہیں ہے کہ ان تمام اجسام کی شیرازہ بند ایک قوت ہے اور ایک رشتہ بطور قدر مشترک ان سب کو ربط دینے والا موجود ہے اور یہ ایک ایسے جرم عظیم الشان کے اجزاء ہیں جو نشر و تحلیل سے پہلے واحد و منفرد تھا؟

لیکن اگر ہم تسلیم کر لیں کہ جس مادہ سے نظام شمسی مرکب ہے وہ ایک دفعہ بشکل ضبابتہ النجوم یعنی بصورت غبار کبھی موجود تھا اور اپنے محور کے گرد گھومتا تھا تو تمام وہ خصوصیات جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ازروئے اصول حرکات الاجسام لازمی نتائج کے طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ سیارگان و اقمار و نجیم کے ترکیب پذیر ہونے کی معقول توجیہ ہمارے ہاتھ آ جاتی ہے۔ ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ بیرونی سیارے اور اقمار اندرونی سیاروں اور اقمار سے کیوں بڑے ہیں۔ ہم بتا سکتے ہیں کہ بڑے سیارے کس لئے زیادہ تیزی سے گھومتے ہیں اور چھوٹے سیاروں کی حرکت میں آہستگی پائی جاتی ہے اور بیرونی سیاروں کے اقمار اندرونی سیاروں کے اقمار کے مقابلہ میں کیوں زیادہ ہیں۔ ہم حکم لگا سکتے ہیں کہ سیارے اور اقمار اپنے اپنے دور کس قدر زمانہ میں طے کرتے ہیں۔ ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ زحل کے حلقے کس طور پر ہیں۔ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ آفتاب کی موجودہ طبیعی حالت کی کیا وجہ ہے اور ارض و قمر جن کی طبقات الارضی سرگزشت سے ہم واقف ہیں کیوں کر مختلف مدارج تغیر طے کرتے ہوئے موجود حالت کو پہنچے۔

لیکن خصوصیات متذکرہ بالا میں دو مستثنیات بھی پائی گئی ہیں جو یورینس اور نیپچون سے متعلق ہیں۔

اگر اس قسم کے ضبابتہ النجوم کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو باقی تمام نتائج خودبخود نکلتے چلے آتے ہیں۔ البتہ ایک بہت بڑی مشکل سنگ راہ ہوتی ہے۔ یعنی جن دنیاؤں کو خدا نے بنایا ہے ان سے خدائے قدیر خارج ہوا جاتا ہے۔

اول ہم کو یہ اطمینان کر لینا چاہئے کہ آیا ایسے ضبابتہ النجوم کے وجود کا اعتراف کرنے کے لئے کوئی قوی شہادت بھی بہم پہنچ سکتی ہے یا نہیں۔

مسئلہ ضبابتہ النجوم کا اصولی حصہ ہرشل اول کے اس دوربینی اکتشاف پر ہے کہ افلاک میں جابجا نور کے زرد درخشاں بقعے پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے بعض اس قدر بڑے ہیں کہ

مجردنگاہ کو بھی محسوس ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بقاع پر جب زبردست دوربینوں کے ذریعہ سے نظرڈالی گئی تو معلوم ہوا کہ کواکب کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے لیکن ایک آدھ بقعہ نور مثلاً" برج جوزا کا ضبابہ اکبر ایسا بھی ہے جسے زبردست سے زبردست دوربینیں بھی کواکب میں تحلیل نہیں کر سکیں۔

جو لوگ مسئلہ ضبابتہ النجوم کی حقیقت کا اعتراف نہ کرنا چاہتے تھے انہوں نے یہ اعتراض پیش کیا کہ عدم تحلیل کی وجہ دوربینوں کا نقص ہے۔ ان آلات مشاہدہ میں دو جداگانہ قوتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی قوت اقتباس ان کے "لنز" (زجاجہ) کے دور پر اور قوت ایضاح صورت ان کی سطوح نظریہ کی غایت لطافت و زکاوت پر منحصر ہوتی ہے۔ بڑی دوربینوں میں وصف اول الذکر تو بوجہ اپنی جسامت کے بدرجہ تام موجود ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری صفت شاذونادر ہی بکمال الوجہ پائی جاتی ہے جس کا باعث یہ ہے کہ یا تو ان کی اصولی ترکیب ہی ناقص ہوتی ہے اور یا وزن کے باعث خمیدگی پیدا ہو جانے سے سطح نظریہ بگڑ جاتی ہے۔ لیکن تاوقتیکہ کسی دوربین میں یہ دونوں صفتیں پوری طرح سے موجود نہ ہوں' اس سے غبارانجم کا انفکاک بصورت نقاط منفصل نہیں ہو سکتا۔

حسن اتفاق سے اس عقدے کے حل کرنے کا دوسرا سامان بھی موجود ہے۔ ۱۸۴۶ء میں مصنف کتاب ہذا نے اس حقیقت کا اکتشاف کیا کہ اجسام مستوقد یعنی جلتے ہوئے اجسام کے الوان منشور کا انعکاس مسلسل ہوتا ہے یعنی اس میں نہ سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں نہ روشن دھاریاں۔ اس سے پہلے فرانوفر نے یہ تکشیف کی تھی کہ غاز (گاس) مستوقد کے الوان منشور کا انعکاس غیر متسلسل ہوتا ہے۔ پس ان دونوں اکتشافات کو پیش نظر رکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی ضبابتہ النجوم سے جو روشنی خارج ہو رہی ہے اس کا ماخذ غاز مستوقد ہے یا اجرام و ثوابت و شموس مستوقد ہیں۔ اگر اس کے الوان منشور کا انعکاس غیر متسلسل ہو تو سمجھنا چاہئے کہ یہ ضبابہ حقیقی یا غاز مستوقد ہے اور اگر متسلسل ہو تو مجموعہ انجم سمجھنا چاہئے۔

۱۸۶۴ء میں مسٹر ہگنس نے ایک ضبابہ کو جو برج ڈریکو میں واقع ہے اسی معیار میں جانچا تو معلوم ہوا کہ یہ ضبابہ حالت غازیہ میں ہے۔ اس کے بعد متعدد مشاہدات ہوئے اور ساٹھ ضبابتہ النجوم کا امتحان کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے انیس کے الوان منشور کا انعکاس غیر متسلسل ہے اور باقی کا متسلسل۔

ایسی حالت میں ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آخرکار طبیعی و عملی ثبوت اس امر کا بہم

پہنچ گیا ہے کہ مادہ کے عظیم الشان انبار غازیہ حالت میں موجود ہیں اور ان کے التہاب کے اشتداد کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی روشنی کا رنگ بالکل سفید ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ لیپلیس کا قیاس حجت موجہ و شہادت ناطق پر مبنی ہے۔ اس قسم کے کوبی تودہ مستوقد کی تمدید تبخیر کے ذریعہ سے لازمی ہے اور انجماد و گردش اس کے نتائج ناگزیر ہیں۔ ضرور ہے کہ اس تودہ میں سے جدا جدا حلقے نکل آئیں جن کی سطح ایک ہی ہو اور سیارے اور اقمار پیدا ہوں جو ایک ہی طرح گردش کرتے ہوں اور وسط میں ایک آفتاب رہ جائے جس کے گرد یہ سیارے گھومتے ہوں۔ غرض ایک ہیولانی مادہ سے قوانین قدرت کے عمل کے باعث ایک مدون و مرتب نظام پیدا ہو جاتا ہے اور حرارت کے بتدریج کم ہونے سے مادہ دنیاؤں کی شکل قبول کر لیتا ہے۔[8]

اگر نظام شمسی اور ثوابت و سیار کی دنیاؤں کی آفرینش کی حقیقت یہی ہو تو ہمیں قانون کی عملداری کے متعلق اپنے دائرہ خیال کو مجبوراً" وسیع کر کے اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کائنات میں جو بے شمار اجرام پھیلے ہوئے ہیں نہ صرف ان کی تکوین بلکہ ان کی صیانت میں بھی قانون ہی کو دخل ہے۔

لیکن اس مقام پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ کا اعتراف انتہائے بدعقیدگی پر دلالت نہیں کرتا؟ کیا ہم قادر مطلق خدا کو اس دنیا سے جسے اس نے پیدا کیا ہے بے دخل نہیں کر رہے ہیں؟

ہم نے صاف مطلع پر ابر گھرتے ہوئے اکثر دیکھا ہے۔ سیاہی کا ایک دھندلا سا نقطہ غبار کا ایک ننھا سا مرغولہ اول اول نمودار ہوتا ہے اور بتدریج بڑھتے بڑھتے سیاہ و غلیظ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ آسمان کے ایک بہت بڑے حصہ پر کالی گھٹا چھا جاتی ہے۔ یہ گھٹا انوکھی اور نرالی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ آفتاب کا نور جب اس میں سے چھنتا ہے تو ایک عجب دلفریب سماں نظر آنے لگتا ہے۔ لکہ ہائے ابر دوش ہوا پر سوار ہو کر بڑھے چلے جاتے ہیں۔ گھٹا چھٹنے لگتی ہے اور جس طرح بتدریج نمودار ہوئی تھی اسی طرح شاید آہستہ آہستہ کم ہوتی ہوئی ہوا میں غائب ہو جاتی ہے اور مطلع پھر صاف ہو جاتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے اجزائے منفوط جن سے یہ گھٹا مرکب تھی حرارت میں تخفیف ہو جانے کے باعث ان آبی نجروں کے انجماد سے پیدا ہوئے جو پہلے سے کرہ ہوا میں موجود تھے اور منجمد ہو کر انہوں نے سحابی شکل اختیار کر لی۔ بادل کی تابانی یا ظلمت کی توجیہ ہم علم مناظر و مرایا کے اصول پر کرتے ہیں۔ ہوا کے زور سے اس کی نقل و حرکت کا

سبب بیان کرتے ہوئے ہم علم تحریک اجسام کے اصول پیش کرتے ہیں۔ اس کے نمودار ہو کر غائب ہو جانے کی وجہ ہمارے نزدیک علم کیمیا کے اصول میں پائی جاتی ہے۔ یہ ہمیں کبھی خیال نہیں آتا کہ اس شکل گریزپا کی تکوین و ترکیب کو خدا کی بلاواسطہ مداخلت سے منسوب کریں۔ اس کے کل واقعات متعلقہ کی توجیہ ہم طبیعی قوانین کی بنا پر کرتے ہیں اور شاید ادب و احترام مانع آئے کہ ہم بادل کی تخلیق کے لئے جناب باری کے قدرت کو بروئے کار آنے کی زحمت دیں۔

لیکن اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو کائنات کی حقیقت بھی اس بادل سے زیادہ نہیں۔ اس کے اجزا بخارات آبی تھے۔ اس کے اجزا شموس و عوالم ہیں۔ ہماری نظروں میں گو اس کی عظمت و تمکنت کی کوئی انتہا نہ ہو لیکن عقل غیرمحدود و لازوال کے نزدیک اس کی ہستی ایک رمتی بدلی ہے۔ جس طرح آسمان پر ایک بادل آتا ہے ایک جاتا ہے اسی طرح یہ نظام ثوابت (یعنی کائنات) بے شمار دوسری دنیاؤں کا قائم مقام ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہیں اور ان گنت ان دنیاؤں کا پیشرو ہے جو وجود میں آنے والی ہیں۔ غرض انقلاب و انبدال علت و معلول اور سبب و مسبب کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔

اگر طبیعیات کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم کہرے اور بادل کے اسباب پر غور کر سکتے ہیں حالانکہ اس قسم کے مسائل علم حوادث الجو کے صغائر میں داخل ہیں تو کیا اسی اصول کی بنا پر دنیاؤں اور کائناتوں کی ابتدا و آفرینش کے مسائل پر غور کرنے کی ہم کو اجازت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ آخر یہ دنیائیں بھی بادل ہی ہیں اگرچہ ان کی وسعت مکان کا پیمانہ کسی قدر زیادہ ہے اور ان کی حقیقت کہرے سے زیادہ نہیں اگرچہ اس کی وسعت زمان کا معیار کسی قدر کم ناپائدار ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ایسی حدفاصل قائم کر سکے جس کے ایک طرف طبیعیات کا عمل ہو اور دوسری طرف مابعدالطبیعیات کا؟ کیا اشیا کی مقدار اور مدت بقا کے متعلق ہمارے قیاسات محض اعتباری نہیں ہوتے؟ برج جوزا میں جو سحابتہ النجوم نظر آتا ہے اگر ہم اس میں موجود ہوں تو کیسا شاندار نظارہ ہمیں دکھائی دے۔ اس کے مہتمم بالشان انقلابات کا ظہور میں آنا۔ اس کے آتشیں غبار کا منجمد ہو کر دنیاؤں کی شکل اختیار کرنا ہمیں اس قائل معلوم ہو کہ خدا بذات خود موجود ہو کر ان کی نگرانی کرے۔ اس مقام بعید سے جہاں کروڑوں میل کی ہماری نگاہوں کے سامنے کوئی ہستی نہیں اور شموس بازغہ فضائے فلکی میں ہمیں چمکتے ہوئے ندوں

کے برابر نظر آتے ہیں۔ برج جوزا کا یہ سنبابتہ النجوم دھندلی سے دھندلی بدلی سے بھی زیادہ موہوم معلوم ہوتا ہے۔ گلیلیو نے برج جوزا کا ذکر کرتے وقت اسے اس درجہ حقیر و ہیچ میرز سمجھا ہے کہ اس کا حوالہ تک نہیں دیا اور اگر کوئی شخص اس کی تکوین و تخلیق کو کسی علت ثانیہ سے منسوب کرتا اور جو انقلابات اس میں ہو رہے ہیں ان کے لئے خدا کی مطلق العنان دست اندازی کو ضروری نہ سمجھتا تو اس زمانہ کے کٹر سے کٹر پادری بھی اسے قابل الزام نہ خیال کرتے۔ پس جب اس سنبابتہ النجوم کے متعلق ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں تو وہ نفس ناطقہ جو وہاں کی کسی دنیا میں موجود ہو گا ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرے گا؟ اس سنبابتہ النجوم کی وسعت ہمارے نظام شمسی سے کروڑوں گنی زیاد ہے۔ ہم وہاں سے مطلق نظر نہیں آتے اور اس لئے وہاں کی عقول کے لئے ہمارا عدم وجود برابر ہے۔ کیا وہ عقول ہماری آفرینش اور بقا کے لئے خدا کی فوری و بلاواسطہ مداخلت کو ضروری و لازمی تصور کریں گی؟

نظام شمسی سے قطع نظر کر کے اب ہم اس کے ایک جزو حقیر یعنی اپنے کرہ زمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ہے اس میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ کیا یہ تبدیلیاں ربانی مداخلت کا نتیجہ ہیں یا غیر متغیر قانون کے مسلسل اور نہ ٹلنے والے عمل کا؟ قدرت کی شکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہر لحظہ متغیر ہوتی رہتی ہے اور طبقات الارضی زمانوں میں یہ تغیر نہایت وسیع اور حیرت انگیز پیمانہ پر ہوا ہے۔ لیکن ان قوانین میں جو ان تغیرات پر حاوی ہیں خفیف سی تبدیلی بھی نہیں ہوتی۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے لیکن وہ نہیں بدلتے۔ موجودہ نظام کون و فساد اس عظیم الشان زنجیر کا محض ایک حلقہ ہے جس کا ایک سرا ماضی کی غیر معین و برتراز احصا سرحد کی طرف چلا گیا ہے اور دوسرا سرا مستقبل کی غیر محدود و خارج از قیاس نہائی کی جانب پھیلا ہوا ہے۔

اس امر کی طبقات الارضی اور ہیئتی شہادت موجود ہے کہ قرون ماضیہ میں زمین اور چاند کی حرارت بمقابلہ زمانہ موجودہ بہت زیادہ تھی۔ یہ حرارت بتدریج کم ہوتی گئی لیکن کمی کا عمل اس قدر بطی الاثر تھا کہ کسی مختصر مدت میں اس کا محسوس ہونا ممکن نہ تھا۔ البتہ طویل زمانوں کے انقضا کے بعد یہ کمی نمایاں ہوتی گئی۔ جو حرارت بذریعہ تبخیر زمین سے خارج ہوئی ہے وہ فضا میں چلی گئی ہے۔

مادہ کے کسی تودہ کی تبرید خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا غیر مسلسل نہیں ہوتی یعنی اس کا عمل رک رک اور تھم تھم کر نہیں ہوتا۔ بلکہ ریاضی کے ایک مقررہ قانون کے تابع ہوتی ہے

اگرچہ ان تغیرات عظیمہ کے لئے جن سے ہمیں یہاں بحث ہے نہ تو نیوٹن کا کلیہ کام دیتا ہے نہ ڈیولانگ کا اور نہ پٹیٹ کا۔ اس واقعہ سے ہمارے دعوے میں کوئی فرق نہیں آ سکتا کہ ایک زمانہ میں حرارت زمین کی رفتار زوال معمول سے کسی قدر کم ہو گئی۔ ایک زمانہ میں یہاں تک کم ہوئی کہ دور زمہر سکریہ نمودار ہو گیا۔ پھر ایک زمانہ میں کچھ عرصہ کے لئے معمول سے زیادہ ہو گئی۔ نہ یہ بحث ہی ہمارے دعوے پر کوئی اثر ڈال سکتی ہے کہ آیا یہ اختلافات سطح زمین کے بلند و پست ہونے کے باعث پیدا ہوئے یا حرارت آفتاب کے موقت الا شتداد ہونے کی وجہ سے حرارت آفتاب کا موقت الا شتداد ہونا حرارت کی تدریجی کمی میں محض بمنزلہ ایک اختلال کے ہے۔ سیاروں کی حرکات کے اختلالات سے اصول کشش ثقل کی تائید و توثیق ہوتی ہے نہ کہ تردید و تغلیط۔

حرارت کا یہ زوال ظاہر ہے کہ ہمارے کرہ کی طبعی نوعیت میں بے شمار تبدیلیوں کا باعث ہوا ہو گا۔ سکڑنے کی وجہ سے اس کا حجم بہت کچھ کم ہو گیا ہو گا۔ اس کے دن کا طول گھٹ گیا ہو گا۔ اس کی سطح شکستہ ہو گئی ہو گی اور جن جن طبقات کی قوت اندفاع سب سے زیادہ کم ہو گی وہاں بڑے بڑے دراڑ اور غار پڑ گئے ہوں گے۔ سمندر کی کثافت بڑھ گئی ہو گی۔ اس کے پانی کی مقدار گھٹ گئی ہو گی۔ کرہ ہوا کے اجزائے ترکیبی خصوصاً ''انجرات آبی اور ''کاربانک ایسڈ'' (حموضۃ الصخم) کی مقدار میں تغیر واقع ہو گیا ہو گا۔ ہوا کا دباؤ کم ہو گیا ہو گا۔

یہ انقلابات اور بہت سے دوسرے تغیرات جو ان کے ساتھ لازم ملزوم ہیں۔ غیر مسلسل طور پر نہیں بلکہ نہایت ترتیب و باقاعدگی سے واقع ہوئے ہوں گے اس لئے کہ وہ علت کبرے یعنی زوال حرارت جو ان تغیرات کے ظہور کا باعث تھی خود ایک ہندسی قانون کے تابع تھی۔

لیکن ان اٹل تبدیلیوں کا اثر کائنات غیرذی حیات ہی پر نہیں پڑا۔ کائنات ذی حیات بھی ساتھ ساتھ برابر متاثر ہوتی گئی۔

ہر شکل ذوی الاعضا خواہ وہ ازقسم نباتات ہو یا ازقسم حیوانات اس وقت تک تبدیلی قبول نہیں کرتی جب تک کہ اس کے حوالی میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر حوالی بدل جائیں تو وہ شکل یا تو متغیر ہو جائے گی اور یا بالکل معدوم ہو جائے گی۔

اگر تغیر حوالی فوری و ناگہانی ہو تو انعدام زیادہ قرین قیاس ہے لیکن اگر تغیر علی التدریج ہو تو تبدیل یا تقلیب کا امکان زیادہ ہو گا۔

چونکہ اس واقعہ کے یقینی ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت کے مظاہر غیرذی روح میں قرنہاقرن کے مرور سے وسیع و عظیم تغیرات واقع ہوئے ہیں۔ چونکہ کرہ زمین کا بیرونی خول اور سمندر اور کرہ ہوا وہ نہیں ہیں جو کسی زمانہ میں تھے۔ چونکہ خشکی اور تری کی تقسیم اور دوسری طبیعی حالتیں بدل گئی ہیں۔ چونکہ مخلوقات ذی حیات کے حوالی میں اس قدر عظیم الشان تغیرات ہوئے ہیں لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ ان مخلوقات کو بھی اسی طرح کے مدارج فناواستحالہ طے کرنے پڑے ہوں گے۔

اس قسم کے فناو استحالہ کے وقوع میں آنے کی ناطق اور قطعی شہادت اس کثرت سے موجود ہے کہ یقین کو مجبوراً" اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

اس موقع پر ہم مکرر اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ چونکہ وہ قوت جو ان تغیرات کا باعث تھی خود ایک ہندسی قانون کی پابندی کر رہی تھی لہٰذا اس کے یہ نتائج بھی اسی قانون کے تابع متصور ہونے چاہئیں۔

ان تمام مباحث سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ مخلوقات ذوی الاعضا کی ترقی قانون غیرممکن التغیر کے عمل کی تابع ہے۔ خدا کی غیر مسلسل غیر مربوط اور سنت شکن مداخلت کا ماحصل نہیں ہے۔ ان مباحث سے ہمارے اس خیال کو بھی تقویت ہوتی ہے کہ بجائے تخلیق کے اس فعل کے جو بغتتہ صادر ہوا ہو ایک جسم ذوی الاعضا کی شکل کا مستحیل ہو کر دوسری شکل اختیار کر لینا بہت زیادہ قرین عقل ہے۔ تخلیق یا پیدائش کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شے دفعتاً" خودبخود نمودار ہو جائے اور استحالہ سے مراد یہ ہے کہ ایک شکل جو پہلے سے موجود ہے بتدریج متغیر ہوتی ہوئی دوسری صورت اختیار کر لے۔

اس طور پر ہمارا ادراک مسئلہ ارتقا کی حقیقت عظیمہ سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر وجود ذوی الاعضا حوادث کے سلسلہ سے مربوط و منوط ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس وجود کو دوسرے مظاہر آفرینش سے کوئی لگاؤ نہیں اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے سلسلہ علت و معلول سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسے واجب الحدوث تصور کرنا چاہئے۔ اس کا تعلق اس برتراز اعصا سلسلہ حوادث سے ہے جو زمانہ ماضی میں علی سبیل تدرج پیدا ہو کر زمانہ موجودہ تک پہنچا ہے اور سلسلہ مقدرات آئندہ کی تیاری کا سامان کر رہا ہے۔ اس وسیع زنجیر کے حلقوں کا انقباض کچھ کچھ وقفہ پر مبدل بحالت بسط ہو جاتا ہے۔ یعنی ارتقا کا اثر نمودار ہوتا ہے۔ لیکن ان تغیرات کے دوران میں وہ قوانین جن کی حدادی اس زنجیر کی تیاری کی ذمہ دار ہے مطلق نہیں بدلتے۔

اگر ہم حیوانات کی کسی جنس کے ظہور پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس کا وجود تغیر و استحالہ کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ تخلیق کے ذریعہ سے مجددا" نمودار نہیں ہوا۔ اس کی ابتدا بہ شکل ناقص ان دوسری اشکال کے درمیان ہوتی ہے جن کا دور حیات قریب الاختتام ہے اور جو معدوم ہونے کے قریب ہیں۔ اس کی متعدد نوعیں یکے بعد دیگرے بتدریج نمودار ہوتی ہیں اور ہر نوع پہلی نوع سے زیادہ کامل و مکمل ہوتی ہے یہاں تک کہ کئی قرنوں کے بعد وہ منتہائے اکملیت پر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں سے اسی تدریج اور آہستگی کے ساتھ زوال شروع ہوتا ہے تا آنکہ اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح سراپردہ عدم میں چلی جاتی ہے۔

مثلاً" اگرچہ حیوانات ذات اللہ دور ثالثہ دور ثالثہ الاخری سے مخصوص ہیں لیکن یہ جنس اپنی آمد آمد کا اعلان کئے بغیر اسی دور میں دفعتہ و بغتتہ ظاہر نہیں ہوتی۔ دور ثانیہ کے قرون بعیدہ میں ہم اسے بشکل ناقص اس طور پر پاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ بالاخر یہ ترقی کرتے کرتے کامل الشکل و متناسب الاعضا ہو گئی ہے۔

اسی طرح جنس ہوام الارض قرون ثانیہ کی حیاتی خصوصیات میں سے ہے۔ جس طرح ہم کسی بدلتے ہوئے طلسمی پردہ تصویر میں ایک منظر کی صورتوں کو دھندلا اور مدہم ہوتا ہوا اور ان دھندلی صورتوں میں سے ایک نئی صورت کو نمودار ہوتا ہوا دیکھتے ہیں بتدریج واضح و نمایاں ہو کر نہایت صاف نظر آنے لگتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر دوسرے مرقع کے لئے جگہ خالی کر دیتی ہے اسی طرح زمین پر رینگنے والے حشرات الارض بشکل ناقص و موہوم نمودار ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ منتہائے شباب کو پہنچ کر انحطاط کے رستہ پر پڑ لیتے ہیں۔ ان تغیرات میں ایک بھی ایسا نہیں جو فوری و ناگہانی ہو بلکہ یہ درجہ بدرجہ ایک دوسرے میں غیر محسوس طور پر ضم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یہ نتائج وہ ہیں جو کسی طرح ٹل نہ سکتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ گرم خون والے حیوان قرون اولی کی اس ہوا میں زندگی بسر کر سکیں جس میں حموضہ الفحم کا عنصر اس درجہ غالب تھا۔ لیکن درختوں کے پتوں نے سورج کی شعاعوں کے ساتھ مل کر کیمیاوی طریقہ پر اس زہریلے عنصر کو ہوا سے خارج کر دیا۔ حموضی جوہر کوئلہ کی شکل میں زیرزمین دفن ہو گیا۔ آکسیجن کا عنصر اس سے علیحدہ ہو گیا اور اس طور پر حیوانات زندہ رہنے کے قابل ہو گئے۔ کرہ ہوا میں جب یہ تبدیلی ہوئی تو سمندر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ حموضہ الفحم کا

جو جزو اعظم اس میں ملا ہوا تھا وہ اس سے جدا ہو گیا اور چونے کا پتھر جو اب تک پانی میں محلول تھا رسوب بن کر ٹھوس ہو گیا۔ جس قدر کوئلہ طبقات زمین میں پیوند ہوا۔ اسی قدر کلس مغم غیر مقرر الشکل حالت میں نہیں بلکہ اشکال ذوی الاعضا بن کر علیحدہ ہو گیا۔ آفتاب کی شعاعیں روز بروز اپنا عمل کرتی رہیں لیکن اس کام کے ختم ہونے کے لئے بے انتہا دنوں کی ضرورت تھی۔ کرہ ہوا کا زہریلے اجزا کی آمیزش سے پاک و صاف ہونا قرنہاقرن کے مرور کا محتاج تھا۔ علی ہذا القیاس سرد خون والے حیوانات کے دور کا گرم خون والے حیوانات کے دور میں ضم ہونا مدت ہائے دراز کے امتداد کا متقضی تھا۔ لیکن یہ طبیعی تغیرات بپا بندی قانون عمل میں آتے رہے اور اجسام ذوی الاعضا کی تبدیل شکل ناگہانی یا خدا کے کسی بے ضابطہ فعل کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ ان تغیرات طبیعی کا لازمی و لابد نتیجہ ہونے کے لحاظ سے ان کی طرح قانون کا ماحصل تھی۔

اگر اس مضمون پر تفصیل سے نظر ڈالنی مقصود ہو تو ناظرین میری کتاب "ٹر میٹیز آن ہیومن فزیالوجی" (علم حیات انسانی) کی دوسری جلد کے پہلے دوسرے اور ساتویں ابواب ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

غالباً" اس سوال کا جواب اب آسانی سے دیا جا سکے گا کہ آیا انتظام عالم پابند و قانون ہے یا مداخلت ربانی کا تابع ہے جو سلسلہ علت و معلول کے سلسلہ کو توڑتی رہتی ہے۔ اس سوال کے ہر پہلو پر نظر غائر ڈالنے کے لئے ہم ایک ایسے نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اگرچہ ایک لحاظ سے تو بے حقیقت محض ہے لیکن ایک اعتبار سے نہایت اہم اور معنی خیز بھی ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ آیا انسانی جماعتوں کی تاریخی زندگی قضا و قدر کی نہ ٹلنے والی منزل میں ارتقائے سابق التعیین کی علامات ظاہر کر رہی ہے۔ آیا کوئی شہادت اس واقعہ کی موجود ہے کہ اقوام کی زندگی قانون غیر متغیر کی تابع ہے اور آیا یہ خیال صحیح ہے کہ جماعت انسانی میں افراد انسانی کی طرح اجزا عدم میں سے دفعتہ پیدا نہیں ہو جاتے بلکہ ان اجزا کے تدریجی ارتقا سے پیدا ہوتے ہیں جو پہلے سے بشکل ناقص موجود تھے؟

مسئلہ ارتقا کا مفہوم جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ کرہ زمین پر زندگی کے نمودار ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک اشکال ذوی الاعضا کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے۔ جس کے اجزا نے مدارج نشوونما منزل بمنزل طے کئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس مسئلہ کو قابل اعتراض یا قابل تحقیر خیال کرے تو اسے غور کرنا چاہئے کہ جن تبدیلیوں میں اسے کلام ہے ان کی مرحلہ پیمائی وہ خود کر چکا ہے۔ نو مہینے تک جب کہ وہ ماں کے

پیٹ میں تھا اس کی زندگی کی نوعیت آبی تھی اور اس زمانہ میں اس نے درجہ بدرجہ بہت سی متمایز مگر متناسب شکلیں بدلیں۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کی زندگی آبی سے ہوائی ہو گئی وہ ہوا میں سانس لینے لگا۔ نئی قسم کی غذا اسے دی جانے لگی۔ اس کی پرورش کا طریقہ بدل گیا لیکن ابھی نہ وہ کچھ دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا نہ پہچان سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے ہوش و حواس کی نعمت عطا ہوئی۔ اسے معلوم ہونے لگا کہ ایک بیرونی و خارجی دنیا بھی موجود ہے۔ وقت مقرر پر اس کے اعضا تبدیل غذا کے خوگر ہو چلے۔ دانت نکل آئے اور خوراک بدل گئی۔ شیرخوارگی کے زمانہ کے بعد طفولیت کا دور آیا اور عہد طفولیت مبدل بہ عالم شباب ہو گیا۔ اس کا جسم نشوونما پاتا گیا اور ساتھ ساتھ قوائے عقلی بھی ترقی کرتے گئے۔ جب اس کی عمر ۱۵ سال کے قریب پہنچی تو بوجہ اس ترقی کے جو اس کے جسم کے خاص خاص اعضا نے کی تھی اس کی اخلاقی سیرت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ نئے جذبے نئے خیالات اور نئی امنگیں اس پر اپنا اثر ڈالنے لگیں۔ اس بات کا ثبوت کہ ان اعضا کا ارتقا ان جذبات کے ظہور کا باعث تھا فن تشریح ابدان کی موشگافیوں سے بہم پہنچتا ہے اور یہ ترقی یا تبدیلی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جسم کو منتہائے بلوغ اور دماغ کو منتہائے کمال پر پہنچنے کے لئے کئی سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخرکار ریعان بلوغ کی حد آ پہنچتی ہے اور اس کے بعد انحطاط کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس دور کے حسرت ناک نظارے یعنی قوائے جسمانی و ذہنی کے ضعف کی تصویر کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ شاید یہ قول مبالغے کی آمیزش سے پاک ہے کہ ہر انسان جو روئے زمین پر موجود ہے ایک صدی سے بھی کم مدت میں ان تمام منازل کو طے کر لیتا ہے بشرطیکہ اس کا خاتمہ قبل از وقت نہ ہو چکا ہو۔

کیا زندگی کی ان تمام منازل کے طے کرنے میں ہر شخص کو قدم قدم پر مداخلت ربانی کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے یا بجائے اس کے یہ عقیدہ زیادہ تر قرین عقل ہو گا کہ وہ بے شمار نفوس انسانی جو روئے زمین پر آباد رہ چکے ہیں ایک غیرمتغیر و ہمہ گیر قانون کے تابع رہے ہیں۔

لیکن افراد اقوام کے اجزائے عنصری ہیں ان کا تعلق اقوام سے وہی ہے جو اجزائے جسمانی کو جسم کے ساتھ ہے۔ جسم کے اجزائے ترکیبی نظام جسمانی میں داخل ہو کر اپنا کار مفوضہ انجام دیتے ہیں اور جب یہ کام ختم ہو چکتا ہے تو وہ فنا ہو جاتے ہیں اور جسم سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔

فرد کی طرح قوم بھی نعیر اپنے علم کے وجود میں آتی ہے اور اس کی موت میں بھی

اس کی مرضی یا خواہش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قومی و انفرادی زندگی میں بجز اس کے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ قوم کی عمر بمقابلہ فرد کی عمر کے ذرا زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم اپنی ساعت موقوت سے ایک لمحہ بھی زیادہ زندہ رہے۔ ہر قوم کی زندگی پر اگر نظر غائر ڈالی جائے گی تو معلوم ہو گا کہ اگر اس کو زندگی کے کل مدارج طے کرنے کا موقع ملا ہے تو بچپن۔ جوانی۔ بڑھاپے سبھی منزلوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔

افراد و اقوام دونوں کی زندگی میں بشرطیکہ زندگی کی مختلف منازل طے کی گئی ہوں۔ خاص خاص خصوصیات بطور قدر مشترک پائی جاتی ہیں اور چونکہ افراد کی حالت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی زندگی حکومت قانون کی تابع ہے لہذا یہ استدلال غیر حق بجانب نہیں ہے کہ اقوام کی رفتار ترقی بلکہ کل بنی نوع انسان کا ارتقا بخت و اتفاق سے متاثر نہیں ہوتا اور فوق العادت دست اندازیاں تاریخی واقعات کے شیرازہ کو پراگندہ نہیں کرتیں بلکہ ہر تاریخی واقعہ کسی واقعہ ماسبق کا معلول ہے اور ان واقعات کے لئے جو ظہور میں آنے والے ہیں بمنزلہ علت ہے۔

لیکن یہ نتیجہ مذہب جبریہ یعنی اس یونانی فلسفہ کا اصل اصول ہے جس کی نسبت ہم ایک مقام پر بیان کر آئے ہیں کہ مصیبت کے وقت جب انسان کا بجز بیکسی کے اور کوئی یارو مددگار نہیں ہوتا یہ فلسفہ اس کے لئے سرمایہ تسلی و تسکین ثابت ہوا اور نہ صرف مشاہیر یونان بلکہ رومتہ الکبریٰ کے جلیل القدر مدبروں سپہ سالاروں اور فرماں رواؤں کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتا رہا۔ اس فلسفہ نے بخت و اتفاق کے عنصر کو ہر شے سے خارج کر دیا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ تمام واقعات کو جو جبرو قدر کے لزوم لابد کے تابع ہیں خیر کامل کی تکمیل کا ذریعہ قرار دینا چاہئے اس لحاظ سے یہ فلسفہ گویا صدق و خلوص تسناحت و تقشف' نیکی و پاک بازی کی تعلیم دیتا تھا اور بنی نوع انسان کو یہ سکھاتا تھا کہ عقل و تمیز سے کام لیں۔ اشیسکیو کے اس قول سے شاید ہمیں بارائے اختلاف نہ ہو گا کہ جبرئین یعنی پروان حکیم زینو کی تیاری نسل انسانی کے حق میں ایک بہت بڑی آفت تھی اس لئے کہ یہی وہ لوگ تھے جن میں سے اکابر و مشاہیر پیدا ہوئے۔

لاطینی مسیحیت اپنے پایائے شکل میں اس اصول کی قطعی مخالف ہے کہ انتظام عالم بذریعہ قانون چل رہا ہے۔ کلیسائے عیسوی کی اس شاخ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معجزوں اور فوق القدرت تصرفات کا ایک اچھا خاصہ روزنامچہ پیش نظر ہو جائے گا۔ اس روزنامچہ کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ مقدس بزرگوں کی التجاؤں نے بسا اوقات نظام قدرت کو

(بشرطیکہ ایسا کوئی نظام حقیقت میں موجود ہو بھی) درہم و برہم کر دیا ہے۔ مورتوں اور تصویروں نے عجیب و غریب کرشمے دکھائے ہیں اور ہڈیاں بال اور دوسرے تبرکات کرامتوں کے ظہور میں آنے کا باعث ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر اشیا کی حقیقت و صداقت کا معیار ان کی غیر ممکن الترديد تاریخی اصلیت نہیں ہے بلکہ ان کی معجزہ نمائی اور کرامت آفرینی ہے۔ ایسی منطق کے نرالے ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے جو ایک ادعا کا ثبوت کسی دوسرے واقعہ غیر متعلق کی ناقابل فہم شہادت سے دے؟

دور جاہلیت کے تاریک ترین زمانہ میں بھی حقیقت شناس اور معقولیت پسند مسیحیوں کو ان ربانی تصرفات اور کراماتی دست اندازیوں کے صحیح ہونے میں ضرور شبہ ہوا ہو گا۔ بہ نظام قدرت کے باقاعدہ ارتقا میں عظمت و جبروت کی ایک ایسی شان نظر آتی ہے کہ ہم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ہماری انفرادی زندگی کے واقعات میں اس بلا کا تسلسل پایا جاتا ہے کہ ہم کو دوسروں کی زندگی میں خوارق عادات یعنی اس تسلسل کے انقطاع کا عمل میں آنا "طبعا" باور نہیں آتا۔ ہر سمجھدار آدمی اچھی طرح جانتا ہے کہ قدرت نے اس کی ذات کے لئے اپنی روش کبھی نہیں بدلی۔ اس کے لئے کبھی کوئی معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر واقعہ کو کسی واقعہ ماسبق سے منوط و مربوط پاتا ہے اور اس کو علت اور اسے معلول قرار دیتا ہے۔ جب یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ اس کے فلاں ہم جنس کی خاطر سنت اللہ تبدیل ہو گئی قانون قدرت بدل گیا اور فلاں فوق القدرت واقعہ معجزے کے طور پر ظاہر ہوا تو لامحالہ اسے یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ وہ ہمجنس یا تو خود فریب خوردہ ہے یا دوسروں کو فریب دے رہا ہے۔

غرض جب اصلاح کنیسہ کا زمانہ آیا تو نشانات آسمانی کے بارے میں رومن کیتھولک عیسائیوں کے عقیدے کو سخت صدمہ پہنچا۔ بعض بڑے بڑے متالہین اور نیز پراٹسٹنٹ کلیسا مسئلہ جبر و قدر کے قائل ہو گئے۔ کیلون زینو کا ہمصفیر ہو کر کہتا ہے کہ ہم ازل کے روز سے جب کہ ابھی عالم کا نام و نشان بھی نہ تھا پابند تضاد و قدر کئے گئے ہیں۔ اس پابندی میں ہماری رضامندی کو کوئی دخل نہیں بلکہ کارفرمائے قدر نے اپنے مقاصد کی تکمیل کو پیش نظر رکھ کر ہمیں جیسا چاہا بنا دیا۔ کیلون کا یہ دعوی اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ جو واقعات گزرتے ہیں وہ ازل سے مقدر ہو چکے ہیں۔ اس طور پر کئی صدیوں کے گزرنے کے بعد دوسری صدی کے مسیحی فرقوں یعنی فرقہ بسیلیلنں و ویلنٹائننں کے خیالات پھر نمایاں ہونے لگے اور یہ وہی فرقے تھے جن کے ادریت آمیز عقائد نے مسیحیت کی شاخ میں مسئلہ تثلیث کا

پیوند لگا دیا تھا۔ ان فرقوں کا یہ دعوی تھا کہ انسان سے تمام افعال بر سبیل اضطرار سرزد ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایمان بھی ایک وہبی نعمت ہے جس سے انسان کو مجبوراً" مستفیض ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا اخلاقی پہلو گو کیسا ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہو لیکن اس کی نجات کے لئے لازمی ہے کہ ایمان میں خلل نہ آنے پائے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدائے بزرگ و برتر ہی تمام اشیا کا مصدر و مخرج ہے۔ اس طرح وہ خیالات رواج پا گئے جن کو سینٹ آگسٹائن نے اپنی تصانیف میں بوضاحت درج کیا ہے۔ یعنی خدا نے اپنی فوق القانون مشیت سے بعض اشخاص کی قسمت میں بلالحاظ ان کے ایمان یا اعمال صالح کے راحت ابدی لکھ دی ہے۔ اور اسی طرح بعض دوسرے اشخاص کو مبتلائے عذاب مخلد کر دیا ہے۔ پیروان مسئلہ تاخر تقدیر ہبوط کا یہ عقیدہ تھا کہ ہبوط آدم مشیت ایزدی کے اقتضا کے تابع تھی۔ یعنی حضرت آدم خدا کی اجازت سے مبتلائے معصیت ہوتے اور پیروان مسئلہ تقدیم تقدیر ہبوط یہ مانتے تھے کہ ہبوط اپنے مہلک نتائج سمیت ازل سے مقدر ہو چکا تھا اور ہمارے آبائے اولین شروع ہی سے کوئی اختیار نہ رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے اس جماعت کا عقیدہ سینٹ آگسٹائن کے اس قول کے خلاف تھا کہ :

"یہ کہنا گناہ ہے کہ بجز حسنات کے خدا کسی اور امر کو بھی مقدمات میں داخل کرتا ہے۔"

پس کیا یہ خیال صحیح ہے کہ نجات ابدی خدا کے ان مقدرات میں سے ہے جن کے ذریعہ سے قبل ازانکہ بنیاد عالم رکھی گئی اس نے اپنی پوشیدہ مصلحت کو اس غرض کی تکمیل کے لئے وقف کر دیا کہ بنی نوع انسان کے ایک منتخب اور برگزیدہ طبقہ کو لعنت و عذاب مخلد سے نجات دلائی جائے؟ کیا یہ سچ ہے کہ جماعت انسانی میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہیں قادر مطلق نے بلاوجہ بے قصور غیر منتہی مصیبت اور غیر مختتم عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟

۱۵۹۵ء میں عقائد عیسوی کی توضیح کے لئے جو تحریر بمقام لیمبتھ (واقع انگلستان) قلمبند کی گئی اس میں یہ فقرہ درج ہے کہ "خدا نے بعض انسانوں کو ازل ہی سے سعید بنایا ہے اور بعض کو شقی قرار دیا ہے۔" ۱۶۱۸ء میں اس مسیحی کونسل نے جو بمقام ڈارٹ منعقد ہوئی تھی اس عقیدے کی تائید کرتے ہوئے اس کے مخالفین کو ملعون قرار دیا اور ان کے ساتھ ایسی سختی کا برتاؤ کیا کہ بہت سے لوگوں کو ممالک غیر میں جا کر پناہ لینی پڑی۔ کلیسائے انگلستان نے بھی جیسا کہ اس کے دستور العمل عقائد کے سترہویں فقرہ سے پایا جاتا ہے اس عقیدہ کی حمایت کی۔

رومن کیتھولک عیسائیوں نے پراٹسٹنٹوں پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا ہے کہ انہوں نے انتظام عالم میں قانون کی مداخلت کو ایک حد تک تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن ان جلے پھپھولوں کے پھوڑنے سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ یورپ میں جہاں جہاں پراٹسٹنٹ مذہب نے رواج پایا معجزے اور کرامتیں صادر ہونی یک قلم موقوف ہو گئیں۔ اس موقوفی سے اس بہت بڑے مالی منافع کا بھی خاتمہ ہو گیا جو کلیسا کو خانقاہوں اور تبرکات کی مسیحائی سے حاصل ہوا کرتا تھا۔ تذکرات الغفران جو اصلاح کینسہ کے محرک تھے بکنے بند ہو گئے اور ان پروانوں کی تجارت جس کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ پادریوں کی خدمت میں ایک رقم مقررہ کے پیش کرنے پر خدا کی طرف سے کھلے بندوں گناہ کرنے کی اجازت مل جائے ماند پڑ گئی۔

اصلاح کینسہ کا فلسفیانہ مفہوم اس رومن کیتھولک عقیدے کے ابطال پر متضمن تھا کہ خدا قسیسی شفاعت کی تحریک پر معاملات انسانی میں مسلسل دست اندازی کرتا رہتا ہے لیکن اس ابطال میں سب کے سب اصلاح یافتہ کلیساؤں نے خاطرخواہ حصہ نہیں لیا۔ سائنس نے گزشتہ چند سال سے شہادت کا جو انبار اس مسئلہ کے متعلق جمع کرنا شروع کیا ہے کہ انتظام کائنات تابع قانون ہے۔ اسے ان میں سے اکثر کلیساؤں نے اشتباہ بلکہ عدم استحسان کی نظر سے دیکھا ہے لیکن شہادت کا وزن روز بروز بڑھتا چلا جاتا رہا ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ اس تشکک و ناپسندیدگی کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو جائے۔

جب حالت یہ ہے تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ کتشیس کے ہمصفیر ہو کر سیسرو کے اس قول کو اپنا اصول موضوعہ قرار دیں کہ ایک ابدی و غیرمتغیر قانون تمام اشیاء اور تمام زمانوں پر حاوی ہے۔

---

[1] اگر دو سوئیوں کو ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر ایک دفتین میں گاڑ کر ان میں تاگے کا ایک گرہ زدہ حلقہ ڈالا جائے اور پنسل کی نوک سے تاگے کو تان کر تناؤ کے ساتھ ساتھ نوک کو حرکت دی جائے تو جو بیضہ نما شکل پیدا ہو گی وہ شکل اہلیلجی کہلائے گی۔ دونوں سوئیاں اس شکل کے دو مرکز ہوں گے۔ سوئیوں میں جس قدر زیادہ فاصلہ ہو گا اسی قدر اس شکل کی اہلیلجیت زیادہ ہو گی اور جس قدر کم فاصلہ ہو گا اسی قدر یہ شکل دائرہ کے قریب ہو گی تاآنکہ اگر دونوں سوئیوں کو ملا دیا جائے اور پھر ڈوری تان کر پنسل کی نوک سے حلقہ کھینچا جائے تو بجائے شکل اہلیلجی کے کامل دائرہ پیدا ہو جائے گا۔ مترجم

[2] سر رابرٹ بال نے اپنی کتاب "دی اسٹوری آف دی ہیونس" (داستان افلاک) میں اس

قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "ہر سیارہ آفتاب کے گرد ہر نقطہ پر جس رفتار کے ساتھ گھومتا ہے اس کی سرعت اس قدر ہوتی ہے کہ اگر اس نقطہ سے بجانب آفتاب ایک خط کھینچا جائے تو وہ خط مساوی رقبوں کو مساوی زمانوں میں طے کرے گا۔"
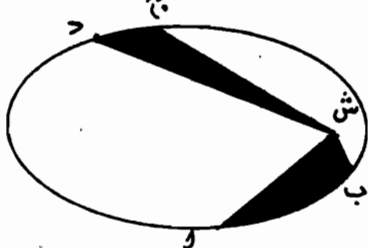
مثلاً" اگر شکل ذیل میں ا ب ش اور ج د ش کا رقبہ مساوی ہو تو جو سیارہ یہ شکل اہلیلجی بناتا ہوا آفتاب کے گرد گھومے گا وہ اب کو باوجودیکہ اس کا فاصلہ ج د سے زیادہ ہے ایک ہی وقت میں طے کرے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ ا ب کا موقع ج د کے مقابلہ میں ش یعنی شمس سے زیادہ قریب ہے اور ازروئے اصول حرکت سیارہ اس منطقہ میں پہنچتے ہی بوجہ قرب آفتاب زیادہ سریع السیر ہو جاتا ہے لیکن منطقہ ج د چونکہ اتاب سے نسبتہً زیادہ دور ہے لہٰذا یہاں سیارہ کی رفتار اسی نسبت سے ست پڑ جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت مرور مساوی ہو جاتا ہے۔ مترجم

ے چونکہ سیاروں کی حرکت کامل الاستدار نہیں ہے بلکہ اہلیلجی ہے لہٰذا گردش کی حالت میں ہر سیارہ کا فاصلہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے لیکن باوجود اس تبدیلی کے ہم اس فاصلہ کا تعین اس کا اوسط نکال کر کر سکتے ہیں جس کی سب سے زیادہ آسان شکل یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ کو کم سے کم فاصلہ کے ساتھ جمع کر کے اس کا نصف لے لیا جائے۔ یہ نصف مقدار اوسط فاصلہ کہلائے گی۔

کیپلر اچھی طرح جانتا تھا کہ مختلف سیاروں کا زمانہ گردش مختلف ہوتا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اوسط فاصلہ جس قدر زیادہ ہو گا اسی قدر زمانہ گردش بڑھا ہوا ہو گا۔ اس علم کی بنا پر اس نے دونوں کی باہمی نسبت دریافت کرنی چاہی۔ حساب لگانے سے اسے معلوم ہوا کہ زمانہ گردش اوسط فاصلہ سے برابر کی نسبت نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے کہ اگر یہ نسبت صحیح سمجھی جائے تو جس سیارہ کا اوسط فاصلہ دوسرے سیارہ کے اوسط فاصلہ سے دگنا ہو گا اس کا زمانہ گردش بھی دوسرے سیارہ کے زمانہ گردش سے دگنا ماننا چاہیے۔ حالانکہ مشاہدہ اس کی نفی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ بعید سیاروں کا زمانہ قریب سیاروں کے زمانہ کے مقابلہ میں دگنے سے زیادہ اور تگنے کے قریب ہے۔

کیپلر نے اپنی فوق العادت مہندسانہ قابلیت سے اس محنت کے بعد جو کسی معمولی دماغ کے انسان کو دیوانہ بنا دیتی آخر میں صحیح نسبت دریافت کر لی جو اس کے تیسرے قانون میں مضمر ہے۔

سر رابرٹ بال اس قانون کی شرح اس طرح کرتے ہیں: "مثال کے طور پر ہم کرہ زمین اور سیارہ زہرہ کا مقابلہ کریں گے۔ اگر آفتاب سے زمین کا اوسط فاصلہ اکائی فرض کیا جائے تو سیارہ

زہرہ کا اوسط فاصلہ ۷۲۳۳ء۰ ہو گا۔ اگر کسور اعشاریہ کو پہلی کسر کے بعد حذف کر دیا جائے تو زمین کا زمانہ گردش ۳۶۵ء۳ دن اور زہرہ کا ۲۲۴ء۷ دن قرار پاتا ہے۔ کپلر کا قانون کہتا ہے کہ ۳۶۵ء۳ کا مربع ۲۲۴ء۷ کے مربع سے وہی نسبت رکھتا ہے جو ایک کو ۷۲۳۳ء۰ کے مکعب سے ہے۔ اس نسبت کی تصدیق ضرب کے عمل کے ذریعہ سے بآسانی کی جا سکتی ہے۔" مترجم

کہ سطح زمین پر جو اجسام اوپر سے نیچے کی طرف گرتے ہیں ان کی سرعت رفتار سولہ فٹ فی ثانیہ ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر مرکز زمین سے چار ہزار میل کے فاصلہ پر ایک جسم سولہ فٹ فی ثانیہ کی سرعت رفتار سے اس کی طرف کھنچتا ہے۔ سطح زمین سے اگر یہ جسم چار ہزار میل یعنی مرکز زمین سے آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر ہو تو چونکہ مرکز زمین سے اس کا فاصلہ بمقابلہ سطح زمین دگنا ہے لہٰذا ازروئے قانون کشش ثقل قوت کشش ثقل فاصلہ کی نسبت معکوس سے گھٹ جائے گی یعنی ایک چوتھائی رہ جائے گی۔ بالفاظ دیگر ایک ثانیہ میں وہ جسم صرف بقدر چار فٹ کے گرے گا۔ مترجم

۵ سر ولیم ہرشل سے مراد وہ شخص ہے جو ایک مشہور و معروف ہیئت دان تھا اور ۱۷۳۸ء میں بمقام ہینوور پیدا ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں ہرشل انگلستان گیا اور وہیں بودوباش اختیار کر لی۔ مروجہ دوربینیں چونکہ بہت چھوٹی تھیں جن سے اس کا شوق رصد بینی پورا نہ ہوتا تھا لہٰذا اس نے خود ایک بہت بڑی دوربین بنانی شروع کی جس میں اسے کامیابی ہوئی اور اس کی مدد سے اس نے نظام شمسی کا وہ سیارہ دریافت کیا جو یورینس کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ جارج ثالث نے اس کی نمایاں علمی خدمات کے صلہ میں اس کا وظیفہ مقرر کیا اور خطاب سے بھی سرفراز کیا اس کا انتقال ۱۸۲۲ء میں ہوا۔ مترجم

۶ سر ولیم کا بیٹا سر جان فریڈرک ولیم ہرشل ایک نامور باپ کا نامور بیٹا ہے۔ ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا۔ فن ہیئت میں اس کی دقت نظر اور مسلسل اور ان تھک محنت نے بہت کچھ معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ باپ بیٹے ہراشلہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہرشل ثانی کا انتقال ۱۸۷۱ء میں ہوا۔ مترجم

۷ خدائے قدیر تو شاید خارج ہو جائے مگر اس کا بنایا ہوا ضابطہ یعنی وہ قانون جس کا مفہوم لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا میں مضمر ہے خارج نہیں ہو سکتا۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ ہم مقنن کے قائل ہیں۔ آپ قانون کے ہم ذات کا اعتراف کرتے ہیں آپ صفات کا۔ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ آپ مادہ اور حرکت کو۔

چلو بس ہو چکا جھگڑا نہ تم خالی نہ ہم خالی

مترجم

۸ انہی خیالات کو ہم نے نظم کا لباس پہنایا ہے۔ یہ نظم جس کا انداز بیان فلسفیانہ تخیل کے ثقل کی ایک حد تک تلافی کرتا ہے۔ حضرات ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے جو خشک فلسفہ پڑھتے

پڑھتے اکتا گئے ہوں گے یہاں درج کی جاتی ہے۔

اول اول جب نہ تھا کچھ بھی بجز ذات خدا
ماسوا کا شکل و صورت سے تعلق تھا جدا
مادے کے منفصل اجزا تھے مانند غبار
ساحت افلاک میں ذروں کا طوفاں تھا بپا
سر بکف جاتا ہے وادی قدم میں جب کہ وہم
کچھ نہیں پاتا خلا میں وہ ہیولا کے سوا
اس جگہ اس مسئلہ پر ہم نہیں کرتے ہیں بحث
ابتدا کیوں کر ہوئی ہو گی کب اس کی انتہا
ہم فقط اتنا کہیں گے قرن گزرے بے شمار
رفتہ رفتہ مادہ پانے لگا نشوونما
پہلے جو کچھ منفصل تھا ہو گیا اب متصل
تو وہ غبرائے فاسق کوکب دری بنا
کھا کے ذروں نے تصادم ہائے پیہم سے رگڑ
پہلے پیدا کی حرارت اور بعد اس کے ضیا
کچھ تو سیارے بنے اور کچھ ثوابت بن گئے
کچھ ہوئے ماہ منیر اور کچھ شموس بازغہ
اس طرح بعد نظام شمس قائم ہو گئے
جن کا پھیلا ہے خدا جانے کہاں تک سلسلہ
اپنے محور پر ہوئے سرگرم گردش آفتاب
اور لگا گرد ان کے سیاروں کا پھرنے جمگھٹا

جس مکاں کے ہم مکیں ہیں یہ بھی اک سیارہ ہے
صحن قدرت کا اک چھوٹا سا آتش پارہ ہے

معرض ہستی میں جب آیا ہمارا آفتاب
نور تھا اس کی ردا اس کی قبا تھا التہاب
حرقت تنویر کا گویا کروڑوں میل میں
روئے دریائے فضا پر تیرتا تھا اک حباب
جرم تھا اب کی طرح اس کا سراپا آتشین
کود کی بھی تھی وہی اس کی جو ہے اس کا شباب
گردوپیش اس کے نہ تھی آراستہ انجم کی بزم
تھی محیط اس کی خلا بے انتہا و بے حساب
یکہ و تنہا وہ رائض تھا خلا کے صحن میں
ایک بھی کوکب نہ تھا اس وقت اس کا ہمرکاب
مدتیں اس نے گزاریں عالم تجرید میں
اپنی تنہائی پہ صدیوں اس نے کھایا پیچ و تاب
جس طرح ہوتا ہے کوہ آتش افشاں مشتعل
جوش میں رہ رہ کے آیا آخر اک دن آفتاب
پھلجھڑی کے منہ سے جیسے نور کے جھڑتے ہیں پھول
کچھ ستارے ٹوٹ کر اس سے گرے مثل شہاب
آٹھ سیارے یہی ہیں جو توابع اس کے ہیں
ان میں اور اس میں ہوا قائم تجاذب کا حجاب
دیکھ کر اپنی ولادت کے طریقے کو یونہی
کر لئے پیدا انہوں نے اپنے اپنے ماہتاب

کہتے ہیں جس کو نظام شمس انور ہے یہی
وہم جس کا عقل میں لاتا ہے چکر ہے یہی

جب زمین آ کر ہوئی صحن خلا میں جلوہ گر
خاصیت خورشید کی اس میں عیاں تھی سربسر
شکل بھی کروی تھی اس کی اپنے مصدر کی طرح
جرم بھی تھا مثل خورشید اس کا موج شرر
متصل تبخیر سے لیکن بہ امضائے زمان
رفتہ رفتہ ہو چلا زائل حرارت کا اثر

آتشیں حالت مبدل ہو گئی سیال سے — ہو گیا جس سے مزاج ارض گویا گرم تر
پھر بتدریج انجماد اپنا عمل کرنے لگا — اور جو مائع تھا پہلے بن گیا وہ اب حجر
سنگ خارا کی زمین نے ایک چادر اوڑھ لی — جس کے نیچے پڑ رہا تھا رود آتش میں بھنور
جابجا لیکن بلندی اور پستی چھا گئی — مادہ ازبسکہ اندر کا ہوا زیرو زیم
تھیں یہ ناہمواریاں اس سطح سنگیں پر جہاں — آج لیتا ہے انہیں کا نام انساں بحروبر
بن گئے کہسار اور میدان بلندی تھے جہاں — اور جہاں پستی تھی اس میں کر لیا دریا نے گھر
اک گھٹا ٹوپ انجروں کا چھا رہا تھا ہر طرف — جسنے جل تھل کر دئے پل بھر میں بن کر ابر تر

اتحاد مہرو ابرو و عدد بادہ برق سے
موج آب شور لپکی تامغرب شرق سے

ہو چکا جس وقت کامل یہ مواد وطین — اور ہوئی جب معتدل بن کر حرارت بھی معین
وقت آ پہنچا کہ ہو سرسبز باغ روزگار — اور موالید ثلثہ سے بھرے مہد زمین
خامہ ابداع صناع ازل ظاہر کرے — پردہ فطرت پہ مخلوقات کے نقش رنگین
رہ گیا باقی تھا پڑنا سب فقط اک جان کا — ڈھل چکا سانچے میں تھا دنیا کا جسم نازنین
زندگی اک راز ہے اور راز داراک راز خود — جس کا پردہ عقل انسانی اٹھا سکتی نہیں
ہیں مظاہر جس کے بینش کے لئے عین القیاس — ہیں معارف جس کے دانش کے لئے حق الیقین
اس چھپی قوت سے ظاہر اہل دنیا کو کیا — اس چھپی قوت نے جو ہے رمز عقل اولین
مردم و ماہی و مورد سبزہ و آب و حجر — صنعت باری کے خرمن کے یہ سب ہیں خوشہ چین

اپنی حکمت سے بنائے بے حساب اس نے جہان
اپنی قدرت کے دکھائے لاجواب اس نے نشان
مترجم

۹ے اسی خیال کو شاعر نے کس خوبصورت سے ادا کیا ہے

ہنگامہ گرم ہستی ناپائدار کا — چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
مترجم

۱۰ے مصطفےٰ جب خاک میں بیٹے کو آئے سونپ کر
ٹکڑے ٹکڑے تھا کلیجہ پارہ پارہ تھا جگر

کہتی تھی شان رسالت ہے یہ وقت صبروشکر — گرچہ تھا دل کا تقاضا روئے جی کھول کر
تھے صحابہ بھی شریک اس غم میں پیغمبرؐ کے ساتھ — سب کے دل اس صدمہ جانکاہ سے تھے پراثر
اتفاقاً" آفتاب اس دن گہن میں آ گیا — ظلمتستان. بن گیا جس سے مدینہ سربسر

اک صحابی نے کہا فرط عقیدت سے کہ آج — سوگوار اس غم میں ہے سورج بھی یا خیرالبشر
جو جواب اس بات کا اس کو پیمبر نے دیا — آب زر سے منقش ہے صفحہ تاریخ پر
کیا تعلق آدمی کے غم سے سورج کو بھلا — اک نشان قدرت حق ہے کسوف اے بے خبر

مترجم

دسواں باب

لاطینی مسیحیت اور تمدن جدید کا تعلق

ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک لاطینی مسیحیت نے یورپ کے عقل و ادراک پر قبضہ کئے رکھا جس کے نتائج کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔

ان نتائج نے جو شکل اختیار کی وہ اصلاح کینسہ کے وقت شہر روما کی حالت اور خانگی و عمرانی زندگی میں یورپ کی حالت سے ظاہر ہوتی ہے۔اقوام یورپ کے کندھوں پر دہری حکومت کا جوا رکھا ہوا تھا یعنی ایک طرف انہیں حکام دینوی کی متابعت کرنی پڑتی تھی دوسری طرف حکام دینی کی۔ اہل یورپ جہالت اوہام پرستی اور تکالیف مدنیہ میں مبتلا تھے۔ رومن کیتھولک مذہب کی ناکامیابی کی وجوہ۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ۔ دینی و روحانی حکومت سے ترقی کر کے یہ مطلق العنان شخصی حکومت کی شکل میں بدل گئی۔ کردینالوں کی انجمن اور کیوریا کی کارروائی۔ پاپائے خزانہ کے لئے بیش قرار محاصل کی ضرورت بداخلاقی کی محرک ہوتی ہے۔

جو فائدے یورپ کو کیتھولک عہد حکومت میں پہنچے ان میں حکومت کے منشا کو کچھ دخل نہ تھا بلکہ وہ محض اتفاقی یا ضمنی تھے۔

عام نتیجہ یہ ہے کہ پاپائیت کا سیاسی اثر موجودہ زمانہ کے تمدن کے حق میں مضر تھا۔

لاطینی مسیحیت چوتھی سے لے کر سولھویں صدی تک یورپ کی مادی اخلاقی اور عقلی حالت کی ذمہ دار ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس فرض سے یہ کس طرح عہدہ برآ ہوئی۔

موجودہ بحث کی اغراض کے لحاظ سے ہم جو کچھ لکھیں گے صرف یورپ ہی کے متعلق لکھیں گے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پاپائیت کا یہ دعوی کہ اسے الوہیت کے ساتھ ایک نسبت قریبہ ہے اور ساری دنیا کو اس کی اطاعت کرنی چاہیئے اسے کل بنی نوع انسان کی حالت کا

جواب وہ ٹھہراتا ہے۔ جنوبی و مشرقی ایشیا کے عظیم الشان اور قدیم مذاہب کے مقابلہ میں اس کے اثر کا فقدان ایک اہم اور نکتہ خیز بحث پیدا کرتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا اثر وہیں تک پہنچا جہاں رومتہ الکبری کا شہنشاہانہ اقتدار نافذ تھا لیکن اس سیاسی نتیجہ کو وہ ازراہ غایت استحقار رد کر دیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کینسہ کے آغاز پر بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس وقت کی تمدنی حالت کو زمانہ قدیم کی حالت سے مقابلہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ نہ تو یورپ کے اخلاق میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ نہ بلحاظ عقل و ادراک اس نے کوئی ترقی کی ہے اور نہ لوگوں کی حالت میں کوئی اصلاح ہوئی ہے۔ خود رومتہ الکبری کی عظمت و شوکت صفحہ تمدن سے محو ہو گئی تھی۔ سنگ مرمر کی وہ سڑکیں جن پر قیصر اگسٹس کو ایک زمانہ میں ناز تھا نابود ہو چکی تھیں۔ اجڑے ہوئے ہیکل۔ ٹوٹے ہوئے مینار کھنڈروں سے پٹے ہوئے کمپنیا کی عظیم الشان نہروں کی طویل مسقف محرابیں۔ حسرت ناک ویرانی کا مرقع نگاہ کے سامنے پیش کرتی تھیں۔ کیپٹل کا برج مشید جس پہاڑی پر واقع تھا اس کا نام اب کوہ گوسفند ہو گیا تھا اس لئے کہ یہاں بکریوں کے گلے رکھے جاتے تھے۔ جس مقام پر فورم کی وہ عالیشان عمارت قائم تھی جہاں روما کے آئین و قوانین وضع ہو کر دنیا میں نافذ ہوئے تھے اسے اب احاطہ گاؤ کہتے تھے اس لئے کہ یہاں گائیں بندھتی تھیں۔ قیاصرہ کا پر تکلف محل مٹی کے ڈھیروں میں چھپ گیا تھا جن پر جھاڑ جھنکار اگ آئے تھے۔ کراکلا کے حمام اپنے جلوخانوں جمنوں اور حوضوں سمیت خزانہ آب کے برباد ہو جانے کے باعث جس سے انہیں پانی پہنچا کرتا تھا مدت کے ویران ہو چکے تھے۔ اس عظیم الشان عمارت کے کھنڈروں میں بلند محرابوں اور وسیع چبوتروں پر پھولدار بیلیں اور خوشبودار جھاڑیاں ہر طرف اگی ہوئی تھیں۔ رومتہ الکبری کی ویران عمارتوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان عمارت یعنی کا ثیرئم کا صرف ایک تہائی حصہ باقی رہ گیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ اس میں نوے ہزار تماشائیوں کی نشست کی گنجائش تھی لیکن انقلاب روزگار نے ازمنہ وسطی میں اسے قلعہ بنا دیا اور اس کے بعد روما کے ناخلف و نالائق فرمانرواؤں نے اس کی دیواریں توڑ توڑ کر اپنے محلوں کے لئے پتھر کی سلوں کا ذخیرہ فراہم کیا۔ پاپایان روما میں سے بعض نے اس میں پشمینہ بافی اور شورہ سازی کے کارخانے قائم کئے اور بعض نے یہ تجویز کی کہ اس کے عالیشان چھتوں اور کمانچوں میں بیوپاریوں کی دکانیں لگائی جائیں۔ وہ لوہے کے قبضے جن سے اس کے پتھر جڑے ہوئے تھے چوری جا چکے تھے[1]۔ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور سلسلہ شکست و ریخت

جاری تھا۔ خودرو نباتات کی جو مختلف قسمیں اس عظیم الشان کھنڈر میں پیدا ہو گئی تھیں ان کی ماہیت پر متعدد کتابیں زمانہ حال میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ "دی فلورا آف دی کالیشریم" (نباتات کالیثریم) میں چار سو بیس انواع کا حال موجود ہے۔ پرانی پرانی وسیع و دلکشا عمارتوں کے کھنڈروں میں ٹوٹے ہوئے ستون۔ صنوبر اور عرعر اور بوسیدہ دستکاری کے ابھرویں نقش دیواروں سے جدا ہو ہو کر گرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ عالم نباتات بھی اس حسرت انداز تغیر میں شریک تھا۔ ریحان جو ایک زمانہ میں ایونٹائن کے کنارے بہ کثرت پھولتا تھا تقریباً" معدوم ہو گیا تھا۔ لارل (شجرۃ الغار) کی جگہ جس کے پتے کبھی تاجداروں کی پیشانی کو زینت بخشتے تھے۔ عشق پیچان کی بیل اگ آئی تھی جو موت کی علامت ہے۔

لیکن شاید اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اس تمام ویرانی و بربادی کے ذمہ دار پاپایان روما نہیں قرار دیئے جاسکتے اور اس ادعا کی تائید میں بیان کیا جائے کہ ایک سو چالیس برس سے کم کے عرصہ میں روما کو الیرک۔ جنسرک۔ اریسمر۔ وٹیجیر اور ٹاٹیلا نے یکے بعد دیگرے مسخر کیا اس کی بہت سی بڑی بڑی عمارتیں قلعوں اور برجوں کی شکل میں بدل دی گئیں۔ وٹیجیز نے کیمپنیا کو برباد کر کے نہروں کو ضائع کر دیا۔ ٹاٹیلا نے قیاصرہ کے محلوں کو تاخت و تاراج کیا۔ پھر قوم لامبرڈ نے اس کے محاصرہ پر محاصرے کئے۔ اس کے بعد رابرٹ گسکارڈ اور اس کی نارمن فوج نے شہر کوانٹو نائن مینار سے لے کر فلیمنشن دروازہ تک اور لیٹرن سے لے کر کیپٹل تک جلا دیا۔ بعد ازا کانسٹیبل بوربون نے اسے لوٹا اور اجاڑا۔ کئی دفعہ دریائے ٹائبر کی طغیانی نے اسے غرقاب کیا اور بارہا اس کو زلزلہ کے صدمے سہنے پڑے۔ یہ سب سچ ہے لیکن ہم کمیاوٹی کے الزام کو بھی نہیں فراموش کرسکتے جو اپنی تاریخ فلارنس میں لکھتا ہے کہ اٹلی پر شمال کی وحشی اقوام نے جس قدر حملے کئے سب پاپایان روما کی تحریک سے کئے۔ اس لئے کہ انہیں نے ان وحشیوں کو اٹلی پر چڑھائی کرنے کی دعوت دی تھی۔ روما کی تباہی و بربادی کا باعث گاتھ یا ونڈل یا نارمن یا عرب قوم کی حملہ آوری نہیں ہے۔ بلکہ خود پاپاؤں اور ان کے بھتیجوں نے اس خوبصورت شہر کو غارت کیا اپنی چونے کی بھٹیوں کے لئے انہوں نے اس کے کھنڈروں سے مصالحہ بہم پہنچایا۔ اپنے محلوں کی تعمیر کے لئے انہوں نے قدیم عالیشان عمارات کے پتھر اکھڑوا اکھڑوا کر منگوائے۔ پرانے مندروں اور ہیکلوں کی غارت گری سے گرجاؤں کی آرائش کا سامان لیا۔

اس وحشیانہ پن کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کہ مندر توڑ توڑ کر گرجا بنائے جائیں!! اس الزام اور اسی طرح کے دوسرے الزامات کا دھبہ پاپایان روما کے دامن سے نہیں چھوٹ سکتا۔

عالیشان کارنتھی وضع کے ستونوں کو خیر اوپر چڑھا کر ان بزرگواروں نے مسیحی اولیا کی مورتیں بنوا ڈالیں۔ شاندار مصری چوکو نئے میناروں کی پاپائی کتبوں کے انتقاش سے بے حرمتی کی گئی۔ قیصر سیویرس کے عہد کی بے نظیر عمارت سپٹیزونیم کو اس غرض سے منہدم کیا گیا کہ اس کے املہ سے سینٹ پیٹر کا گرجا تعمیر کیا جائے۔ پنتھئین کی کانسی کی چھت گلا کر وہ ستون ڈھالے گئے جن سے سینٹ پیٹر کے روضہ کو آراستہ کیا گیا۔

کیپیٹل کے برج میں وٹربو کا گھنٹہ اپنی ماتمی گونج سے بہت سے پاپاؤں کی موت کا اعلان کر چکا تھا اور عمارات کی بے حرمتی اور لوگوں کی فاسد الاخلاقی کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ غرض پاپائی روما کو قدیم روما کا کچھ پاس نہ تھا بلکہ اور اس سے الٹی نفرت تھی جس کا رہ رہ کا اظہار ہوا۔ پاپایان روما اول اول فرمان روایان قسطنطنیہ کے ماتحت تھے۔ پھر تاجدارن فرانس کے مددگار ہو گئے اور اس کے بعد یورپ کی عنان فرمان فرمائی ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ گویا ان کی حکومت نے بھی ہمسایہ اقوام کی حکومت کی طرح تغیرو انقلاب کے مختلف مدارج طے کئے اور ان کے اغراض و مقاصد اور مطالبات و دعاوی یک قلم بدل گئے۔ پاپائیت کو تغیر نہیں ہوا تو صرف ایک بات میں نہیں ہوا یعنی اس کا تعصب بدستور قائم رہا۔ چونکہ اسے یورپ کی مذہبی زندگی کے مرکز ہونے کا ذعوی تھا لہٰذا اس نے پاپائیت سے خارج ہر مذہبی وجود کے تسلیم کرنے سے اصرار کے ساتھ انکار کیا حالانکہ اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ سیاسی اور دینی ہر ایک اعتبار سے وہ ازسرتاپا بوسیدہ اور متعفن ہو رہی تھی۔ ارسمس اور لوتھر نے جب روما کی بے دینی اور دہریت پر نظر ڈالی تو ان کے اندام انقاد ارادت پر لرزہ طاری ہو گیا۔

ان واقعات میں سے اکثر کی تفصیل کے لئے ہم رینکی[۳۵] کی وقایع نویسی کے رہین منت ہیں جس نے اپنی تاریخ میں روما کے اخلاقی مفاسد و ذمایم کی تصویر کھینچ دی ہے۔ انتخاب کے وقت پاپایاں روما عموماً" عمر رسیدہ سالخوردہ ہوتے تھے۔ اس لئے عنان اقتدار ہمیشہ نئے ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ ہر انتخاب امیدوں اور تمناؤں کا انقلاب ہوتا تھا۔ جس جماعت کے تمام افراد کو بام ترقی پر پہنچنے کا موقع حاصل ہو اور ہر شخص کو اپنے دامن میں دولت اور طاقت کے گنج شائگان کا سمیٹنا ممکن نظر آئے اس کا ہر فرد بھلا کیوں نہ دوسروں کے حقوق کی پامالی کی دھن میں لگا ہوا ہو۔ اگرچہ واقعہ اصلاح کنیسہ کے وقت روما کی آبادی گھٹتے گھٹتے اسی ہزار رہ گئی تھی پھر بھی عہدہ داروں کی تعداد بہت بڑی تھی اور ان عہدوں کے امیدواروں کی تعداد اور بھی زیادہ تھی۔ کامیاب پاپا ہزاروں خدمتیں عطا کر سکتا تھا اور

یہ وہ خدمتیں ہوتی تھیں جن سے بہت سے بے قصور ملازم نہایت بے دردی سے برطرف کر دیئے جاتے تھے اور بہت سی جدید خدمتیں اس غرض سے قائم کی جاتی تھیں کہ امیدواران ملازمت کے ہاتھ فروخت کی جائیں۔ کسی امیدوار کی دیانت یا قابلیت کو ہرگز پیش نظر نہ رکھا جاتا تھا بلکہ صرف ان امور پر لحاظ ہوتا تھا کہ وہ فریق مقتدر کی کیا خدمت کر چکا ہے یا کر سکتا ہے اور ماموری کے معاوضہ میں کسی قدر نذرانہ پیش کرنے کی استطاعت رکھتا ہے ہمارے امریکن ناظرین ان حالات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ امریکہ کے پریزیڈنٹ کے انتخاب کے موقعہ پر بھی اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ مجلس انتخاب پاپائے روما۔ جماعت نامزدگی پریزیڈنٹ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے چنداں مغایر نہیں ہے۔ قرعہ انتخاب جس کے نام پر پڑتا ہے اسے دونوں صورتوں میں بہت سے عہدوں کے عطیہ کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

ولیم ساکن مامسبری کا بیان ہے کہ اس کے زمانہ میں اہل روما نے صداقت اور تقدس کا اچھا خاصا بیوپار قائم کر رکھا تھا۔ کوئی پاک یا مقدس شے ایسی نہ تھی جس کا بھاؤ سونے چاندی میں مقرر نہ ہو۔ اس کے زمانہ کے بعد بھی کوئی اصلاح نہ ہوئی بلکہ کلیسا کی حالت اور بدتر ہو گئی اور کلیسا آلہ جلب منفعت بن گیا۔ اٹلی میں اس طور پر بیش قرار رقمیں جمع کی گئیں اور ممالک ملحقہ سے ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف بہ لطائف الحیل بڑی بڑی رقمیں وصول کی گئیں۔ روپیہ جمع کرنے کا سب سے زیادہ ناپاک حیلہ فروخت تذکرات الغفران تھا جنہیں خرید کر مشتری من مانے گناہ کر سکتا تھا۔ غرض اطالوی مذہب لوگوں کو لوٹنے کا فن بن گیا تھا۔

ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک روما پاپاؤں کے زیر نگین رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس عرصہ میں اس پر بہت سی تباہیاں ایسی آئیں جن کہ وہ جواب دہ نہیں ٹھہر سکتے لیکن یہ ذمہ داری یقیناً" ان پر عائد ہوتی ہے کہ ان کی طرف سے کبھی کوئی پرزور یا مستقل کوشش اس شہر کی مادی و اخلاقی اصلاح کے لئے عمل میں نہیں آئی۔ بجائے اس کے اس بارے میں روما کوئی ایسی نظیر قائم کرتا جو دنیا کے لئے واجب التقلید ہو اس نے ایک ایسی حالت کی مثال پیش کی جو ہر طرح سے قابل نفرت ہے۔ القصہ روما کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب واقعہ اصلاح ظہور پذیر ہوا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کوئی صاحب اتقا اجنبی یہاں آ کر کارہ اور متنفر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

پاپایان روما نے سائنس سے تو اس بنا پر قطع تعلق کر لیا تھا کہ یہ ان کے دعاوی سے

بالکل مغایر ہے۔ البتہ اخیر اخیر میں فنون لطیفہ کی سرپرستی شروع کی تھی۔ لیکن موسیقی و نقاشی گو بجائے خود سرمایہ لذت و آرائش حیات ہوں پھر بھی ان میں کوئی ایسی زندہ طاقت موجود نہیں ہے جو ایک کمزور قوم کو شہزور بنا دے یا جماعت انسانی کی مادی راحت و آسائش میں بالاستقلال اضافہ کر سکے۔ اسی لئے اصلاح کے وقت اس شخص کی نظروں میں جو روما کی حالت پر نظر غائر ڈال چکا تھا اس شہر کی تمام زندہ توانائی سلب ہو چکی تھی۔ وہ اس قابل نہ رہا تھا کہ دنیا کی دیوی یا دینی ترقی میں حصہ لے سکے۔ نظام جمہوری و شہنشاہی کے ترقی پذیر قواعد کے بجائے اس نے پاپائیت کے جامد و غیر متحرک اصول قائم کر لئے تھے۔ اس کی دینی حالت تو یہ تھی کہ اس پر زہد و اتقا کا ایک غیر حقیقی ملمع چڑھا ہوا تھا اور دیوی ترقیات کی قسم سے اس کے قبضہ میں فنون لطیفہ تھے۔ اس لحاظ سے گویا وہ کسی راہب کی اس لاش کے مشابہ تھا جو ہمیں ابھی تک کپوشینی طبقہ کے راہبوں کے مدفن میں بھورے رنگ کی کفنی اوڑھے اور ہاتھ میں دعاؤں کی کتاب یا کچھ مرجھائے ہوئے پھول لئے نظر آتی ہے۔

"مدینتہ البقا" (روما) کی تصویر کا یہ رخ دکھانے کے بعد اور لاطینی مسیحیت نے اس کے ساتھ جو جو سلوک کئے ان پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہم کل براعظم یورپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب جو جماعت انسانی کے پیشوا اور رہنما ہونے کا مدعی تھا اپنے نتائج کے لحاظ سے کیا قدروقیمت رکھتا ہے۔

اقوام کی حالت باعتبار ان کے سود و بہبود کے نہایت صحیح طور پر ان کی آبادی کی کمی و بیشی سے ظاہر ہوتی ہے۔ آبادی پر طرز حکومت (یعنی اس کی جمہوریت یا شخصیت) کا اثر بہت کم پڑتا ہے۔ البتہ تدبیر مملکت و طریقہ نظم و نسق کا اثر اس کے شمار و اعداد پر چھا جاتا ہے۔

جن مصنفین نے اس مضمون پر غور کیا ہے انہوں نے قابل اطمینان طور پر ثابت کر دیا ہے کہ آبادی کا گھٹنا بڑھنا جماعت انسان کی قوت تولید اور قوت مدافعت حیات کے باہمی توازن پر منحصر ہے۔

قوت تولید سے مراد وہ مقتضیات فطرت ہیں جو توفیر نسل انسانی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں ایک حد تک اس قوت کا دارومدار آب و ہوا پر ہے لیکن چونکہ یورپ کی آب و ہوا میں چوتھی اور سولہویں صدیوں کے درمیان کوئی محسوس تغیر نہیں ہوا لہٰذا ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ براعظم یورپ میں یہ قوت زمانہ زیربحث میں بحالت اصلی قائم رہی۔

قوت مدافعت حیات سے مراد وہ تمام اسباب ہیں جن سے بقائے افراد انسانی مشکل ہو

جائے۔ اس قسم کے اسباب میں غذا کا ناکافی ہونا لباس کا غیر مکتفی ہونا اور مسکن کا ناقص ہونا شامل ہیں۔

ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر قوت مدافعت گھٹ کر غیر محسوس ہو جائے تو قوت تولید آبادی کو ۲۵ سال میں دگنا کر سکتی ہے۔

قوت مدافعت کے عمل میں آنے کے دو طریقے ہیں۔ جسمانی و دماغی۔ مدافعت کی جسمانی قوت اولاد کی تعداد کو کم کر دیتی ہے اور زندگی کا اوسط گھٹا دیتی ہے۔ مدافعت کی دماغی قوت ان لوگوں کو جن پر اخلاق اور خصوصاً" مذہب کا گہرا اثر ہو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ تاوقتیکہ ان میں بیوی بچوں کی خبرگیری و پرورش کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت نہ پیدا ہو جائے شادی نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت معینہ میں جس قدر شادیاں ہوتی ہیں ان کی تعداد کو خوراک کی قیمت کی شرح کے ساتھ ایک خاص نسبت ہوتی ہے۔

خوراک میں جس نسبت سے اضافہ ہوتا ہے اسی نسبت سے آبادی بھی بڑھ جاتی ہے اور قوت تولید اس درجہ طاقتور ہے کہ وہ ذرائع معاش سے تجاوز کر جاتی ہے اور ان پر مسلسل دباؤ ڈالے رکھتی ہے۔ ایسی حالت میں ضرور ہے کہ افلاس کی ایک خاص مقدار دنیا میں موجود ہو۔ یعنی جماعت انسانی کے ایک طبقہ کے لئے فاقہ کشی کرنا ضروریات سے ہے۔

مختلف ممالک کی آبادی میں جو تغیرات واقع ہوئے ہیں ان کا ثبوت مفصلہ ذیل مثالوں سے مل سکتا ہے۔ جسٹینین کی فوج کشی نے اٹلی کی آبادی کو بے حد گھٹا دیا۔ شمالی افریقہ مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے قریب قریب ویران ہو گیا۔ لیکن جب یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو آبادی پھر ترقی کر گئی۔ طریقہ جاگیرداری کے رواج سے تمام یورپ کی آبادی بڑھ گئی۔ اس لئے کہ جاگیریں بمقابلہ ان متوسلین کی تعداد کے جن کی قوت بسری کا وہ ذریعہ تھیں زیادہ وقیع ہو گئیں۔ حروب صلیبیہ نے آبادی کو بہت کچھ گھٹا دیا اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ لڑائیوں میں بہت سے آدمی مارے گئے اور کچھ یہ کہ بہت سے تندرست اور صحیح البدن لوگوں کو متاہلانہ زندگی سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح کے انقلابات براعظم امریکہ میں بھی ہوئے ہیں۔ مکسیکو کی آبادی ہسپانویوں کی اس وحشیانہ سفاکی اور ظالمانہ دست برد کی وجہ سے جس نے یہاں کے تہذیب یافتہ باشندوں کی عافیت تنگ کر دی اور انہیں زندگی کی طرف سے ناامید کر دیا۔ بقدر بیس لاکھ کے گھٹ گئی۔ یہی حال پیرو کا بھی ہوا۔

انگلستان کی آبادی نارمن فتوحات کے وقت تقریباً" بیس لاکھ تھی۔ پانچ سو سال میں یہ بمشکل دگنی ہو سکی۔ اس جمود کی ذمہ دار ایک حد تک غالباً" وہ پاپائی مصلحت تھی جس نے پادریوں کو تجرد کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مصلحت نے قانونی قوت تولید پر تو ضرور اثر ڈالا لیکن حقیقی قوت تولید پر اس سے خاک اثر نہ پڑا اس مسئلہ پر جن لوگوں نے نظر غائر ڈالی ہے وہ مدت کے مطمئن ہو چکے ہیں کہ علانیہ تجرد خفیہ عیاشی کا مترادف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام انگلستان چیخ اٹھا کہ ملک میں ایک لاکھ عورتیں ایسی موجود ہیں جنہیں پادری کر چکے ہیں اور اسی بنا پر عامہ خلایق اور نیز حکومت انگلستان نے ان خانقاہوں کو جو رہبانیت کا مرکز تھیں بند کر دینے کا قصد کر لیا۔

ہم نے اپنی کتاب "تاریخ خانہ جنگی امریکہ" میں اسی مسئلہ پر بعض خیالات ظاہر کئے ہیں جن کا اقتباس اس مقام پر خالی از لطف نہ ہو گا۔ "آبادی کی اس جامد اور استقراری حالت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کو خوراک بصد وقت و زحمت حاصل ہو۔ تن ڈھکنے کو کافی کپڑا میسر نہ آئے۔ جسم غلاظتوں سے آغشتہ ہو۔ رہنے کے لئے جھونپڑیاں ایسی بنائی جائیں کہ موسم کی سختی سے بچاؤ نہ ہو سکے۔ سردی گرمی کے تباہ کن اثر کے سدباب کی کوئی صورت نہ ہو۔ غلیظ اور وبائی ابخرے پھیلے ہوئے ہوں۔ حفظان صحت کی تدابیر مفقود ہوں۔ اطبا و معالج نام کو دکھائی نہ دیں۔ گنڈے تعویذ ٹونے ٹوٹکے کی چارہ گری بے سود ثابت ہو۔ معجزوں اور کرامتوں کی اونچی دکان کا پکوان پھیکا اور سیٹھا نکلے۔ غرض مصیبتون تکلیفوں اور حاجتوں کی اس طویل فہرست کا اگر خلاصہ کیا جائے تو آبادی کے جامد و غیر متحرک ہونے کا مفہوم یہ ہو گا کہ شرح اموات کا اوسط غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ مفہوم ابھی مزید تفصیل کی گنجائش رکھتا ہے۔ یعنی اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ شرح پیدائش کا اوسط معمول سے گھٹا ہو یا بالفاظ دیگر مناکحت کا دروازہ بند ہو گیا۔ عیاشی کی گرم بازاری ہو۔ درپردہ فسق و فجور ہوتا ہے۔ اخلاق کا قوام بگڑ گیا ہو۔

"باشندگان امریکہ کے لئے جو ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں کل تک ایک وسیع اور ناقابل نفوذ جنگل چھایا ہوا تھا مگر جہاں آج اس آبادی کا ہجوم ہے جو ہر پچیس سال کے بعد مقررہ رفتار کے مطابق دگنی ہو رہی ہے حقیقی و اضافی زندگی کی یہ خوفناک تضیع ایک نہایت ہی حیرت انگریز واقعہ ہے وہ بہ تقاضائے تحیر دریافت کریں گے کہ آخر وہ کس قسم کا طرز نظم و نسق تھا جس کا دعویٰ تو یہ تھا کہ انسان کے معاش و معاد کی اصلاح و ترقی اس کا نصب العین ہے لیکن جب نتیجہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو خوفناک تباہی

اور مصیبت انسان پر نازل ہوئی وہ ہمہ گیری میں جنگ وبا اور قحط کی سہ گانہ بلاؤں کے متفقہ اثر سے کہیں بڑھی ہوئی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں کو گمان تھا کہ اس طرز حکومت میں ان کی دینوی بھلائی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اس زمانہ کی حالت اور آج کل کی حالت کا اگر مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ انگلستان کی اسی جغرافیائی سطح پر آج دس حصہ زیادہ لوگ آباد ہیں اور آبادی کے روز افزوں اضافہ کی یہ حالت ہے کہ ہجرت کرنے والوں کے انبوہ کثیر دنیا کے مختلف حصوں میں جا جا کر آباد ہو رہے ہیں۔ جو شخص عہد گزشتہ کو ادب و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اسے خود قیاس کر لینا چاہئے کہ اس قسم کے طرز نظم و نسق و تدبیر مملکت کی کیا قدر ومنزلت ہو سکتی ہے۔"

یورپ کی آبادی کے ان تغیرات کے ساتھ ساتھ آبادی کی تقسیم بھی متغیر ہوتی رہی ہے۔ سلطنت روما میں مسیحیت کے شائع ہونے کے بعد سے آبادی کا مرکز شمال کی طرف منتقل ہو گیا اور وہاں سے صنعت و حرفت کی ترقی کے باعث مغرب کی طرف چلا گیا۔

اب کسی قدر زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ ان مدافعانہ قوتوں کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں جنھوں نے یورپ کی آبادی کو ایک ہزار سال تک حالت جمود و سکون میں رکھا۔ براعظم یورپ کی سطح کا بہت بڑا حصہ لق و دق اور بے راہ جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ کہیں راہبوں کی خانقاہیں اور بستیاں آباد تھیں۔ نشیبی مقامات اور دریاؤں کے دونوں جانب سینکڑوں میل لمبی دلدلیں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے عفونت انگیز بخارات نکل نکل کر دور دور تک وبا پھیلاتے تھے۔ پیرس اور لندن میں مکانات لکڑی کے تھے جن کی درزوں پر گارا لسا ہوا تھا اور چھتیں پرال یا سرکنڈوں کی تھیں۔ ان مکانوں میں روشن دان اور کھڑکیاں نہ ہوتی تھیں اور آرہ کی کل کے زمانہ ایجاد تک بہت کم مکان ایسے تھے جن کا فرش چوبی ہو۔ دری یا قالین ایک ایسا سامان آرائش تھا جسے کوئی جانتا تک نہ تھا۔ اس کا قائم مقام پرال تھا جس کی کچھ مقدار فرش پر بچھا دی جاتی تھی۔ گھروں میں دودکش بھی نہ ہوتے تھے۔ اس چولہے کا دھواں جو کافی ایندھن کے میسر نہ آنے سے بے رونق نظر آتا تھا چھت کے ایک سوراخ میں سے باہر نکل جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے جھونپڑے موسم کی سختی کو کسی طرح روک سکتے تھے۔ بدر رویں بالکل موجود نہ تھیں اور صفائی کا مطلق انتظام نہ تھا۔ سڑے ہوئے فضلہ اور کوڑے کرکٹ کا دروازہ پر ڈھیر لگا رہتا تھا۔ مرد عورت اور بچے ایک ہی کوٹھری میں سوتے تھے اور اکثر گھر کے جانور بھی اسی حجرے میں ٹھونس دیئے جاتے تھے۔ اس طوفان بدتمیزی میں ممکن نہ تھا کہ حیا اور اخلاق قائم رہ سکے۔ بستر بالعموم پرال کا ایک

تھیلا ہوتا تھا اور لکڑی کا ایک گول کندا تکیہ کا کام دیتا تھا۔ جسمانی صفائی سے لوگ مطلق نا آشنا تھے بڑے بڑے ارکان دولت یہاں تک کہ کنٹربری کے لاٹ پادری کے سے جلیل القدر حکام اس درجہ گندے ہوتے تھے کہ ان کے

کپڑوں میں جوئیں بخیہ کے ٹانکوں سے سوا تھیں

چنانچہ انگلستان کے ایک تاجدار کے حریف ٹاس بیکٹ کی یہی حالت بیان کی گئی ہے۔ جسمانی عفونت کے چھپانے کے لئے عطریات کا بکثرت استعمال کیا جاتا تھا۔ عوام الناس کا لباس چرمی ہوتا تھا جو سالہا سال تک کام دیتا تھا اور جس میں جسم کا میل برابر جمع ہوتا رہتا تھا۔ ہفتے میں جس شخص کو کھانے کے لئے ایک دفعہ گوشت مل جاتا تھا وہ فارغ البال اور آسودہ حال متصور ہوتا تھا۔ گلیوں میں کوئی بدررو نہ ہوتی تھی۔ سڑکیں نہ تو کٹی ہوئی ہوتی تھیں نہ ان پر روشنی کا انتظام ہوتا تھا۔ رات کے وقت کوٹھریوں کے دروازے کھول دئے جاتے تھے اور کوڑا کچرا دھوں بلاتکلف باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ جو بیچارہ شامت کا مارا رہ گزر تنگ و تار گلی میں سے ہاتھ میں مدہم ٹمٹماتی ہوئی لالٹین لئے گزر رہا ہوتا تھا وہ اس آلائش کے سیلاب سے لت پت اور شور بور ہوجاتا تھا۔

اینئس سلوئیس نے جو آگے چل کر پائیس ثانی کے نام سے مسند پاپائی پر متمکن ہوا اور جس کی تحریر اس لحاظ سے نہایت قابلانہ و غیر متعصبانہ سمجھی جائے گی۔ اپنی سیاحت جزائر برطانیہ کے مشرح حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ سفر اس نے ۱۴۳۰ء کے قریب اختیار کیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ کسانوں کے مکانات خشک چنائی کے پتھروں کے تھے جن میں چونا نہیں لگایا گیا تھا۔ چھتیں گھانس پھونس کی تھیں اور بیل کی ایک اینٹھی ہوئی کھال دروازے کا کام دیتی تھی۔ خوراک کی قسم سے وہ ساگ پات موٹھ مٹر یہاں تک کہ درختوں کی چھال تک کا استعمال کرتے تھے۔ بعض مقامات کے باشندے روٹی کے نام تک سے ناواقف تھے۔

گارے سے لیے ہوئے سرکنڈوں کی کوٹھریاں۔ بھدے اور بے ڈھنگے ٹٹروں کے گھر۔ بے دوردکش کے بے رونق دھواں دہار انگیٹھیاں۔ جوؤں کھٹملوں اور پسوؤں سے بھرے ہوئے جسمانی اور اخلاقی غلاظتوں کے بھٹ۔ سردی سے بچنے کے لئے اعضا کے گرد پرال کے لپٹے ہوئے مٹھے۔ بخار سے سسکتے ہوئے کسان کے لئے عالموں اور سیانوں کی چارہ گری کے سوا اور کسی تدبیر کا نہ ہونا!! ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کیونکر ممکن تھا کہ آبادی میں ترقی ہو سکے؟

جب حالت یہ ہو رہی ہو تو کون سی تعجب کی ہے کہ ۱۴۳۰ء کے قحط میں انسان کا

گوشت پکایا اور بیچا گیا اور ۱۲۵۸ء کے قحط میں لندن کے ۱۵ ہزار باشندے بھوکوں مر گئے یا وبا کے بعض حملوں میں لوگ اتنے مرے کہ لاشوں کی تجہیز و تکفین کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ ۱۳۴۸ء کی وبا میں جو مشرق سے اٹھی اور تجارتی رستہ سے ہوتی ہوئی یورپ پر چھا گئی فرانس کی ایک ثلث آبادی ضائع ہو گئی۔

دیہات اور شہروں کے عوام الناس کی تو یہ حالت تھی ہی لیکن امراء کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھے۔ انگلو سکسن قوم کی بداطواریوں کا ذکر کرتے ہوئے ولیم ساکن مامس بری کہتا ہے کہ "اس قوم کے امرا پیٹو اور عیاش تھے اور کبھی گرجے نہیں جاتے تھے۔ نماز فجر اور نماز قدآس کے ادا کرنے کا انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ انکا پادری جس کو ان کی کاسہ لیسی نے ان کی نظروں سے گرا رکھا تھا ان کی خوابگاہ میں جا کر بیدار ہونے سے قبل جلد جلد نماز کے الفاظ دہرا جاتا تھا اور ان کے کان میں ایک لفظ بھی نہ پڑتا تھا۔ عام لوگ طاقتور امرا کے پنجہ ظلم میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کی جائدادیں چھین لی جاتی تھیں وہ دور و دراز ممالک میں جبرا" بھیج دیئے جاتے تھے۔ ان کی لڑکیوں کو یا تو دارالقمامہ میں بٹھا دیا جاتا تھا اور یا وہ لونڈیاں بن کر بیچ ڈالی جاتی تھیں۔ دن رات شراب کے دور پیاپے چلتے رہتے تھے اور جو برائیاں بدمستی کی رفیق ہیں وہ ظاہر ہو ہو کر مردوں کو نامرد بناتی جاتی تھی۔" جاگیرداروں کے قلعے گویا ڈاکوؤں کے گھر ہو رہے تھے۔ چنانچہ یہی مورخ جس کی تحریر سے ہم نے اوپر اقتباس کیا ہے بیان کرتا ہے کہ مرد اور عورتیں ان قلعوں میں پکڑ بلائی جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کے انگوٹھوں یا پاؤں میں رسی باندھ کر انہیں لٹکا دیا جاتا تھا۔ ان کے اعضا آگ سے جھلسے جاتے تھے۔ گرہ دار رسیوں کو ان کے سر کے گرد لپیٹ کر مروڑا جاتا تھا۔ غرض زر فدیہ وصول کرنے کے لئے طرح طرح کے عذاب انہیں پہنچائے جاتے تھے۔

یورپ بھر میں بیش قرار مشاہرہ اور ذمہ داری کی بڑی بڑی سیاسی خدمتوں پر پادری مامور تھے۔ ہر ملک میں دہری حکومت تھی۔ ایک تو مقامی یعنی دنیوی حکومت اور دوسری غیر ملکی حکومت جس کے اقتدارات کا مصدر و مرکز پاپائے روما تھا۔ روما کے اثر کا مقامی اثر پر غالب ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے ایک شخص واحد کا شہنشاہانہ ارادہ یورپ کی تمام اقوام کے متحدہ و منطقہ ارادہ کے مقابلہ میں کامیابی کے ساتھ ظاہر ہوتا تھا اور بوجہ اپنی وحدت و اکتناز کے بے انتہا طاقتوں کا جامع تھا۔ علی ہذا القیاس مقامی اثر کا ضعیف ہونا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ اول تو خود ہمسایہ سلطنتوں کی باہمی رقابتیں اسے کمزور کر دیتی تھیں اور رہی سہی طاقت کے سلب کرنے کے لئے رومائی رقیب کی حیلاآفرین تفرقہ

پردازیاں کافی تھیں۔ ایک بھی ایسا موقع پیش نہیں آیا کہ مختلف دول یورپ نے اپنے مشترک حریف کو زک دینے کے لئے آپس میں اتحاد قائم کیا ہو۔ جب کبھی کسی بحث کے چھڑنے سے اتحاد کا خدشہ پیدا ہوتا تھا تو نہایت چالاکی سے یہ جھگڑا علیحدہ علیحدہ چکا دیا جاتا تھا اور ہر حکومت کو بالعموم پاپائے روما کے سامنے گردن جھکانے ہی بنتی تھی۔ پاپائی مداخلت کا ظاہری و بادی النظری مقصد تو مختلف اقوام کے اخلاقی و روحانی حقوق کی نگہداشت ہوتا تھا لیکن اصلی و حقیقی غایت یہ ہوتی تھی کہ ذرائع آمدنی میں توفیر کا پہلو نکالا جائے اور پادریوں کے جم غفیر کی شکم پروری کی سبیل پیدا کی جائے۔ جو محاصل اس طور پر پاپائی خزانہ میں داخل ہوتے تھے وہ بسا اوقات مقامی حکومت کے مداخل سے بمدارج بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً" جب انوسنٹ رابع نے یہ مطالعہ کیا کہ کلیسائے انگلستان تین سو مزید اطالوی پادریوں کا متکفل ہوا اور لنکن کے گرجا میں اس کا ایک بھتیجا جو سن بلوغ کو بھی نہ پہنچا تھا ایک بڑی خدمت پر مامور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ جو رقم پہلے ہی سے ہر سال غیر ملکی پادریوں پر صرف ہوتی تھی وہ اس رقم کے مقابلہ میں شاہی خزانہ میں داخل ہوتی تھی تگنی تھی۔

اعلیٰ طبقہ کے پادریوں نے تو ہر ملکی خدمت پر جو کچھ بھی باعث منفعت تھی قبضہ کر ہی رکھا تھا اور ہر دیر کا صدر راہب کثیر التعداد غلاموں کے مالک ہونے کے لحاظ سے بڑے بڑے امیروں اور جاگیرداروں کا مقابلہ کرتا تھا چنانچہ بعض صدر راہبوں کے پاس بیس بیس ہزار غلام موجود تھے لیکن گدائی پیشہ راہبوں کے لئے بھی معاش کے وسیع ذرائع موجود تھے۔ ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں یہ نظر نہ آتے ہوں اور غربا کے قوت لایموت میں اپنا حصہ نہ بٹا لیتے ہوں۔ نکمے اور نکھٹو پادریوں کا ایک انبوہ کثیر جس کے ارادت میں ممالک غیر منسلک تھے ایسا تھا جس کی زندگی کاہلی اور بے کاری میں کٹتی تھی اور جو اپنا پیٹ محنت مزدوری کرنے والوں کے پسینے سے پالتا تھا۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن تھا کہ چھوٹے چھوٹے کھیت بڑی بڑی جاگیروں میں ضم نہ ہوتے چلے جائیں۔ غربا کا افلاس روز بروز نہ بڑھتا جائے اور جماعت انسانی کی حالت روبہ اصلاح ہونے کے بجائے پایہ اخلاق سے ساقط نہ ہوتی چلی جائے۔ دیروں صومعوں اور خانقاہوں سے باہر تحصیل علم کی کوئی کوشش نہ کی جاتی تھی اور کیوں کر کی جاتی؟ کلیسا کی مصلحت اسی میں تھی کہ لوگ جاہل رہیں۔ چنانچہ یہ اصول عام طور سے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ جہالت زہد و اتقا کی ماں ہے۔

روما نے جمہوریت اور شہنشاہیت کے زمانہ میں ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا تھا کہ مستحکم

پلوں اور پختہ سڑکوں کے ذریعہ سے اپنے دور دست صوبوں کے ساتھ سریع السیر تعلقات قائم رکھے جائیں۔ پلوں اور سڑکوں کی تعمیر اور مرمت افواج رومتہ الکبریٰ کے اہم فرائض میں داخل تھی۔ اس اصول پر کاربند ہونے سے اس کا فوجی تفوق برقرار رہا۔ لیکن پاپائیت کے زمانہ میں چونکہ روما کی حکومت ایک بالکل جداگانہ اصول پر مبنی تھی اور اس کو اگلی سی ضرورتیں درپیش نہ تھیں لہٰذا اس فرض کی بجاآوری کو اس نے دول مقامی کی بے اعتنائی کے لئے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ بھر میں کوئی سڑک ایسی نہ تھی جو سال کا اکثر حصہ بند نہ رہتی ہو۔ حمل و نقل کے عام ذرائع بیلوں کے بے ڈھنگے چھکڑے ہوتے تھے جو گھنٹہ میں تین چار میل سے زیادہ نہ جا سکتے تھے۔ جہاں کشتیاں بھم نہ پہنچ سکتی تھیں مال تجارت کہ وہ بھی کیف و کم کے اعتبار سے چنداں قابل لحاظ نہ ہوتا تھا گھوڑوں اور خچروں پر لاد کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچایا جاتا تھا۔ جب فوج کے بڑے بڑے دستوں کو نقل و حرکت کی ضرورت پیش آتی تھی تو مشکلات اس قدر بڑھ جاتی تھے کہ ان پر غالب آنا دشوار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حروب صلیبیہ کے مجاہدین ادنیٰ کے کوچ کی کہانی ان مشکلات کا مرقع ہے۔ نقل و حرکت بین الممالک کی یہ دقتیں اور زحمتیں اس تاریکی اور جہالت کی ایک بڑی حد تک ذمہ دار تھیں جو عام طور سے پھیلی ہوئی تھی۔ اکیلا اکیلا مسافر جان جوکوں میں ڈالے بغیر سفر نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ کوئی دلدل یا جنگل ایسا نہ تھا جہاں ڈاکو اور لٹیرے موجود نہ ہوں۔

جہالت اور لاعلمی ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ یورپ میں شرمناک کراماتوں اور معجزوں کی بھرمار تھی۔ کوئی سڑک ایسی نہ تھی جس پر زائروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اولیا کی ان خانقاہوں کی طرف ارادت کی باگیں اٹھائے نہ جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہوں جو اپنی مسیحائی اور شفابخشی کی وجہ سے شہرہ آفاق تھیں۔ کلیسا نے ہمیشہ اسی مصلحت کو پیش نظر رکھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو طبیب یا اس کے پیشہ سے مانوس نہ ہونے دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ خانقاہوں کو آلہ جلب منفعت بننے سے بہت کچھ روکتا ہے۔ زمانہ اس منفعت رساں زور و تلبیس کی آخر قلعی کھول کر رہا۔ یورپ میں آج کتنی خانقاہیں ہیں جن کی دکانداری کا سلسلہ بدستور قائم ہے؟

جو مریض اس قدر ناتواں ہوتے تھے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ پہنچائے جا سکتے تھے ان کا اللہ ہی حافظ تھے۔ بجز روحانی علاج یعنی ان لاطینی دعاؤں کے جو اس پر دم کر دی جاتی تھیں اس کے لئے اور کوئی شکل مداوا نہ تھی۔ امراض کے روکنے کے لئے گرجاؤں

میں دعائیں لٹکا دی جاتی تھیں۔ لیکن حفظ صحت کی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائی جاتی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ شہر فرط عفونت سے سنڈاس بنا ہوا ہے اور وبا چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے لیکن پادری صاحب انسداد وبا کا سامان دعا سے کر رہے ہیں۔ مینہ کی جھڑی تھمنے میں نہیں آتی یا امساک باران کی وجہ سے سقامت ہنگال کا اندیشہ ہے لیکن یہ بزرگوار اپنے چند دعائیہ جملوں کے زور سے مینہ کو رکوایا برسوا دینے کے مدعی ہیں۔ سورج یا چاند کو گہن لگ گیا ہے یا کوئی دمدار ستارہ نمودار ہوا ہے لیکن یہ عقل کے پتلے ان قدرت کے کرشموں کو بلائے آسمانی سمجھ کر ادعیہ ماثورہ سے ان کی نحوست ٹالنے کی فکر میں ہیں۔ جب ۱۴۵۶ء میں وہ دمدار ستارہ جو ہیلی کے نام سے موسوم ہے نمودار ہوا تو اس کی شکل ایسی خوفناک اور اس کا منظر ایسا مہیب تھا کہ خود تقدس ماب الوہیت انتساب جناب کیلکسٹس خامس پاپائے روما کو اپنی روح القدس قوت سے اس کی مدافعت پر ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ نے ایک ایسا زبردست عمل پڑھا اور اتنی لعنتیں بھیجیں کے مارے ڈر کے یہ خبیث ستارہ دم دبا کر ہانپتا کانپتا جوف فضا میں غائب ہو گیا اور کہیں پچھتر سال کے بعد اس کے ہوش و حواس اس حد تک بجا ہوئے کہ اس نے دوبارہ نمودار ہونے کی جرات کی۔

اولیا کے تصرفات روحانی اور دعاؤں کے ذریعہ سے مریضوں کو جو شفا ہوتی تھی اس کا طبیعی اندازہ اگر لگانا مقصود ہو تو اس زمانہ کی اور آج کل کی شرح اموات کا مقابلہ کر لینا کافی ہو گا۔ ان دنوں تیس میں ایک آدمی مرتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جب کہ روحانیت کے بجائے چاروں طرف مادیت کا عمل ہے بحساب اوسط چالیس میں ایک آدمی مرتا ہے۔

یورپ کی اخلاقی حالت روز روشن کی طرح وقت آشکارا ہو گئی جب کولمبس کے ساتھی جزائر غرب الہند سے مرض باو فرنگ اپنے ساتھ لگاتے لائے۔ یہ بیماری حیرت انگیز سرعت کے ساتھ یورپ بھر میں پھیل گئی۔ ادنیٰ و اعلیٰ غریب و امیر سب کے سب اس شرمناک مرض میں مبتلا ہو گئے اور تو اور پاپائے مقدس حضرت لیودہم بھی تو ناپاک بیٹھے اور نیم کی ٹہنی ہلاتے ہوئے پائے گئے۔ اکثر لوگ جو شامت اعمال سے یہ دکھ بھر رہے تھے یہ عذر پیش کرتے تھے کہ یہ ایک وبائی مادہ ہے۔ جو سمیت اجزائے ہوا کی وجہ سے پھیل گیا ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو اس مادہ کی اشاعت کا باعث ہوا سمت نہ تھی بلکہ فطرت انسانی کی ایک خاص کمزوری تھی جسے وہ روحانیت بھی زائل نہ کر سکتی تھی جو انسان کے صدہا سال سے بمنزلہ چراغ ہدایت تھی۔

خانقاہوں کے طبی کرشموں پر خاص خاص تبرکات کی معجزنما شفا گستری مستزاد تھی۔ ان

میں سے بعض تبرکات ایسے تھے جن کی نوعیت عقل کو محو حیرت کر دیتی تھی۔ متعدد دیر اور خانقاہیں ایسی تھیں جن میں جناب مسیح" کا کانٹوں کا تاج موجود تھا۔ گیارہ دیروں میں وہ برچھا رکھا ہوا تھا۔ جس سے آپ کا پہلو چھید اگیا تھا۔ اگر کوئی شخص ازراہ جسارت یہ سوال کر بیٹھتا کہ ان سب کا اصلی ہونا کیوں کر ممکن ہے تو وہ دہریہ اور مرتد قرار دیا جاتا۔ حروب صلیبیہ کے دوران میں طبقہ ہیکلیینؒ کے سورماؤں نے یورشلم سے مقدس دوشیزہ کے دودھ کی بوتلیں لا لا کر صلیبی افواج کے سپاہیوں کے ہاتھ من مانے اور منہ مانگے داموں بیچیں اور خوب ہی نفع کمایا۔ یہ بوتلیں ازراہ غایت ادارت و عقیدت بعض بڑے بڑے مذہبی اماکن میں مدتوں نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھی ہیں۔ لیکن دیدہ دلیری اور ڈھٹائی میں بیت المقدس کی اس خانقاہ کا درجہ شاید سب سے بڑھا ہوا تھا جس کے تبرکات مین روح القدس کی ایک انگلی بھی داخل تھی۔ اس شرم ناک بطلان پرستی کو زمانہ موجودہ نے حقارت آمیز خموشی کے ساتھ رد کر دیا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ یہی تبرکات ہزارہا خوش عقیدہ لوگوں کی کشت ارادت کو اپنے روحانی چھینٹوں سے سیراب کرتے تھے لیکن آج وہ اس درجہ ناپاک اور ذلیل خیال کئے جاتے ہیں کہ کسی عجائب خانہ میں بھی انہیں جگہ نہیں ملتی۔

آخر اس حرمان کیا وجہ ہے جو یورپ کی امانت سے عہدہ برآ نہ ہونے کی شکل میں کلیسا کو نصیب ہوا؟ اگر روما نے یورپ کی روحانی و مادی ترقی کو حقیقت میں اپنا نصب العین قرار دیا ہوتا۔ اگر جانشین پطرس یعنی ساری دنیا کے گڈریے نے صدق دل سے واحد الغرض ہو کر اپنے گلہ کی بھیڑوں کی رکھوالی کی ہوتی اور ان کی دنیاوی آسائش اور دینی نجات کو اپنی غایت الغایات سمجھا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ کلیسا کو اس ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

یہ وجہ بڑی آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے اور اگر اسے قلمبند کیا جائے گا تو حیا سوز معصیت کا ایک طومار تیار ہو جائے گا۔ فقرات ذیل میں ہم توجیہا" جو واقعات سپرد قلم کرتے ہیں وہ کیتھولک مصنفین کی تحریرات سے ماخوذ ہیں اور ہم کوشش کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہو ان واقعات کا اعادہ مصنفین مذکور ہی کے الفاظ میں کیا جائے۔

جو داستان ہم اب بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہو گا کہ کیونکر ایک جماعت متحدہ نے ترقی کرتے کرتے مطلق العنان حکومت شخصی کی شکل اختیار کر لی۔

قدیم الایام میں ہر گرجا اس توافق کی نفی کئے بغیر جو جملہ اصولی امور میں اسے کلیسائے عمومی کے ساتھ ہوتا تھا اپنا انتظام کامل آزادی کے ساتھ جداگانہ طور پر خود کرتا تھا اور اپنی روایات و تادیبات کو انفرادی حیثیت سے برقرار رکھ کر ان تمام مسائل کو جنہیں کلیسائے

عمومی کے اغراض سے تعلق نہ ہوتا تھا۔ یا جن میں کوئی اصولی بحث مضمر نہ ہوتی تھی خود مقامی طور پر فیصل کر دیتا تھا۔

نویں صدی کے آغاز تک یہی حالت قائم رہی اور کلیسائے روما کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہونے پائی۔ لیکن ۸۴۵ء کے قریب سینٹ اسی ڈور (ساکن اشبیلیہ) کے مرتب کئے ہوئے فتاوی بہت کچھ تصرف و تدریس کے بعد فرانس کے مغربی علاقہ میں شائع کئے گئے۔ جن میں پاپایان زمانہ سابق کے تقریباً" ایک سو وضعی فرمان اور دوسرے حکام کلیسا کی بناوٹی تحریرات اور مسیحی کونسلوں کے فیصلہ جات شامل تھے۔ ان جعلی فتاوی کی اشاعت نے پاپائیت کے اقتدار کو بہت کچھ وسیع کر دیا۔ کلیسائی حکومت کے پرانے طریقہ کو بدل دیا اور اسے جمہوریت کے پیرایہ سے عاری کر کے مطلق العنان حکومت کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ سب کے سب اساقف روما کے حلقہ بگوش ہو گئے اور اسقف اعظم یعنی پاپائے روما کل مسیحی دنیا کے پادریوں کا حاکم اعلے بن گیا۔ ہلڈ میرنڈ (پاپائے گریگوری سابع) نے بعد میں اسی بنا پر یہ مہتم بالشان کوشش کی کہ دول یورپ کو ایک ربانی الاصل قسیسی حکومت کی صورت میں بدل دیا جائے جس کا شہنشاہ پاپائے روما ہو۔

گریگوری سابع جو اس مہتم بالشان منصوبہ کا بانی تھا جانتا تھا کہ اس کی تجویز کے کامیاب ہونے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ قسیسی مجالس کے ذریعہ سے کام نکالا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک فرمان اس مضمون کا جاری کیا کہ قسیسی مجالس کے انعقاد کا حق پاپاؤں اور ان کے نائبوں کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ مزید تقویت کی غرض سے انسلم ساکن لکا نے کچھ تو قدیم اسیڈوری منسوبات اور کچھ نوتراشیدہ فتاوی کی بنا پر قانون کلیسا کا ایک نیا مجموعہ کیا۔ روما کی فوقیت اور برتری کے برقرار رکھنے کی غرض سے نہ صرف ایک جدید ضابطہ دیوانی و دینی کی تیاری ضروریات سے تھی۔ بلکہ ایک نئی تاریخ کا گھڑ لیا جانا بھی لازمی تھا۔ اس تاریخ میں بادشاہوں کے تخت حکومت سے اتارے اور مسیحی برادری سے خارج کئے جانے کے فرضی واقعات اس غرض سے درج کر دئے گئے کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ ہمیشہ سے پاپایان روما کے مطیع و منقاد تھے۔ پاپاؤں کے فرامین واجب العمل ہونے کے لحاظ سے کتب مقدسہ کی آیات کے ہمدرجہ قرار دئے گئے۔ ان کوششوں کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ارض مغرب میں یہ عقیدہ عام طور سے پھیل گیا کہ مسیحیت کی ابتدا ہی سے پاپایان روما کلیسائے عمومی کے واضعان قوانین رہے ہیں۔ چونکہ مطلق العنان روا مجالس شوریہ کے روادار نہیں ہو سکتے لہٰذا پاپائیت نے بھی جب مطلق العنان ہونا چاہا تو قصد کر لیا

کہ بعض قومی کلیساؤں کی مجالس جو زیادہ آزاد رو اور سرچڑھی ہیں توڑ دی جائیں اور صرف انہیں مجالس کو قائم رہنے دیا جائے جو پاپائے اعظم کی بلاواسطہ نگرانی میں ہیں۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔

آٹھویں صدی میں ایک اور روایت روما میں تراشی گئی جو بہت سے اہم نتائج کی ذمہ دار ہے۔ وہ روایت یہ تھی کہ چونکہ پاپائے سلولسٹر نے قیصر قسطنطین کو مرض جذام سے اچھا کر دیا تھا اور اصطباغ بھی دیا تھا لہٰذا قیصر نے اس کے شکرانہ میں اٹلی اور مغربی صوبے نذرانہ کے طور پر پاپائے مقدس کی خدمت میں پیش کئے تھے اور نیز بطور اظہار اطاعت حضرت پاپا کی سائیسی کی خدمت انجام دی تھی اور حضرت اقدس کی گھوڑے کی باگ تھام کر کچھ دور چلا تھا۔ اس تزویر کا مقصد یہ تھا کہ تاجداران فرانس اپنی اصلی قدر پہچان جائیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ جو علاقے وہ کلیسا کو دے رہے ہیں اس میں ان کا کچھ احسان نہیں ہے بلکہ محض حق کو حقدار تک پہنچا رہے ہیں۔

حکومت پاپائی کے جدید نظام کا سب سے زیادہ زبردست حربہ "فتاوائے گر یشئین" تھا۔ یہ کتاب جو بارھویں صدی کے وسط میں شائع ہوئی افترا و تزویر کا ایک بہت بڑا مجموعہ تھی۔ اس کی رو سے کل مسیحی دنیا بوساطت پاپائے روما اطالوی پادریوں کی ملکیت ہو گئی۔ اس نے یہ اصول قائم کر دیا کہ انسان کو اعمال حسنہ پر غور کرنا اور ملاحدہ و زنادقہ کو عذاب دینا قتل کرنا اور ان کی جائداد قرق کر لینا جائز و مستحسن ہے۔ جو شخص مسیحی برادری سے خارج کیا جا چکا ہو اسے مار ڈالنا قتل انسان متلزم سزا نہیں ہے اور پاپائے مقدس بلحاظ اس غیرمحدود برتری کے جو اسے قانون پر حاصل ہے ابن اللہ کا ہمپایہ ہے۔

اجتماع قوت کی یہ نئی تحریک جوں جوں ترقی پذیر ہوتی گئی ان اصول کا جو زمانہ قدیم میں منافی مسیحیت سمجھے جاتے بے محابا اعلان ہوتا گیا۔ مثلاً" کمال بے باکی اور جسارت سے یہ دعوے کیا جانے لگا کہ کل کلیسا پاپائے مقدس کی جائداد ہے اور وہ اس سے جو کام چاہے لے سکتا ہے۔ سیمونیت[1] دوسروں کے حق میں گناہ ہے لیکن اس کے حق میں گناہ نہیں ہے۔ وہ قانون سے بالا اور برتراز احتساب ہے۔ جو شخص اس کی نافرمانی کرے وہ گردن زدنی ہے۔ ہر اصطباغ یافتہ شخص اس کی رعیت ہے اور خواہ وہ شخص چاہے یا نہ چاہے عمر بھر تک اس کی رعیت رہے گا۔ بارھویں صدی کے ختم تک پاپایان روما پطرس کے نائب تھے انوسنٹ ثالث کے زمانہ کے بعد وہ نائب مسیح ہو گئے۔

لیکن ہر مطلق العنان فرمان روا کو خزانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس کلیہ سے

پاپایان روما مستثنیٰ نہ تھے۔ نائبان پاپا کا عہدہ ہلڈیبرنڈ کے زمانہ ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ ان کا فرض بعض دفعہ تو یہ ہوتا تھا کہ کلیساؤں کا معائنہ و تنقیح کریں اور بعض دفعہ کسی خاص خدمت پر مامور کئے جاتے تھے لیکن ہر صورت میں انہیں ممالک آن روے کوہ الپس سے روپیوں اور اشرفیوں کی پوٹلیاں باندھ کر لانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ چونکہ پاپائے مقدس قوانین وضع کرنے کے علاوہ ان کے منسوخ و معطل کرنے پر بھی مقتدر تھا لہٰذا ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا گیا کہ جو شخص چاہے نذرانہ ادا پروانہ نقض قانون حاصل کر سکتا ہے۔ جو دیور روما کو خراج ادا کرتے تھے ان کے اختیارات میں پاپا کی طرف سے دست اندازی نہ ہوتی تھی۔ غرض پاپائے روما اسقف عالم ہو گیا۔ ہرا برشید (اسقف کا حلقہ اختیار) پاپائی حدود ارضی میں داخل تھا اور پاپا بوجہ متصادف الاختیار ہونے کے ہر مقدمہ کی مثل اپنی عدالت میں طلب کر سکتا تھا۔ اساقف کے ساتھ اس کے تعلقات وہی تھے جو ایک مطلق العنان بادشاہ کے اپنے ارکان سلطنت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ کسی اسقف کو اجازت نہ تھی کہ بغیر اس کی اجازت کے مستفی ہو اور جو ابرشیہ استعفے کی وجہ سے خالی ہوتا تھا اس پر جدید اسقف کے تقرر کا اختیار بجز اس کے اور کسی کو حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس غرض سے کہ اسے پروانہ نقض قانون کے اختیار اجرا کے استعمال کا موقع ملے عدالت ہائے ماتحت کے فیصلوں کی ناراضی سے عدالت العالیہ پاپائیہ میں اپیل دائر کرنے کی بات بات پر فریق متعلقہ کو ترغیب دی جاتی تھی۔ ہزاروں ڈگریاں بغرض تعمیل جاری ہوتی تھیں۔ جن کی بدولت روما میں ڈھیروں روپیہ کھنچا ہوا چلا آتا تھا۔ جب کسی ابرشیہ کے لئے بہت سے امیدوار ہوتے تھے تو پاپا اکثر ان سب کو ٹکا سا جواب دے کر کسی اپنے پٹھو کو اس عہدہ پر مقرر کر دیتا تھا۔ پادریوں کو بسا اوقات روما میں سالہا سال تک ملازمت کے لئے امیدواری کرنی پڑتی تھی اور وہ یا تو امیدواری کرتے کرتے دوسری دنیا کو سدھار جاتے تھے۔ اور یا بوریا بدھنا باندھ کر پاپائیت کی خباست و ارتشا کا داغ سینے پر لئے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ جرمنی کو اس بارے میں بمقابلہ تمام دوسرے ممالک کے زیادہ رنج ناکامی برداشت کرنا پڑا اور یہی وجہ تھی کہ تخم اصلاح کی روئیدگی کے لئے یہاں کی زمین میں سب سے زیادہ قابلیت پیدا ہو گئی۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں پاپاؤں نے اپنے اقتدارات کو غیر معمولی طور پر بڑھا لیا۔ بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح وہ کسی خالی شدہ ابرشیہ پر اپنے کسی منظور نظر کے مقرر کئے جانے کی سفارش کرتے اب وہ ایسے تقررات کے متعلق قطعی احکام جاری کرنے لگے۔ چونکہ ان کے اطالوی طرفداروں کی دہان دوزی

ضرور تھی لہٰذا بجز اس کے اور کوئی علاج نہ تھا کہ ممالک غیر میں ان کے لئے عہدے تجویز کئے جائیں۔ ایک ایک خدمت کے لئے روما میں سینکڑوں پادری امیدواری کرتے کرتے مر جاتے تھے۔ اور جب حضرت عزرائیل کی توجہ سے اس طور پر جگہ خالی ہوتی تھی تو پاپا اس جگہ کا انتظام استحقاقاً" خود کرتا تھا۔ اول اول یہ استحقاق روما تک محدود رہا۔ بالاخر یہ دعوی پیش کیا گیا کہ پاپائے مقدس کو بلا تفریق و امتیاز کل کلیسائی خدمتوں کے انتظام کا حق حاصل ہے اور بروقت تقرر اسقف کا یہ حلف اٹھاتا کہ وہ پاپا کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے گا نفیسی اور سیاسی دونوں مفہوم رکھتا ہے۔ جو ممالک مثنوی الحکومت تھے ان میں اس طور پر روحانی عنصر کی طاقت بدرجہ غایت بڑھ گئی۔

پاپائی قوت کے اس اکتناز و اجتماع کے لئے ہر قسم کے حقوق نہایت بیدردی سے پامال کئے گئے۔ گدائی پیشہ راہبوں کے طبقوں سے پاپائیت کو اس مقصد کی تکمیل میں بہت بڑی مدد ملی۔ گویا پاپا اور یہ طبقے ایک طرف تھے اور اساقف اور ان کے ماتحت پادری دوسری طرف۔ پاپائے روما کے دربار نے تمام وہ حقوق غصب کر لئے جو مجالس عامہ۔ مجالس مطرانیہ (کونسل متعلق بہ دارالسلطنت)۔ اساقف اور قومی کلیساؤں کو حاصل تھے۔ چونکہ پاپا کے نائب بات بات پر دست اندازی کرتے تھے لہٰذا اساقف نے اپنے ماتحین کو ان کی بے عنوان ہونے پر روک ٹوک کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اور چونکہ گدائی پیشہ راہبوں کی مداخلت حد سے بڑھ گئی تھی اس لئے دیہاتی پادریوں کے اختیار بالکل سلب ہو گئے اور جو رہا سہا اثر تھا اسے ان راہبوں نے پاپائی تذکرات الغفران اور پروانجات نقض قانون بیچ بیچ کر زائل کر دیا۔ ان حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کر دینے والی سندوں کی فروخت سے جو روپیہ وصول ہوتا تھا وہ سیدھا روما پہنچ جاتا تھا۔

مالی ضرورتوں سے مجبور ہو کر بہت سے پاپا اس ذلیل حیلہ جوئی پر اتر آئے کہ جب کسی فرمانروا یا اسقف یا رئیس ہیکلین کا مقدمہ پاپائی عدالت میں پیش ہوتا تھا تو اس سے کہا جاتا تھا کہ ایک جام طلائی جس میں دوکات بھرے ہوئے ہوں بطور نذرانہ پیش کرے۔ اسی قسم کی ضرورتیں۔ جشن جوبلی کے انعقاد کی محرک ہوئیں۔ پاپائے سکٹس رابع نے بہت سے جدید عہدے قائم کئے اور ہر عہدہ بعوض تین یا چار سو دوکات کے فروخت کر ڈالا۔ پاپائے انوسنٹ ثامن نے اکلیل پاپائی رہن رکھا۔ پاپائے لیودہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی جو رقم اس کا پیشرو خزانہ میں چھوڑ مرا تھا اول تو اس پر ہاتھ صاف کیا اس کے بعد اپنی دولت پر دست تبذیر دراز کیا اور جب یہ بھی کافی نہ ہوئی

تو اپنے جانشین کے متفرقہ مداخل کو پہلے سے وصول کر کے لیکھا چوکھا برابر کر دیا۔ اس نے دو ہزار ایک سو پچاس جدید خدمتیں قائم کر کے فروخت کیں۔ مشتریوں کے لئے روپیہ لگانے کی اس سے بہتر ترکیب نہ تھی۔ اس لئے کہ اصل سرمایہ پر بارہ فیصدی سود کہیں گیا ہی نہ تھا۔ اس سود کے استحصال کے لئے وہ ممالک موجود تھے جہاں کیتھولک مذاہب رائج تھا یورپ بھر میں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں سرمایہ اس قدر بامنفعت طور پر لگایا جا سکتا ہو جیسے روما میں۔ اخلاق الرہن کے ذریعہ سے اور نیز عہدوں کو نہ صرف ایک دفعہ بلکہ مکرر فروخت کر کے بڑی بڑی رقمیں وصول کر لی جاتی تھیں۔ عہدہ داروں کا اضافہ اس غرض سے کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے عہدہ کو دوبارہ بیچ ڈالیں۔

اگرچہ سود خواری پاپائی اجتہاد کی رو سے ممنوع تھی لیکن پھر بھی پاپائی عدالت العالیہ کے متعلق ایک بہت بڑا بنک قائم ہو گیا تھا جو پادریوں ملازمت کے امیدواروں اور اہل مقدمہ کو نہایت سخت شرح سود پر روپیہ قرض دیتا تھا۔ پاپائی مہاجنوں کے لئے تو گویا سود لینا مباح تھا اور باقی سود خوار مطرو و مردود تھے۔ پاپائی عدالت العالیہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ بھر کے پادری اگر اس کے مقروض ہوں گے تو پاپائیت کی اغراض کو بہت کچھ نفع ہو گا اس لئے کہ عدالت ان پر من مانا دباؤ ڈال سکے گی اور اگر وہ دباؤ نہ مانیں گے تو عدم ادائے سود کی علت میں انہیں کلیسا کے حلقہ سے خارج کر سکے گی۔ ۱۳۲۷ء میں جب حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ نصف مسیحی دنیا حلقہ کلیسا سے خارج ہو چکی ہے۔ اساقف کا اخراج اس لئے عمل میں آیا کہ وہ پاپا کے نائبوں کے مطالبات سے عہدہ بر آ نہ ہو سکے تھے اور عام اشخاص اس لئے خارج کئے گئے کہ وہ مجبور ہو کر تذکرات لغفران یا اجاز نامجات نقض قانون خریدیں اور پاپائی کارندوں کو ان کی منہ مانگی قیمت ادا کریں۔ تمام یورپ کے قسیسی مداخل روما کی طرف کھنچے ہوئے چلے جاتے تھے جوار تشا۔ سیمونیت۔ سودخواری۔ بددیانتی اور استحصال بالجبر کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ۱۰۶۶ء سے جو تحریک اجتماع و اکتناز قوت کی تاریخ آغاز ہے۔ پاپاؤں نے اپنے خاص گلے کی بھیڑوں کی دیکھ بھال بالکل چھوڑ دی تھی یعنی روما کی آبادی کی روحانی عورد پرداخت اور کلیسائے روما کے اندرونی انتظامات کی طرف توجہ کرنے کی انہیں مطلق فرصت نہ تھی۔ ممالک غیر کے ہزاروں معاملات جن میں سے ہر ایک بجائے خود بہت بڑا ذریعہ آمدنی تھا انہیں ہر وقت مصروف رکھتے تھے۔ اسقف الوبرو پلابو کا بیان ہے کہ "میں جب کبھی ایوان عدالت العالیہ پاپایہ میں داخل ہوتا تھا تو ارکان عدالت یعنی پاپا کے گماشتوں کو اشرفیاں گنتے ہوئے پاتا تھا جن کے ڈھیر کے ڈھیر ہر طرف لگے رہتے

تھے۔" پاپائی عدالت کی حدودارضی کی توسیع کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا۔ قانون سے مستثنیٰ کرنے کا ڈھنگ ایسا ڈالا گیا تھا کہ جو شخص مستثنیٰ ہوتا تھا اسے ہر وقت ایک نیا استثنا حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اساقف کو مجمع الاکلیروس کے مقابلہ میں خاص خاص رعایتیں حاصل تھیں۔ تو مجمع الاکلیروس بھی بمقابلہ اساقف خاص رعایات سے مستفیض تھا۔ علی ہذا القیاس اساقف خانقاہیں عام اشخاص نائبان پاپا کے استحصال سے مستثنیٰ تھے۔ غرض استثنا کا یہ سلسلہ پاپائے مقدس کی خواہش جلب منفعت کی طرح کہیں ختم ہوتا ہی نہ تھا۔

پاپائیت کا مدار اب جن دو طاقتوں پر تھا ان میں سے ایک نوکردینالون کی مجلس تھی اور ایک "کیوریا" یعنی عدالت العالیہ پاپائیہ۔ ۱۰۵۹ء میں پاپا کا انتخاب کردینالون کی کثرت رائے سے ہونے لگا۔ اس سے پہلے یہ انتخاب کل رومن کیتھولک پادریوں کی طرف سے عمل میں آتا تھا اور روما کے مجسٹریٹوں اور سربرآوردہ باشندوں کا استصواب بھی لازمی ہوتا تھا۔ لیکن پاپائے نکولس ثانی نے حق انتخاب کو مجلس کردینالان کی آرا کے دو ثلث پر محدود کر کے توثیق انتخاب کا حق شہنشاہ جرمنی کو عطا کر دیا۔ تقریباً" دو سو سال تک کردینالون کی حکومت مختصہ و مجتمعہ اور پاپا کی حکومت مطلقہ و منفردہ میں ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے کشمکش ہوتی رہی اور آپس میں خوب خوب داوں پیچ ہوئے۔ کردینال اس بات پر تو راضی تھے کہ پاپا کی حکومت خارجہ مطلق العنان ہو اور اس کے اقتدارات کے اس شعبہ میں مطلق دست اندازی نہ کی جائے۔ لیکن بوقت انتخاب اس کے موافق رائے دینے سے پہلے وہ اس سے یہ اقرار لے لیتے تھے کہ حکومت میں ان کو بھی ایک خاص حصہ دیا جائے گا۔ انتخاب کے بعد اور رسم تطہیر کے ادا ہونے سے پہلے وہ خاص خاص مراعات پر کاربند ہونے کی قسم کھاتا تھا مثلاً" یہ کہ مداخل میں کردینالون کو بھی شریک کرے گا ان کو برطرف نہ کرے گا اور سال میں دو مرتبہ اس بحث کے لئے ان کی مجلس کے منعقد ہونے کی اجازت دے گا کہ آیا وہ اپنے عہد و پیمان پر قائم رہا ہے یا نہیں۔ لیکن پاپا اپنے عہد پر کبھی قائم نہ رہے اور متواتر پیمان شکنی کے مرتکب ہوئے۔ کردینال چاہتے تھے کہ کلیسائی حکومت اور آمدنی میں انھیں زیادہ حصہ ملے لیکن پاپا قوت اور دولت کی اس علیحدگی کے کسی طرح روادار نہ تھے۔ کردینالون کی آرزو تھی کہ مشکوہ و طمطراق اور اسراف و تبذیر میں سربرآوردہ نظر آئیں اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ رقم خطیر درکار تھی۔ ان میں سے ایک کے اختیار میں ایک دفعہ پانچ سو عہدے تھے۔ ان کے اعزا و اقربا اور ملازمین و متوسلین کا

تکلف بھی لازمی تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔ بعض دفعہ ان کی رقابتوں کی وجہ سے سالہا سال تک کسی پاپا کا انتخاب نہ ہوتا تھا۔ گویا اپنے اس طرز عمل سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ نائب مسیح کے بغیر بھی کلیسا کا کام باسانی چل سکتا ہے۔

گیارہویں صدی کے خاتمہ پر کلیسائے روما دربار روما ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ مسیحی بھیڑیں ممیاتی ہوئی اپنے گڈریے کے پیچھے پیچھے روما کے مقدس باڑے میں پھرتی ہوئی نظر آئیں۔ محرروں کارندوں محصلوں اور نوشتہ جات داد و سند کی تصدیق کرنے والے عہدہ داروں کا ایک محکمہ قائم ہو گیا۔ جس میں مراعات ناموں تذکرات الغفران اور استثناؤں کا لین دین ہوتا تھا اور اہل مقدمہ ہاتھوں میں عرضیاں لئے صیغہ بصیغہ پھرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ روما ہر قوم و ملک کے امیدواران ملازمت کا نقطہ اجتماع بن گیا تھا۔ دینی ڈگریوں پاپائی نوازش ناموں عفو و غفران کے تذکروں ارتکاب گناہ کے اجازت ناموں' فرمانوں اور فیصلوں کے طومار نے جو یورپ اور ایشیا کے ہر حصہ کے لوگوں کے نام شب و روز جاری رہتا تھا کلیسائے مقامی کے فرائض اور ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال دیا سینکڑوں ایسے اشخاص اس خدمت کی بجا آوری پر مامور تھے جو سکونت ہی "کیوریا" میں رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ پاپائی خزانہ کی آمدنی کی توفیر سے مستحق ترقی قرار پائیں۔ تمام مسیحی دنیا "کیوریا" کی باج گزار ہو رہی تھی۔ مذہب کا یہاں نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ "کیوریا" کے عہدہ داروں کو سیاسی مباحث' فصل حضوات اجرا و تعمیل ڈگریات دینی سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ روحانی امور میں اپنا وقت ضائع کریں' ہر کشش قلم کی ایک خاص قیمت مقرر تھی۔ تذکرات الغفران اجازت نامجات نقض قانون۔ سندات نجات۔ پروانہ جات حلت محرمات و ممنوعات کی خریدوفروخت' مال تجارت کی طرح ہوتی تھی۔ اہل مقدمات کو چپراسی سے لے کر پاپا تک سب کی مٹھی گرم کرنی پڑتی تھی۔ ورنہ مقدمہ جیتنا محال تھا۔ غیر مستطیع لوگوں کو نہ ترقی مل سکتی تھی اور نہ ملنے کی امید تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر پادری یہ سمجھنے لگا کہ اسے روما کی مثال کی تقلید کا حق حاصل ہے اور اپنے مقتدیوں کی روحانی تواضع اور عشائے ربانی کے ذریعہ سے جائز و ناجائز طور پر جسقدر روپیہ بھی وصول ہو سکتا ہے وصول کرنا چاہیے۔ جلب منفعت کا یہ استحقاق اس نے روما میں وہ رقم ادا کر کے خریدا تھا جو مہاجن سے قرض لی گئی تھی۔ اگر اس طور پر روپیہ نہ وصول کیا جاتا تو یہ قرض کیونکر ادا ہوتا۔ جب "کیوریا" کا مستقر روما سے ایویناں میں منتقل ہوا اور اطالویوں کی طاقت فرانسیسیوں کے پاس چلی گئی۔ تو پھر بھی قدیم حالت بدستور قائم رہی۔ فرق صرف اتنا ہوا

کہ اطالویوں کو بعد حسرت معلوم ہوا کہ سونے کی چڑیا ان کے ہاتھ سے اڑ کر فرانسیسی اڈے پر جا بیٹھی ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ پاپائیت ان کا موروثی حق ہے اور جس طرح شریعت موسویؑ کے دور میں یہودی خدا کے خاص بندے تھے اسی طرح شریعت عیسوی کی رو سے خدا کا فیضان خاص انہیں پر نازل ہوا ہے۔

تیرہویں صدی کے خاتمہ پر ایک جدید مملکت دریافت ہوئی جس میں بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہونے کی قابلیت موجود تھی اس مملکت کا نام مطہر تھا۔ عقل کے اندھوں اور گانٹھ کے پوروں کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ حضرت پاپا اس سرزمین کی گناہگار آبادی کو تذکرات الغفران کے اجرا سے خالی فرما سکتے ہیں۔ اس کے لئے کسی دام تذویر کا بچھایا جانا ضروری نہ تھا۔ دن دہاڑے لوگوں کی چشم اعتقاد میں خاک جھونکی جاتی تھی۔ غرض استغنی طاقت کے ابتدائی جراثیم نے نشوونما پا کر رفتہ رفتہ ایک بہت بڑی زبردست مخفی سلطنت کی شکل پکڑ لی۔

محکمہ احتساب عقائد نے پاپائی قوت کو ایسا زبردست بنا دیا کہ اس کی مزاحمت و مدافعت محال ہو گئی۔ جو شخص مخالفت کرتا تھا آگ میں زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ کسی شخص کے دل میں مخالفانہ خیال کا ناشی ہونا عام اس سے کہ اس خیال کا اظہار کسی خارجی علامت سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو جرم سمجھا جاتا تھا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا محکمہ احتساب عقائد کا طرز عمل زیادہ وحشیانہ ہوتا گیا۔ محض شبہ کی بنا پر ملزم کو شکنجہ کی سزا دی جاتی تھی۔ ملزم کو الزام لگانے والے کا نام تک نہ بتایا جاتا تھا۔ اسے کسی قانون دان شخص سے مشورہ لینے کی اجازت تک نہ دی جاتی تھی۔ اس محکمہ کے فیصلہ کی نہ داد تھی نہ فریاد۔ افسرانِ محکمہ یعنی ارکان احتساب کو حکم تھا کہ رحم و انسیت کو دل میں مطلق نہ آنے دیں۔ ملزم کا عقائد منسوبہ سے توبہ کرنا بھی بے سود لاحاصل تھا۔ ملزم کے ناکردہ گناہ خاندان کا مال و اسباب ضبط کر لیا جاتا تھا۔ جس میں سے آدھا پاپا کے خزانہ میں چلا جاتا تھا اور آدھے سے ارکان احتساب اپنے دوزخ کی تواضع کرتے تھے۔ پاپائے انو سنٹ ثالث کا قول تھا کہ ملاحدہ کی اولاد کی صرف جان بخشی کرنی چاہئے اور وہ بھی محض بہ تقاضائے ترحم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نکولس ثالث کے سے ڈاکو پاپاؤں نے اس مقدس عدالت کی لوٹ کے مال سے اپنے خاندانوں کو نہال اور مالامال کر دیا اور ارکان احتساب کو تو ہر روز اس کی بدولت تر لقمے ملتے رہتے تھے۔

پاپائیت کے قبضہ کے لئے فرانسیسیوں اور اطالویوں میں جو جدوجہد ہوئی وہ چودھویں صدی کے مشہور مذہبی تفرقہ کی ذمہ دار ہے۔ چالیس سال تک دو رقیب پاپا ایک دوسرے پر سب و شتم کرتے رہے اور وہ رقیب پاپائی عدالتیں بہ تقاضائے جلب منفعت اقوام یورپ کو

جونک بن کر چپٹی رہیں۔ بالآخر پاپاؤں کی تعداد دو سے بڑھ کر تین ہو گئی اور امتثال امرو ادائے خراج ربانی کے لئے تین جداگانہ مرکز قائم ہو گئے۔ لوگوں کی ارادت و عقیدت صنفطہ میں پڑ گئی۔ وہ حیران تھے کہ کس پاپا کو اصلی اور سچا نائب جناب مسیح کا تصور کریں اور عشائے ربانی و سرالقدوس جیسی پاک مذہبی رسموں کی تطہیر کے متعلق کس سے اور کیوں کر استناد کریں۔ مسیحی انجمن میں جائز مجتہدانہ قیاس کی کرسی صدارت خالی تھی۔ ہر شخص مجبور تھا کہ اپنا مجتہد خود بنے۔ لوگوں کو معلوم ہونے لگا کہ کلیسا کے پاؤں میں عدالت العالیہ پاپائیہ کی جو زنجیر پڑی ہوئی ہے اس کا ٹوٹنا اور ایک مجلس عمومی کا قائم ہونا کلیسا کی سلامتی کے لئے ضروریات سے ہے چنانچہ مجلس عمومی کے قیام کی کوشش بار بار کی گئی۔ اس کوشش کی غایت یہ تھی کہ اس مجلس کو مسیحی دنیا کی پارلیمنٹ بنا دیا جائے جس کا اعلیٰ عہدہ دار انتظامی پاپا ہو۔ لیکن وہ ذاتی اغراض اور نفسانیتیں جو مدت ہائے مدید کے ذمایم و مفاسد کا نتیجہ تھیں کیوں کر یک بیک علاج پذیر ہو سکتیں۔ عدالت العالیہ پاپائیہ کا بازار پھر گرم ہو گیا اور پادریوں کا وہی اگلا سا تجارتی لین دین پھر شروع ہو گیا۔ اہل جرمنی نے جنہیں عدالت العالیہ پاپائیہ کے اقتدارات میں کبھی حصہ نہ ملا تھا اصلاح کی ان کوششوں میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن جب حالت بد سے بدتر ہوتی چلی تو ان کو بھی ماننا ہی پڑا کہ مجالس عمومی کے ذریعہ سے اصلاح کینسہ کی توقع رکھنا لاحاصل ہے۔ چنانچہ ارسمس کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات نکلے کہ "اگر مسیح اپنے بندوں کو ان گوناگوں قسیس مظالم سے نجات نہ دلائیں گے۔ تو ترکوں کے ظلم کی سختی کم ہو جائے گی۔" غرض کلیسا کی حالت اس درجہ ابتر ہو گئی تھی کہ کردینالون کا منصب علانیہ فروخت ہونے لگا تھا اور پاپائے اگرہم کے عہد میں تو ہر قسیس و مذہبی خدمت نیلام ہوتی تھی۔ زندگی کا اصول موضوعہ یہ ہو گیا تھا کہ اول دولت بعدہ عزت۔ عہدہ داروں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو آنکھ سے اوجھل ایماندار ہو یا گواہ لائے بغیر پاکبازی کا ادعا کر سکے۔ کردینالون کے ارغوانی رنگ کی مخملی عبائیں اور سفید سنجاب کے طیلسان دھوکے کی ٹٹی ہو رہے تھے جن کی آڑ میں کوئی خباثت نہ تھی جس کا یہ بزرگوار ارتکاب نہ کرتے ہوں اور کوئی گناہ نہ تھا جو ان حضرات سے صادر نہ ہوتا ہو۔

کلیسا کی وحدت (اور اس لحاظ سے اس کی طاقت) اس امر کی مقتضی تھی کہ لاطینی کا استعمال بطور زبان مقدس عام طور سے ہو۔ لاطینی ہی کے استعمال کے بدولت روما یورپ کا جزو لاینفک بنا رہا اور تعلقات بین الاقوام کے قائم رکھنے میں کامیاب ہوا۔ لاطینی زبان کے بین الاقوامی استعمال نے روما کو جو قوت بخشی اس کے مقابلہ میں ان اقتدارت کے اثر کی

کوئی ہستی نہیں۔ جن کے ساوی الاصل ہونے کا پاپائیت کو ادعا تھا اور اگرچہ اس کو اپنے کارناموں پر بہت بڑا ناز ہے لیکن وہ اس الزام سے کسی طرح بچ نہیں سکتی کہ باوجود اتنی بڑی طاقت کے جو آئندہ اس کے کسی جانشین کو حاصل نہ ہو سکے گی اس نے کچھ اس سے بھی زیادہ کیوں نہیں کر دکھایا۔ اگر پاپایان روما اپنی ہوس رانیوں اور دنیا پرستیوں میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اس بات پر قادر تھے کہ ان کے ایک اشارہ پر تمام براعظم بالاتفاق ایسی ترقی کرتا کہ دنیا دنگ رہ جاتی۔ ان کے نائب بے روک ٹوک ہر ملک میں جا سکتے تھے اور آئرلینڈ سے لے کر بوہیمیا اور اٹلی سے چل کر اسکاٹ لینڈ تک بلاتکلف آپس میں بات چیت کر سکتے تھے۔ ایک زبان ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی امور کے نظم و نسق میں دخیل ہو گئے تھے اور ہر ملک میں انہیں ایسے ہوشیار اور معاملہ فہم حلیف ہاتھ آ گئے تھے جو ایک ہی زبان بولتے تھے اور مہمات الامور میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار تھے۔

ایسی حالت میں یونانی زبان کے احیا اور عبرانی زبان کی ترویج پر روما نے جس نفرت و عداوت کا اظہار کیا وہ کچھ بے وجہ نہ تھا اور جو تشویش اسے یہ دیکھ کر دامنگیر ہوئی کہ السنہ جدیدہ کی دیوار گنوار بولیوں کی بنیاد پر چنی جا رہی ہے وہ بیجا نہ تھی۔ پیرس کے مدرسہ الہیات کے اس تردد آمیز استفسار کو کہ اگر یونانی و عبرانی کے پڑھنے کی اجازت دی جائے گی تو مذہب کا کیا حشر ہو گا۔ اگرچہ کروبتال زمنیز کے عہد کے خیالات کی گونج سے تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن اس کی تہ میں ایک حقیقی خدشہ بھی مضمر تھا۔ لاطینی کے رواج عام پر روما کی طاقت کا انحصار تھا۔ اس کے انحطاط کے ساتھ اس کا زوال وابستہ تھا۔ اس کے عدم استعمال کے یہ معنی تھے کہ روما کی حد اثر اٹلی کے ایک چھوٹے سے صوبہ تک محدود ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپین زبانوں کی ترقی روما کی بربادی کا باعث ہوئی ہے۔ یہ زبانیں گدائی پیشہ راہبوں اور ان پڑھ عوام الناس کے درمیان تبادلہ خیالات کا موثر ذریعہ بن گئیں اور ان میں سے ایک زبان بھی ایسی نہ تھی جس نے اپنی اولین تصانیف میں روما کو نشانہ حقارت و آماجگاہ ملامت نہ بنایا ہو۔

غرض یورپ کے مختلف الالسنہ لٹریچر کی ترقی پاپائی مسیحیت کے زوال کی ہمعصر ہے۔ پاپائی عہد حکومت میں ناممکن تھا کہ یورپ کا لٹریچر وجود میں آ سکے اس لئے کہ مذہبی وحدت علمی وحدت کی متقاضی تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ صرف ایک ہی علمی زبان ہر جگہ رائج ہو۔

اگرچہ ایک زبان واحد کے مالک ہونے کی وجہ سے کلیسا کی قوت میں ایسا حیرت انگیز اضافہ ہو گیا لیکن اس کی طاقت کا اصلی راز اس دسترس میں پوشیدہ تھا جو اس نے نہایت

چالاکی سے لوگوں کی خانگی زندگی پر حاصل کر لی تھی۔ اس کے فقدان کے ساتھ اس کا اثر بھی گھٹ گیا اور ساتھ ہی بین الاقوامی امور میں اس کی سیاسی مداخلت بھی برائے نام رہ گئی۔

مسیحیت سے پہلے جب تاجداران روما کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا تو سلطنت کے صوبوں میں جہاں رومی افواج کی چھاؤنیاں قائم ہوتی تھیں وہ سب مقامات تہذیب و شائستگی کے مرکز بن جاتے تھے۔ صنعت و حرفت اور امن و امان کی جو حالت ان مقامات میں پائی جاتی تھی اس کی مثال گردونواح کی وحشی اقوام پر جو برطانیہ فرانس اور جرمنی میں آباد تھیں اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہی اور اگرچہ حکام روما کا یہ فرض نہیں تھا کہ اقوام مفتوحہ کی فلاح و بہبود میں نمایاں دلچسپی ظاہر کریں بلکہ ان کا فائدہ اسی میں تھا کہ ان اقوام کی حالت ذلیل رہے۔ کیونکہ پستی حالت حلقہ بگوشی و اطاعت کیشی کی ممد و معاون ہوتی ہے لیکن پھر بھی رعایا کی تمدنی و معاشرتی حالت میں منفرداً" و مجتمعاً" برابر اصلاح ہوتی گئی۔

جب روما میں پادریوں کا دور دورہ ہوا تو اسی قسم کے نتائج خودبخود ظہور میں آنے شروع ہوئے۔ بیرو نجات میں فوجی چھاؤنیوں کی جگہ دیر قائم ہو گئے۔ گاؤں یا شہر میں گرجا روشنی اور تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اول الذکر کے سامان عیش و عشرت اور ثانی الذکر کے مواعظ و نصائح نے لوگوں پر ایک زبردست اثر ڈالا۔

خاندانوں کے نظام معاشرت کی تنظیم۔ حکومت ملکی کے ضابطہ کی تعیین اور دول یورپ کی ترکیب میں پاپائیت کے طرز عمل نے جو حصہ لیا اس کے محاسن پر نظر ڈالتے وقت ہم اس امر کو فراموش نہیں کر سکتے کہ کلیسی حکمت عملی کا خاص مقصد اصلاح تمدن نہ تھا بلکہ اعتلائے کلیسا تھا۔ پس دنیادار لوگوں کو جو فوائد پہنچ گئے وہ مقصود بالذات و معہود بالنہایت نہ تھے بلکہ ذیلی و اتفاقی تھے۔

اقوام کی مادی حالت کی اصلاح و ترقی کے لئے کوئی نتیجہ خیز و مستقل بالذات تدبیر پاپاؤں کی طرف سے اختیار نہیں کی گئی۔ ان کے نشوونمائے عقلی کے لئے کوئی طریقہ عمل میں نہیں لایا گیا اور انہیں پڑھ بلکہ جاہل مطلق رکھنے کی کوشش کی گئی۔ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں لیکن کسانوں کی حالت کھیت کے چوپایوں سے بہتر نہ ہونے پائی۔ وسائل نقل و حرکت اور ذرائع رسل و رسائل کو جو توسیع خیالات کے ممد و معین ہوا کرتے ہیں جامد و غیر متحرک رہنے دیا گیا۔ آبادی کا اکثر حصہ ایسا تھا جسے ساری عمر اپنے گھر سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اس بدنصیب طبقہ کو نہ اصلاح حالت کی امید تھی نہ کسی ترقی

کی توقع۔ افلاس کے سدباب اور قحط کے اندفاع کے لئے بڑے پیانہ پر کوئی تجویز نہ سوچی گئی۔ وبا کو اجازت تھی کہ کھلے بندوں جہاں چاہے پھرے اور جس شہر پر چاہے چھاپہ مارے۔ بہت ہی روک ٹوک ہوئی تو کسی پادری نے دوچار لاطینی دعائیں بڑبڑا دیں۔ بری خوراک ناقص لباس اور ناکافی مکان برابر اپنا اثر کئے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہزار سال کے بعد یورپ کی آبادی دگنی بھی نہ ہونے پائی۔

اگر کسی حکومت کا فن تدبیر مملکت پیدائش کو روکنے اور اموات کا باعث ہونے کے اعتبار سے قابل مواخذہ ٹھہر سکتا ہے تو پاپائیت پر کتنا بڑا مواخذہ عائد ہوتا ہے۔

کیتھولک مذہب کے اس عام اثر کی تنقید کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے آپ کو تو خیر جو کچھ نفع پہنچایا وہ ظاہر ہے لیکن اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ساتھ کیا بھلائی کی ہے۔ راہب کی خانقاہ کی شاندار تصویر پردہ تصویر پر کھینچو۔ اس میں عیش و عشرت اور راحت و آسائش کا ہر ایک سامان تمہیں نظر آئے گا۔ ترشی ہوئی گھاس کے زمردیں تختے پھولوں کے چمن۔ میوہ دار درختوں کے حدیقے اچھلتے ہوئے فوارے۔ ترنم آفرین نہریں سبھی کچھ پاؤ گے۔ لیکن ان نعمتوں کا تعلق بیچارے وباز دہ کسان سے نہ ہو گا جو کسی دلدل کے کنارے ایک ٹوٹے چھپر کے نیچے بے یارومددگار سسکیاں بھرتا ہوا دم توڑ رہا ہو گا بلکہ ان کا تعلق خانقاہ کے سجادہ صاحب سے ہو گا جن کے ٹاٹگن کی ہلچل جن کی ترمیتوں۔ شکروں اور تازی کتوں کی صید افگنی جن کے تمغانہ اور نعمخانہ کے اطعمہ لذیذہ و اشربہ نفیسہ کی حکایت سے تاریخ کے ورق بھرے پڑے ہیں۔ یہ عیش پرست راہب اسی مذہبی نظام کا ایک جزو لاینفک ہے۔ جس کا مرکز اٹلی ہے۔ وہ روما کا باجگذار اور مطیع و منقاد ہے اور اس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہوتا جس سے روما کے فوائد کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔ جب ہم اس زمانہ کے عالیشان گرجاؤں اور کنیساؤں پر نظر دوڑاتے ہیں جن کا شمار فن تعمیر کی معجزنمائی کے کرشموں میں ہے اور جنہیں دیکھ دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پاپائیت کے حقیقی معجزات یہی عمارتیں ہیں اور جب ہم ان مہتمم بالشان اور دل پر رعب طاری کرنے والے مذہبی مراسم کو جو ان گرجاؤں میں ادا کئے جاتے تھے۔ اس دھندلے نور کو جو رنگا رنگ آئینوں والے دریچوں میں سے چھنتا تھا۔ ان سریلی آوازوں کو جن کے الاپ کی سامعہ فریبی ملائک کے نغموں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ان پادریوں کو جو اپنے مقدس خلعت ہائے فاخرہ زیب تن کئے ہوئے تھے اور سب سے زیادہ ان سربسجدہ عبادت گزاروں کو جو ایک اجنبی اور نامعلوم زبان میں دعائیں اور نمازیں سن رہے ہوتے تھے۔ غرض جب ہم

اس تمام عالیشان مذہبی نظارہ کو اپنے تصور میں لاتے ہیں تو بے اختیار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ عبادت گزاروں کی روحانی فلاح کی خاطر تھا یا روما کی زبردست اور ہمہ گیر طاقت کا پایہ جلال و عظمت اور بھی اونچا کرنے کی غرض سے؟

لیکن شاید کوئی شخص اس کے جواب میں یہ کہے کہ انسانی مساعی محدود ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جنہیں کوئی سیاسی نظام اور کوئی انسانی طاقت خواہ اس کا ارادہ کیسا ہی نیک کیوں نہ ہو انجام نہیں دے سکتی۔ انسان وحشیانہ حالت سے ترقی کر کے دفعتہ شائستہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک وسیع براعظم ایک ہی دن میں مہذب نہیں ہو سکتا۔

یہ سب سچ ہے مگر پاپائیت کے جانچنے کے لئے اس قسم کا معیار پہلے ہی مقرر نہیں کیا گیا۔ کیتھولک طاقت کی نسبت جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ وہ ازراہ غایت استحقار انسانی الاصل ہونے سے منکر ہوئی بلکہ اس وقت تک منکر ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا ماخذ ربانی ہے اور اس کو الوہیت کے ساتھ بلاواسطہ نسبت ہے۔ پاپائے اعظم خلیفتہ اللہ فی الارض ہے۔ اس کا اجتہاد خطا سے پاک ہے۔ اس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اگر ضرورت آ پڑے تو معجزے کے ذریعے سے ان ہونی بات کو ہونی کر دکھائے۔ ایک ہزار سال تک اس نے یورپ کے عقل و ادراک پر جابرانہ اور قاہرانہ حکومت قائم رکھی اور اگرچہ بعض تاجداروں نے سرکشی کی راہ سے کبھی کبھی اس کی مخالفت کی۔ لیکن مجموعی حیثیت سے یہ مخالفت ایسی بے حقیقت تھی کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے حل و عقد و بست و کشاد کا مدار علیہ پاپائے روما ہی تھا۔

جو واقعات اس فصل میں بیان کئے گئے ہیں ان پر بلاشبہ سولھویں صدی کے پراٹسٹنٹ علم برداران اصلاح کی نظر غائر پڑ چکی تھی اور وہ یہ نتیجہ نکال چکے تھے کہ رومن کیتھولک مذہب اپنے فرائض مذہبی کی انجام دہی سے بالکل عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ بلکہ ضلالت افترا اور ریاکاری کا مجموعہ بن گیا ہے۔ پس سچی مسیحیت کے احیاء کی صرف یہی شکل ہے کہ قرون اولیٰ کے عقائد و مراسم کو ازسرنو تازہ کیا جائے۔ اس فیصلہ پر حامیان اصلاح دفعتہ و بغتتہ نہیں پہنچے تھے۔ ایک مدت ممتد سے بہت سے پیشوایان مذہب اور روشن خیال علماء فضلا کی یہی رائے تھی۔ چنانچہ ازمنہ وسطیٰ میں فرانسسکن طبقہ کے متقی اور پرہیزگار راہب اس خیال کو صاف طور سے ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے کہ روما کے ایک قیصر کی لن ترانیوں نے سچے مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ غرض اصلاح کے لئے مواد ایک عرصہ سے تیار ہو رہا تھا۔ سرنگ بچھائی جا چکی تھی۔ صرف بتی دکھانے کی دیر تھی۔ لوتھر کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ تمام

شمالی یورپ نے فیصلہ کر لیا کہ مریم عذرا کی پرستش۔ اولیا سے مراد طلبی۔ معجزہ نمائی۔ مریضوں کا کراماتی علاج۔ ارتکاب گناہ کے لئے تذکرۃ الغفران کی خرید اور پاپا پرستوں کی مٹھی گرم کرنے والے باقی کے تمام ان اعمال سیئہ کا جو عیسائیت سے منسوب کر دیئے گئے تھے۔ لیکن اس سے حقیقت میں تعلق نہ رکھتے تھے یک قلم خاتمہ کر دیا جائے۔ کیتھولک مذہب کو ایک ایسی طاقت ہونے کی حیثیت سے جس کی غایت فلاح و ترقی انسان تھی اپنے اس دعوے میں کہ اس کا طرز عمل معلل بہ تائید آسمانی ہے صاف ناکامی ہوئی۔ اس کے کارناموں اور اس کے ادعاؤں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک ہزار سال تک اسے انسان کی اصلاح حالت کا موقع دیا گیا۔ لیکن جب اس کی کارگزاری کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ بنی نوع انسان کی جس جماعت کثیر کو اس کے حوالہ کیا گیا تھا اس کی حالت جسمانی و عقلی ترقی کے اعتبار سے اس حالت کے مقابلہ میں بہت ہی پست تھی جس میں یہ جماعت پائی جانی چاہیئے تھی۔

۱؎ پروفیسر اڈورڈ ٹیلر فیلو آف دی رائل سوسائٹی اپنی کتاب "انتھراپالوجی" (علم الانسان) کے صفحہ ۲۳۳ پر ترقی فن تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج کل پتھر کی عمارت کے طریقہ تعمیر کے متعلق ہمارا عام خیال یہی ہے کہ پتھر کی سلوں کو جوڑنے کے لئے ان کے درمیان چونے یا گچ کی ایک تہ بچھا دی جائے لیکن مصر اور یونان قدیم کی خوبصورت شاندار عمارتوں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں خشک چنائی کا رواج تھا۔ سلیں تلے اوپر چن دی جاتی تھیں اور ان کی پیوستگی کے لئے چونے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ ہاں جب پتھروں کو خاص طور سے جوڑنا منظور ہوتا تھا تو دہات کے قبضے استعمال کئے جاتے تھے۔ مترجم

۲؎ نکولو کیاولی پاپائے لیو دہم کا معاصر اور پندرہویں صدی کے مشاہیر اہل تدبر سے ہے۔ لیکن اگرچہ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا فلسفی اور سب سے بڑا مدبر سمجھا گیا ہے پھر بھی اس کی شہرت قابل رشک نہیں خیال کی جاتی۔ اس لئے کہ اس نے فن تدبیر مملکت اور حکمت عملی کی بنیاد بے ایمانی۔ چالاکی۔ بدعہدی اور بے اصولی پر رکھی ہے۔ اسی لئے اس کا نام غدارانہ چال بازی کا مترادف ہو گیا ہے۔ لارڈ میکالے کیاولی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگ اس کے اصل نام سے بدمعاش اور اس کے مسیح نام سے شیطان مراد لینے لگے۔ مترجم

۳؎ لیوپولڈوان اینکی زمانہ حال کا ایک بہت بڑا جرمن مورخ۔ ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں وفات پائی۔ اس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ واقعات کو بے رو و رعایت بلاکم و کاست درج کرتا ہے اور ذاتی رائے یا رجحان کو وقائع نگاری میں مطلق دخل نہیں دیتا۔ اگر

دوسرے یورپین مورخین بھی اسی اصول پر چلتے تو تاریخ تدلیس و تصرف کے ان عیوب سے پاک ہوتی جو یورپ کے عارض تہذیب پر بمنزلہ ایک بدنماسہ کے ہیں۔

تاریخ پاپایان روما کی نسبت جس کا ڈریپر نے متن میں حوالہ دیا ہے لارڈ میکالے لکھتے ہیں کہ پروفیسر اینکی کی تصنیف ان حلقوں میں جہاں جرمن لٹریچر کا رواج ہے قدرومنزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور یہ ایک ایسے شخص کی مشق قلم کا نتیجہ ہے جو نکتہ رسی و دقیقہ سنجی اور وسیع النظری کے اعتبار سے اقران و اماثل میں سربرآوردہ ہے۔ کتاب کا طرز تحریر نہایت دپسندیدہ دل نشین ہے۔ متانت و رزانت اس کے حرف حرف سے مترشح ہے۔ تعصب اور چھچھوراپن اس میں نام کو نہیں پایا جاتا اور ابتدا سے لے کر انتہا تک رواداری کے ساتھ بلارورعایت لکھی گئی ہے۔ اس تاریخ کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے اور اس کے انگریزی ترجمہ ہی کی تنقید کرتے ہوئے جولیڈی سارا آسٹن کا کیا ہوا ہے لارڈ میکالے نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ مترجم

[4] قرون متوسط کے عیسائیوں کی اس گندگی اور گھناؤنے پن کی اگر تحلیل کی جائے تو اس عنصر غالب وہ مجنونانہ تعصب ثابت ہو گا جو پادریوں کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ چونکہ جسمانی طہارت مسلمانوں کا مذہبی فریضہ تھی لہٰذا ضرور تھا کہ پادری شست و شو سے قابلتہ ابا کریں اور اپنے چیلوں کو بھی یہی پٹی پڑھائیں چونکہ مسلمان صاف ستھرے رہتے تھے اس لئے لازم تھا کہ پادری گندے رہیں۔ غرض من تشبہ بقول فھومنھم کے اصول پر انہوں‌ں نے اس حد تک عمل کیا تھا کہ مسلمان اگر دن کو دن کہتے تو پادری کہتے تھے کہ نہیں رات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی صدیوں تک مسیحی دنیا غلاظت اور نجاست میں لتھڑی رہی۔ مترجم

[5] جب بیت المقدس اور کل ارض مقدس کو مسلمانوں کے قبضہ میں دیکھ کر مسیحی دنیا کی غیرت یعنی تعصب کا دریا جوش میں آیا اور حروب صلیبیہ کا خونریز سلسلہ شروع ہوا تو چند مسیحی برادریاں اس غرض سے قائم ہو گئیں کہ جو مسیحی زائر ارض مقدس کا سفر اختیار کریں ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے یہ جماعتیں طبقہ ٹیمپلین کے نام سے موسوم ہیں۔ بعد میں اس طبقہ کا مقصد دین مسیحی کی حمایت اور مسلمانوں کا استیصال ہو گیا۔ اس طبقہ کے جانباز اراکین اگرچہ رہبانیت اور زہد و اتقا کا دم بھرتے تھے لیکن ان سے بسا اوقات ایسی ایسی حرکتیں سرزد ہوتی تھیں جو بڑے سے بڑے فاسق و فاجر کو بھی عرق انفعال میں ڈبو دینے کے لئے کافی ہوتیں۔ مترجم

[6] کلیسا کے عہدوں کی خریدوفروخت۔ مترجم

[7] ڈہائی روپے کا ایک سکہ جو وینس میں چلتا تھا۔ مترجم

[8] جب اقبال بنی اسرائیل کے ساتھ تھا اور حکومت ان کے ہاتھ میں تھی تو ان کے سلاطین کا یہ دستور تھا کہ ہر پچاسویں سال ایک بہت بڑا تہوار مناتے تھے اور اس موقع پر رعایا کے ساتھ طرح طرح کے سلوک اور احسان کرتے تھے۔ تمام غلام آزاد کر دئے جاتے تھے۔ تمام قیدیوں کو رہائی دے دی جاتی تھی۔ تمام قرض معاف کر دئے جاتے تھے۔ تمام جائدادیں حواصلی مالکوں کے

ہاتھ سے گزشتہ نصف صدی میں نکل چلی تھیں۔ انہیں واپس دے دی جاتی تھیں۔ اسی تیوہار کا نام جوبلی ہے جس کے عام معنی خوشی کے ہیں۔ لفظ جوبلی ایک عبرانی لفظ یوبل سے مشتق ہے جس کے معنی نفیری کے ہیں۔ چونکہ جشن جوبلی کا اعلان نفیری یا ترئی کی صدا سے کیا جاتا تھا اس لئے اس کا نام یوبل یا جوبلی پڑ گیا۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی کلیسائے رومن کیتھولک نے بھی جشن جوبلی منانا شروع کیا چنانچہ پہلے جشن کے انعقاد کا اعلان پاپائے بانی فیس ثامن نے ۱۲۹۹ء میں کیا۔ یہ جشن اول پنجاہ سالہ قرار پائے پھر حضرت مسیح کی عمر کے اعداد کی مناسبت سے سی و سہ سالہ ہو گئے اور بست و پنج سالہ قرار دے گئے۔ اصلی غایت اس جشن کے انعقاد کی جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے یہ تھی کہ اس موقع پر عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے عیسائیوں سے پاپاؤں کو نذرانہ وصول کرنے کا حیلہ ہاتھ آجائے۔ چنانچہ ان موقعوں پر پاپائی خزانہ میں کروڑوں ہی روپیہ داخل ہو جاتا تھا۔ جشن جوبلی کلیسا کی خوشی میں پاپا کی طرف سے ہر اس شخص کو جو اعتراف سری کے بعد عشائے ربانی کی صحبت میں شریک ہوتا تھا خاص خاص گرجاؤں میں داخل ہونے کی شرط کے ساتھ پروانہ مغفرت عطا کیا جاتا تھا۔

مترجم

۸ے فرانس کے جنوبی و مشرقی حصہ میں دریائے رائن کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور اس ریلوے کا اسٹیشن ہے جو لائن سے مارسیل کو جاتی ہے۔ مسیحی معابد مقابر اور اماکن یہاں کثرت سے موجود ہیں اور ان کی شاندار عمارتیں قسیسیت کے اس مرکز کی خصوصیات سے ہیں۔ چنانچہ پاپائے جان بست و دہم کا مقبرہ سولہویں صدی کے فن تعمیر کی بہترین یادگار ہے۔ ۱۳۰۵ء سے ۱۳۱۷ء تک اونیان پاپائیت کا صدر مقام رہا۔ ۱۸۷۲ء میں یہاں کی آبادی ۲۷۴۰۹ تھی ۱۹۰۱ء میں ۴۶۲۰۹ ہو گئی۔ آج یہ شہر اپنی تجارت خصوصاً ریشمی کپڑوں کے کارخانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ مترجم

۹ے ارسمس کا یہ فقرہ تعصب نفرت اور عناد کے ان سہ گانہ جذبات کا نچوڑ ہے جن کا خون پادریوں کی آنکھوں میں مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں کو دیکھ کر رہ رہ کر اترتا چلا آیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ قسطنطنیہ کے تخت پر سلطان سلیمان قانونی جیسا عادل و بیدار مغز فرماں روا متمکن تھا جسے یورپ بھی عالیشان کا لقب دیئے بغیر نہ رہ سکا اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ سلطان سلیمان کا چہل و شش سالہ عہد حکومت اس حسن سلوک و مراعات کے لحاظ سے جو عیسائی رعایا کے ساتھ کی گئی ترکی کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے تو ارسمس کی حق ناشناسی پر ہمیں ضرب المثل والی اس آنکھ کی پھبتی سوجھتی ہے جس کی شان میں "عیب نماید ہنرش در نظر" کہا گیا ہے۔ سرایڈورڈ کریسی اپنی تاریخ ترکی میں لکھتے ہیں کہ "سلیمان نے اپنے ہر ویسرائے کے نام فرمان جاری کیا کہ قیام امن و امان کی فوری تدابیر اختیار کی جائیں۔ امیر و غریب مسلم و ذمی سب کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے اور عدل و انصاف سے سرمو تجاوز نہ کیا جائے۔ اس کے اس فرمان کو ساری دنیا نے سراہا

اور اس کی عام طور سے تعمیل کی گئی- لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان پر ایک زبردست اور ساتھ ساتھ ہی مہربان حکومت کا سایہ ہے-" یہ تو یورپ کا خیال ہو اور ارسمس صاحب ترکوں کو ظالم اور جابر قرار دیں- پھر یہ ان کا پادریانہ تعصب نہیں تو کیا ہے!!

یکم مئی ۱۵۰۲ء وہ تاریخ ہے جس کا واقعہ کسی طرح واقعہ کربلا سے کم نہیں اس لئے کہ اس دن مسلمانوں کو اندلس سے جہاں انہوں نے آٹھ سو سال تک بڑے کروفر اور آن بان کے ساتھ سلطنت کی تھی طرح طرح کے عذاب کے ساتھ نہایت غدارانہ و سفاکانہ طور پر دیس نکالا دیا گیا- سلطان سلیمان صاحبقران کا زمانہ حکومت ۱۵۳۰ء سے لے کر ۱۵۵۶ء تک ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جس میں ترک آج کل کی طرح دول یورپ کے چوگان کی گیند نہ بنے ہوئے تھے بلکہ خود ان سے ہر نصرانی حکومت کی کور دبتی تھی- اسپین کے مسیحی طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر اگر سلیمان جس کی شمشیر آبدار ہنگری کے جگر میں پیر چکی تھی اپنی سلطنت سے عیسائیوں کو اسی طرح نکال دیتا یا زبردستی مسلمان بنا لیتا جس طرح اس کے معاصرین فرڈیننڈ اسابیلا نے کیا تھا تو وہ ہر طرح سے حق بجانب ہوتا گو ارسمس کی خاطر ہم اسے کچھ دیر کے لئے "ظالم" کہہ لیتے لیکن اس کی انسانیت اور شرافت نفس اس سے ظاہر ہے کہ جب اس نے جزیرہ روڈس کو طبقہ سینٹ جان کے ہیکلین سے فتح کیا جنہوں نے اس کا مقابلہ مدت تک جم کر نہایت بے جگری سے کیا تھا تو بجائے اس کے کہ وہ اسکندر کی طرح غیظ و غضب میں آ کر ان کا مقابلہ مدت تک جم کر نہایت بے جگری سے کیا تھا تو بجائے اس کے کہ وہ اسکندر کی طرح غیظ و غضب میں آ کر ان کو نیست و نابود کر دیتا یا فرڈی ننڈ‌ا سابیلا کی طرح ان کے آثار اور یادگاروں کو مٹا دیتا اس نے روڈس کے مسیح باشندوں کو پوری مذہبی آزادی عطا کی اور حکم دیا کہ ان کے گرجاؤں کی بے حرمتی نہ کی جائے بچے انکے والدین سے نہ چھینے جائیں اور ان کے تمام مذہبی اماکن اور قومی علامات کو برقرار رہنے دیا جائے- چنانچہ مارشل مارمانٹ جس نے ۱۸۳۷ء میں روڈس کا سفر کیا- لکھتا ہے کہ "تین سو پندرہ سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ طبقہ سینٹ جان کے جلیل القدر ہیکلین کو دو سو بارہ سال تک اس جزیرہ پر قابض رہ کر آخر اپنی سپر ڈالنی پڑی- ترکوں نے اپنے بہادر حریفوں کا یہاں تک ادب کیا ہے کہ ہیکلین کا محلہ ابھی تک قائم ہے اور ہر گھر کے دروازے پر ابھی تک اپنے سابق مکین کا طغرے اور معرکہ ابھی تک ثبت ہے- ہیکلین کی بنائی ہوئی عمارات بھی بدستور موجود ہیں اگرچہ ان میں آج کل کوئی رہتا نہیں- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بہادروں کی روحیں یہاں مقیم ہیں-" مترجم

گیارھواں باب

سائنس کا تعلق تمدنِ جدیدہ کے ساتھ

سائنس کے عام اثرات کی مثال تاریخ امریکہ سے۔

سائنس کا یورپ میں داخل ہونا۔ اسلامی اسپین سے چل کر سائنس کا گزر شمالی اٹلی میں ہوا۔ جہاں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا مستقر اٹلی منتقل ہو گیا تھا اس نے خاطر خواہ نشوونما پائی۔ چھاپہ، بحری اسفار اور اصلاح کنیسہ کا اثر۔ اطالوی مجالس علمی کا قیام۔

سائنس کا عقلی اثر اس نے یورپ میں ادراک کی طرز و روش بدل ڈالی۔ لندن کی رائل سوسائٹی اور دوسری علمی مجلسوں کے کارناموں سے اس کی تصدیق و توضیح۔

سائنس کا اقتصادی اثر ان بیشمار ایجادات متعلقہ فن جرثقیل و فن طبیعیات سے ظاہر ہوتا ہے جو چودھویں صدی کے آغاز سے کی گئی ہیں۔ ان ایجادات کا اثر صحت بدلی۔ اور خانگی زندگی اور نیز فنون رزم و بزم پر۔

اس سوال کا جواب کہ سائنس نے بنی نوع انسان کو کیا نفع پہنچایا ہے۔

یورپ کی تاریخ بزمانہ اصلاح کنیسہ ان اثرات کے نتائج پر روشنی ڈالتی ہے جو رومائی مسیحیت نے اصلاح تمدن پر ڈالی۔ اگر ہم امریکہ کی تاریخ زمانہ حال پر اسی طرح کی نظر انتقاد ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ سائنس کے اثرات سے کیا کیا نتائج مترتب ہوئے ہیں۔

سترہویں صدی میں اہل یورپ کی ایک مختصر سی جماعت بحر اوقیانوس کے مغربی ساحل پر آباد ہو گئی تھی۔ جزیرہ نیو فاونڈ لینڈ (ارض جدید) میں چونکہ کاڈ مچھلی کا بامنفعت شکار بہ

کثرت تھا۔ لہٰذا فرانسیسیوں نے ایک چھوٹی سے نو آبادی سینٹ لارنس کے شمال میں قائم کر لی تھی۔ قوم انگریزی قوم ڈچ اور قوم سوئیڈ کے لوگ نیو انگلینڈ (انگلستان جدید) کے سواحل اور "مڈل اسٹیٹز" (ریاستہائے متوسطہ) میں آباد تھے اور فرانسیسی پراٹسٹنٹوں کی کچھ جماعت کیرولائنا میں رہتی تھی۔ یہ افواہ کہ فلاریڈا میں آب بقا کا ایک چشمہ ہے جس کا پانی پی کر انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے چند ہسپانویوں کو یہاں لے آئی تھی۔ ان من چلے سیاحوں نے جو گاؤں قائم کر لئے تھے ان کے پرلی طرف ایک وسیع و غیر معلوم سرزمین پھیلی ہوئی تھی جس میں خانہ بدوش وحشیوں کے گروہ پھرتے تھے۔ ان وحشیوں کی تعداد خلیج میکسیکو سے لے کر سینٹ لارنس تک ایک لاکھ اسی ہزار سے زیادہ نہ ہو گی۔ ان کی زبانی یورپین نوواردوں کو معلوم ہوا کہ اندرون ملک میں آب شیریں کے وسیع سمندر موجود ہیں اور ایک بہت بڑا دریا ہے جس کا نام مسی پسی ہے اس دریا کے بارہ میں ان کے اقوال مختلف تھے۔ بعض کا یہ قول تھا کہ یہ دریا ورجینا میں سے ہوتا ہوا بحراوقیانوس میں جا گرتا ہے۔ بعض کہتے تھے کہ ورجینا میں نہیں بلکہ فلاریڈا میں سے گزرتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ دریا بحرالکاہل میں جا ملتا ہے اور بعض کا قیاس یہ تھا کہ اس کا دہانہ خلیج میکسیکو ہے۔ بحراوقیانوس کی طوفان خیز موجیں جن کو عبور کرنے کے معنی یہ تھے کہ کئی مہینے کا سفر اختیار کیا جائے ان یورپین پردیسیوں کو ان کے وطن سے جدا کرتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ایک ایسے کونے میں پڑے ہوئے ہیں جہاں کسی کو ان کی خبر نہیں ہو سکتی

لیکن انیسویں صدی ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ان بے سرو سامان اور بے یارومددگار آوارگان دشت غربت کی اولاد دنیا کی ایک زبردست اور طاقتور قوم بن گئی۔ اس قوم نے ایک ایسی جمہوری سلطنت قائم کر لی جس کا علم بحراوقیانوس سے لے کر تابہ ساحل بحرالکاہل لہراتا تھا۔ دس لاکھ سپاہیوں کے ایک لشکر جرار کی مدد سے جس کا شمار صفحہ قرطاس ہی کی زینت نہ تھا بلکہ جو میدان جنگ میں موجود تھا اس قوم نے ایک خانگی حریف کا تختہ سطوت و اقتدار الٹ ڈالا۔ اس کے جنگی بیڑے میں سات سو جہاز شامل تھے جن پر پانچ ہزار توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں سے بعض توپیں ایسی بھاری تھیں کہ دنیا میں اس لحاظ سے ان کا جواب نہ تھا۔ ان جہازوں کے سامان محمولہ کا مجموعی وزن پانچ لاکھ ٹن تھا۔ اپنے قومی حقوق کی حفاظت میں اس قوم نے پانچ سال سے کم کی مدت میں چار سو کروڑ ڈالر خرچ کئے تھے۔ اس کی مردم شماری سے جس کا انتظام وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا معلوم ہوا کہ اس کی آبادی ہر پچیسویں سال دگنی ہو رہی ہے جس سے یہ امید قائم کرنی بیجا نہیں کہ انیسویں

صدی کے خاتمہ پر اس قوم کی آبادی تقریباً" دس کروڑ ہو جائے گی۔

ایک ویران براعظم جو سنسان اور سونا پڑا ہوا تھا صنعت و حرفت کا اکھاڑا بن گیا جس میں کلوں کے چلنے کے شور اور آدمیوں کی چہل پہل حرکت نے ایک نئی روح پھونک دی۔ جہاں پہلے ایک گھنا بے راہ جنگل چھایا ہوا تھا وہاں صدہا شہر اور قصبے آباد ہو گئے۔ روئی تمباکو اور اناج جیسی بیش قیمت پیداوار کے کثیر المقدار انباروں نے تجارت کی رونق بڑھا دی۔ کانوں سے سونا۔ لوہا اور کوئلہ اس مقدار میں نکلنے لگا کہ عقل کو باور نہیں آتا تھا۔ تعداد کلیساؤں دارالعلموں اور مدرسوں نے ثابت کر دیا کہ اس مادی ترقی کے دوش بدوش عقلی و روحانی ارتقا کا عمل بھی جاری ہے۔ ذرائع نقل و حرکت کا انتظام بھی خاطر خواہ کر دیا گیا۔ ریل کی سڑکیں طول میں یورپ کی آہنی سڑکوں کے مجموعی طول سے بڑھ گئیں۔ ۱۸۷۳ء میں یورپین سلسلہ ریل کا مجموعی طول ۶۳۳۶۰ میل تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں امریکہ کا سلسلہ ۷۰۶۵۰ میل لمبا تھا۔ اس سلسلہ کی ایک شاخ براعظم کے عرض میں پھیلی ہوئی تھی اور بحراوقیانوس کو بحرالکاہل سے ملاتی تھی۔

لیکن امریکہ کی ترقی میں یہ مادی نتائج ہی قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اخلاقی اور تمدنی نتائج بھی ہماری توجہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں مثلاً چالیس لاکھ حبشی غلام یک قلم آزاد کر دیئے گئے۔ قانون میں اگر رعایت کا میلان پایا گیا تو بجق غربا پایا گیا۔ واضعان قانون کا مقصد یہ تھا کہ افلاس کا انسداد کیا جائے اور غیر مستطیع طبقہ کے لوگوں کی حالت درست کی جائے۔ قابلیت کے لئے ترقی کی راہ کھول دی گئی اور سب رکاوٹیں دور کر دی گئیں۔ ترقی کا کوئی ایسا درجہ نہ تھا جس پر ذہین اور محنتی شخص فائز نہ ہو سکے۔ بعض بڑی بڑی سرکاری خدمتوں پر ایسے شخص مامور تھے جو ابتدا" نہایت غریب اور کسمپرسی کی حالت میں تھے لیکن بڑھتے بڑھتے ان جلیل القدر مدارج پر پہنچ گئے۔ میل جول کی مساوات تو لوگوں میں خیر نہ پائی جاتی تھی اور دولتمند اور آسودہ حال جماعتوں میں اس کا پایا جانا ممکن بھی نہیں لیکن مدنیت کے حقوق سے ادنی و اعلے یکساں بہرہ اندوز تھے اور یہ مساوات نہایت تشدد کے ساتھ قائم رکھی گئی۔

شاید یہ کہا جائے کہ اس غیر معمولی ترقی کا باعث وہ مختص المقام و مختص الحیثیت حالتیں تھیں جو کسی قوم کو اس سے پہلے پیش نہ آئی تھیں۔ ترقی کا ایک وسیع میدان کھلا پڑا تھا اور ایک پورا براعظم ہر اس قوم کو جو اس کے ساحلوں تک آنے کی زحمت گوارا کرتی حق مقاصفت و ملکیت عطا کرنے کے لئے تیار تھا۔ قدرت کے مسخر کرنے اور اس کے خرمن

فیضان سے خوشہ چین ہونے کے لئے بجز محنت اور جرات کے اور کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔

لیکن ہم تو یہی سمجھیں گے کہ ان مسافروں کے لئے جنہوں نے نئی دنیا کی عظیم الشان نو آبادی قائم کی ترقی کی راہ پر ایک بہت بڑے اصول نے میل و فرسنگ کا کام دیا۔ اسی اصول کی رہنمائی سے انہوں نے ان خاموش مقامات کو جہاں ابدالاباد سے سناٹا چھایا ہوا تھا تہذیب و شائستگی کا مرکز بنا دیا۔ جنگلوں دریاؤں پہاڑوں اور بیابانوں سے ہراساں ہوئے بغیر ویرانی کو آبادی سے مبدل کر دیا اور ایک صدی کے اندر اندر ایک پورے براعظم کو مسخر کر لیا۔ اس کے مقابلہ میں میکسیکو اور پیرو پر اہل اسپین کی اس فوج کشی کے نتائج پر نظر ڈالنا خالی از انتفاع نہ ہو گا جس نے ان ممالک کے حیرت انگیز تمدن کو نیست و نابود کر دیا یہ تمدن ہسپانوی تمدن پر کئی ایک اعتبار سے فوقیت رکھتا تھا۔ اس تمدن نے فولاد اور بارود کی مدد کے بغیر عروج حاصل کیا تھا۔ اس تمدن کا انحصار فلاحت کے ان کارناموں پر تھا جو نہ گھوڑوں کے محتاج تھے نہ بیلوں کے اور جن کو نہ ہل کی ضرورت تھی نہ جوے کی۔ اہل اسپین کے لئے ترقی کی راہ صاف کھلی تھی۔ ان کے رستہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن انہوں نے کیا تو یہ کیا کہ امریکہ کے اصلی باشندوں کی کی کرائی محنت کو غارت کر دیا۔ ان میں سے لاکھوں بدنصیب قسی القلب حملہ آوروں کی وحشیانہ خونخواری کا شکار ہوئے۔ وہ قومیں جو صدہا سال سے فارغ البال اور اسودہ حالی کی زندگی بسر کرتی چلی آتی تھیں اور ان رسموں اور رواجوں کی پابند تھیں جنہیں تاریخ نے ان کے لئے موزوں ثابت کیا تھا یک بیک غدر و بدامنی کی بلا میں گرفتار ہو گئیں۔ اوہام پرستی کا مرض چاروں طرف پھیل گیا اور لوگوں کی جائداد منقولہ و غیرمنقولہ کا بہت بڑا حصہ کلیسائے روما کے قبضہ میں چلا گیا۔

ہم نے متذکرہ بالا مثال کو جس کا انتخاب تاریخ امریکہ سے کیا گیا ہے دوسری مثالوں پر جو تاریخ یورپ سے اخذ کی جا سکتی تھیں اس لئے ترجیح دی ہے کہ اس سے اس واقعہ کی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ عمل ارتقا میں خارجی اثرات کا تصرف بہت ہی کم ہوا۔ یورپ کی سیاسی ترقی امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کے طرز عمل اور نتائج پر غور کرنے سے پہلے ہم مختصراً بیان کریں گے کہ سائنس نے یورپ میں کس طرح رواج پایا۔

یورپ میں سائنس کی ترویج

حروب صلیبیہ نہ صرف سالہا سال سے روما کے کلیسائی خزانہ کو ان بیش قرار رقموں

سے پاٹ رہی تھیں جن کا ماخذ ہر مسیحی قوم کا خوف یا اتقا تھا بلکہ ان کی وجہ سے پاپائی طاقت خطرناک طور پر بڑھ گئی تھی۔ اس دو عملی حکومت میں جو یورپ میں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی دینی حکومت کو پورا غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور دنیوی حکومت کی حیثیت اس کے خادم کی سی رہ گئی تھی۔

مسیحی دنیا کے اطراف و اکناف سے بندھی رقمیں روما میں چلی آ رہی تھیں کوئی ایسا حیلہ نہ تھا جو لوگوں سے روپیہ وصول کرنے کے لئے نہ تراشا جاتا ہو۔ چاندی سونے کا ایک مینہ تھا کہ موسلا دھار اٹلی پر برس رہا تھا۔ دنیوی فرمانرواؤں کے خزانے خالی ہو چلے محاصل کی مقدار قلیل اور غیر مکتفی رہ گئی۔ آمدنی کی کمی کے باعث انتظام چلانا دشوار ہو گیا۔ فلپ الملقب "برنیر" (خوشرو) شاہ فرانس ۱۳۰۰ء نے جب دیکھا کہ اس کی مملکت سے بغیر اس کی اجازت کے لکھوکھا روپیہ یوں باہر کھنچا چلا جاتا ہے تو اس نے دل کڑا کر کے نہ صرف اس مضمون کے امتناعی احکام جاری کر دیئے کہ اس کے فرمان کے بغیر چاندی اور سونا برآمد نہ کیا جائے بلکہ یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ مذہبی جاگیروں اور قسیسی جائدادوں سے محصول شاہی وصول کیا جائے۔ اس فیصلہ کا صادر ہونا تھا کہ پاپائیت اور حکومت فرانس میں ایک مہلک جنگ چھڑ گئی۔ پاپا نے شاہ فرانس کو کلیسا سے خارج کر دیا۔ بادشاہ نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ پاپائے بانیفیس ثامن پر دہریت کا الزام لگا کر یہ خواہش ظاہر کی کہ پاپا کا چالان مجلس عمومی کے اجلاس میں کیا جائے۔ اسی اثنا میں اس نے چند معتبر اشخاص کو اٹلی بھیجا جنہوں نے بانیفیس کے محل واقع انگنی میں داخل ہو کر اسے گرفتار کر لیا اور اس کے ساتھ ایسی سختی کی کہ وہ چند دن میں مر گیا۔ اس کا جانشین پاپائے بینیڈکٹ یازدہم زہر دے کر مار ڈالا گیا۔

شاہ فرانس نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ پاپائیت کے ذمائم و مفاس کی کامل اصلاح کی جائے اور یہ عہدہ چند اطالوی خاندانوں ہی کا ورثہ نہ ہو جائے جو اپنی چالاکی سے یورپ کی سریع الاعتقادی کو سیم و زر کی شکل میں بدل رہے تھے بلکہ فرانس کے رسوخ کا عنصر اس میں غالب ہو۔ چنانچہ کرو بنالون کے ساتھ اس بارہ میں اس کا سمجھوتا ہو گیا۔ ایک فرانسیسی صدر اسقف پاپائی مسند پر بٹھایا گیا اور اس نے کلیمنٹ خامس کا لقب اختیار کیا۔ دربار پاپا فرانس کے شہر اونیان میں اٹھ آیا اور روما جو اب تک مسیحیت کا پایہ تخت تھا اس شرف سے محروم ہو گیا۔

ستر سال گزرنے کے بعد پاپائیت کی قسمت نے پلٹا کھایا یعنی ۱۳۷۶ء میں ملیفنتہ البقا

(روما) کو پاپائے اعظم کے مستقر حکومت بننے کا شرف از سرِ نو حاصل ہوا۔ اس عرصہ میں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا رسوخ جزیرہ نمائے اٹلی میں گھٹ گیا تھا شمالی اٹلی کے بڑے تجارتی شہروں میں وہ عقلی تحریک جلد جلد پھیل گئی جو تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی بعض اور بھی مبارک و سازگار حالتیں نمودار ہو چلیں۔ حروب صلیبیہ کے انجام نے تمام مسیحی دنیا کے عقائد میں خلل ڈال دیا۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ فتح و شکست کو عام طور سے حق و باطل کا ربانی معیار سمجھا جاتا تھا ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی رغم انف مسیحیت ارض مقدس پر مسلمان قابض ہو گئے۔ وہ ہزارہا مسیحی سورما جو شکست کھا کر اپنے گھروں کو لوٹے بلا تامل اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے پائے گئے کہ کلیسا نے ان کے حریفوں کی جو تصویر کھینچی تھی اس سے وہ بالکل مختلف تھے یعنی وہ بزدل وحشی اور ظالم نہیں تھے بلکہ شجاع خلیق اور عادل تھے۔ جنوبی فرانس کے خوش گزرا شہروں میں عشق و عاشقی کے افسانوں کا چرچا پھیلتا جاتا تھا۔ خانہ بدوش بھاٹ اور گوئے لوگوں کو اپنے نو تصنیف گیت اور اشعار سناتے پھرتے تھے۔ ان اشعار کے مضامین تغزل و تقصد اور رزم و بزم کی داستانوں ہی تک محدود نہ ہوتے تھے بلکہ اکثر ان میں ان وحشیانہ مظالم مثلاً "لنگویڈک" کے واقعہ قتل عام کا بھی ذکر ہوتا تھا جن کے ارتکاب کی ذمہ دار پاپائی حکومت تھی۔ علی ہذا القیاس ان نظموں میں پادریوں کی سیہ کاریوں اور بد چلنیوں کے واقعات بھی مذکور ہوتے تھے۔ مسلمانان اندلس سے عیسائیوں نے "شولری" کا اولوالعزمانہ وکریمانہ خیال مستعار لیا اور اسی کے ساتھ خودداری و آبرو پروری کا وہ شریفانہ سبق بھی حاصل کیا جس نے آگے چل کر یورپ کی شرافت نفس کے دستور العمل کے وضع کرنے میں مدد دی۔

پاپائیت اگرچہ اپنے مرکز اصلی پر واپس آ گئی لیکن وہ اقتدار جو پاپاؤں کو ستر سال پہلے جزیرہ نمائے اٹلی میں حاصل تھا زندہ نہ ہو سکا۔ روما سے گئے ہوئے انہیں دو نسلوں سے زیادہ کا زمانہ ہو چکا تھا اور اگر وہ اپنی پوری شان جلالت و جبروت کے ساتھ بھی واپس آتے تاہم اس عقلی ترقی کا ردِّ عمل نہ کر سکتے جو ان کی غیبت میں بروئے کار آ چکی تھی۔ لیکن پاپائیت کی رجعت فرمان روائی کی غرض سے نہ تھی بلکہ انقراض و انقسام کی غرض سے اور اس اعتزال عظیم کا مقابلہ کرنے کے مقصد سے جس نے چودھویں صدی میں مسیحیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان اندرونی فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپاؤں کی تعداد ایک سے دو اور دو سے تین ہو گئی جن میں سے ہر ایک مسیح کے نائب حقیقی ہونے کا مدعی تھا اور اپنے رقیب کو معلون و کذاب قرار دیتا تھا۔ اس طوفان بے تمیزی نے یورپ کی عقیدت و ارادت کو

مبدل بن نفرت و حقارت کر دیا اور اس نے مصمم عزم کر لیا کہ اس شرمناک توتو میں میں کا جلد خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ یہ اعتقاد کہ خدا کا ایک نائب زمین پر موجود ہے اور وہ پاپا ہے جس سے خطا کا سرزد ہونا ممکن نہیں اس تھکا فضیحتی کے مقابلہ میں بھلا کیوں کر صحیح ہو سکتا تھا؟ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے لائق پادریوں نے یہ تحریک کی کہ مجلس عموی قائم کی جائے جو گویا یورپ کی دینی پارلیمنٹ ہو اور پاپا کو اس مجلس کا ناظم اعلے مقرر کیا جائے۔ یورپ کے نصیب اچھے ہوتے اگر یہ تحریک منظور ہوجاتی۔ یہ جنگ جو سائنس اور مذہب میں چھڑی ہوئی ہے ہرگز برپا نہ ہوتی۔ اصلاح کنیسہ کا بھونچال ہرگز نہ آتا۔ پراٹسٹنٹ فرقوں کی مخالفت کا علم ہرگز بلند نہ ہوتا۔ لیکن کانسٹین کی کونسلیں اطالوی جوے کو کندھے سے نہ اتار سکیں اور یہ دلپذیر نتیجہ ان سے مترتب نہ ہو سکا۔

اس طور پر کیتھولک مذہب کمزور ہو رہا تھا۔ اس کا کابوسی بوجھ عقل و ادراک کے سینہ سے جوں جوں کم ہوتا گیا روح کی شگفتگی بڑھتی گئی۔ اور عقل انسانی ترقی کرتی گئی۔ مسلمانوں نے پرانے سوتی کپڑوں اور روئی سے کاغذ بنانے کا فن ایجاد کیا تھا اور اہل وینس چھاپہ کا فن چین سے جا کر سیکھ آئے تھے۔ چھاپہ اور کاغذ کی ایجادیں لازم و ملزوم تھیں۔ اب وہ وقت آ گیا کہ بلاخوف مزاحمت تمام دنیا کے انسان آپس میں تبادلہ خیالات کرنے لگیں۔

چھاپہ کی ایجاد نے کیتھولک مذہب کے سینہ میں ایک خم جانستان لگایا تکاتب و تخاطب کے بین العرانی حق پر اس سے پہلے پاپائیت نے بلا مشارکت اعدے قبضہ کر رکھا تھا۔ پاپائی مرکز سے مختلف المدارج پادریوں کی وساطت سے احکام و فرامین جاری ہوتے تھے اور منبر سے پڑھ کر سنا دیئے جاتے تھے۔ مطبوعات نے اس حق خاص اور ان غیر معمولی اقتدارات کو جو اس کا لازمہ تھے یک قلم مٹا دیا۔ زمانہ حال میں منبر کا اثر بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ خطیب کے قائم مقام آج کل اخبار نویس ہیں۔

پھر بھی پاپائیت اپنے پرانے حق سے جدوجہد کئے بغیر دست بردار نہ ہوئی۔ نئے فن کے ان نتائج پر جو قضائے مبرم کی طرح ٹل نہ سکتے تھے جب اسکی نظر پڑی تو ایک نظارۃ المطبوعات قائم کر دیا گیا جس کی تحریج کی سختی سے مکتوبات و جرائد کے روکنے کی کوشش کی گئی۔ کتاب چھاپنے کے لئے تیسی نظارت سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ اور اجازت نامہ اس وقت ملتا تھا جب پادری صاحب کتاب کو بالاستیعاب دیکھ کر اس کی نسبت اظہار پسندیدگی فرماتے تھے اور اس کے صحیح العقاید ہونے کی تصدیق کرتے تھے۔ ۱۵۰۱ء میں پاپائے اگزینڈر

سادس ؑ نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے وہ اہل مطابع کلیسا سے خارج قرار دیئے گئے جو باطل عقائد شائع کریں۔

۱۵۱۵ء میں لیٹرن کونسل نے حکم دیا کہ بجز اس کتاب کے جس کا تحریجی معائنہ ناظرین کلیسا کر چکے ہوں اور کوئی کتاب شائع نہ کی جائے ورنہ شائع کرنے والے کو کلیسا سے خارج کیا جائے گا اور اس کو جرمانہ کی سزا بھی دے جائے گی۔ نظارت مطبوعات کے عہدہ داروں کو حکم تھا کہ اس بات کی نہایت احتیاط رکھیں کہ کوئی تحریر ایسی نہ چھپنے پائے جو عقائد راسخہ و صحیحہ کے خلاف ہو۔ اس تقید کی تہ میں یہ اندیشہ مضمر تھا کہ ممکن ہے کہ مذہبی مناظر چھڑ جائے اور سچی بات جواب تک چھپی ہوئی تھی ظاہر ہو جائے۔

لیکن جہالت کی طاقتوں کی یہ مجنونانہ جدوجہد بیکار ثابت ہوئی۔ لوگوں مین دماغی و عقلی راہ و رسم مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے۔ اسی راہ رسم نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے زمانہ حال کے اخبار کی صورت اختیار کر لی جو ہر روز دنیا کے ہر حصہ کی تازہ ترین خبریں شائع کرتا ہے۔ مطالعہ ایک عام شغل ہو گیا اور یہ وہ نعمت تھی جس سے قدیم الایام میں بہت کم لوگ بہرہ ور تھے۔ زمانہ حال کے تمدن کی بعض نہایت ہی نمایاں خصوصیات کا راز اسی شوق کتب بینی و مطالعہ اخبارات میں پوشیدہ ہے۔

غرض کاغذ کی ساخت اور چھاپے کے استعمال نے یورپ کے تمدن میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ علی ہذا القیاس آلات جہاز رانی میں کمپاس یعنی قلب نما کا اضافہ بڑے بڑے مادی و اخلاقی نتائج کا باعث ہوا۔ ہندوستانی تجارت نے اہل وینس اور اہل جیوا کو ایک دوسرے کا رقیب بنا کر امریکہ کی تحقیقات کرائی۔ ڈی گاما نے افریقہ کا چکر کاٹا اور میگین نے زمین کے گردا گرد جہازرانی کی۔ سفر موخر الذکر پر جو انسان کا سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ ہے نظر ڈالتے ہوئے ہمیں اس امر کی طرف سے خالی الذہن نہ ہونا چاہئے کہ کیتھولک مذہب نے قطعی طور پر بلاگنجائش تردید یا عقیدہ اختیار کر لیا تھا کہ زمین چپٹی ہے۔ آسمان بہشت کا صحن ہے اور دوزخ دنیائے سافل میں ہے۔ بعض پادریوں نے جن کے اجتہاد میں بوجہ ان کی جلالت قدر کے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی شکل زمین کی کرویت کے ابطال میں فلسفیانہ اور مذہبی دلائل پیش کی تھیں۔ چنانچہ اس کا ذکر ہم پیشتر کر بھی چکے ہیں۔ اب یہ بحث دفعتہ ختم ہو گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کلیسا غلطی پر تھا۔

جن تین بڑی سیاحتوں کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے ان سے ایک فقط یہی اہم نتیجہ نہیں نکلا کہ انسطاح شکل زمین کی جس جغرافیائی غلطی میں کلیسا مبتلا تھا۔ اس کی اصلاح ہو گئی۔

کولمبس ڈی گاما اور میگیلن کی روح مغربی یورپ کے تمام اولوالعزم اور باہمت اشخاص میں سرایت کر گئی۔ لوگوں کے معاد و معاش کی غایت الغایات اب تک یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہ کے ساتھ وفاداری برتی جائے اور کلیسا کی متابعت کی جائے گویا لوگوں کی زندگی کا مقصد اس وقت تک استفادہ نہ تھا بلکہ افادہ تھا۔ ان کی محنت کا ثمرہ اپنے لئے نہ تھا بلکہ دوسروں کے لئے تھا۔ اس عقیدہ کا سیاسی اثر ترقی پذیر ہو کر حروب صلیبیہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ان لڑائیوں میں ہلاک ہو گئے جن سے انہیں خاک فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا اور جن کا نتیجہ بجز حسرت و ناکامی کے اور کچھ نہ نکلا تھا۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ان معرکہ آرائیوں کی وجہ سے نفع اگر کسی طبقہ کو ہوا تو پاپاؤں کردینالوں اور روما کے دوسرے پادریوں کو یا وینس کے مالکان جہاز کو لیکن جب اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھا کہ میکسیکو پیرا اور ہندوستان کی دولت ہر اس شخص کے حصہ میں آ سکتی ہے جو ہمت اور جرات رکھتا ہو تو وہ اغراض و مقاصد جنہوں نے یورپ کی بے چین اقوام میں بیداری کی روح پھونک رکھی تھی ہوا کے رخ کی طرف دفعتہ بدل گئے۔ کارٹیز اور پزارو کی داستان کو ہر شخص ذوق و شوق سے سننے لگا۔ مذہبی جوش کی جگہ بحری مہمات نے لے لی۔

اگر ہم اس اصول کو الگ کر کے دیکھنا چاہیں جو اس زمانہ کے حیرت انگیز تمدنی انقلاب کی تہ میں مضمر تھا تو اس کے پہچاننے میں ہمیں ذرا دقت نہ ہو گی۔ اب تک ہر شخص نے اپنی خدمات اپنی دنیوی یا دینی آقا کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ لیکن اب سے اس نے قصد کر لیا کہ اپنی محنت کے ثمرہ سے خود تمتع حاصل کرے تشخص جس سے مراد انفرادی عصبیت ہے غلبہ پا رہا تھا اور ایثار مٹ کر خیال محض رہ چلا تھا۔ اس تمہید کے بعد ہم کو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ کلیسا پر کیا بیت رہی تھی۔

تشخص کا انحصار اس اصول پر ہے کہ ہر شخص اپنا آقا آپ ہے اور اس کو آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ جو رائے چاہے قائم کرے اور اپنے ارادہ کو جس وقت چاہے عمل میں لائے اس اصول کے لحاظ سے اسے ہر وقت اپنے ابنائے جنس کے ساتھ سرگرم مسابقت رہنا پڑتا ہے گویا اس کی زندگی قوت عملی کا ذریعہ اظہار ہے۔

یورپ کے صدیوں کے جمود کو حرکت میں بدل دینا۔ اس جسم میں جو اب تک غیر متحرک تھا یک بہ یک بیداری کی روح پھونکنا اور اصول تشخص کو اس کی غایت الغایات بنا دینا ان اثرات و اقتدارات کی مخالف قوتوں کو اس کے مقابلہ میں لا کھڑا کرنا تھا جو اب تک اسے پامال کر رہی تھیں۔ چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں وہ اضطراب آمیز کشمکش

برابر جاری رہی جو آنے والے معرکہ عظیم کا پتہ دیتی تھی۔ سولہویں صدی کے شروع ۱۵۱۷ء میں یہ معرکہ شروع ہو گیا۔ اصول تشخص مجسم ہو کر جرمنی کے ایک ونبگ راہب کی صورت میں نمودار ہوا اور اس لحاظ سے بمصداق کل انائیت شح بمافیہ شاید ضرور تھا کہ وہ اپنی حقوق طلبی دینی شکل میں کرے۔ پہلے تو تذکراۃ الغفران اور بعض چھوٹے چھوٹے معاملات پر ایک آدھ پکڑ حریفوں میں ہوئی لیکن لڑائی کا اصلی سبب بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ یعنی مارٹن لوتھر نے اپنے قسیسی بالادستوں سے جو روما میں بیٹھے بیٹھے تمام مسیحی دنیا کے عقائد کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے صاف کہدیا کہ میں تمہارے اجتہاد کا پابند نہیں ہوں۔ بائبل کی تاویل و تفسیر کے متعلق مجھے بھی آزادی رائے کا وہ حق حاصل ہے جس میں کوئی شخص دست اندازی نہیں کر سکتا۔

اول اول روما نے مارٹن لوتھر کو ایک جاہل نافرمانبردار اور جھگڑالو پادری سے زیادہ نہ سمجھا اور اگر "انکوئزیشن" کا قابو چلتا تو اس کا کام چٹکی بجاتے میں تمام کر دیا گیا ہوتا۔ لیکن جنگ جوں جوں طول کھینچتی گئی یہ معلوم ہوتا چلا کہ لوتھر اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر ہزارہا صمیم العزم اشخاص موجود ہیں جو اس کے قلم کے حملوں کی تائید اپنی تلوار کی ضربوں سے کر رہے ہیں۔

لوتھر کو روما نے جس جس طرح سے کوسا ہے اور اس کے اعمال کی جس جس طرح سے تضحیک کی گئی ہے وہ اس درجہ ترش و تلخ ہے کہ سن کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ مثلاً" مقدس نکتہ چینوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ "لوتھر کا باپ اس کی ماں کا خاوند نہیں تھا بلکہ ایک خبیث جن تھا جو اس کی ماں کا آشنا تھا۔ لوتھر دس سال تک ایمان و کفر کی دوگونہ چوگان کی گیند بنا رہا اور آخر میں دہریہ ہو گیا۔ وہ بقائے روح کا منکر تھا۔ شراب اس کی گھٹی میں پڑی تھی اور اسی لئے اس نے شراب خواری کی تعریف میں نظمیں تصنیف کیں۔ وہ کتب مقدسہ کی توہین کرتا تھا۔ خصوصاً" حضرت موسیٰ کی شان میں کلمات اہانت آمیز استعمال کرنے کا عادی تھا۔ جو وعظ کرتا تھا اس کے ایک لفظ کو بھی دل میں سچ نہ سمجھتا تھا۔ سینٹ جیمس کے خط کی نسبت اس کا یہ قول تھا کہ اس کی وقعت پرکاہ سے زیادہ نہیں۔ واقعہ اصلاح کنیسہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کے ظہور کا باعث ستاروں کی نحوست تھی ہے" لیکن رومن کیتھولک پادریوں کی زبان پر باوجود اس کو کبھی نحوست کے جو اصلاح کی ذمہ دار قرار دی گئی ہے یہ ناتراشیدہ اور سوقیانہ فقرہ چڑھا ہوا تھا کہ آرسمس نے اصلاح کا انڈا دیا اور لوتھر اسے سینے بیٹھ گیا۔

روما نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ واقعہ اصلاح بعض شوریدہ سر پادریوں کا ایک عارضی نمو تھا۔ اس نے یہ نہ دیکھا کہ یہ انقلاب اس اندرونی تحریک کی انتہائی شکل تھا جو دو صدیوں سے یورپ میں ہو رہی تھی اور جس کی طاقت لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی اس کو یہ نہ سوجھا کہ اگر انقلاب کی اور کوئی وجہ تحریک نہ بھی ہوئی تاہم لوگوں کو ذاتی غور و فکر اور ذاتی اجتہاد پر مجبور کرنے کے لئے ایک اکیلا یہ واقعہ کیا کم تھا کہ تین پاپا ایک وقت میں موجود ہوں اور تینوں کی فرماں برداری لوگوں پر واجب ہو۔ کانسٹنس اور بیل کی مجالس نے ثابت کر دیا کہ ایک قوت ایسی بھی موجود ہے جسے پاپاؤں کی قوت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ اس کے بعد جو دیرپا اور خونریز ہنگامے واقع ہوئے ان کا خاتمہ عہد نامہ و سٹیفیلیا نے کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی آشکارا ہو گئی کہ وسطی و شمالی یورپ نے روما کے عقلی جبر کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکا ہے اصول تشخص نے میدان مار لیا ہے اور ہر شخص کو یہ حق مسلم قرار پا چکا ہے کہ وہ اپنا مجتہد آپ ہے۔

لیکن ناممکن تھا کہ اجتہاد شخصی کے اس حق کے استقرار کا نتیجہ صرف اسی قدر نکل کر رہ جائے کہ لوگ کیتھولک مذہب کے منکر ہو جائیں۔ آغاز اصلاح کے وقت جب بعض ممتاز و سربرآوردہ اشخاص مثلاً ارسمس نے جس کا شمار بانیاں اصلاح میں ہے اسے ترک کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اکثر پیشوایان اصلاح کو علم سے سخت نفرت ہے۔ ایسے پیشواؤں کے اقتدا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جہالت و تعصب کی گرم بازاری ہو۔ ایسی حالت میں ضرور تھا کہ پراٹسٹنٹ مذہب میں تفرقہ و اعتزال کی ان قوتوں کا تختہ مشق نہیں جو اس کے وجود میں آنے کی محرک ہوئی تھیں اس کا مختلف فرقوں میں تقسیم ہو جانا ایک لازمی بات تھی۔ ان فرقوں کو جب اپنے مہیب اطالوی حریف کی طرف سے کھٹکا نہ رہا تو ان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی مختلف ممالک میں جب ایک پراٹسٹنٹ فرقہ برسراقتدار ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں کے خون میں بلا تامل اپنے ہاتھ رنگ ڈالے۔ لیکن جب امتداد روزگار نے ستم رسیدوں کو ستم گاروں پر غالب کر دیا اور انہوں نے اپنی مظلومیت کی تلافی کینہ و انتقام سے کی تو فریقین نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ ایک فرقہ جو حقوق اپنے لئے طلب کرتا ہے ان ہی حقوق سے دوسروں کو بھی فائدہ اٹھانے دے۔ غرض ان خونریز ہنگاموں اور خرخشوں سے وہ اصول عظیم قائم ہوا جو مسالمت یا رواداری کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن مسالمت پھر بھی ایک درمیانی درجہ ہے جوں جوں پراٹسٹنٹ مذہب کا عقلی انحلال و انفکاک ہوتا جائے گا یہ درمیانی درجہ ترقی پذیر ہو کر اس متفرقہ حالت میں تبدیل ہوتا جائے گا جو دنیا میں ہمیشہ سے

فلسفہ کا نصب العین رہی ہے یعنی وہ تمدنی حالت جس میں ہر شخص کو خیال کی کامل آزادی حاصل ہو بجز ان لوگوں کے جو اصول مسالمت پر خوف یا دباؤ کی وجہ سے کاربند ہوں اس اصول کے پابند وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو دوسروں کی آرا و عقائد کو وقعت کی نظر سے دیکھنے اور تسلیم کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ پس ظاہر ہے کہ اس اصول کا ماخذ صرف فلسفہ ہی ہو سکتا ہے تاریخ گواہ ہے کہ مذہب سے تعصب کو تقویت پہنچی ہے اور فلسفہ اس کا ردعمل یا استیصال کرتا ہے۔

اصلاح کنیسہ کا علانیہ مقصد یہ تھا کہ قسطنطین اور اس کے جانشینوں نے مسیحیت اور سلطنت رومتہ الکبریٰ میں موافقت و مصالحت پیدا کرنے کی نیت سے بت پرستی کے جن خیالات و رسوم کو مسیحیت میں داخل کر دیا تھا۔ وہ اس سے خارج کر دیئے جائیں۔ پراٹسٹنٹ جماعت یہ چاہتی تھی کہ مذہب عیسوی میں قرون اولیٰ کی پاکیزگی اور نزاہت کی مثال ازسرنو پیدا کر دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم عقائد کی بحالی کے ساتھ ساتھ انہوں نے وہ تمام رسمیں ترک کر دیں جن میں بت پرستی کا شائبہ بھی پایا جاتا مثلاً" مریم عذرا کی پرستش موقوف ہو گئی۔ اولیا سے مرادیں مانگنے کا طریقہ جاتا رہا۔ انجیلین یعنی اصلاح یافتہ کلیسا کے پیشوا ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ مریم عذرا نے زواجی زندگی کے فرائض اختیار کر لئے تھے اور اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں چنانچہ ان کے بطن سے کئی ایک اولادیں بھی ہوئیں لیکن بت پرستی کی اشاعت کے ساتھ یہ خیال کہ آپ یوسف نجار کی بیوی تھیں۔ دلوں سے محو ہو گیا اور آپ ملکہ آسمان اور خدا کی ماں بن گئیں۔

عربوں کے ادب کی طرح جس نے مسیحی دنیا پر جنوبی فرانس اور سسلی کی راہ سے پیش قدمی کی تھی۔ ان کا سائنس بھی انہیں دونوں رستوں سے یورپ میں داخل ہوا۔ پاپاؤں کو تو دیس نکالا مل ہی چکا تھا اور وہ بجائے روما کے اونیان میں مقیم تھے۔ اس کے علاوہ اعتزال عظیم یعنی پاپائیت کی تفریق کا واقعہ بھی برسرتائید تھا لہٰذا اسلامی سائنس کے قدم شمالی اٹلی میں مضبوطی سے جم گئے۔ فلسفہ مشائیہ نے اس خلعت سے آراستہ ہو کر جو ابن رشد نے اس کے لئے تیار کیا تھا بہت سے خفیہ اور علانیہ پیرو پیدا کر لئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی جو اس فلسفہ کا خیرمقدم نہایت تپاک سے کرنے اور اس کے مسائل کو بہ نظر استحسان دیکھنے کے لئے تیار تھے۔ لیونارڈو ڈاونسی کا شمار اسی جماعت میں ہے۔ وہ اس اصول موضوعہ کا بانی ہے کہ سائنس میں استدلال بجز تجربہ اور مشاہدہ کے معتبر اور مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ حقائق قدرت پر صحیح روشنی صرف تجربہ ہی ڈال سکتا ہے اور قوانین قدرت کی

دریافت کے لئے تجربہ کا ہونا لازمی ہے۔ ڈاونسی نے ثابت کیا کہ ایک ایک نقطے پر دو عمودی قوتوں کا عمل کسی مستطیل کے خط الزاویہ کے عمل کے مشابہ ہوتا ہے جس کے اضلاع ان قوتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس اصول کے معلوم ہونے کے بعد غیر مستقیم قوتوں کے مسئلہ کا حل ہونا بہت آسان ہو گیا۔ اس مسئلہ پر ایک صدی بعد اسٹونیس نے ازسرنو روشنی ڈالی اور قوت جر ثقیل کی تشریح کے متعلق اس سے کام لیا۔ ڈاونسی نے بیرم پر قوت کے بخط غیر مستقیم صرف کئے جانے کے مسئلہ کی بخوبی توضیح کی۔ رگڑ کے قوانین جن کا عملی ثبوت آگے چل کر اماشس نے دیا اسی کے دریافت کئے ہوئے ہیں۔ اصول حقیقت سرعت رفتار کی ماہیت سے وہ بخوبی واقف تھا۔ سطوح مائل اور قوس ہائے مدور پر اجسام کے نزول کی شرائط پر اس نے مفصل بحث کی ہے۔ عکسی تصویر کھینچنے کا کیمرا اس کی ایجاد سے ہے۔ علم ترکیب اجسام حیوانات و نباتات کے متعدد مسائل کی نسبت اس نے صحیح خیالات ظاہر کئے ہیں۔ طبقات الارض کے جدید علم کے بعض مہمات المسائل مثلاً" آثار متحجرات کی نوعیت اور برہائے اعظم کے ارتفاع کی نسبت جو امور اس نے بیان کئے ہیں ان کی تجربہ نے آج تصدیق کر دی ہے اس نے اس مسئلہ کی تشریح کی ہے کہ چاند کی روشنی زمین کے نور کا عکس ہے۔ یہ جامع حیثیات شخص جس کی قابلیتوں میں حیرت انگیز تنوع کی شان نظر آتی ہے۔ فنون سنگ تراشی و صناعی و انجینئری میں بھی ید طولی رکھتا تھا اور اپنے زمانہ کے فن ہیئت فن تشریح ابدان اور فن کیمیا میں بھی اسے دستگاہ کامل حاصل تھی' نقاشی میں وہ میکائیل انجیلو کا مدمقابل تھا اور جب ایک دفعہ ان میں مسابقت ہوئی تو تفوق کا سہرا اسی کے سر رہا۔ سانتا میریا ڈل گریزی کی ڈامینیکن خانقاہ کے نعمت خانہ کی دیوار پر اس کا جو مرقع موسوم بہ "عشائے اخیر" موجود ہے۔ اس نے بہت بڑی شہرت پائی ہے اور مصوروں نے اس کی بیسیوں نقلیں اتاری ہیں۔

شمالی اٹلی میں جب ایک دفعہ سائنس کے قدم مضبوطی سے جم گئے تو بہت جلد کل جزیرہ نما میں اس کا اثر پھیل گیا اس کے پرستش کرنے والوں کی روز افزوں تعداد کا پتہ ان علمی مجلسوں سے چلتا ہے جو بہ کثرت قائم ہوتی جاتی ہیں اور جلد جلد ترقی کر رہی ہیں۔ یہ مجلسیں ان اسلامی مجالس کا چربہ تھیں جو بزمانہ سابق غرناطہ و قرطبہ میں موجود رہ چکی تھیں۔ اسلامی تمدن نے جس رستہ پر اپنے نقش قدم چھوڑے تھے اس پر گویا مسافر کی یادگار قائم کرنے کی غرض سے ۱۳۴۵ء میں ٹولوز کی اکاڈمی کی بنا ڈالی گئی۔ جو آج کے دن تک قائم ہے لیکن یہ اکاڈمی جنوبی فرانس کے دل خوش کن لٹریچر ہی کا مرکز تھی اور اس کا نام اسی

مناسبت سے "دی اکاڈمی آف فلورل گیمز" (چمنستان) رکھا گیا تھا۔ علم طبیعات کو ترقی دینے کی غرض سے پہلی علمی مجلس کی بنا نیپلز میں پٹسٹا پورٹا نے ڈالی۔ ترابوشی کا بیان ہے کہ حکام کلیسا نے اس مجلس کو بند کر دیا۔ اس کے بعد پرنس فریڈرک سیسی نے روما میں ایک مجلس بنام "لنسٹن" (فہدیہ) قائم کی۔ اس مجلس کا مقصد اس کے نشان ہی سے ظاہر تھا یعنی ایک سیاہ گوش آسمان کی طرف منہ اٹھائے اپنے پنجوں سے ایک تین سر والے "سربرس" کو نوچ رہا ہے۔ فلارنس کی اکاڈمی ۱۶۵۷ء میں قائم ہوئی۔ اس کے ارکان کا اجلاس فرمانروائے فلارنس کے محل میں ہوا کرتا تھا۔ دس سال تک یہ مجلس قائم رہی اس کے بعد پاپائی حکومت کے ایما سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور اس علم کشی کے معاوضہ میں فرمانروائے فلارنس کا بھائی کرڈینال بنا دیا گیا۔ بڑے بڑے مشاہیر مثلاً ٹارسیلی اور کیسٹلی اس مجلس کے رکن تھے داخلہ کی شرط یہ تھی کہ ایمان و مذہب کو ترک کر دیا جائے اور تحقیق حق کا عزم کر لیا جائے ان مجالس نے حامیان علم کو اس کنج خلوت سے جس میں وہ اب تک رہتے چلے آئے تھے نکال کر آپس میں ملا دیا اور ان کو تبادلہ خیالات اور اتفاق باہمی کا موقع دے کر ترقی علوم و فنون میں بہت بڑا حصہ لیا۔

سائنس کا عقلی اثر

یہ تاریخی بحث کہ سائنس برعظم یورپ میں کیوں کر داخل ہوا بیچ میں بطور جملہ معترضہ آ گئی تھی۔ اب ہم اس ذیلی بحث کو چھوڑ کر اصل مضمون یعنی سائنس کے طرز عمل اور نتائج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تمدن جدید پر سائنس نے دو پہلوؤں سے اثر ڈالا ہے۔ ۱۔ علمی و ۲۔ اقتصادی ان عنوانات کی ذیل میں اس اثر پر باسانی بحث کی جا سکتی ہے۔

سائنس کا عقلی اثر یہ ہوا کہ روایت کا اقتدار بالکل زائل ہو گیا۔ کسی استاد کے دعوے بلادلیل کو خواہ اس کا نام کیسا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور کیسی ہی تعظیم کے ساتھ کیوں نہ لیا جاتا ہو اس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فلارنس کی علمی مجلس نے اپنے ارکان کے لئے داخلہ کی جو شرائط مقرر کی تھیں اور لندن کی شاہی سوسائٹی نے جو مقولہ اپنی علمی علامت کے طور پر اختیار کی اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ روایت کی سائنس کے نظروں میں کہاں تک وقعت ہے۔

طبیعی مباحث میں سائنس نے فوق القدرت اور خارق عادت امور کو بطور شہادت

تسلیم کرنے سے ابا کیا۔ شگون یا آسمانی نشان کے ثبوت کو جس کا قدیم الایام میں یہودیوں کے ہاں رواج تھا اس نے ترک کر دیا اور ایک واقعہ کے ثبوت کو دوسرے واقعہ غیر متعلقہ کا ثبوت مان لینے سے انکار کر دیا۔ اس طور پر وہ منطق جو صدہا سال سے رائج چلی آتی تھی باطل ہو گئی۔

طبیعی تحقیقات میں سائنس کا طرز عمل یہ تھا کہ کسی مفروضہ قیاس کی تنقید کی غرض سے اول کسی صورت خاص کو پیش نظر رکھ کر اس قیاس کی بنا پر اندازہ قائم کیا جاتا تھا اور اس کے بعد تجربہ یا مشاہدہ کر کے تحقیق کر لیا جاتا تھا کہ اس تجربہ یا مشاہدہ کا نتیجہ اندازہ قائم نمودہ کے نتیجہ سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں اگر مطابقت نہ پائی جاتی تھی تو وہ قیاس رد کر دیا جاتا تھا۔

اس طرز عمل کی ایک دو مثالیں ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

نیوٹن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کہ کشش زمین یعنی کشش ثقل کی حد عمل چاند تک ہو اور یہی وہ قوت ہو جو اسے زمین کے گرد گھومنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس قیاس کی بنا پر جب اس نے حساب لگایا تو نتیجہ یہ نکلا کہ جرم قمر اپنے مدار پر حرکت کرتے ہوئے خط المماستہ سے ایک دقیقہ میں بقدر تیرہ فٹ کے منحرف ہوتا ہے۔ لیکن اس مسافت کا اندازہ لگانے سے جو اجسام سطح زمین پر گرتے وقت ایک دقیقہ میں طے کرتے ہیں اور اس مسافت کو مربع معکوس کی نسبت سے گھٹتا ہوا فرض کرنے سے معلوم ہوا کہ مدار قمر پر جو کشش ہو گی وہ اجسام کو پندرہ فٹ سے بھی زیادہ کھینچے گی۔ غرض اس وقت نیوٹن نے یہی سمجھا کہ اس کا قیاس صحیح نہیں ہے۔ لیکن اتفاق سے کچھ مدت کے بعد ایک درجہ ارضی کی پیمائش زیادہ صحت کے ساتھ کی گئی۔ اس پیمائش نے زمین کے اندازہ جسامت اور فاصلہ قمر کو جو کرہ ارض کے نصف قطر کی بنا پر ناپا گیا تھا متغیر کر دیا۔ نیوٹن نے اب اپنا تخمینہ ازسرنو شروع کیا اور جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں یہ تخمینہ جب قریب بہ اختتام ہوا تو یہ دیکھ کر حتی قہ مطابقت ظاہر ہونے کے قریب ہے وہ ایسا گھبرایا کہ حسابی عمل ختم کرنے کے لئے اسے مجبوراً" اپنے ایک دوست سے فرمائش کرنی پڑی۔ اب وہی قیاس بدلائل قاطع ثابت ہو گیا۔

ایک اور مثال طریقہ زیربحث کو کافی طور پر واضح کر دے گی۔ یہ مثال اس مسئلہ کیمیاوی سے متعلق ہے جو فلوجسٹن (جوہر حرارت) کے نام سے موسوم ہے۔ اشال نے جو اس مسئلہ کا موجد تھا یہ دعوی کیا کہ قابلیت اضطرام یا سوزندگی کا ایک ایسا عنصر کائنات میں

موجود ہے جس میں اجسام کے ساتھ اتصال پیدا کرنے کا خاصہ پایا جاتا ہے۔ اس عنصر کا نام اس نے "فلوجسٹن" رکھا تھا۔ اسٹال کا قول تھا کہ وہ شے جسے فلزاتی اکسید کہا جاتا ہے جب اس عنصر کے ساتھ ملتی ہے تو فلز یعنی دہات پیدا ہوتی ہے لیکن اگر "فلوجسٹن" نکال لی جائے تو دہات اپنی اصلی خالی صورت یعنی اکسیدی حالت میں بدل جائے گی۔ اس اصول کی رو سے گویا فلزات اجسام مرکب یعنی ٹمیان ہیں جن میں "فلوجسٹن" ملی ہوئی ہے۔

لیکن اٹھارہوں صدی میں کیمیاوی تحقیقات کے آلات پر کانٹے کا اضافہ کیا گیا۔ اب کیمیا دان آسانی سے حکم لگانے کے قائل ہو گئے کہ "فلوجسٹن" والا اصول صحیح ہے یا نہیں اس لئے کہ اگر یہ اصول صحیح ہو تو دہات بمقابلہ اپنے اکسید کے بھاری ہونے چاہیئے کیونکر اول الذکر میں ایک جزو یعنی "فلوسٹن" ایسا موجود ہے جو ثانی الذکر میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن جب کسی دہات کا کوئی حصہ وزن کیا جاتا ہے اور وہ اکسید بھی تولی جاتی ہے جو اس سے نکلتی ہے تو اکسید بھاری ثابت ہوتی ہے۔ اور یہاں آکر مسئلہ "فلوجسٹن" غلط ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس تحقیقات کو جاری رکھا جائے تو ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اکسید بالکلس جو اس کا ابتدائی نام تھا ہوا کے ایک جزو کے شمول کی وجہ سے اور بھی زیادہ بھاری ہو جاتی ہے۔

یہ تجربہ علی العموم لیوازیر سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ کی فلزات کا وزن تکلیس سے بڑھ جاتا ہے لیوازیر کے زمانہ سے بہت پہلے بعض یورپین کیمیادانوں کے تجربہ سے پایہ تحقیق کو پہنچ چکا تھا بلکہ اس کی حقیقت مسلمان کیمیا دانوں کو پہلے ہی سے اچھی طرح معلوم تھی۔ البتہ لیوازیر پہلا وہ شخص تھا جس نے اس مسئلہ کی اہمیت کا صحیح صحیح انداز کیا اور اس کے ہاتھوں اس نے علم کیمیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

"فلوجسٹن" والے قیاس کا ترک کیا جانا اس حقیقت کی ایک بین مثال ہے کہ علمی مفروضات و قیاسات اگر واقعات سے مطابق نہ ہوں تو وہ کسی آمادگی سے رد کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ وہ کوچہ ہے جس میں سند و روایت کا گزر نہیں۔ یہاں ہر معاملہ میں استنا و استصواب قدرت سے کیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عملی استفسار کا جو جواب قدرت دے گی وہ ہمیشہ صحیح ہو گا۔

اب اگر ان فلسفیانہ اصولوں کا جن پر سائنس کی ترقی منحصر تھی ان اصولوں کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جن پر قیسیت کا دارومدار تھا تو معلوم ہو گا کہ سائنس درایت کا دامن گرفتہ تھا تو مذہب روایت کا سائنس نے اندازہ و مشاہدہ کے توافق یا عقل اور واقعہ کے

تطابق پر زور دیا تو مذہب نے اسرار واوہام پر سائنس نے اپنے قیاسات کو جب مطابق حقائق فطرت نہ پایا تو بلا تامل رد کر دیا۔ لیکن مذہب نے کورا نہ تقلید سے کام لے کر ان عقائد کی رکاب تھام لی جو ناقابل فہم اور برتراز عقل تھے۔ دونوں کا تفرقہ برابر بڑھتا چلا گیا۔ ایک طرف سے حقارت ظاہر ہونے لگی تو دوسری طرف سے نفرت۔ جن لوگوں نے چشم انصاف کھلی رکھ کر ان دونوں حریفوں کی زور آزمائی کا تماشا دیکھا انہیں معترف ہونا پڑا کہ سائنس جلد جلد تسیسیت کی بیخ کنی کر رہا ہے۔

اس طور پر فن ریاضی تحقیقات علمی کا بہت بڑا آلہ بن گیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ فن علمی استدلال کا آلہ بن گیا۔ ایک اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے دماغ کے عمل کو حرکت اضطراری کی شکل میں بدل دیا اس لئے کہ اس کی علامات اکثر و بیشتر فکر و غور کی قائم مقام ہو گئیں۔ تحکم و تدقیق استدلال کی عادت جس نے اس کے فیض سے نشوونما پایا دوسرے علوم و فنون میں بھی داخل ہو گئی جس کی وجہ سے دنیا میں ایک عقلی انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب یہ ممکن نہ تھا کہ معجزات و کرامات کے ثبوت سے لوگوں کی تشفی ہو سکے یا وہ منطق ذریعہ تسکین ہو سکے۔ جس پر ازمنہ وسطی میں عقل انسانی بھروسا کرتی تھی۔ ریاضی نے نہ صرف طریقہ خیال بلکہ رجحان خیال میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ چنانچہ ان مضامین کا جن پر مختلف علمی مجلسیں اور انجمنیں اس زمانہ میں بحث کرنے لگیں اگر ازمنہ وسطی کے مباحث سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

لیکن ریاضی کا فائدہ قیاسات و نظریات کی تصدیق و توثیق تک ہی محدود نہ تھا۔ جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے اس کے ذریعہ سے ان حقائق کی نسبت پیشین گوئی بھی ہونے لگی۔ جو ابھی تک نامعلوم تھیں۔ اس لحاظ سے گویا اسے تسیسیت کی پیشین گوئیوں کا جواب سمجھنا چاہئے۔ فن ہیئت نے اسی طرح سے سیارہ نپچون کا اکتشاف کیا اور فن مناظر ومرایا کے مسئلہ ارتعاش نور کے صغری و کبری سے وہ نتیجہ برآمد ہوا جو شعاع نور کے انعطاف مخروطی کے نام سے موسوم ہے۔

ادھر تو ریاضی کی بدولت علوم طبعی میں یہ حیرت انگیز ترقی ہو رہی تھی۔ ادھر خود یہ فن مدارج ارتقا طے کر رہا تھا۔ ہم ذیل میں اجمالی طور پر اس ارتقا کی کیفیت قلم بند کرتے ہیں۔

فن الجبرا کے ابتدائی جراثیم اسکندریہ کے مہندس ڈایوفنٹس کی تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ اس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی بیان کیا جاتا ہے سابق میں اقلیدس نے دارالعلم

اسکندریہ ہی میں علم ہندسہ کی عظیم الشان حقیقتیں منطقیانہ ترتیب کے ساتھ جمع کی تھیں۔ سائر اکیوزمین ارشمیدس نے علم ہندسہ کے اعلیٰ مسائل کو استمقا کے عمل کے ذریعہ سے حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ علمی رجحان کی یہ کیفیت تھی کہ اگر علوم و فنون کی سرپرستی جاری رہتی تو الجبرا کبھی کا ایجاد ہو گیا ہوتا۔

مبادی فن الجبرا کی معلومات کے لئے ہم عربوں کے رہین منت ہیں۔ ریاضی کی اس شاخ کا نام تک انہیں کا رکھا ہوا ہے۔ دارالعلم اسکندریہ سے اس فن کے جو بچے کھچے اجزا ان تک پہنچے تھے ان میں انہوں نے اس معلومات کا اضافہ کیا جو ہندوستان سے حاصل کی گئی تھی اور تنقیح و ترتیب کے بعد اس اصلاح یافتہ مجموعہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے مدون کیا۔ عربوں سے یہ فن تیرھویں صدی کے شروع میں اٹلی پہنچا۔ لیکن اس پر اس قدر کم توجہ کی گئی کہ تین سو سال تک یورپ میں کوئی کتاب اس فن پر نہ لکھی گئی۔ ۱۴۹۶ء میں پیشیولی نے پہلی مرتبہ ایک کتاب بنام "فن الجبرا" شائع کی۔ ۱۵۰۱ء میں کارڈن ساکن میلان نے مساوات مکعبہ یعنی تیسرے درجے کی مساوات کے حل کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ ۱۵۰۸ء میں سپیوفیرو اور اس کے بعد ٹارٹیلیا اور وِیٹا نے مزید مفید اضافے کئے اب علمائے جرمنی نے اس فن پر اپنی توجہ مبذول کرنی شروع کی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علامات نویسی ناقص حالت میں تھی۔

۱۶۳۷ء میں ڈیکارٹ کی تصنیف فن ہندسہ پر شائع ہوئی۔ یہ کتاب جس میں اصول الجبرا کا اطلاق خطوط مقوس کی تعریف و تحقیق پر کیا گیا ہے ریاضیات کی تاریخ میں بمنزلہ ایک نئے دور کی تمہید کے ہے۔ اس سے دو سال قبل کو یلیری کا رسالہ مقادیر لا تیجزی پر شائع ہو چکا تھا۔ اس طریقے کو ٹارسیلی اور بعض دوسرے ریاضی دانوں نے ترقی دی۔ اب حساب مقادیر لاانتاہی اور نیوٹن کے طریقہ فضلی اور لائبنٹز کے طریقہ حساب جزئیات و طریقہ حساب تمامی کی ترقی کے لئے رستہ کھل گیا۔ اگرچہ اصول علم الفضل کے نکات کا سرمایہ نیوٹن کے پاس کئی سال سے جمع تھا لیکن اس نے اس موضوع پر ۱۷۰۴ء تک کوئی تصنیف شائع نہ کی۔ جن ناقص علامات کا استعمال نیوٹن کرتا تھا اس کی وجہ سے طریقہ فضلی کا عمل موثر و کارگر نہ ہوتا تھا۔ اس اثنا میں فن الجبرا کو یورپ میں بہت ترقی ہوئی۔ برنولیز کے تجربے نے اس کے بعض اعلیٰ مسائل کو نہایت خوبصورتی سے حل کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لائبنٹز کا طریقہ حساب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا جس میں بہت سے ریاضی دانوں نے بہت کچھ اضافے اور اصلاحیں کیں۔ یہ رفتار ترقی غیر معمولی سرعت کے ساتھ

اٹھارہویں صدی میں برابر جاری رہی۔ شکل ذوعددین پر جس کا اکتشاف نیوٹن سابق میں کر چکا تھا ٹیلر نے ۱۷۱۵ء میں اپنے مشہور طریقہ اضافات کا اضافہ کیا جو آج تک اس کے نام سے موسوم ہے۔ مولر نے ۱۷۳۴ء میں حساب اختلافات جزئیہ کا طریقہ رائج کیا۔ ڈلبرٹ نے اس طریقہ کو اور زیادہ وسعت دی۔ اس کے بعد یولر اور لگرینج نے طریقہ تغیرات کی بنا ڈالی اور ۱۷۷۲ء میں لگرینج نے طریقہ اعمال استخراجی ایجاد کیا۔

لیکن اٹلی۔ جرمنی۔ انگلستان اور فرانس ہی تک ریاضیات کی یہ عظیم الشان تحریک محدود نہ تھی۔ ریاضی کے سر پر جو عقلی تاج رکھا ہوا ہے اس میں اسکاٹ لینڈ نے لوکارثم کی ایجاد سے ایک نیا ہیرا جڑ دیا۔ اس عظیم الشان ایجاد کے لحاظ سے علمی دنیا نیپیئر آف سرمرچسٹن کی ممنون احسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے مثل ایجاد کی علمی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے سے فہم قاصر ہے۔ طبیعین و ہیئت دانان زمانہ موجودہ گریشم کالج کے استاد ریاضی پروفیسر برگس کے اس قول پر سچے دل سے صاد کریں گے کہ "آج تک اس درجہ دل پسند اور حیرت اثر کتاب میرے دیکھنے میں نہیں آئی" کیلر جس کا نام علمی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا کہتا ہے اور بجا کہتا ہے کہ "علم کی جس شاخ پر نیپئیر نے اپنی قابلیتوں کو صرف کیا اس کے لحاظ سے وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شخص ہے" نیپئیر کا انتقال ۱۶۱۷ء میں ہوا۔ اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ لوکارثم کی ایجاد نے علماء ہیئت کی محنت گھٹا کر ان کی عمر دگنی کر دی ہے۔

قلت گنجائش مانع ہے کہ فن ریاضی کی ترقیات پر زیادہ مبسوط بحث کی جائے۔ اس کے علاوہ ہم ریاضی کی تاریخ نہیں لکھ رہے ہیں۔ بلکہ اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ سائنس نے انسانی تمدن کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس مقام پر بے اختیار یہ سوال پھر تازہ ہوتا ہے کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ کلیسا نے اپنے بارہ سو برس کے خودمختارانہ عہد حکومت میں ایک بھی مہندس نہیں پیدا کیا؟

ریاضی بسیط یا ریاضی مطلق کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تحصیل میں ان آلات کی ضرورت نہیں پڑتی جو اکثر لوگوں کو میسر نہ آ سکیں۔ ہیئت کے لئے رصدگاہ اور کیمیا کے لئے معمل کا ہونا ضرور ہے لیکن ریاضی دان کو صرف طبیعت کے لگاؤ اور چند کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس فن کا اکتساب نہ صرف کثیر کا متقاضی ہے نہ کسی مددگار خادم کی اعانت کا محتاج ایسی حالت میں خیال ہوتا ہے کہ رہبانیت کی خلوت گزین زندگی کے لئے بھی اس سے زیادہ دلپسند اور اس سے بڑھ کر روح کو بالیدگی بخشنے والا مشغلہ اور کیا ہو سکتا

تھا۔

اس استفسار کے جواب میں کیا ہم بھی خدانخواستہ جناب پادری یوسیبس صاحب کے ہم صفیر ہو کر یہ کہیں کہ "یہ محنت لاحاصل چونکہ ہماری نظروں میں نہایت ہی ذلیل ہے اس لئے ہم اس کو قابل توجہ نہیں سمجھتے بلکہ اعلیٰ تر حقائق کے اکتساب کو زیادہ مفید خیال کرتے ہیں؟ اعلیٰ تر حقائق کی بھی ایک ہی کہی۔ یہ تو ارشاد ہو کہ وہ کونسی حقیقت ہے جو حق مطلق پر فضیلت رکھتی ہے؟ کیا جھوٹی روایتیں بے بنیاد کرامتیں اور باطل افترا پردازیاں ہی وہ حقیقتیں ہیں جنہیں حقائق علمیہ کے مقابلہ میں افضلیت کا ادعا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انہیں نے اتنی مدت تک سائنس کے رستہ میں رکاوٹیں ڈالے رکھیں۔

اس علمی حملہ کی پہلی ہی جھپٹ میں حکام کلیسا کو معلوم ہو گیا تھا کہ جو اصول سائنس شائع کر رہا ہے وہ مروجہ مذہب کے عقائد سے مطلق لگا نہیں کھاتے۔ اسی لئے انہوں نے سائنس کی مخالفت میں ناخنوں تک کا زور لگایا اور جائز و ناجائز سبھی طرح کی کوششیں اس کی تخریب کے لئے کیں۔ علوم عملی سے جن کا دارومدار تجربہ اور مشاہدہ پر تھا۔ پادریوں کو اس قدر سخت عداوت تھی کہ جب فلارنس کی اکاڈمی بند ہوئی تو ان کے گھر میں گھی کے چراغ جلے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مار لیا۔ اور یہ معاندانہ جذبات کچھ رومن کیتھولک مذہب ہی کے سینہ میں جوش زن نہ تھے۔ پراٹسٹنٹ مذہب کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ چنانچہ جب لندن کی "رائل سوسائٹی" (شاہی مجلس) کی بنا ڈالی گئی تو پادریوں کی طرف سے اس پر ایسی سخت لے دے ہوئی کہ اگر شاہ چارلس ثانی اس کی علانیہ حمایت نہ کرتا تو اس کا اسی وقت خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ پادریوں نے اس سوسائٹی پر یہ الزام لگایا تھا کہ یہ چاہتی ہے کہ مذہب مروجہ کو مٹا دے۔ یونیورسٹیوں کو نقصان پہنچائے اور علوم قدیمہ کا ستیاناس کر دے۔

اس علمی مجلس کی روئداد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انسان کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کا انعقاد ۱۶۶۲ء میں ہوا اور اس وقت سے لے کر اب تک جو جو علمی تحریکات و اکتشافات ہوئی ہیں۔ ان سب میں اس کی مستعدی شریک غالب رہی ہے۔ اس نے نیوٹن کی تصنیف "پرنسپیا" اپنے اہتمام سے شائع کی۔ ہیلی کا بحری سفر جو پہلی وہ مہم تھی جس کا اہتمام کسی حکومت کی طرف سے سرکاری طور پر ہوا ہو اس کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے تشریب خون کے متعلق متعدد تجربے کئے اور ہاروی کی تحقیقات دوران خون کو تسلیم کر لیا۔ چیچک کے مرض میں مریض کو ٹیکا لگانے کی ترغیب اسی

نے دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادی کیرولائن نے بادشاہ سے چھ ایسے مجرموں کی جان بخشی بغرض تجربہ کرائی جن کی نسبت سزائے موت کی تجویز ہو چکی تھی اور اس کے بعد شہزادی نے خود اپنے بچوں کے ٹیکا لگوایا۔ اسی کی تائید سے بریڈ لی نے اپنے عظیم الشان انکشاف یعنی اختلاف منظر ثوابت کو مکمل کیا اور اہتزاز محور ارض کی کیفیت دریافت کی اور یہ وہ دو انکشافات ہیں جن پر ڈلامبر کے قول کے مطابق ہیئت جدیدہ کی تدقیق و تحکیم منحصر ہے۔ اسی کی کوششوں سے مقیاس الحرارت میں جو میزان مدارج حرارت ہے اور ہیریسن کی جیبی گھڑی میں جو میزان وقت ہے اصلاح ہوئی۔ اسی کی مساعی سے ۱۷۵۲ء میں تقویم گریگوری باوجود شدید مذہبی مخالفت کے انگلستان میں رائج ہوئی۔ عوام و جہلا کا خیال تھا کہ "رائل سوسائٹی نے ان کی عمر کے گیارہ دن گھٹا دیے ہیں اسی لئے وہ ایسے برافروختہ ہوئے کہ سوسائٹی کے بعض "فیلوز" (اعضا) کو ان کے ہاتھوں جان کے لالے پڑ گئے اور ایک طیش آلودہ انبوہ کے غضب سے انہوں نے بھاگ کر بمشکل اپنا پیچھا چھڑایا۔ پادری وہملی نے جو جیسویٹ فرقہ کا ایک عالم تھا انقلاب تقویم کے مسئلہ میں بہت دلچسپی ظاہر کی تھی لہذا سوسائٹی کو مجبوراً" اس کا نام مخفی رکھنا پڑا بریڈلی کا انتقال اتفاق سے اسی ہل چل میں ہو گیا لہذا جہلا نے نہایت شدومد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ یہ مرگ مفاجات خدا کا قہر تھا جو اس پر اپنے گناہ کی پاداش میں نازل ہوا۔

اگر ہم اس عالی شان مجلس کی خدمات کا موزوں طور پر اعتراف کرنا چاہیں تو اس کے کارناموں کی تفصیل کے لئے کئی اوراق مطلوب ہوں گے۔ ڈالینڈ کی دوربین بے رنگ راسڈن کا باخرہ انقسام جس کی ایجاد اول اول مشاہدات فلکی کی تصحیح و تحکیم کا باعث ہوئی۔ میسن اور ڈکسن کی مساعی سے سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش۔ سیارہ زہرہ کے مرور کے ارتصاد کے لئے کپتان کک کی سیاحت۔ زمین کے گرد اس کا بحری سفر۔ اس کا یہ ثبوت کہ مرض احتراق خون کی بلا جس سے طویل بحری سفروں میں مسافر بچ نہیں سکتا میوہ اور ترکاری کے استعمال سے دفع ہو سکتی ہے۔ قطب شمالی و قطب جنوبی کی مہمات۔ مسکیلن کے تجربوں کے ذریعہ سے جو بمقام شمالین عمل میں لائے گئے اور نیز کیونڈش کے تجربوں کی وساطت سے تکاثف ارض کی تعیین۔ ہرشل کا انکشاف سیارہ۔ یورینس۔ کیونڈش اور واٹ کی تحلیل اجزائے آب۔ لندن اور پیرس کے طول البلد کے فرق کی تعیین۔ بطاریہ کہربایہ کی ایجاد۔ ہراشلہ کی پیمائش فلکی۔ ینگ کا اصول متقارشت کو ترقی دینا اور مسئلہ ارتعاش نور کو قوی دلائل سے ثابت کرنا۔ جیل خانوں اور دوسری عمارات میں ہوا رسانی کا انتظام۔ شہر کی

روشنی کا انتظام بذریعہ گاز۔ رقاص ثانویہ کے طول کی تحقیق اختلاف عرض البلد کے لحاظ سے کشش ثقل کے اختلافات کا اندازہ تقوس ارضی کی تحقیق کا عمل۔ راس کی ہم قطبی۔ ڈیوی کی ایجاد فانوس سلامتی اور تحلیل حرضیات و ارضیات اورسٹڈ اور فیراڈے کے کہربائی اور مقناطیسی اکتشافات۔ بیج کا باخرہ تخمین۔ ہبولٹ کی تحریک پر متعدد مقناطیسی رصدگاہوں کے قیام کی تدابیر۔ سطح زمین پر ایک ہی وقت میں مختلف مقناطیسی اختلالات کے حادث ہونے کی تحقیق و تصدیق۔ غرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ "رائل سوسائٹی" کے علمی کارناموں کی مکمل فہرست بھی بخوف طوالت یہاں درج کرنے سے ہم قاصر ہیں۔ اس کے قالب میں بھی وہی روح کارفرما تھی جو فلارنس کی علمی مجلس کی زندگی کا باعث ہوئی تھی اور اسی لئے اس کا نشانِ امتیازی یہ فقرہ تھا۔ "تقلید جامد سے پرہیز" اس نے اوہام و روایات کو اپنی حدود سے خارج کر دیا اور صرف محاسبہ مشاہدہ اور تجربہ کو جائز رکھا۔

یہ ہرگز نہ خیال کرنا چاہئے کہ ان غیر معمولی کوششوں اور نمایاں کامیابیوں کے لحاظ سے رائل سوسائٹی یکہ و تنہا تھی۔ یورپ کے تمام دارا لسلطنتوں میں مساوی الامتیاز اور مساوی الفوز دارالعلم مجالس اور انجمنیں قائم تھیں جو معلومات انسانی اور تمدن جدید کے ارتقا میں برابر حصہ لے رہی تھیں۔

سائنس کا اقتصادی اثر

علمی نظر سے اگر صحیفہ فطرت کی ورق گردانی کی جائے تو نہ صرف انسان کے عقلی تصورات کی رسائی معرفت اور حقیقت شناسی کے مقامات عالیہ تک ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی طبیعی و مادی حالت کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ انسان کے دل میں ہمیشہ یہ خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے کہ واقعات محققہ کے اقتصادی استعمال کی کوئی ایسی شکل نکالے جس سے وہ اس کے معاش کی اغراض کی تکمیل کر سکیں۔

اصول علمی کی تحقیقات کے بعد بہت جلد ایجادات عملی کا ظہور ہوتا ہے۔ علم و عمل کا یہ باہمی تعلق ہمارے زمانہ کی خصوصیت مختصہ ہے۔ اس نے دنیا کے تمدن میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

زمانہ سابق میں جنگ استرقاقاً" ہوا کرتی تھی۔ فاتح غلاموں کے کیمپ کے کیمپ اپنے ساتھ لے آتا تھا اور ان سے جبراً" محنت لیتا تھا اس لئے کہ انسانی محنت میں انسانی محنت ہی کے ذریعہ سے تخفیف ہونی ممکن تھی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ قدرت کی طبیعی اور جر ثقیلی قوتوں سے کام لینے میں بدرجہا زیادہ فائدہ ہے تو اقوام کی حکمت عملی میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب اس حقیقت کا علم ہوا کہ کسی نئے علمی اصول کا استعمال یا کسی نئی کل کی ایجاد ایک جدید غلام کے حصول کی بہ نسبت زیادہ نفع رساں ہے تو صلح کو جنگ پر ترجیح حاصل ہو گئی۔ ان جدید انکشافات کا اثر یہاں تک ہوا کہ اہل امریکا و روس کی طرح ان قوموں نے جن کی آبادی کا بڑا حصہ غلاموں سے مرکب تھا یہ دیکھ کر ہمدردی انسانی اور اغراض شخصی اب ایک دوسرے کی مغائر نہیں ہیں۔ اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔

غرض ہم ایک ایسے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی محنت کا قائم مقام کلوں کو بنایا جائے۔ اس زمانہ کی جر ثقیلی ایجادات نے تمدن اور معاشرت میں ایک انقلاب بپا کر دیا ہے۔ ہم اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے قدرتی طاقتوں سے مدد مانگتے ہیں۔ فوق القدرت طاقتوں سے چارہ جوئی نہیں کرتے۔ کیتھولک مذہب اسی جدید تمدن سے جو اس طور پر پیدا ہوا ہے۔ ابا کرتا ہے۔ پاپائیت بہ بانگ دہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ اس کو موجودہ حالت سے ہرگز کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ ازمنہ وسطی کے دور جاہلیت کی طرف رجعت قہقری کی جائے۔

یہ حقیقت انسان کو حضرت مسیح سے چھ سو برس پیشتر معلوم تھی کہ اگر کہربا کے ایک ٹکڑے کو رگڑا جائے تو اس میں جذب و دفع کی قوت پیدا ہو جائے گی۔ ظہور مسیح سے سولہ سو سال بعد تک یہ حقیقت محض بچوں کا کھیل بنی رہی اور اس سے کسی نے فائدہ نہ اٹھایا۔ لیکن جب اس پر علمی طریقہ سے بحث کی گئی اور مہندسانہ مناظرو اور تجربہ کی کسوٹی پر کس کر اس کے نتائج کو عملی طور پر کام میں لایا گیا تو اسی ادنی سی حقیقت کی بدولت انسان اس قابل ہو گیا کہ خشکی اور تری کے حائل ہونے کے باوجود ہزارہا میل کے فاصلہ پر بیٹھا ہوا ایک دوسرے سے طرفتہ العین میں بات چیت کر سکے۔ اس حقیقت نے دنیا کی قوتوں کو ایک مرکز پر لا کر جمع کر دیا ہے۔ فرمان روائے وقت کو بلالحاظ زمان و مکان اجرائے احکام و فرامین پر قدرت عطا کرنے سے اس نے تدبر میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور سیاسی قوت کے سابقہ تخلخل کو تکاثف سے بدل دیا ہے۔

عجائب خانہ اسکندریہ میں ایک کل تھی جسے جبرو ریاضی دان نے حضرت مسیح سے کوئی ایک سو سال قبل ایجاد کیا تھا۔ یہ کل دخانی قوت سے چلتی تھی اور اس کی شکل ویسی ہی تھی جیسی آج کل باخرہ استرجاعیہ یعنی ردعمل کرنے والے انجن کی ہوتی ہے۔ یہ انجن جو دنیا کی ایک نہایت عظیم الشان ایجاد کا ہیولی تھا سترہ سو سال تک محض ایک عجوبہ سمجھا جاتا رہا۔

زمانہ حال کے دخانی انجن کی ایجاد کو بخت و اتفاق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اسے غور فکر اور تجربہ کا عقلی ماحصل سمجھنا چاہیے۔ سترہویں صدی کے وسط میں بعض مہندسوں نے جو علم الحرکات و الجیل کے ماہر تھے دخانی قوت سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں شروع کیں۔ ان کوششوں کو واٹ نے اٹھارہویں کے وسط میں مکمل کر دیا۔

دخانی انجن بہت جلد تمدن کا مزدور بن گیا۔ اس نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ان اشخاص کو جن کی عمر ڈلیا ڈھوتے ڈھوتے کٹ جاتی زیادہ مفید مشغلوں کا موقع دیا۔ جو لوگ پہلے حمال تھے اب حکیم بننے کے قابل ہو گئے۔

اول اول اس سے بذریعہ نل پانی کھینچنے اور اسی قسم کا دوسرا کام لیا گیا جس میں محض طاقت صرف ہوتی تھی لیکن زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی لطیف صنعت میں حصہ لے کر اس نے ثابت کر دیا کہ اس میں باریک اور نازک کام کرنے کی قابلیت بھی موجود ہے۔ اس نے صنعت و حرفت کے عظیم الشان کارخانے قائم کر دئے اور دنیا کا بزازہ اسی کے طفیل چلنے لگا۔ غرض اقوام عالم کے صنعت و حرفت کی اس نے

صورت ہی بدل دی۔

پہلے دریاؤں اور اس کے بعد سمندروں میں جب دخانی انجن سے جہازرانی کے متعلق کام لیا گیا تو اس نے کشتیوں اور جہازوں کی سرعت رفتار کو دگنا چوگنا چھگنا کر دیا۔ امریکہ سے انگلستان پہنچنے میں پہلے چالیس دن صرف ہوئے تھے اب آٹھ ہی دن میں یہ سفر طے ہونے لگا۔ لیکن خشکی کے سفر میں دخانی انجن کی طاقت حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوئی جو فاصلہ انسان پہلے ایک دن میں بھی طے نہ کر سکتا تھا۔ اب ایک گھنٹے سے بھی کم میں طے ہونے لگا۔

دخانی انجن سے نہ صرف انسانی مستعدی و کارگزاری کے میدان کو وسیع کر دیا ہے بلکہ فاصلہ کے اعتبارات کو گھٹا دینے سے انسانی زندگی کی قابلیتوں کو بڑھا دیا ہے۔ کارخانوں کے تیار شدہ مال اور زراعتی پیداوار کے سریع السیر نقل و حمل سے اس نے انسانی صنعت و حرفت کی تحریک میں ایک بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

گھڑی کی ایجاد نے دخانی جہازرانی کے فن کو درجہ کمال پر پہنچانے میں ایک بڑی حد تک تحریک کی اس لئے کہ اس ایجاد کی بدولت نہایت صحت کے ساتھ یہ معلوم ہونے لگ گیا کہ سمندر میں جہاز کس وقت کس موقع پر ہے۔ عجائب خانہ اسکندریہ میں سائنس کی ترقی اس وجہ سے ایک بڑی حد تک رکی ہوئی تھی کہ کوئی ایسا آلہ نہ تھا جس سے وقت یا حرارت کا اندازہ کیا جا سکے یعنی نہ اس زمانہ میں گھڑی موجود تھی نہ مقیاس الحرارت کا وجود تھا اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایجادیں لازم و ملزوم ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عجائب خانہ اسکندریہ میں آبی گھڑیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن ان کی ساعت نمائی صحیح اور قابل اعتماد نہ تھی۔ ان میں سے ایک گھڑی کو جو منطقتہ البروج کی علامات سے مزین تھی قرون اولی کے بعض جاہل عیسائیوں نے ضائع کر دیا اور ایک مقدس عالم سینٹ پالیکارپ نے اس کی نسبت نہایت ہی معنی خیز لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ "ان تمام خبیث دیووں کی شکل میں ایک ایسے سفلی علم کی صورت نظر آتی ہے جو دشمن ایمان ہے۔" کہیں ۱۶۸۰ء میں جا کر گھڑی درجہ صحت کو پہنچی۔ ہوک نے جو نیوٹن کا معاصر تھا اس میں دولاب تعدیل اور چکر دار کمانی دو پرزے بڑھائے۔ اس کے اور مختلف پرزے مثلاً لنگر۔ کلالہ۔ کھٹی اور رفتار کیے بعد دیگرے اضافہ کئے گئے درجات حرارت کے تغیرات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی اور اس کے لئے مزید ترمیمات کی گئیں۔ یہاں تک کہ ہیرسن اور آرنلڈ نے گھڑی کو وقت کا ایک نہایت ہی صحیح پیمانہ بنا دیا۔ گھڑی کی ایجاد پر گاؤ فری کا مزولہ انعکاسی یعنی سدس دائرہ کی

شکل کا وہ آلہ مستزاد ہوا جس کی وجہ سے چلتے جہاز میں مشاہدات فلکی کا ارتصاد ممکن ہو گیا۔

فن جہازرانی میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں ان سے انقسام اقوام پر ایک قوی اثر پڑ رہا ہے۔ مستعمرات یعنی نو آبادیاں بڑھ رہی ہیں اور ان کی نوعیت تغیرپذیر ہو رہی ہے۔

لیکن ان بڑے بڑے اکتشافات و ایجادات ہی نے جو تحقیقات علمی کا ماحصل ہیں انسان کی حالت کو نہیں بدلا ہے بہت سی چھوٹی چھوٹی ایجادات نے جو بجائے خود چنداں قابل لحاظ نہیں مجموعی حیثیت سے تمدن پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ چودھویں صدی میں سائنس نے قوت ایجاد کو ایک حیرت انگیز تحریک پہنچائی اور اس قوت نے اپنے آپ کو ان علمی نتائج کے استخراج پر وقف کر دیا جو سودمندی کا پہلو لئے ہوئے تھے۔ قانون نے موجدوں کو اپنی ایجاد سے معقول نفع حاصل کرنے کا استحقاق بذریعہ سند ایجاد عطا کیا جس سے لوگوں کو نئی نئی ایجادیں کرنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ اس قسم کی ایجادات کا ذکر ہم اس مقام پر بر سبیل تذکرہ سرسری طور پر کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان سے تمدن کس قدر متاثر ہوا ہے۔ آرہ کشی کی کل کے جاری ہونے سے مکانات کے فرش چوبی ہو گئے اور اینٹ چونے پتھر کے فرش خواب و خیال ہو گئے۔ شیشہ سازی کے کارخانوں کے قائم ہونے سے آئینہ دار کھڑکیوں کا مکانوں میں اضافہ ہو گیا اور کمرے گرم رہنے لگے لیکن آئینہ بندی کا فن سولہویں صدی سے پہلے کمال کو نہ پہنچا۔ سولہویں صدی میں شیشہ ہیرے سے تراشا جانے لگا۔ دو دکشوں کے اضافہ سے مکانوں کی ہوا صاف ہو گئی پہلے وہ وحشیوں کے جھونپڑوں کی طرح دھوئیں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے اور ان کے اندر کی دیواریں کالک سے لسی ہوئی ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں دودکشون کی وجہ سے منطقہ باردہ کے مکانوں میں وہ سامان راحت مہیا ہو گیا۔ جسے آتش دان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب تک آگ تاپنے اور مکان کو گرم رکھنے کا ذریعہ صرف یہ تھا کہ دھواں نکلنے کے لئے چھت میں ایک سوراخ کر دیا جاتا تھا۔ الاؤ جلانے کے فرش کے بیچوں بیچ ایک گڑھا کھود دیا جاتا تھا اور جب بتی گل کرنے کی سرکاری گھنٹی بجتی تھی یا رات ہو جاتی تھی تو ایک سرپوش سے اسے گڑھے کو ڈھک دیا جاتا تھا۔

اگرچہ پادریوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی لیکن لوگوں کے ان خیالات کو کسی طرح روک تھام نہ ہو سکی کہ وباؤں کو خدا کا قہر نہ سمجھنا چاہئے جو بندوں پر ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں نازل ہوتا ہے بلکہ غلاظت اور تباہ حالی کا مادی نتیجہ تصور کرنا چاہئے

اور ان سے بچنے کا مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ پیروں اور اولیاؤں سے دعائیں مانگی جائیں۔ بلکہ یہ ہے کہ شہروں میں صفائی کا انتظام کیا جائے اور ہر شخص خود بھی جسمانی صفائی کا خیال رکھے۔ بارھویں صدی میں پیرس کی گلیاں مارے غلاظت اور عفونت کے سنڈاس بنی ہوئی تھیں۔ حکومت نے مجبور ہو کر سڑکیں صاف کرائیں اور ان پر کنکر کٹوائے۔ گندگی کا دور ہونا تھا کہ پیچش اور وبائی بخار فوراً جاتا رہا۔ اس طور پر بتدریج شہر کی صفائی کی قریب قریب وہی حالت ہو گئی جو اسپین کے اسلامی شہروں میں نظر آتی تھی جہاں سڑکیں صدہا سال سے پختہ چلی آتی تھیں۔ غرض پیرس میں جس کا حسن اب روز بروز بڑھتا چلا سوروں کے رکھنے کی ممانعت کر دی گئی لیکن اس حکم پر سینٹ انتھنی کے ویز کے راہب بہت بگڑے اور متقاضی ہوئے کہ اس خانقاہ کے سوروں کو بے روک ٹوک ہر جگہ پھرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ کلیسا کے عتاب کی تاب کوئی نصرانی حکومت اس زمانہ میں نہ لا سکتی تھی۔ اس لئے مجبوراً فرانسیسی حکومت کو اپنے حکم میں ترمیم کرنی پڑی اور معاملہ اس طرح رفع دفع ہوا کہ اس خانقاہ کے سوروں کے گلے میں گھنٹیاں لٹکا دی جائیں۔ ساہ لوی الملقب بہ فربہ کا بیٹا شاہ فلپ ایک دن گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ ایک سورنی سامنے آ گئی۔ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور بادشاہ کو لے کر گرا۔ جس کا گرتے ہی دم نکل گیا۔ بالاخانوں اور کھڑکیوں میں سے دھوون باہر پھینکنے کی لوگوں کی عام عادت تھی جس کی وجہ سے آئندہ ورفندلت پت ہو جایا کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے اس کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ۱۸۷۷ء میں پاپائی حکومت کے انتزاع کے وقت جب مصنف کتاب ہذا کو روما کی سیر کا اتفاق ہوا تو گلیوں میں گھورے کے ڈھیروں گندے پانی کے ڈابروں کی یہ کیفیت تھی کہ کپڑ دنکو نجاست کی آلودگی سے بچانے کے لئے ضرور تھا کہ گزرنے والے کی آنکھیں کبھی کبھی آسمان کی طرف اٹھ جانے کے بجائے زمین کی مسلسل و متصل دربانی کیا کریں۔ سترھویں صدی کے شروع میں برلن کی گلیوں کی یہ حالت تھی کہ ان کو کبھی صاف نہیں کیا جاتا تھا۔ اس شہر کا قانون یہ تھا کہ جو دیہاتی سودا سلف خریدنے کی غرض سے اپنا چھکڑا لے کر بازار میں آئے وہ واپسی کے وقت چھکڑے میں کوڑا کرکٹ بھر کر لے جایا کرے۔

سڑکوں کی کٹائی کے بعد نالیوں اور بدرروں کی تیاری کی کوشش کی گئی لیکن اول اول یہ کوشش ناقص اور ادھوری رہی۔ جو لوگ سوچ سمجھ رکھتے تھے ان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ شہروں اور نیز ان مکانوں میں جو الگ تھلگ واقع ہیں جب تک نالیوں اور بدرروں کا انتظام نہ کیا جائے گا صحت درست نہ رہ سکے گی۔ اس کے بعد عام گزرگاہوں کی

روشنی کا انتظام ہوا۔ جن لوگوں کے گھر لب راہ واقع تھے اول تو ان پر اس قاعدے کی پابندی لازم کی گئی کہ موم بتیاں یا چراغ اپنی کھڑکیوں میں روشن رکھیں تاکہ ان کی روشنی سڑک پر بھی پڑتی رہے اس کے بعد قرطبہ و غرناطہ کے اسلامی طریقہ کو پیش نظر رکھ کر سرکاری طور پر روشنی کا انتظام کیا گیا لیکن یہ انتظام اٹھارہویں صدی سے پہلے جگہ گاس کی روشنی ایجاد کی گئی تکمیل کو نہ پہنچا۔ سرکاری لالٹینوں کے نصب کیے جانے کے ساتھ ساتھ رات کے پہرے اور پولیس کا انتظام بھی کیا گیا۔

سولہویں صدی کے آغاز پر کلون کی ایجاد اور دست کاریوں کی اصلاح نے تمدن اور معاشرے پر نمایاں اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ دیواروں پر صورت دیکھنے کے آئینے آویزاں نظر آنے لگے۔ طاقچوں پر وقت دیکھنے کی گھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ آتش دانوں پر کارنسیں بن گئیں۔ اگرچہ اکثر مقامات کے باورچی خانوں میں گھاس پھوس اور لکڑی ابھی تک ایندھن کا کام دیتی تھی لیکن کوئلہ کا استعمال عام ہو چلا۔ کھانا کھانے کے کمروں میں میز پر الوان نعمت کے نئے خوان لگے ہوئے نظر آنے لگے۔ تجارت کا ہاتھ ممالک غیر کی نعمتیں اس پر چننے لگا۔ شمالی ممالک کی بدمزہ اور غیر مصفا شرابوں کی جگہ جنوب کی لطیف اور روح پرور اشربہ نے لے لی۔ برف خانے تعمیر ہو گئے۔ ہوا کی چکیوں میں آٹے کے چھننے اور روٹی زیادہ سفید اور زیادہ نفیس تیار ہونے لگی۔ مکی۔ آلو۔ فیل مرغ کا گوشت اور تمباکو وہ نعمتیں تھیں جو پہلے بوجہ نادر اور کمیاب ہونے کے خاص خاص لوگوں کو میسر آتی تھیں۔ اب ان کا ذائقہ کام و زبان کے لئے عام ہو گیا۔ پہلے لوگ ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ کانٹے نے جو اٹلی میں ایجاد ہوا اس گھناؤنے طریقے کی اصلاح کر دی۔ غرض مہذب و شائستہ قوموں کے دسترخوان کی صورت ہی بدل گئی۔ چاء چین سے قہوہ عرب سے اور شکر ہندوستان سے آنے لگی جن کا استعمال ایک بڑی حد تک مسکرات و منشیات کا قائم مقام ہو گیا۔ پرال کے فرش کی جگہ دریوں اور قالینوں نے لے لی۔ خوابگاہوں میں صاف ستھرے پلنگ اور اجلے بچھونے موجود ہو گئے۔ توشہ خانوں میں صاف اور نفیس پوشاک کے متعدد جوڑے مہیا ہو گئے۔ بہت سے شہروں میں بجائے اس چشمہ آب کے جہاں سے ہر شخص بقدر اپنی ضرورت کے پانی بھر کر لے جاتا تھا یا پانی کے اس نل کے جو گلی میں نصب ہوتا تھا گھر گھر پانی کا نل جاری ہو گیا۔ وہ چھتیں جو بزمانہ سابق میل اور کلونس سے غلیظ ہو جاتی تھیں اب بیل بوٹے اور نقش و نگار سے مزین ہو گئیں۔ حمام کا استعمال عام ہو چلا۔ جسم کی بدبو کا ردعمل کرنے کے لئے عطریات کے استعمال کی ضرورت کم رہ گئی۔ حدیقہ آرائی و

چمن بندی کے دل پذیر مذاق کو روز بروز ترقی ہوتی چلی اور ممالک غیر سے بہت سے نئے نئے پھولوں کے پودے لا کر گلشنوں میں لگائے گئے مثلاً "گل شبو کرن پھول- گل اکلیل- گل نرگس- گل شقیق لقمانی- گل صد برگ- سواری کی قسم سے اول پالکیاں اور تام جھام رائج ہوئے اس کے بعد بند گاڑیاں استعمال ہونے لگیں اور آخر میں کرایہ کی گاڑیاں رائج ہو گئیں۔

گلوں کا گھر گھر چرچا ہو چلا- گنوار دیہاتیوں تک بھی ان کی رسائی ہو گئی اور رفتہ رفتہ ہل جوتنے- بیج بونے گھاس کاٹنے- فصل کی لاؤنی کرنے اور دائیں چلانے کے آلات مکمل ہوتے گئے۔

باوجود ان پادریوں کے مواعظ و نصائح کے جو بھیک کا ٹھیکرا لئے ہوئے یورپ کے ہر شہر میں دربدر پھرتے تھے لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہو چلا کہ فلاکت ام الجرائم اور حجاب العلم ہے اور تجارت کے ذرائع سے دولت کمانا بمقابلہ اس جادہ کمنت کے جو بذریعہ جنگ حاصل ہو بمراتب افضل ہے- ماشیسکیو کا قول ہے کہ تجارت قوموں کو ملاتی ہے مگر افراد کو لڑاتی اور جنس اخلاق کا بیوپار کرتی ہے- یہ قول اگرچہ سچ ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تجارت ہی کی بدولت دنیا میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ تجارت کا نصب العین یہی ہے کہ عالم میں امن و صلح کا علم لہراتا ہوا نظر آئے۔

جب سے سائنس اپنا فیض رساں اثر دنیا پر ڈالنے لگا ہے اور قوت ایجاد صنعت و حرفت کا ہاتھ بٹانے لگی ہے انسان کے تمدن اور معاشرے کی حالت میں غیر معمولی اصلاح اور ترقی ہوئی ہے۔ ان اصلاحات و ترقیات کی تفصیل کے لئے بجائے کئی ضخیم جلدوں کے ان چند اوراق پر اکتفا کرنا اگرچہ مضمون کو تشنہ چھوڑنا ہے اور قلت گنجائش ہمیں مزید ایضاح کی اجازت بھی نہیں دیتی لیکن بعض امور پھر بھی ایسے ہیں جنہیں خموشی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا- بارسلونا کی بندرگار خلفائے اندلس کی عظیم الشان بحری تجارت کا مرکز تھی- یہاں سے سینکڑوں جہاز قیمتی مال تجارت سے لدے ہوئے اطراف و اکناف عالم میں جاتے تھے۔ مسلمانوں نے یہودی تاجروں کی اعانت سے فن تجارت میں بہت سے جدید اصول اختیار یا ایجاد کئے تھے اور یہ اصول علم کے نظری مسائل کے ساتھ ان کی فیض رسانی کی بدولت یورپ کی تجارتی جماعتوں تک پہنچ گئے تھے۔ اس طور پر حساب نویسی کا طریقہ ذواندراجین یا حساب فروج رائج ہو گیا جس میں آمدنی اور خرچ کا روزانہ حساب دو جداگانہ خانوں میں بالمقابل لکھا جاتا ہے۔ علی ہذا القیاس بیمہ کی مختلف قسمیں بھی رائج ہو

گئیں۔ اگرچہ پادری کڑکڑاتے اور بڑبڑاتے ہی رہے۔ بیمہ آتشزدگی و بیمہ بحری کی مخالفت پادریوں کی طرف سے نہایت سختی کے ساتھ اس بناء پر ہوئی کہ یہ ایک فتنہ ہے جو گویا قضا و قدر کا امتحان لیتا ہے۔ زندگی کے بیمہ کے عدم جواز کے متعلق یہ فتویٰ صادر ہوا کہ اس فعل سے گویا خدائے تعالیٰ کی مشیئت کے نتائج میں دخل دہی مقصود ہے۔ سود یا کفالت پر روپیہ قرض دینے کی جو کوٹھیاں یعنی بینک اور بندھک کے ساہوکاری قائم تھے۔ ان کی سخت مخالفت کی گئی۔ خصوصاً" زیادتی شرح سود کو رباخواری کے ذلیل نام کی آڑ میں قابل نفرت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور یہ وہ خیال ہے جو ابھی تک بعض ناترقی یافتہ جماعتوں میں پایا جاتا ہے۔ موجودہ شکل کی ہنڈیاں جن میں وہی اصطلاحات مستعمل تھیں جو آج کل زیرِاستعمال ہیں رائج ہو گئیں۔ افسر تصدیق قبالہ جات کا عہدہ قائم ہو گیا اور ہنڈیوں کا سکارنے سے پہلوتہی کرنے والے پر گرفت ہونے لگی۔ غرض بلامبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ تجارت کی کل آج جن پرزوں کے زور سے چل رہی ہے وہ اس زمانہ میں تمام و کمال رائج ہو چکے تھے۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ امریکہ کی دریافت نے یورپ میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اٹلی کے بہت سے دولت مند تاجر اور باہمت یہودی ہالینڈ انگلستان اور فرانس میں جا کر آباد ہو گئے اور ان ممالک میں ان کی وجہ سے تجار کو مختلف تجارتی گر معلوم ہو گئے۔ پاپاؤں نے حد سے زیادہ سود کھانے والوں کو مردود و ملعون قرار دیا تھا۔ یہودی جنہیں ان ملاعن کی کچھ پروا نہ تھی بھاری سود پر روپیہ قرض دے دے کر خوب مالدار ہو گئے تھے۔ پاپا ئی پائس ثانی نے یہ دیکھ کر کہ اس سے عیسائیوں ہی کا نقصان ہے فتوائے لعنت واپس لے لیا۔ بالآخر لیودہم کی اجازت سے بندھک کے ساہوکاری قائم ہو گئے اور پاپا کی طرف سے اس مضمون کا ایک تہدید آمیز فرمان جاری ہوا کہ جو شخص ان کوٹھیوں کے جواز کے خلاف قلم اٹھائے گا وہ کلیسا سے خارج کر دیا جائے گا۔ پراٹسٹنٹوں نے محض ضد کی وجہ سے ان مہاجنی کارخانوں کی مخالفت شروع کی۔ بھلا کیونکر ممکن تھا کہ جس چیز کو روما جائز بتائے اسے پراٹسٹنٹ ناجائز سمجھیں۔ جب اس دینی عقیدے کو کہ زلزلہ کی طرح وبا بھی خدا کا قہر ہے جو انسان پر اس کے اعمال سیئہ کی پاداش میں نازل ہوتا ہے لوگ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تو وبا کے دفعیہ کی کوشش قرنطینوں کے قیام سے عمل میں لائی جانے لگی۔ تلقیح یعنی انسانی چیچک کے ٹیکے کا طریقہ مسلمانوں کا دریافت کیا ہوا تھا۔ ۱۷۲۱ء میں لیڈی میری وارٹلی ماٹیگ جب قسطنطنیہ سے اس طریقہ کو اپنے ہمراہ لائیں تو پادریوں نے اس کی ترویج کی ایسی سخت مخالفت کی کہ اگر انگلستان کا شاہی خاندان اپنی مثال سے اس کے

استعمال کی ترغیب نہ دلاتا تو اس کا رواج پذیر ہونا محال تھا۔ علی ہذا القیاس جب اس طریقہ میں اصلاح کر کے تلقیح البقر یعنی گائے کی چیچک کے ٹیکے کا طریقہ رائج کیا گیا تو اس وقت بھی پادریوں نے مخالفت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا حالانکہ ایک صدی پیشتر خال خال ہی کوئی چہرہ ایسا نظر آتا تھا جو چیچک کے داغوں سے مسخ نہ ہو گیا ہو اور آج کل ایسا چہرہ شاذو نادر دکھائی دیتا ہے جس پر چیچک کے داغ ہوں۔ اسی طرح جب امریکہ میں ادویہ بے ہوشی کی اہم دریافت ہوئی اور یہ ادویہ زچگی کی حالتوں میں استعمال کی جانے لگیں تو پادریوں نے حسب معمول اس استعمال کی مخالفت کی نہ اس لئے کہ ازروئے اصول علم الابدان یہ استعمال قابل گرفت تھا بلکہ اس بنا پر کہ کتاب پیدائش کے تیسرے باب کی سولہویں آیت نے جو لعنت کا طوق عورت ذات کے گلے میں ڈال دیا ہے وہ اس ملحدانہ کوشش سے اترا جاتا ہے۔

ایجاد و ابداع نے مخترعات مفیدہ ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا بلکہ سامان تفریح طبع بھی بہم پہنچانا شروع کر دیا۔ اٹلی میں سائنس نے قدم رکھا ہی تھا کہ عجوبہ پسند لوگوں کے مکانوں میں طرح طرح کے متحرک و مجیل نو اور جنہیں جادو کا کھیل کہا جاتا تھا نظر آنے لگے۔ ان میں جادو کی لالٹین کا سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا۔ پادریوں کو اگر حکمت عملی اور تجربہ آموز فلسفہ سے نفرت تھی تو وہ بلاوجہ نہ تھی اس فلسفہ سے ایک نہایت اہم نتیجہ پیدا ہوا یعنی بھان متی کا تماشہ کرنے والے ان بزرگواروں کی مسابقت کا کامیابی کے ساتھ دم بھرنے لگے جو صاحب اعجاز و کرامت سمجھے جاتے تھے۔ وہ جعلی خوارق عادت اور جھوٹی کرامتیں جو گرجاؤں میں پیش کی جاتی تھیں بازار میں تماشا کرنے والے مداریوں کے کرتبوں کے سامنے پھیکی پڑ گئیں۔ جو بات مقدس پیشوایان کلیسا سے نہ ہو سکتی تھی وہ مداری نے کر کے دکھا دی۔ یعنی وہ منہ میں سے آگ کے شعلے نکالنے لگا۔ دہکتے انگاروں پر ننگے پاؤں چلنے لگا دانتوں میں سرخ جلتے ہوئے لوہے کی سلاخ پکڑنے لگا۔ منہ میں سے کوڑیوں انڈے نکالنے لگا اور کٹ پتلیوں کے ذریعہ سے معجزے دکھانے لگا۔ بایں ہمہ معجزات کا قدیم خیال بڑی مشکل سے مٹنے میں آیا۔ ایک گھوڑے پر جسے اس کے مالک نے بہت سے عجیب عجیب کرتب سکھا رکھے تھے ۱۶۰۱ء میں بمقام لزبن مقدمہ چلا گیا اور اس جرم کی علت میں کہ اس پر بھوت سوار ہے بیچارے بے زبان جانور کو آگ میں جلا دیا گیا۔ اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک سینکڑوں عورتیں اس الزام میں زندہ جلائی جاتی رہیں کہ وہ چڑیلیں ہیں۔

اکتشاف و ایجاد کا سلسلہ جب ایک دفعہ قائم ہو چکا تو اس کی ترقی نہایت سرعت سے

ساتھ علی التسلسل ہونے لگی۔ دونوں کا ایک دوسرے پر برابر عمل اور ردعمل ہوتا رہا اور ان کی وجہ سے خرق عادت کی جڑھ کھوکھلی ہوتی گئی۔ قوس قزح کی تشریح ڈی ڈامنیس نے شروع اور نیوٹن نے ختم کی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ قوس قزح مظہر قہر خدا نہیں ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے بلکہ پانی کے قطروں میں نور کی شعاعوں کے عمل کا کرشمہ ہے۔ ڈی ڈامینس کو صدر اسقف کے عہدے اور کردینال کے منصب کی امید پر بہلا پھسلا کر روما میں بلایا گیا۔ جب وہ یہاں پہنچا تو اسے ایک عالی شان محل میں نظربند کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد اس الزام کی بنا پر کہ وہ روما اور انگلستان میں اتحاد و مرافات کا محرک ہے وہ سینٹ انجیلو میں قید کر دیا گیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا تابوت ایک تسیسی عدالت کے سامنے لایا گیا اور زندقہ و اتحاد کے جرم کی علت میں ملحدانہ کتابوں کے ایک ڈھیر کے ساتھ آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ میں جھونک دیا گیا۔

فرینکلن نے اس بات کا ثبوت دے کر کہ بجلی اور برقی قوت دراصل ایک ہیں جوپیٹر کو اس کے صواعق سے محروم کر دیا۔ اوہام باطلہ کے کرشموں کی جگہ حقائق کے عجائبات نے لے لی۔ دوربین عکس افگن اور دوربین بے رنگ نے جو اٹھارھویں صدی کی ایجادات میں انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ کائنات کی غیرمحدود عظمت و شان کے چہرے سے پردہ اٹھا سکے۔ اور مکان لامتناہی و زمان بے پایاں کا اس حد تک جو انسان کے لئے ممکن ہے اندازہ کر سکے۔ کچھ مدت بعد خوردبین بے رنگ نے عالم صغار کی بے انتہا دقیق موجودات کو انسان کے پیش نظر کر دیا۔ غبارہ اسے بادلوں سے بھی اوپر لے گیا اور آلہ غواصی کے ذریعہ سے وہ سمندر کی تہ تک پہنچ گیا۔ مقیاس الحرارت اور مقیاس الہوا نے اسے مدارج حرارت کی تعیین اور ہوا کے دباؤ کے اندازہ کی قابلیت عطا کی۔ کانٹے کے رواج سے فن کیمیا کی دقیقہ سنجی بڑھ گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ مادہ غیر ممکن الفنا ہے۔ آکسیجن ہائڈروجن اور بہت سی دوسری غازوں کی دریافت الومینم کلس اور دوسری فلزات کے تجرد سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ خاک وباد و آب عناصر نہیں ہیں۔ اس علمی عزیمت و مستعدی سے کام لے کر جس کی تعریف کے لئے ہمارے پاس کافی الفاظ موجود نہیں ہیں واقعہ مرور زہرہ سے فائدہ اٹھایا گیا اور مختلف حصص ارض میں علمی مہمات بھیج کر زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ دریافت کیا گیا۔ ۱۴۵۶ء سے لے کر ۱۷۵۹ء تک یورپ نے جو عقلی ترقی کی اس کا اندازہ ہیلی کے ددار تارے سے ہوتا ہے۔ سال اول الذکر میں جب یہ تارہ نمودار ہوا تو اسے خدا کے قہر و غضب کی آسمانی علامت سے تعبیر کیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ اس کا ظہور جنگ

وبا اور گوناگوں بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ پاپائے مقدس کے حکم سے یورپ بھر کے گرجاؤں کے گھنٹے ہلائے گئے تاکہ ان کی ٹن ٹن سے تارہ دم دبا کر بھاگ جائے۔ دیندار اور خوش عقیدہ نصرانیوں کو ایما ہوا کہ روزانہ نماز پر ایک جدید نماز کا اضافہ کریں۔ اس قسم کی نمازیں اور دعائیں پہلے بھی کسوف و خسوف اور خشک سالی و بارش کے موقع پر کارگر ثابت ہوئی تھیں چنانچہ اس موقع پر بھی جب تارہ غائب ہو گیا تو یہ اعلان کیا گیا کہ عالی جناب تقدس ماٰب حضرت پاپائے اعظم کو خدا نے دمدار تارے پر فتح عطا فرمائی ہے۔ لیکن اس اثنا میں ہیلی کو کپلر اور نیوٹن کے اکتشافات کی مدد سے یہ معلوم ہوا کہ اس دمدار تارے کی حرکات پر مسیحی دنیا کے عجز و الحاح اور منت و زاری کو قابو نہیں ہے بلکہ مقدرات نے ایک اہلیلجی الشکل مدار کا چکر اس کے پاؤں میں ڈال رکھا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ مقتضیات قدرت سے وہ اس بے باکانہ پیشین گوئی کو اپنی آنکھوں پورا ہوتا نہ دیکھ سکے گا۔ لہٰذا اس نے آئندہ نسل کے ہیئت دانوں کو وصیت کی کہ ۱۷۵۹ء میں اس کی واپسی کا انتظام کریں۔ اس پیشین گوئی کا حرف حرف پورا ہوا اور اسی سال میں ستارہ مکرر نمودار ہوا۔

اگر کوئی شخص بیجا طرفداری سے پاک ہو کر اس مسئلہ پر غور کرے گا کہ رومن کیتھولک نصرانیت نے اپنی طول طویل مدت حکومت میں یورپ کی عقل اور مادی ترقی میں کس قدر حصہ لیا اور اس کے مقابلہ میں سائنس نے اپنے مختصر عہد میں کیا کر دکھایا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ بجز اس کے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچے گا کہ اس تقابل میں شان تضاد نظر آ رہی ہے۔ حالانکہ واقعات و حقائق کی جو فہرست ہم نے گزشتہ اوراق کے ذریعہ سے پیش کی ہے وہ نہایت ہی غیر مکمل اور ناقص ہے۔ ہم نے فنون نوشت و خواند کی ترویج کی بدولت مدارس عامہ کے ذریعہ سے تعلیم کی اشاعت اور کتب میں جماعت کے روز افزوں اضافہ۔ اخباروں اور تنقیدی رسالوں کے ذریعہ سے عام رائے کی تولید۔ اخبار نویسی کی بڑھتی طاقت' ڈاکخانہ اور سستے محصول ڈاک کے ذریعہ سے خانگی اور عام خبروں کی اشاعت اور اخباری اشتہاروں کے شخصی اور عمرانی فوائد کا ذکر تک نہیں کیا۔ ہم نے یہ نہیں بتایا کہ پیرس کے ہسپتال کے بعد جو پہلا شفاخانہ تھا عام شفاخانے قائم ہو گئے۔ قید خانوں میں اصلاح کی گئی۔ مجرموں کے لئے دارالاصلاح اور غیر مستطیع لوگوں کے لئے محتاج خانے کھولے گئے۔ نہریں تعمیر کی گئیں۔ حفظان صحت کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ مردم شماری کا انتظام کیا گیا۔ ہم نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ انطباع حروف مسبوکہ یعنی سیسے کے حروف کو جما کر چھاپنے کی ایجاد کیونکر ہوئی۔ کلورائن سے کپڑا سفید کرنے کی ترکیب کب معلوم ہوئی۔

روئی سے بنولے جدا کرنے کل اور پارچہ بانی کے پتلی گھروں کی وہ حیرت انگیز ایجادات جنھوں نے کپڑے کا نرخ بے حد سستا کر کے انسان کی جسمانی صفائی آسائش اور صحت پر اضافہ کر دیا ہے۔ کس طرح عمل میں آئیں۔ ہم نے طب و جراحی کی عظیم الشان ترقیات عالم الابدان کی جدید معلومات۔ فنون لطیفہ کی تحریک۔ فلاحت اور اقتصادیات دیہی کی ترقی۔ کیمیاوی کھادوں اور زراعتی کلوں کے رواج۔ لوہے کی ساخت اور اس کے وسیع کارخانوں اور نیز انواع و اقسام کے ریشمی اونی اور سوتی کپڑوں کے کارخانوں کے قیام۔ عجائب خانجات متعلقہ علم حیوانات اور آثار قدیمہ میں نوادر و عجائبات کیف راہی پر ایک سطر تک نہیں لکھی۔ ہم نے اس اہم مضمون کو بالکل ہی قلم انداز کر دیا ہے کہ کلین کیونکر خودبخود تیار ہونے لگیں اور خیر اور اوپر چڑھانے اور رندہ پھیرنے کے ان آلات متحرکہ اور نیز دوسرے آلات کا مطلق حال نہیں لکھا جس کے ذریعہ سے انجنوں کی تیاری مہندسانہ صحت کے ساتھ عمل میں آنے لگے۔ ہم نے کافی طور پر نہ ریل سے بحث کی ہے نہ تار برقی سے نہ علم حساب سے۔ نہ پتھر کے چھاپہ سے نہ ہوا کشی کے نل سے نہ برقی بطری سے نہ سیارہ یورینس یا نیپچون کے اکتشاف سے۔ نہ سوسے بھی اوپر نجمیوں کی تحقیقات سے۔ نہ شہابہ متوالیہ اور دمدار تاروں کے باہمی تعلقات سے۔ ہم ان علمی مہمات کی توضیح کے حق سے عہدہ برا نہیں ہو سکے جو مختلف حکومتوں کی طرف سے براہ خشکی و تری ہیئت و جغرافیہ کے مختلف اہم مسائل کے حل کرنے کے لئے جابجا بھیجی گئیں اور نہ ان بیش بہا و کامل العیار تجربوں کی مترح کیفیت ہی ہم نے قلمبند کی ہے جو ان حکومتوں کے ایما سے طبیعات کے اصول نکات کی تعیین کے لئے عمل میں لائے گئے۔ ہم نے انیسویں صدی تک کی بعض عظیم الشان علمی فتوحات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ علم الموجودات کے متعلق اس صدی کے محققین کے مہتم بالشان تصورات۔ مقناطیسی اور کہربائی حقائق کی دریافت فن فوٹوگرافی (عکاسی) کی دلکش ایجاد۔ فلکیات کے متعلق تجزیہ ایوان نور معکوس کا استعمال فن کیمیا کو ایووگڈرویایل و میریٹ اور چارلس کے قوانین ثلثہ کے تابع کرنے کی کوشش۔ غیر ذوی الاعضا مادہ سے مصنوعی طور پر اجسام و ذوی الاعضا کی تولید جس کے فلسفیانہ نتائج کی اہمیت میں کلام نہیں۔ علم ترکیب حیوانات و نباتات کی بنا فن کیمیا پر رکھنے سے اس علم کا استنباب۔ جغرافیائی پیائش اور سطح زمین کی ہیئت کذائی کے صحیح نقشہ جات کی ترتیب۔ لوہی التقویب بندوقوں اور آہن پوش جہازوں کی تیاری۔ فن حرب کے انقلابات عورتوں کے حق میں اس آیہ خیر و برکت یعنی سینے کی کل کی ایجاد۔ صنائع و بدائع کی کرشمہ ریزی۔

دنیا کے ہمہ گیر میلوں کی رونق اور صنعت و دستکاری کی نمائشوں کا انعقاد۔ یہ وہ امور ہیں جن پر ہم نے قلم تک نہیں اٹھایا۔

ایجادات و اکتشافات علمیہ کی جو فہرست ہم نے اوپر درج کی ہے اگرچہ وہ بادی النظر میں طویل نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس طوالت پر بھی نہایت ہی موجز و مجمل بلکہ ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس فہرست کو پیش نظر رکھنے سے ہماری نگاہ سرسری طور سے اس عقلی ہل چل پر جا پڑتی ہے جس کی شورش میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا ایک فانوس خیال ہے جس کے مثالی نقش نظر کے سامنے گذرتے جاتے ہیں۔ اس علمی و ادبی سرگرمی کا مقابلہ جب ازمنہ وسطی کے سکون و جمود سے کیا جاتا ہے تو زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔

اس ان تھک سرگرمی کے چاروں طرف جو عقلی نور پھیلا ہوا ہے اس نے بنی نوع انسان پر بے شمار برکتیں اور رحمتیں نازل کی ہیں روس میں اس کی وجہ سے کاشتکار طبقہ کے وہ لاکھوں نفوس آزاد ہو گئے جو مالکان اراضی کے پشتینی غلام تھے۔ امریکہ میں اس کی بدولت چالیس لاکھ حبشی غلام آزاد ہو گئے۔ بجائے اس نپی تلی خیرات کے جو خانقاہ یا دیر کے پھاٹک پر چند بدنصیب فلاکت زدہ لوگون کو مل جایا کرتی تھی۔ اس نے خیرات خانے محتاج خانے اور بیت المعذورین ایک وسیع پیمانہ پر قائم کر دیئے اور محتاجین و غرباء کے لئے قانون بنا دیا۔ اس نے طب کو سیدھے رستہ پر لگا دیا یعنی مرض کے ازالہ سے بدرجہا بہتر اس کا دفعیہ ہے۔ فن تدبیر مملکت میں اس نے صحیح علمی اصول قائم کر دیئے اور بجائے اس قانون کے جس میں عطائیانہ بے ترتیبی کی شان نظر آتی تھی ایسے قوانین وضع کئے جن میں یہ اصول مضمر تھا کہ قانونی چارہ جوئی سے پہلے تمدنی واقعات پر تفحص کے ساتھ تحقیق کی نظر ڈال لی جائے۔ انسان کے ارتقاع عقلی میں جو حصہ اس نے لیا ہے وہ اس درجہ نمایاں اور نکتہ آموز ہے کہ ایشیا کی دیرینہ سال اقوام بھی اس نعمت عظمی سے مستفیض ہونے کی آرزو مند ہیں۔ ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ مغرب کا جو عمل مشرق پر ہو گا جو اس کا رد عمل مغرب پر ہونا لازمی ہے۔ روما میں جب مختلف دیار و امصار کے دیوتا ایک جگہ لا کر جمع کئے گئے تھے تو ان کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے بت پرستی مٹ گئی تھی۔ اسی طرح آج وسائل نقل و حرکت کی آسانیوں نے متضاد و معارض مذاہب کو ایک دنگل میں لا اتارا ہے اور مسلمان بدھ برہمن ایک دوسرے کے مواجہ میں صف آرا نظر آتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ ان مختلف مذاہب میں ترقیات اور تبدیلیاں ہو جائیں۔ اس مذہبی تصادم کے اثر سے

مامون و مصئون صرف سائنس ہی رہے گا اس کے ذریعہ سے کائنات اور آفریدہ کون و مکان کا جو تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوا ہے وہ زیادہ تر عظمت و جبروت اور زیادہ تر ہیبت اور رعب کی شان لئے ہوئے ہے۔

جس اصول نے اس تحریک کو زندہ کیا ہے اور جو ان علمی اکتشافات و ایجادات کی روح و رواں ہے وہ تشخص کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اصول بعض دلوں میں آرزوئے دولت بن کر ظاہر ہوتا ہے اور بعض دلوں میں جن کی طینت شرافت سے مخمو کی گئی ہے۔ تمنائے عزت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پس مقام تعجب نہیں ہے کہ یہ اصول سیاسی قوت بن کر اٹھارہویں صدی میں دو موقعوں پر ان عظیم الشان تمدنی زلزلوں کا محرک ہوا جو نتائج میں انقلاب امریکہ و انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہیں۔ انقلاب اول الذکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پورا براعظم وقف تشخص ہو گیا اور کوئی دن جاتا ہے کہ وہاں بہ اتباع اصول جمہوریت دس کروڑ انسان ہر اس قید سے آزاد ہو کر جو مخل فلاح امن عامہ ہو کامل حریت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ انقلاب ثانی الذکر نے اگرچہ یورپ بھر کی سیاسی بساط الٹ دی ہے اور اگرچہ حیرت انگیز جنگی فتوحات اس کے ہمرکاب رہی ہیں پھر بھی اپنے مقاصد کو کامل و مکمل نہیں کیا۔ بلکہ فرانس پر اس کی وجہ سے رہ رہ کر تباہی اور برباد آئی ہے۔ فرانس کی دو عملی حکومت نے جو دنیوی و دینی دو فرمانرواؤں کی اطاعت و ارادت کا جو اس کے کندھے پر رکھے ہوئے ہے اسے اگر موجودہ ترقیات کا ایک پہلو سے حلیف بنایا ہے تو دوسرے پہلو سے حریف کر دکھایا ہے۔ ایک ہاتھ سے اس نے عقل کے سر پر تاج رکھا دوسرے ہاتھ سے اس نے سنبھالا لیتے ہوئے پاپا کو نئے سرے سے سنبھالا۔ اس تناقض کا خاتمہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی تمام اولاد وطن یہاں تک کہ ادنی گنوار کو بھی سچی تعلیم نہ دے۔

انقلاب فرانس نے موجودہ آرا پر جو عقلی حملہ کیا اس میں سائنس کی طاقت صرف نہیں کی گئی تھی بلکہ ادب کی۔ اس میں انتقاد و مبادات کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن سائنس پر البادی اظلم کی تعریف کبھی صادق نہیں آئی۔ اس نے ہمیشہ مدافعانہ پہلو اختیار کیا ہے اور حریف کو بے روک ٹوک حملہ کرنے کا بکمال فراخ حوصلگی موقع دیا ہے۔ پھر بھی ادب کا حملہ اس قدر خطرناک نہیں ہے جس قدر سائنس کا۔ اس لئے کہ انشاپردازی ایک مقامی شے ہے اور سائنس عالمگیر و ہمہ گیر ہے۔

اب اگر ہم یہ سوال کریں کہ سائنس کی ذات سے تمدن جدید کو کیا فائدہ پہنچا ہے اور

اس نے بنی نوع انسان کی راحت و آسائش اور فلاح و بہبود میں کس قدر حصہ لیا ہے تو اس کا جواب ہمیں اسی طرح ملے گا جس طرح اس سوال کا جواب ملا تھا کہ لاطینی نصرانیت نے انسان اور اس کے موجودہ تمدن کو کیا نفع پہنچایا ہے۔ جن ناظرین نے اوراق گذشتہ پر نظر امعان ڈالی ہے وہ اس نتیجہ پر لامحالہ پہنچے ہوں گے کہ ضرور ہے کہ ہمارے ابنائے جنس کی حالت میں اصلاح واقع ہوئی ہو لیکن جب ہم اس نتیجہ کو شمار و اعداد کے معیار سے جانچتے ہیں تو اس میں شامل تعیین و تحکیم پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفہ کے مسالک اور مذاہب کی اشکال کا اثر اگر بنی نوع انسان پر دیکھنا مطلوب ہو تو مردم شماری کی رپورٹوں کی ورق گردانی کرنی چاہیئے۔ لاطینی نصرانیت ہزار سال میں یورپ کی آبادی دگنی نہ کر سکی اور انفرادی زندگی میں بھی کوئی نمایاں اضافہ اس کے عہد میں نہ ہو سکا۔ لیکن ڈاکٹر جاروس کی رپورٹ سے جو اس نے مسیچوسٹس کی مجلس حفظ صحت کے ملاحظہ میں پیش کی معلوم ہوتا ہے کہ "واقعہ اصلاح کنیسہ کے وقت جنوا میں انسان" کی عمر کا اوسط ۲۱۷۲۱ سال تھا۔ ۱۸۱۴ء اور ۱۸۳۳ء کے درمیان ۴۰۲۶۸ ہو گیا۔ تین سو سال پہلے جتنے آدمی چالیس برس زندہ رہتے تھے اتنے آج کل ستر برس کی عمر کو پہنچتے ہیں۔ ۱۶۹۳ء میں گورنمنٹ انگریزی کو روپیہ قرض لینے کی ضرورت پڑی۔ یہ ضرورت اس طرح پوری کی گئی کہ اوسط مدت عمر کے حساب سے ہر شخص کے لئے وظیفہ سالانہ مادام الحیات مقرر کیا گیا اور یہ وظائف سن شیرخوارگی سے لے کر اوسط سن عمر تک کے اشخاص کے ہاتھ بعوض ایک خاص رقم کے بیچ ڈالے گئے۔ اس انتظام میں فائدہ گورنمنٹ ہی کو رہا۔ ستانوے سال بعد وظائف کا ایک جدید سلسلہ گزشتہ صدی کے اوسط معیار حیات کی توقع پر جاری کیا گیا۔ لیکن وظیفہ خواران دور ثانی نے اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں اتنی زیادہ عمر پائی کہ گورنمنٹ کو لینے کے دینے پڑ گئے اور یہ قرضہ بہت ہی گرانبار ثابت ہوا۔ حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ وظیفہ خواران قرضہ اول میں سے مذکورہ اناث دونوں جنسوں کے دس ہزار اشخاص اٹھائیس سال کو پہنچنے سے پہلے مرگئے لیکن ایک صدی بعد جب دوسرے قرضہ کے وظائف جاری کئے گئے تو اسی عمر کے صرف پانچ ہزار سات سو بہتر مردوں اور چھ ہزار چار سو سولہ عورتوں نے وفات پائی۔"

ہم روحانیات کا جسمانیات کے ساتھ اور قیاسات کا واقعات کے ساتھ مقابلہ کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ اقوال جن کا اتباع قرون اولی و اخری میں کیا کیا رنگ لائے بغیر نہ رہے۔ زمانہ سابق میں جو مقولہ واجب الاتباع سمجھا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ "جہالت زہد و اتقا کی ماں

ہے۔" دور آخر میں جس مقولہ پر عمل ہوا اس کے الفاظ یہ ہیں۔ "علم اور طاقت مترادف ہیں۔"

---

[1] فرانس کا وہ خوش سواد صوبہ ہے جو ۷۲۵ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ ۱۳۶۱ء میں اس کا الحاق فرانس کی عملداری کے ساتھ ہوا۔ مترجم

[2] لفظ "شوری" میں سپاہیانہ جانبازی۔ جنس لطیف یعنی طبقہ نسواں کا بدرجہ غایت ادب و احترام۔ جان جوکھوں میں ڈالنے کا شوق اور نام آوری کی خواہش کے وہ گوناگوں مفہوم شریک ہیں جو قرون متوسطہ میں شجاعت و شرافت کا لازمہ سمجھے جاتے تھے۔ مترجم

[3] کہ کرو کہ نیافت۔ لوتھر نے ارسطو کو جو گالیاں دی تھیں یہ اس کا بدلہ ہے۔ مترجم

[4] اس اصول کا ماخذ مذہب بھی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس مذہب کی تعلیم یہ ہو کہ "لکم دینکم ولی دین" "لا اکراہ فی الدین"۔ مترجم

لیکن ایک مذہب ایسا بھی ہے جس کے پیشوا نے تعصب سے ان تاریخی الفاظ میں بیزاری ظاہر کی ہے۔ لیس منادعا الی عصبیتہ ولیس مناقاتل عصبیتہ ولیس منامات علی عصبیتہ حبک الشئی یعمی ویصم لسان الہند مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی یادگار زمانہ مسدس میں حضور سرور کائنات صلعم کے اس ارشاد پاک کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

ڈرایا تعصب سے ان کو یہ کہہ کر کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اس کے یاور
نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرا
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

تاریخ اسلام پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے عام طور سے اپنے ہادی برحق کے اس ارشاد مقدس کو اپنے سیاسی و عقلی دستور العمل کا اصل الاصول قرار دے رکھا ہے۔ مترجم

[5] اب یہ مسافت پانچ ہی دن میں طے ہونے لگی ہے۔ مترجم

بارھواں باب

خطرہ کی آمد آمد

مذہب کے مبتلائے خطرہ ہونے کی قریب الوقوع علامات۔ کلیسائے روما جو نصرانیت کا رکن رکین ہے ان علامات کو پہنچا کر آنے والے خطرہ سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے۔ پاپائے پائس تاسع مجلس عمومیہ مسیحیہ منعقد کرتا ہے۔ مختلف دول یورپ کے تعلقات پاپائیت کے ساتھ۔ کلیسا کے تعلقات سائنس کے ساتھ حسب' تصریح مندرجہ مکتوب عمومی و تلخیص پاپائیہ۔

ویٹیکن کونسل کے فتوے عصمت پاپا کے متعلق اور نیز دربارہ سائنس۔ کونسل کے فیصلہ کا خلاصہ۔

حکومت پروشیا اور پاپائیت کی مٹ بھیڑ۔ یہ مقابلہ تقوی اور غلبہ کے حصول کے لئے دراصل سلطنت اور کلیسا کا مقابلہ ہے۔ یورپ میں دو عملی حکومت کا اثر۔ ویٹیکن کونسل کا اعلان اس امر کے متعلق کہ پاپائیت سائنس کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ رومن کیتھولک مذہب کی تحکمانہ ساخت۔ خدا الہام ایمان اور عقل کے متعلق اس کی تعریفات۔ اس کا سب و شتم۔ تمدن جدید پر اس کی لے دے۔ جماعت اتحاد انجیلیہ فرقہ پراٹسٹنٹ اور اس کے فیصلہ جات۔

سابق الذکر فیصلہ جات و فتاوی پر ایک عام نظر۔ مسئلہ زیر بحث کی موجودہ و آئندہ صورت۔

جو شخص مسیحی دنیا کے موجودہ رجحان خیال سے آگاہ ہے وہ اس واقعہ کے اخفا پر قادر نہیں ہو سکتا کہ نصرانیت ایک عقلی و مذہبی بحران میں مبتلا ہوا چاہتی ہے۔

ہر طرف مطلع تیرہ و تار نظر آ رہا ہے طوفان کی آمد آمد کا شور کانوں میں پڑ رہا ہے۔
جرمنی میں قومی جماعت عقائد ماوراء الجبال (یعنی پاپائی مذہب) کی مخالفت پر کمر باندھے کھڑی ہے۔ فرانس میں ترقی یافتہ طبقہ ابنائے جمود کے ساتھ دست و گریبان دکھائی دیتا ہے اور اس کشمکش میں اس دولت عظیم الشان کی سیاسی فوقیت بے اثر بلکہ زائل ہو چلی ہے۔ اٹلی میں روما پر ایک ایسا فرماں روا قابض ہے جو کلیسا سے خارج کیا جا چکا ہے۔ پاپائے مقدس اس حیلہ کی آڑ ڈھونڈ کر کہ آپ قید میں اپنے قصر و ٹیکن سے حریف پر ملاعن و مطاعن کی بوچھاڑ کر رہے ہیں اور باوجودے کہ آپ کی غلطیاں اور خطائیں بدلائل قاطع و براہین ساطع ثابت ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی برابر یہ بڑ لگائے جاتے ہیں کہ آپ معصوم عن الخطا ہیں۔ ایک رومن کیتھولک اسقف سچ کہتا ہے کہ اہل یورپ علانیہ طور پر نصرانیت سے قطع تعلق کر رہے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں اہل مذہب نہایت بدحواسی کے ساتھ یہ دیکھ رہے ہیں کہ زمانہ میں آج کل کچھ ایسی ہوا چل رہی ہے کہ مذہب کی عقلی بنیاد منہدم ہوئی جاتی ہے۔ آنے والی تباہی کا وہ جس طرح بن پڑے مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

ایک قوم پر وہ وقت بڑی آزمائش اور امتحان کا ہوتا ہے جب وہ مذہبی پابندیوں کی کینچلی جسم سے اتارتی ہے۔ یونان اور روما کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ وقت کیسا معرکہ کا ہوتا ہے اور اس میں کیسے کیسے خطرات عظیم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذاہب سدا ایک حالت میں نہیں رہتے۔ ان میں انسان کے عقلی نشوونما کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا میں ایسے کتنے ملک ہیں جن کا مذہب وہی ہے جو مسیحؑ کی ولادت کے وقت تھا؟

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ یورپ کی کل آبادی تیس کروڑ دس لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں سے اٹھارہ کروڑ پچاس لاکھ رومن کیتھولک ہیں اور تین کروڑ تیس لاکھ یونانی کیتھولک۔ پراٹسٹنٹ سات کروڑ دس لاکھ ہیں جو بہت سے فرقوں میں منقسم ہیں۔ یہودیوں کی آبادی پچاس لاکھ ہے اور مسلمانوں کی ستر لاکھ۔

امریکہ کی مذہبی تقسیم کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تمام جنوبی امریکہ کی مسیحی آبادی کا مذہب رومن کیتھولک ہے۔ وسطی امریکہ۔ میکسیکو۔ اسپین اور فرانس کے غرب الہندی مقبوضات کی نسبت بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ اور کینیڈا میں پراٹسٹنٹ آبادی کی کثرت ہے۔ آسٹریلیا پر بھی یہی قول صادق آتا ہے۔ ہندوستان کے بیس کروڑ

مسلمانوں اور دوسری مشرقی قوموں کے مقابلہ میں مسیحی آبادی تعداد کے لحاظ سے بے حقیقت محض ہے۔ غرض کلیسائے رومن کیتھولک زمانہ حال کی تمام مذہبی جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ زبردست زیادہ ترتیب یافتہ اور زیادہ وسیع الاثر ہے۔ بلکہ اسے مذہبی جماعت کہنا ہی غلطی ہے۔ اسے ایک پولیٹکل جتھا سمجھنا چاہیئے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ کل طاقت پادریوں کے ہاتھ میں آئے۔ دنیاداروں کو صرف عبودیت و متابعت کا حق حاصل ہے۔ مسیحیت کے قرن اولین میں کلیساؤں کی شکل جمہوری تھی۔ پھر جمہوریت بتدریج ایک متحد النظام اور مطلق العنان حکومت کی شکل میں بدل گئی ہے اور ایک انسان نائب خدا ہونے کی حیثیت سے اس پر مسلط ہے۔ اس کلیسا کو اس امر کا ادعا ہے کہ اس کی ماموری من اللہی کا اطلاق دینی اور دنیوی دونوں حکومتوں پر یکساں ہوتا ہے اسے یہ حق حاصل ہے کہ حکومت ملکی کو اپنی اغراض کی تکمیل کا آلہ بنائے لیکن حکومت ملکی کو اس کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور ان ممالک میں بھی جہاں پراٹسٹنٹ مذہب جاری ہے۔ اس کو حق حکمرانی علی سبیل الساوات ہی نہیں بلکہ پورا شاہی اقتدار بلامساہمت احدی و مشارکت غیرے حاصل ہے۔ کلیسائے مذکور کو اس دعوے کی حقیقت پر بھی اصرار ہے کہ حکومت ملکی کو اس کے حدود اراضی کے اندر کسی شے پر کسی طرح کا حق حاصل نہیں اور چونکہ پراٹسٹنٹ مذہب کی حیثیت محض باغیانہ ہے لہٰذا اس کو کوئی حق حاصل ہو ہی نہیں سکتا بلکہ پراٹسٹنٹ جماعتوں کا جائز اور حقیقی روحانی پیشوا کیتھولک اسقف ہی ہو سکتا ہے۔

پس ظاہر ہے کہ نصرانیت کے پیروؤں کا جزو غالب کیتھولک ہے اور پاپائیت کا یہ مطالبہ کہ اسے مسیحی دنیا کی اعلیٰ ترین طاقت تسلیم کیا جائے تحکمانہ اصرار کی ایسی شان لئے ہوئے ہے کہ مسیحی دنیا کی موجودہ مذہبی حالت پر نظر انتقاد ڈالتے وقت اس کے فیصلہ جات و فتاوی کو پیش نظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔ پاپائیت کے طرز عمل میں اعلیٰ درجہ کی دانشمندی اور تدبر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ کیتھولک فرقہ ایک شخص کے احکام کی تعمیل کرتا ہے لہٰذا اس کو وہ اتحاد اکتناز اور اقتدار حاصل ہے جو پراٹسٹنٹ جماعتوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ اس کے علاوہ روما کا بڑا نام اپنی شان دار یادگاروں کے ساتھ اس کا پشتیبان ہے۔

پاپائیت نے تامل و تذبذب سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اس عقلی خطرہ کے ہر پہلو پر غور کیا ہے جو کوئی دم میں ظاہر ہوا چاہتا ہے اور جو فیصلہ اس نے اس بارہ میں صادر کیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بزعم خود اپنے حریف پر پورا غلبہ حاصل

ہے۔

یہ فیصلہ گزشتہ "ویٹیکن کونسل" کے اجلاس کی روئداد کے معائنہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

پاپائے پائس ناسع نے بذریعہ فرمان مورخہ ۲۹ جون ۱۸۶۸ء روما میں ایک مجلس عمومیہ کے انعقاد کی تحریک کی۔ اس مجلس کا اجلاس ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء کو شروع ہو کر جولائی ۱۸۷۰ء میں ختم ہوا۔ منجملہ دوسرے مسائل کے جو اس مجلس میں بغرض غور پیش ہوئے۔ دو امور نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ پاپائے روما معصوم ہے دوسرا یہ کہ مذہب کا تعلق سائنس کے ساتھ کیا ہونا چاہئے۔

لیکن اس مجلس کا انعقاد عام رضامندی کے ساتھ نہ ہونے پایا۔ مشرقی کلیساؤں کی رائے زیادہ تر اس کے خلاف تھی۔ ان کی طرف سے یہ عذر پیش ہوا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پاپائے روما نصرانیت کی پیشوائی کا منصب اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے حالانکہ ان کی رائے میں حضرت یسوع مسیح ہی کلیسا کے سردار ہیں۔ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مجلس کے انعقاد کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ نئے فساد اور نئی خرابیاں اٹھ کھڑی ہوں گی۔ ان محترم کلیساؤں کے خیالات کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب ۱۸۶۷ء میں کلدانی بطریق نے نسطوری بطریق سائمین کو رومن کیتھولک اتحاد میں شامل ہونے کی دعوت دی تو اس نے یہ جواب دیا "آپ چاہتے ہیں کہ میں اسقف روما کی پاپوش کو بصد عجز بوسہ دوں لیکن یہ تو فرمایئے کہ کیا وہ بھی آپ ہی کی طرح ایک انسان نہیں ہے؟ کیا وہ عزت و آبرو میں آپ سے بڑھ کر ہے؟ ہم اس بات کو کبھی جائز نہ رکھیں گے کہ ہمارے مقدس معابد میں مورتوں اور مجسموں کی پرستش ہو اس لئے کہ ان کی پرستش ناپاک اور ذلیل بت پرستی کی ہم معنی ہے۔ کیا آپ لوگوں کی طرح ہم بھی اس عقیدہ کے پیرو ہو جائیں کہ خدائے قدیر انسان کی طرح ماں کے بطن سے پیدا ہوا؟ حضرت یہ کفر آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہمیں تو اس سے معاف رکھا جائے۔ اس جواب نے ثابت کر دیا مشرق اور مغرب کا اتحاد محال ہے۔

بالآخر اطراف و اکناف عالم سے جو بطریق صدر اسقف اور اسقف آ کر اس مجلس عمومیہ میں شریک ہوئے ان کی مجموعی تعداد سات سو چار تھی۔

روما کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ سائنس نہ صرف پاپائی عقائد کی جلد جلد جڑھ کاٹ رہا ہے۔ بلکہ سیاسی قوت بھی فراہم کر رہا ہے۔ یہ واقعہ اس سے چھپا ہوا نہ تھا کہ

یورپ بھر میں تعلیم یافتہ اشخاص مذہب سے قطع تعلق کر رہے ہیں اور اس اعتزال کا مرکز اصلی جرمنی کا شمالی علاقہ ہے۔ پس جب جرمنی اور آسٹریا میں جنگ چھڑ گئی تو اس نے اس جنگ سے نہایت دلچسپی ظاہر کی اور بقدر امکان آسٹریا کا حوصلہ بڑھایا۔ لیکن معرکہ ساڈووا کے نتیجہ نے اس کی امید کو مبدل بہ مایوسی کر دیا۔

اس کے بعد جب فرانس اور جرمنی میں لڑائی ہوئی تو پاپائیت کو پھر تھوڑا سا اطمینان قلب نصیب ہوا۔ اس کو ذرا شک نہ تھا کہ فتح فرانس کو حاصل ہو گی جس کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا خود اس کی فتح ہوئی۔ لیکن جنگ سیڈان نے دوبارہ اس کی امیدوں کا خون کر دیا۔

اب چونکہ کئی سال کے لئے اس کی امیدوں کے احیا کی کوئی صورت نہ تھی لہٰذا اس نے تہیہ کر لیا کہ جرمنی میں بغاوت کر دی جائے۔ چنانچہ آج کل اس سلطنت میں جو گل کھل رہے ہیں وہ حضرت پاپائے روما ہی کی چمن آرائی کے کرشمے ہیں۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر آسٹریا یا فرانس کو کامیابی نصیب ہوتی تو پروشیا کے ساتھ پراٹسٹنٹ مذہب کا بھی خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

اس جنگی کشاکش کے ساتھ ساتھ ایک اور منصوبہ بھی بروئے کار لایا گیا جس کا تعلق ذہنیات کے ساتھ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ازمنہ وسطی کے سالخوردہ و فرسودہ عقائد و مراسم کے احیا کی تدبیر کی جائے اور انہیں افراط کی حد تک پہنچایا جائے خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو چنانچہ نہ صرف اس ادعا کا علم بلند کیا گیا کہ پاپائیت کو تمام ممالک کی دنیوی حکومتوں میں علی السویہ شریک ہونے کا ربانی حق حاصل ہے بلکہ یہ دعوی بھی کیا گیا کہ روما کی برتری اور فوقیت واجب الاعتراف ہے اور مسائل مابہ النزاع میں دنیوی حکومت کو اس کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ چونکہ پاپائیت کے خطرہ میں پڑنے کا باعث سائنس کی ترقی ہوئی تھی لہٰذا اس نے کمال شوخ چشمی و بے باکی کی راہ سے سائنس کی حدبندی کر دی اور اس کے اقتدارات کی حدود مقرر کر دیں اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ تمدن جدید کو بھی مردود و مسطرود قرار دینے کی خدمت اپنے ذمہ لی۔

جب پاپائے مقدس ۱۸۴۰ء میں گیٹا[1] سے مراجعت فرما ہوئے تو ان منصوبوں پر غور شروع ہوا اور جیسوئٹ فرقہ کے مشورہ پر انہیں عمل میں لانے کا ڈھنگ ڈالا گیا۔ یہ فرقہ اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ خدا ناممکن کو ممکن کر دے گا اور پاپائیت کی بڈھی ہڈیوں میں جوانی کا کس بل پیدا کیا جا سکے گا۔ غرض پاپائی گزٹ میں یہ اعلان کیا گیا کہ کلیسا بمقابلہ

حکومت آزاد و خودمختار مطلق ہے۔ اساقف پاپا کے مطیع ہیں۔ اساقف کی فرمان برداری ان کے ماتحتین پر واجب ہے۔ پراٹسٹنٹ بھیڑوں کا فرض ہے کہ جادہ ارتداد و دہریت سے منحرف ہو کر اس گلہ میں شریک ہو جائیں جس سے جدا ہو کر وہ بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مسالمت و رواداری کسی شکل میں کسی طرح جائز نہیں۔ ماہ دسمبر ۱۸۵۴ء میں اساقف کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں پاپا نے عقیدہ حبل بلادنسن کا اعلان کیا۔ اس کے دس سال بعد وہ فرامین پاپا کی طرف سے جاری ہوئے جو مکتوب عمومی اور تلخیص کے نام سے مشہور ہیں۔

مکتوب عمومی کی تاریخ اجرا ۸ دسمبر ۱۸۶۴ء ہے۔ اس کا مسودہ بڑے بڑے عالم پادریوں نے مرتب کیا تھا اور "ہولی آفس" (دفتر مقدس) کی مجلس انتظامی نے اس پر بہت کچھ بحث کی تھی۔ اس کے بعد یہ اساقف کے پاس پہنچا گیا تھا اور سب سے آخر میں پاپا نے کرڈینالون کے ساتھ مل کر اس پر نظرثانی کی تھی۔

تمدن جدید پر اس مکتوب میں جو لے دے کی گئی تھی اس سے بعض پادریوں نے اختلاف کیا۔ اور بعض کرڈینال بھی اس کے ساتھ رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جھجکتے کیتھولک اخباروں نے اس کی اشاعت کی تو سہی لیکن بہ تاسف و ارتیاب۔ پراٹسٹنٹ حکومتوں نے اگرچہ اس کی مزاحمت نہ کی لیکن کیتھولک حکومتوں کو اس نے مضطرب و سراسیمہ کر کے مخمصہ میں ڈال دیا۔ فرانس نے اس کے صرف اس حصہ کی اشاعت کو روا رکھا جو جوبلی کے اعلان سے متعلق تھا۔ آسٹریا اور اٹلی نے اسے شائع ہو جانے دیا لیکن سرکاری طور پر منظور نہ کیا۔ کیتھولک ممالک کے اخبارات و رسالجات اور مجالس وضع آئین و قوانین کی طرف سے اس پر نکتہ چینی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے بہ تاسف یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کی وجہ سے کلیسا اور موجودہ تمدن کا اختلاف بہت بڑھ جائے گا اور تو اور اسپین تک میں بعض اخبارات ایسے تھے جنہوں نے ان الفاظ میں اپنا افسوس ظاہر کیا کہ "دربار پاپائے روما نے تمدن جدید کو بدنام کرنے اور اس پر نفرین بھیجنے میں نہایت ہٹ دھرمی اور کورسوادی کا ثبوت دیا ہے۔"

اس مکتوب نے آزادی ضمیر و آزادی ایمان پر ان الفاظ میں نکتہ چینی کی ہے:

"یہ عقیدہ نہایت ہی خطرناک بلکہ مجنونانہ ہے کہ آزادی ضمیر آزادی پرستش کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اور ہر شائستہ سلطنت میں اس حق کے اعلان اور نگہداشت کا ذمہ دار قانون کو ہونا چاہئے اور نیز یہ کہ عامہ خلائق کا ارادہ جو اس طریقہ سے جسے عام رائے کہا جاتا ہے یا دوسرے ذرائع سے ظاہر ہو ایک اعلیٰ قانون ہے جو تمام ربانی یا انسانی حقوق کی قید سے

آزاد ہے۔" والدین کے اس حق کی بھی اس مکتوب میں نفی کی گئی ہے کہ وہ کلیسائے رومن کیتھولک کی حدود سے خارج ہو کر اپنی اولاد کو تعلیم دلا سکتے ہیں۔ ان "گستاخ و بے ادب" لوگوں پر اس مکتوب میں نفرین کی گئی ہے جو ازراہ جسارت کلیسا اور پاپائی منصب کے ان پیشوایانہ اقتدارات کو "دنیوی حکومت کے تابع کرنا چاہتے ہیں جو خداوند یسوع مسیح کا عطیہ ہیں۔" تقدس ماب جناب پاپا نے مکتوب عمومی کے مکتوب الیہم یعنی اپنے محترم برادران دینی کو ہروقت عبادت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اور حسب ذیل تاسیسی الفاظ سے اس تاکید پر مزید اضافہ فرمایا ہے۔ "اس غرض سے کہ خدائے تعالیٰ زیادہ آسانی سے ہماری اور آپ کی دعاؤں کو قبول فرمائے ہمیں چاہئے کہ کامل سچائی اور خلوص کے ساتھ خدا کی ماں مریم عذرا سے مدد مانگیں جو ہمارے اور اس کے درمیان بمنزلہ ایک وسیلہ کے ہیں اور جو اپنے اکلوتے بیٹے خداوند یسوع مسیح کے دہنے ہاتھ پر زریں روا اوڑھے ہے اور مختلف زیورات پہنے ہوئے بطور ملکہ کے جلوہ فرما ہیں۔ اس لئے کہ کوئی مراد ایسی نہیں جو آسمان کی ملکہ کے توسل سے پوری نہ ہو سکے۔"

صاف ظاہر ہے کہ پاپا کی طرف سے جس اصول کا اب اعلان ہوا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جن حکومتوں کے تعلقات پاپائیت کے ساتھ اب تک مرافقانہ و مصالحانہ تھے وہ بھی اس کے مخالف ہو جائیں۔ روس میں بہت بڑی ناراضی پھیل گئی اور جو واقعات اس کے بعد پیش آئے ان کے لحاظ سے جناب تقدس ماب نے ایک تہدید آمیز فرمان نومبر ۱۸۶۶ء میں صادر فرمایا جس کا جواب گورنمنٹ روس نے یہ دیا کہ اس معاہدہ کو جو ۱۸۶۷ء میں دربار روما اور دولت روس کے درمیان قرار پایا تھا فسخ و کالعدم کر دیا۔

جنگ ساڈووا (جولائی ۱۸۶۶ء) کے نتیجہ کی طرف سے بالکل خالی الذہن ہو کر باوجودیکہ یہ ظاہر تھا کہ تمام یورپ کا سیاسی نقشہ بدل گیا ہے۔ خصوصاً" وہ تعلقات جو پاپائیت کو دول یورپ کے ساتھ تھے اپنے حال پر قائم نہیں ہیں۔ پاپا نے بتاریخ ۲۷ جون ۱۸۶۷ء ایک فرمان جاری کیا جو مکتوب عمومی اور تلخیص کا مصدق و موثق تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک مجلس عمومیہ کے انعقاد کا بھی قصد ظاہر کیا جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ چنانچہ دوسرے سال یعنی بتاریخ ۲۹ جون ۱۸۶۸ء انعقاد مجلس کا اطلاع نامہ جاری کیا گیا۔ لیکن اب آسٹریا کے ساتھ چپقلش ہو پڑی۔ آسٹریا کی پارلیمنٹ نے جو قوانین جاری کئے تھے ان کی رو سے سلطنت کے تمام باشندوں کا درجہ ملکی حقوق کے لحاظ سے مساوی قرار دیا گیا تھا اور کلیسا کے اقتدارات محدود کر دیئے گئے تھے اس پر پاپا کی گورنمنٹ کی طرف سے اعتراض ہوا اور آسٹریا کو بھی روس کی طرح مجبورا" وہ معاہدہ جو ۱۸۵۵ء میں حکومت آسٹریا و دربار روس کے مابین قرار پایا تھا منسوخ کرنا پڑا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے فرانس میں سالم تلخیص کی اشاعت کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن پروشیا چونکہ پاپائیت سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اس کا مزاحم نہ ہوا۔ پاپائیت تو ہل من مزید کے مرض میں مبتلا تھی ہی۔ اس عدم مزاحمت نے مرض کو اور بڑھا دیا۔ یعنی علانیہ یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ اہل ایمان اپنے مال و جان بلکہ اپنے عقلی عقائد تک کلیسا کی نذر کر دیں۔ پراٹسٹنٹوں اور یونانیوں کو بھی کلیسائے رومن کیتھولک کی حلقہ بگوشی کی دعوت دی گئی۔

تاریخ مقررہ پر مجلس عمومیہ کا افتتاح ہوا۔ اس کے مقاصد یہ تھے کہ تلخیص کو قوت سے فعل میں لایا جائے۔ عصمت پاپا کے عقیدہ کی ترسیس کی جائے اور مذہب اور سائنس کے تعلقات صاف صاف بتا دیئے جائیں۔ اس بات کی ہر طرح سے تیاری کرلی گئی تھی کہ جو مقاصد ذہن میں پیشتر سے قائم ہیں ان کی تعمیل و تکمیل ہو کر رہے۔ اسقفوں کو پیش از پیش مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ روما میں بحث کرنے کے لئے نہیں آ رہے ہیں بلکہ ان فیصلوں پر صاد کرنے کی غرض سے بلائے جا رہے ہیں۔ جو ایک معصوم و غیر خاطی پاپا صادر کر چکا ہے۔ آزادانہ بحث کا خیال تک بھی پیش نظر نہ تھا۔ مجلس کے کسی اجلاس کی روئداد کے معائنہ کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ ان اساقف کو جن کا تعلق محض ایک رسمی ضابطہ کی تکمیل کے لئے فریق اختلاف سے تھا بات کرنے کا موقع تک نہ دیا گیا۔ بتاریخ ۲۲ جنوری ۱۸۷۰ء اس مضمون کی درخواست مجلس میں بغرض تصفیہ پیش ہوئی کہ عصمت پاپا کی تعریف کی

جائے۔ اس کے مقابلہ میں جماعت اقلین کی اختلافی درخواست پیش ہوئی۔ اس پر اقلین کو مباحثہ کی ممانعت کر دی گئی اور ان کی آرا کی اشاعت کے متعلق بھی حکم امتناعی جاری کیا گیا۔ اگرچہ یہ انتظام کر لیا گیا تھا کہ جماعت اکثرین فریقین مباحثہ کا اس حد تک جزو غالب ہو کہ جماعت اقلین پر پوری طرح سے چھا جائے لیکن پھر بھی مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ ایک حکم اس مضمون کا جاری کیا جائے کہ کسی تحریک کی منظوری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ غلبہ آرا اتفاق کامل کے قریب قریب پہنچا ہوا ہو بلکہ محض کثرت رائے کافی ہو گی۔ جماعت اقلین کی آرائے مخالف کی مطلق پروا نہ کی گئی۔

مجلس نے اپنے مقاصد کی تکمیل پر جب اس قدر زور دیا تو دول خارجہ کے حکام کو اس کی اس غیرمال اندیشانہ کارروائی نے ہایم و سراسیمہ کر دیا۔ دائنا پایہ تخت آسٹریا کے صدر اسقف نے پاپا کی خدمت میں ایک محضر روانہ کیا جس پر بہت سے کرڈینالوں اور صدر اسقفوں کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں جناب تقدس مآب سے التجا کی گئی تھی کہ مسئلہ عصمت کو معرض بحث میں نہ لائیں۔ اس لئے کہ کلیسا آج کل ایسی کشمکش میں مبتلا ہے جس کا گذشتہ زمانے میں وجود نہ تھا اور اس کو ایسے حریفوں سے پالا پڑا ہے جو سرے سے مذہب ہی کے دشمن ہیں اور اسے فطرت انسانی کے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں جب کہ کیتھولک اقوام کی نیت اعدا اور معاندین کی منصوبہ بازیوں سے ڈانواڈول ہو رہی ہو ان کو ایسے عقائد کے تسلیم کرنے پر مجبور کرنا جو ٹرنٹ کی کونسل کے مسلمہ عقائد پر مستزاد ہوں قرین مصلحت نہ ہو گا۔" اس محضر میں یہ عبارت بھی درج تھی کہ "مسئلہ عصمت پاپا عن الخطا کی تعریف جن الفاظ میں کرائی جاتی ہے وہ دشمنان مذہب کے ہاتھ میں ایک اور زبردست حربہ دے دیں گے۔ جس کا اثر یہ ہو گا کہ وہ لوگ بھی جو بلحاظ عقائد افضل الناس ہیں کلیسائے رومن کیتھولک کو ان مغویوں کے اغوا سے برا سمجھنے لگیں گے۔" وزیراعظم آسٹریا نے ایک انتباہی تحریر کے ذریعہ سے دربار پاپا کو اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ ہر ایسی کارروائی کا خمیازہ دربار موصوف کو کھینچنا پڑے گا جو آسٹریا کے حقوق میں تصرف و دست اندازی کا موجب ہو گی۔ فرانسیسی گورنمنٹ نے بھی ایک یادداشت پاپا کی خدمت میں بھیجی جس میں یہ تحریک کی گئی تھی کہ ایک فرانسیسی اسقف کو مجلس کے اجلاس میں فرانس کے حالات پر بحث اور اس کے حقوق کی حمایت کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس کا جواب پاپا کی گورنمنٹ نے یہ دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا اسقف سفارت کی خدمات بھی انجام دے اور مجلس کی رکنیت کے مقدس فرائض سے بھی سبکدوش ہو سکے۔

اس پر فرانسیسی گورنمنٹ نے ایک مودبانہ عریضہ کے ذریعہ سے گزارش کی کہ امید ہے کہ حضرات اساقف کسر و انکسار کے اصول کو پیش نظر رکھ کر اور جناب پاپائے مقدس احتیاط و عاقبت شناسی کو کام فرما کر غلو آمیز شخصی آرا کو مذہبی عقائد کی فہرست میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ توقع بھی ظاہر کر دی کہ دینی حکومت کی بیجا مداخلت اور دست اندازی سے اس کے مدنی و سیاسی قوانین کو کیتھولک فرانسیسیوں کی عقل سلیم اور حب وطن محفوظ رکھے گی۔ اس مخالفت میں شمالی جرمنی کی "کانفیڈریشن" (انجمن اتحاد) بھی شریک ہو گئی اور ہر طرف سے پاپا کی گورنمنٹ پر دباؤ ڈالا گیا۔

۲۳ اپریل کو دان آرنم سفیر پروشیا نے دارو سفیر فرانس کے ساتھ مل کر پاپا کی خدمت میں یہ تحریک پیش کی کہ قرون متوسط کے خیالات کا احیا بعید از مصلحت ہے۔ اساقف اقلین نے یہ شہ پا کر مطالبہ کیا کہ مسئلہ عصمت پاپا کے تصفیہ سے پہلے دینی اور دنیوی حکومتوں کے تعلقات کا تعین کر دیا جائے۔ اور اس مسئلہ کا بھی تصفیہ کر دیا جائے کہ آیا مسیح نے سینٹ پیٹر اور اس کے جانشینوں کو بادشاہوں اور شہنشاہوں پر اقتدار عطا فرمایا ہے یا نہیں۔

لیکن اس تحریک پر مطلق التفات نہ کی گئی یہاں تک کہ بحث کے لئے مہلت تک نہ دی گئی۔ فرقہ جیسوئٹ کے اراکین جو اس تمام تحریک کے بانی مبانی تھے اپنی ہر ایک تجویز بجبر منوا لیتے تھے۔ عام نکتہ چینی سے بچنے کا کوئی ایسا حیلہ نہ تھا جو مجلس نے اختیار نہ کیا ہو۔ تمام کارروائی راز میں رکھی گئی۔ جو لوگ اس کارروائی میں شریک تھے ان سے حلف لے لیا گیا تھا کہ خاموش رہیں گے۔

۱۳ جولائی کو وہ رائیں لی گئیں۔ ۶۰۱ آرا میں چار سو اکاون (۴۵۱) موافق تھیں کثرت آرا کے قاعدے کے مطابق تحریک منظور شدہ قرار پائی اور پانچویں دن پاپا نے اس عقیدہ کا اعلان کر دیا کہ وہ معصوم عن الخطا ہے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ یہ وہ دن تھا جب کہ فرانس نے پروشیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اس کے آٹھ دن بعد فرانسیسی فوج روما سے بلا لی گئی۔ شاید مدبر اور فلسفی دونوں کو اس کا اعتراف ہو گا کہ اگر عقل سلیم پاپا کو غیر خاطی تسلیم کرتی تو اس کی عصمت اتحاد و اتفاق کا بہت بڑا عنصر ہو سکتی ہے مگر عقل کو یہ بات باور آئے تو کیونکر آئے۔

اس کے بعد شاہ اٹلی نے اپنی قلم سے ایک خط پاپا کو لکھا جس میں نہایت مودبانہ طور پر ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ امر ضروری ہے کہ شاہی فوجیں بڑھ کر ان مقامات پر قبضہ کر لیں جن

کا جناب تقدس ماب کی سلامتی اور ملک کو حریفوں کی دست برد سے بچانے کے لئے شاہی قوت کی حمایت میں آ جانا مصالح سیاسیہ کے مقتضیات سے ہے۔ اس خط میں یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ کیتھولک مذہب کا تقدس انتساب پیشوا اس ضرورت کو تسلیم کرنے سے نہ صرف قومی تمناؤں کو پورا کرے گا بلکہ باشندگان اٹلی کی ارادت و عقیدت کا مرکز بن کر دریائے ٹائبر کے کنارے اگر چاہے تو ایک ایسی شاندار حکومت قائم رکھ سکے گا۔ جو انسانی حکومت کی اطاعت سے مطلقاً" آزاد ہو گی۔

اس کا جواب جناب تقدس ماب نے ایک مختصر سے جلے کٹے خط میں یوں دیا۔ "میں خدا کا شکر کرتا ہوں جس نے حضور کو میری زندگی کے پیالہ کی تلچھٹ میں تلخی کے ملانے کی توفیق عطا کی ہے باقی رہے آپ کے بعض مطالبات سو میں ان کے منظور کرنے سے قاصر ہوں اور ان اصول کی پابندی بھی میرے حیطہ امکان سے خارج ہے جو آپ کے خط میں درج ہیں میں پھر خدا سے استعانت چاہتا ہوں اور اپنا کام اس کے ہاتھ میں چھوڑتا ہوں کہ وہ خود اسی کا کام ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ وہ حضور پر اپنی بہت سی برکتیں نازل کرے اور آپ کو خطرات سے بچائے اور آپ پر وہ رحم فرمائے جس کی آپ کو بہت ہی ضرورت ہے۔"

شاہی فوج کو بہت کم مزاحمت پیش آئی۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۰ء کو اس نے روما پر قبضہ کر لیا۔ اب ایک عام اعلان جاری کیا گیا کہ مسئلہ اتحاد دولت اٹلی کے متعلق کل باشندگان اٹلی کی رائے بذریعہ قرعہ اندازی لی جائے۔ اس عام قرعہ اندازی کے نتیجہ نے ثابت کر دیا کہ اٹلی میں لوگوں کا دماغ دینیات کی قیود سے کامل طور پر آزاد ہو چکا ہے ان صوبجات میں جو روما سے متعلق تھے آرائے قابل اندراج کی تعداد ۱۶۷۵۴۸ تھی ان میں سے بہ قدر ۱۳۵۲۹۱ آرا کے قرعہ اندازی ہوئی۔ الحاق صوبہ جات کی تائید میں ۱۳۳۶۸۱ آرا برآمد ہوئیں۔ آرائے مخالف کی تعداد ۱۵۰۷ تھی اور ۱۰۳ رائیں ایسی تھیں جو منسوخ کر دی گئیں۔ اٹلی کی پارلیمنٹ نے باشندگان روما کی اس متحدہ رائے کو کہ رومائی صوبجات کا دولت اٹلی کے ساتھ الحاق کر دیا جائے .غلبہ آرا تسلیم کر لیا۔ ۲۳۹ رائیں اس اعتراف کی موید تھیں اور بیس مخالف۔ غرض ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ پاپائی ریاستیں دولت اٹلی کے ساتھ ملحق کر دی گئیں اور ایک اشتہار اس الحاق کی جزیات کے متعلق جاری کیا گیا۔ اس اشتہار میں بتایا گیا تھا کہ "ان رعایات سے گورنمنٹ اٹلی یورپ پر یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہے کہ باتباع اس اصول کے کہ ایک خودمختار حکومت میں کلیسا کو

خودمختار ہونا چاہئے۔ اٹلی پاپا کی فرماں روائی کو تسلیم کرتی ہے۔

جب پروشیا اور آسٹریا کی جنگ ہوئی تو پاپائیت کو یہ امید تھی کہ سلطنت جرمنی پر آسٹریا کی نگرانی قائم ہو جائے گی اور اہل جرمنی کا مذہب کیتھولک ہو جائے گا۔ جب جرمنی اور فرانس میں لڑائی ہوئی تو فرانسیسیوں کو امید تھی کہ جرمنی میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے۔ جنہیں رومن کیتولک مذہب کے ساتھ ہمدردی ہو گی۔ اسی لئے کیتھولکوں کو پراٹسٹنٹوں کے خلاف بھڑکانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا۔ کوئی ایسی گالی نہ تھی جو ان کو نہ دی گئی ہو کبھی انہیں دہریہ کہا گیا کبھی ان کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ ان میں ایمانداری اور دیانت کی صفت ہو ہی نہیں سکتی۔ کبھی ان کے فرقوں کی نسبت یہ ظاہر کیا گیا کہ ان کا اعتزال روبہ زوال ہے کبھی ان پر یہ آواز کسا گیا کہ پیروان لوتھر سے زیادہ فاسق و فاجر قوم یورپ بھر میں کوئی نہیں۔ خود جناب پاپا نے شاید یہ سمجھ کر کہ دنیا کو تاریخ نسیا منسیا ہو گئی ہے بلا تامل یہ ارشاد فرمایا کہ "اہل جرمنی کو سمجھ جانا چاہئے کہ بجز کلیسائے روما کے اور کوئی کلیسا آزادی اور ترقی کا سرچشمہ نہیں ہو سکتا۔"

اس اثنا میں جرمنی کے پادریوں نے ایک جماعت اس غرض سے قائم کی کہ پاپا کی غاصبانہ دست برد کے خلاف اپنی آواز بلند کرے بلکہ عملی طور پر اس کی مزاحمت کرے۔ اس جماعت نے صاف کہہ دیا کہ ہم ہرگز اس امر کے روادار نہیں ہو سکتے کہ انسان خدا کے تخت پر بٹھا دیا جائے بلکہ ہم کسی شکل میں بھی کسی کو نائب خدا بنا ہوا دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے علمی عقائد کو تسیسیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا سکتے ہیں۔ بعض تو یہاں تک بے دھڑک نکلے کہ انہوں نے خود پاپا ہی پر زندقہ و الحاد کا الزام لگا دیا۔ ان متمرد اور سرکش اشخاص کو خارج از کلیسا کئے جانے کی دھمکیاں دی گئیں اور بالآخر یہ مطالبہ کیا گیا کہ بعض پروفیسروں اور معلموں کو خدمت سے سبکدوش کر کے بجائے ان کے ایسے اساتذہ مقرر کئے جائیں جو عصمت پاپا کے قائل ہوں۔ اس مطالبہ کی تعمیل سے گورنمنٹ جرمنی نے انکار کر دیا۔

گورنمنٹ جرمنی کی دلی تمنا تھی کہ پاپائیت کے ساتھ صلح صفائی کے تعلقات قائم رکھے وہ مذہبی جھگڑوں میں ہرگز نہ پڑنا چاہتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہو کر رہا کہ امرمابہ البحث مذہبی نہ تھا بلکہ پولیٹکل یعنی حکومت کی طاقت آیا حکومت ہی کے خلاف صرف کی جائے یا نہیں۔ ایک دفعہ ایک استاد جو کسی مدرسہ میں ورزش کی تعلیم دینے پر مامور تھا کلیسا سے خارج کیا گیا اور جب کلیسا کی طرف سے اس کی برطرفی کی تحریک

ہوئی تو گورنمنٹ نے اس تحریک کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ حکام کلیسا نے اس انکار کو کلیسا کے حقوق کی پائمالی پر محمول کر کے ظاہر کیا کہ گورنمنٹ نے مذہب پر حملہ کیا ہے۔ شہنشاہ جرمنی نے اپنے وزیر کی اس کارروائی کو جو کلیسا کے مقابلہ میں کی گئی تھی بنظر استحسان دیکھ کر اس کی حمایت کی۔ اس پر پاپائی اخباروں نے شہنشاہ کو ہر ایماندار کیتھولک کی مخالفت کی دھمکی دے کر جتایا کہ پاپا کے ساتھ مقابلہ کرنا کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس میں حکومتیں تہ و بالا ہو سکتی ہیں اور ہو کر رہیں گی۔ ہر شخص جو ذرا بھی سمجھ رکھتا تھا اچھی طرح جان گیا کہ امر مابہ النزاع نے اب اس سوال کی شکل اختیار کر لی ہے کہ سلطنت کا اصلی مالک کون ہے گورنمنٹ یا کلیسائے روما؟ دو بادشاہ درا قلیمے نہ گنجند۔ والی مثل ثابت ہو رہی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ لوگ دو حکومتوں کے ماتحت رہ سکیں جن میں سے دونوں ایک دوسرے کا تخلیہ کرتی ہوں۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر گورنمنٹ کلیسائے روما کے احکام کی متابعت کرنے سے پہلوتہی کرے گی تو دونوں گویا ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ اس طور پر روما نے جرمنی کو لڑائی پر مجبور کیا اور یہ وہ لڑائی تھی جس میں روما کی بوجہ تمدن جدید کے حریف ہونے کے صاف زیادتی پائی جاتی ہے۔

گورنمنٹ جرمنی نے اب اپنے حریف کو پہچان کر یہ مدافعانہ چال چلی کہ محکمہ وزارت عبادات عامہ کے کیتھولک صیغہ کو یک قلم تخفیف کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۷۱ء کے موسم گرما میں پیش آیا۔ نومبر آئندہ میں شاہنشاہ نے پارلیمنٹ میں ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا کہ جو پادری اپنے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر موجب نقض امن ہوں گے وہ مستوجب سزا بصیغہ فوجداری ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس اصول کو پیش نظر رکھ کر کہ کامیاب وہی جماعت ہو گی جس کے ہاتھ میں مدارس ہوں گے ایک منصوبہ وسیع پیمانہ پر اس غرض سے قائم کیا گیا کہ مدارس کو کلیسا سے علیحدہ کر لیا جائے۔"

"جیسوئٹ" فرقہ تمام جرمنی میں اس سازش کا جال پھیلا رہا تھا کہ ایسے مذہبی قانون کی تعمیل رعایا پر فرض نہیں ہے جو حکومت کا بنایا ہوا ہو۔ یہ گویا کھلم کھلا بغاوت تھی گورنمنٹ اگر ان باغیوں کی دھمکی میں آ جاتی تو اس کی خیر نہ تھی۔ ارملان کے اسقف نے صاف کہہ دیا کہ حکومت کے ان قوانین کی وہ ہرگز متابعت نہ کرے گا۔ جو موثر کلیسا ہوں گے۔ اس پر گورنمنٹ نے اس کی تنخواہ روک دی اور یہ دیکھ کر کہ جب تک جیسوئٹ فرقہ کا ملک میں قدم رہے گا۔ امن قائم نہ ہو سکے گا ان کے اخراج کا قصد کر لیا اور جتنے جیسوئٹ تھے سب ملک بدر کر دیئے گئے۔ ۱۸۷۲ء کے خاتمہ پر جناب تقدس ماب نے ایک

خطبہ شائع کیا جس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ سلطنت جرمنی میں کلیسا جور و جفا کا تختہ مشق بنا ہوا ہے۔ اس نے یہ دعوی کیا کہ کلیسا اور حکومت کی حدود ارضی کے معین کرنے کا حق صرف کلیسا ہی کو حاصل ہے۔ یہ اصول جس درجہ خطرناک اور ناقابل تسلیم ہے ظاہر ہے اس لئے کہ لفظ اخلاق کلیسا کی اصلاح میں انسان کے جملہ تعلقات باہمی پر حاوی ہے اور کلیسا نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ہر وہ قوت جو اس کی معین نہیں ہے اس پر جبر کرتی ہے۔ اس خطبہ کی اشاعت کے چند روز بعد یعنی ۹ جنوری ۱۸۷۳ء کو گورنمنٹ نے چار قوانین نافذ کئے۔

(۱) ان وسائل کے انضباط و تعین کے متعلق جن کو اختیار کر کے انسان اپنا تعلق کلیسا سے منقطع کر سکے۔

(۲) کلیسا کے اقتدارات تعزیری کی تقلید و تحدید کے متعلق۔

(۳) قانون تنبیہات و تادیبات مذہبی دربارہ ممانعت سزائے جسمانی اور انضباط سزائے جرمانہ و جلائے وطن و عطائے حق اپیل بہ ناراضی فیصلہ عدالت ہائے ماتحت بعدالت العالیہ امور مذہبی جس کا فیصلہ قطعی اور ناطق متصور ہو گا۔

(۴) قانون تعلیم ابتدائی و تقرر پادریان۔ اس چوتھے قانون کی رو سے لازمی قرار دیا گیا کہ پادریوں نے خاطر خواہ تعلیم پائی ہو اور سرکاری امتحان پاس کیا ہو اور فلسفہ و تاریخ و جرمن علم ادب میں مہارت رکھتے ہوں یہ بھی قرار پایا کہ جو مذہبی مدارس سلطنت کی نگرانی میں قائم رہنے سے انکار کریں وہ بند کر دیئے جائیں۔

یہ قوانین حکومت جرمنی کے اس مصمم قصد کو ثابت کرتے ہیں کہ وہ ہرگز اس بات کی روادار نہ ہو گی کہ اٹلی کے چند اونچے گھرانے جرمنی میں من مانی کارروائیاں کریں اور اسے کٹ پتلی کی طرح تار پر نچائیں۔ بلکہ وہ اپنے گھر کا انتظام اب خود اپنے ہاتھ سے کرنا چاہتی ہے۔ اس مقابلہ کو وہ مذہب اور ایمان کا معاملہ نہیں سمجھتی بلکہ قانون سلطنت اور قانون کلیسا کی فرمانروایانہ صولتوں کا تصادم تصور کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ پاپائیت کو مذہب نہیں بلکہ پولیٹکل طاقت سمجھتی ہے اور اس نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ جرمنی کی دستوری حکومت کا یہ اعلان لفظاً" و معناً" علماً" و عملاً" برقرار رہے گا کہ "مذہبی آزادی کو ہرگز ان فرائض میں مخل نہ ہونا چاہیئے جو ہر فرد رعایا کے ذمہ دوسرے افراد رعایا اور حکومت کی طرف سے واجب الادا ہیں۔"

یہ قول بالکل درست ہے کہ پاپائی حکومت میں شان عمومیت نظر نہیں آتی یعنی وہ ایک

ہمہ گیر کلیسا نہیں ہے جس کی برکات سے کل مسیحی دنیا مستفیض ہوتی ہو بلکہ اس کا مقصد محض چند اطالوی خاندانوں کو نفع پہنچانا ہے۔ اس کی ہیئت ترکیبی پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پاپا کردینال اسقف اور کردینال شماس سب کے سب اطالوی ہیں۔ کردینال قسیس تقریباً" سب کے سب اطالوی ہیں۔ روما کی مجلس مقدسہ کے اعضا و اعمال سب کے سب اطالوی ہیں۔ قرون متوسطہ سے لے کر آج تک فرانس کا ایک بھی پادری پاپا نہیں ہوا۔ یہی حال آسٹریا' پرتگال اور اسپین کا ہے۔ باوجود ان کوششوں کے جو اس اختصاص کے خلاف وقتاً" فوقتاً" عمل میں لائی گئی ہیں اور باوجودیکہ سبھی طرح کے جتن کئے گئے ہیں کہ کلیسا کے مناصب جلیلہ کا دروازہ تمام کیتھولک دنیا کے لئے بلاامتیاز کھول دیا جائے لیکن ممکن نہیں کہ کوئی غیرملکی کرسی مقدس تک پہنچ سکے۔ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کلیسا ایک سلطنت ہے جو خدا نے مخصوص طور سے اٹلی ہی کے امرا کو عطا فرمائی ہے۔ موجودہ مجلس کردینالان کے پچپن ارکان میں سے چالیس اطالوی ہیں حالانکہ انصافاً" ان کی تعداد آٹھ سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے تھی۔

ترقی یورپ کی چلتی گاڑی کی راہ میں حکومت کی دو عملی نے روڑا اٹکائے رکھا ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ ہر قوم کے دو بادشاہوں ایک دنیوی یعنی داخلیہ اور ایک دینی یعنی خارجیہ جب کہ مختلف ممالک جد اجدا فرمان رواؤں کے ماتحت ہوں اور ان سب کا ایک فرمان روا پاپائے روما ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تاریخ میں ہم کو بجز ان متخالف و متعارض طاقتوں کی رقیبانہ جدوجہد کی داستان کے اور کوئی سبق آموز حقیقت نظر آئے؟ جو شخص ان واقعات کا بنظر غور مطالعہ کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ قومیں جنہوں نے مثنویت کے عنصر کو اپنی حکومت سے خارج کر دیا ہے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اس پر اس فالج کی حقیقت منکشف ہو جائے گی جس نے فرانس کو عضو معطل بنا رکھا ہے۔ ایک طرف تو فرانس یورپ کا مقتداو پیشوا بننا چاہتا ہے اور دوسری طرف عہد ماضی کی اس لاش سے ہم آغوشی ہے۔ جس کی ہڈیاں بھی گل کر چونہ ہو گئی ہیں یعنی طبقہ جہلا و عوام کے خوش رکھنے کی غرض سے وہ طرز عمل اختیار کرتا ہے جس کی وقعت اس کی عقل سلیم کی نظروں میں خاک نہیں ہو سکتی۔ جن دو حکومتوں کا فرانس میں دور دورہ ہے وہ یہاں تک مساوی القوت ہیں کہ کبھی ایک کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کبھی دوسرے کو اور بارہا ایسا بھی اتفاق پیش آتا ہے کہ ایک قوت دوسری قوت کو اپنے اغراض کی تکمیل کا آلہ بنا لیتی ہے۔

لیکن اس دو عملی کے خاتمہ کا وقت اب قریب آتا جاتا ہے[۹۳]۔ شمالی اقوام کو جو تخیلات

بارہ و توہمات باطلہ میں اس درجہ مبتلا نہ تھیں یہ مشنویت مدت سے ناقابل برداشت ہو گئی تھی اور انہوں نے علی رغم انف روما اس کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکا تھا۔ روس جس کی قسمت دوسری قوموں سے اچھی تھی۔ کبھی بھی کسی غیر قوت کا روحانی حلقہ بگوش نہ بنا۔ وہ قدیم کلیسائے یونان کی رسموں ہی کو اپنا سرمایہ نجات تصور کرتا تھا اور پاپائیت کو نصرانیت قرون اولی میں مفسدانہ رخنہ اندازی سے تعبیر کرتا تھا۔ امریکہ میں امور دنیا و دین بالکل الگ الگ کر دیے گئے ہیں۔ مذہب کو حکومت میں دست اندازی کرنے کی مطلق اجازت نہیں۔ اگرچہ باقی ہر اعتبار سے اسے پوری آزادی حاصل ہے۔ نئی دنیا کی حالت دیکھ کر ہمیں یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ نصرانیت کے دونوں فرقوں یعنی کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی قوت بالیدگی و انفراع سلب ہو چکی ہے۔ ان کی جو حدود ایک عرصہ سے معین ہو چکی ہیں ان سے یہ دونوں متجاوز ہونے کے قابل نہیں رہے۔ کیتھولک اقوام کیتھولک ہیں اور پراٹسٹنٹ پراٹسٹنٹ۔ پراٹسٹنٹوں کے دل سے فرقہ بندی کا خیال دور ہو رہا ہے۔ ان کے اختلافات مٹتے جاتے ہیں۔ مختلف فرقوں کے افراد کا میل جول بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی آرا و عقائد مروجہ کا ماخذ کلیسا نہیں ہے بلکہ اخبارات و رسائل ہیں۔

جس جدوجہد کا ذکر ہم نے کیا ہے اس کے لحاظ سے پاپائے پائس تاسع کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اول یہ کہ پاپائیت کی قوتیں ایک مرکز پر لا کر جمع کر دی جائیں اور یہ مرکز ایک مطلق العنان روحانی مقتدا ہو جسے ربانی اقتدارات حاصل ہوں۔ دوسرے یہ کہ جو اقوام مسیحی المذہب ہیں ان کے عقلی نشوونما کی باگ پاپا کے ہاتھ میں آ جائے۔ مقصد اول الذکر کا کوئی اور نتیجہ بجز سیاسی مداخلت کے ہو ہی نہیں سکتا۔ پاپائے موصوف کو اصرار تھا کہ دنیوی طاقت ہر حال میں دینی طاقت کے تابع ہو اور ہر وہ قانون جو کلیسا کی اغراض کا حامی نہ ہو منسوخ کر دیا جائے۔ اس لئے کہ ایسا قانون اہل ایمان کے لئے واجب الاتباع نہیں ہے۔ گزشتہ اوراق میں ہم مجمل طور پر محض ان پیچیدگیوں کا ذکر کر آئے ہیں جو اس اصول کو برقرار رکھنے کی کوشش کے باعث واقع ہو چکی ہیں۔

اب ہم اس طریقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو پاپائیت نے اپنی عقلی حکومت کے قیام کے لئے تجویز کیا ہے۔ یعنی ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس نے اپنے اور اپنے حریف سائنس کے باہمی تعلقات کی تعریف و تعیین کن الفاظ میں کی ہے۔ ازمنہ وسطی کی حالت کے احیا کی کوشش میں اس نے تمدن جدید کی کیوں کر مخالفت کی ہے اور ابنائے زمانہ حال کو کس کس طرح سے کوسا ہے۔

مکتوب عموی و تلخیص میں جو اصول مندرج ہیں انہیں و ٹیکن کونسل قوت سے فعل میں لانے کی آرزومند تھی۔ "تلخیص" میں ان لوگوں کی تکفیر کی گئی ہے جو عقیدہ ہمہ اوست کے قائل ہوں یا نیچری ہوں یا مطلقاً" استدلالی و معقولی ہوں اور اس قسم کے عقائد کو موردنفرین قرار دیا گیا ہے کہ خدا کائنات ہے۔ خدا اور قوت مترادفات ہیں۔ امور دین پر بھی اسی حیثیت سے نظرڈالنی چاہئے جس حیثیت سے مسائل فلسفہ پر نظرڈالی جاتی ہے۔ وہ طریقے اور اصول جنہیں متکلمین زمانہ قدیم نے دینیات کی حمایت کے لئے اختیار کیا تھا مقتضیات زمانہ حال و ترقی سائنس کے لحاظ سے موزوں و مناسب نہیں رہے۔ ہر شخص آزاد ہے کہ جس مذہب کو ازروئے عقل سچا سمجھے قبول کر لے۔ کلیسا کے اقتدارات کی تعین و تحدید کا حق حکومت کو حاصل ہے۔ کلیسا کو جبریا بالواسطہ و بلاواسطہ قوت سے کام لینے کا حق حاصل نہیں۔ کلیسا کو حکومت اور حکومت کو کلیسا سے الگ کر دینا چاہئے۔ اب یہ امر قرین مصلحت نہیں رہا کہ حکومت کا مذہب عبادت کے باقی تمام طریقوں کی نفی کر کے کیتھولک مذہب ہی قائم رہنے دیا جائے۔ جو لوگ کیتھولک ممالک میں آکر سکونت پذیر ہوں انہیں اپنا طریقہ عبادت علانیہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ پاپائے روما کو تمدن جدید کی ترقی کے ساتھ اتفاق و وفاق ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے بھی۔ تلخیص میں یہ دعوی بھی کیا گیا ہے کہ کلیسا کو مدارس عامہ کی نگرانی کا کامل اختیار حاصل ہے اور حکومت کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نکاح اور طلاق کے معاملات بھی کلیسا کے حیز اقتدار میں داخل ہیں۔

ان میں سے وہ اصول جنہیں کونسل نے بالفعل بشکل ضابطہ مرتب کرنا قرین مصلحت سمجھا ایک رسالہ میں جس کا نام "کیتھولک مذہب کا دستور عقائد" ہے درج کر دئے گئے ہمیں اب ان عقائد کے مہمات الامور خصوصاً" مذہب اور سائنس کے تعلقات باہمی پر غور کرنا ہے۔ مخفی نہ رہے کہ سطور ذیل اس رسالہ کا مکمل اقتباس پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کے ذریعہ سے صرف ان اجزا کا خلاصہ درج کیا گیا ہے جو ضروری الاظہار ہیں۔

رسالہ کی تمہید ایک مناقرانہ تقریظ پر مشتمل ہے جس میں واقعہ اصلاح کنیسہ کے اصول و نتائج پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے:

"اس ربانی اقتدار کی نفی کرنے کے باعث جو کلیسا کو دین برحق کے حقائق کی تعلیم کے متعلق حاصل ہے اور جملہ امور متعلقہ مذہب کو ہر شخص کے اجتہاد ذاتی کے حوالے کر دینے کی بدولت متعدد فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور ان فرقوں کے باہمی اختلاف و نزاع سے نہ

صرف بہت سے لوگوں کے دل سے یسوع مسیح کا ایمان زائل ہو گیا بلکہ کتب مقدسہ کا شمار افسانوں اور فرضی رواتیوں میں ہونے لگا۔ لوگ مسیحیت کے منکر ہو گئے اور اس کے بجائے محض عقل یا بقول خود نیچر کی تعلیم کی پیروی کرنے لگے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جو ہمہ اوست مادیت اور دہریت کے قعر میں جا گرے ہیں۔ اور فطرت انسانی کے استدلالی پہلو کو نظرانداز کر کے اور نیکی و بدی کے ہر قاعدہ کو پس پشت ڈال کر جماعت انسانی کا اخلاقی شیرازہ بکھیرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ متعقدات فاسدہ و بدعات سیئہ کی چونکہ ہر جگہ اشاعت ہو رہی ہے لہٰذا بہت سے کیتھولک بھی ان کے دام تزویر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے سائنس کو جس کا ماخذ انسان ہے مذہب کے ساتھ جو ربانی الاصل ہے ملا کر غلط مبحث کر دیا ہے۔

لیکن کلیسا جو ابوالامم اور سید الاقوام ہے کمزوروں کی قوت اور ناتواں کا سہارا ہے جو راہ گم کردہ اس کے آغوش عاطفت میں آ کر عافیت گزین ہونا چاہیں انہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہے اور جس رستہ سے وہ بھٹک گئے تھے اس پر انہیں نئے سرے سے ڈالنے کے لئے آمادہ ہے۔ اسی لئے کل دنیا کے اساقف اس مجلس عمومیہ میں آ کر جمع ہوئے ہیں اور چونکہ روح القدس بھی اس جلسہ میں نزول اجلال فرما کر ہمارے اجتہادات میں شریک ہے لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پطرس کی کرسی سے مسیحی نجات کے عقیدہ کا اعلان کریں اور ان بدعات کو جو اس عقیدہ کی مخالف ہیں سرزمین اعتقاد سے قابتہ" خارج کر دیں۔

"خدا کی حقیقت جو آفریننده کون و مکاں ہے: مقدس رومن کیتھولک کلیسا جو مرسلین کی یادگار ہے یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدائے حی و برحق ایک ہے جو آسمان و زمین کا خالق و مالک، قادر مطلق، ازلی و ابدی، لاتعدد لا تحصے۔ برتراز فہم و قیاس۔ غیرمتناہی العقل و الاراوہ اور من کل الوجوہ کامل ہے۔ وہ کائنات سے جدا اور متمائز ہے وہ اپنی مشیت مطلقہ کی تحریک پر دو مخلوق ہستیوں کو عدم سے وجود میں لایا جن میں سے ایک روحانی ہے دوسری جسمانی، ایک لاہوتی ہے دوسری ناسوتی۔ اس کے بعد اس نے فطرت انسانی کو بنایا جو ان دونوں سے مرکب ہے۔ اس کے علاوہ خدا اپنی تائید سے تمام چیزوں کی حفاظت اور انتظام کرتا ہے اور اس کا جلال و جبروت اقصائے کائنات پر محیط ہے اس کے نظم و نسق میں موزونی و ترتیب پائی جاتی ہے۔ وہ ہمہ دان و ہمہ بین ہے۔ اور وہ باتیں بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہیں جو اس کی مخلوقات کے آزادانہ افعال سے وقوع میں آتی ہیں۔

"الہام کی حقیقت: کلیسائے مقدس کا عقیدہ ہے کہ اگرچہ خدا کی ذات عقل انسانی

کے قدرتی نور کی روشنی میں صاف صاف نظر آ سکتی ہے لیکن اس کی یہ بھی مرضی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مقدرات کو فوق العادت طور پر ظاہر کرے۔ یہ فوق العادت الہام ٹرنٹ کی مقدس کونسل کے اجتہاد کے مطابق عہود عتیق و جدید کے ان نسخوں میں مندرج ہے جن کی توضیح کونسل نے کی ہے اور نیز کتب مقدسہ کے لاطینی نسخہ میں موجود ہے۔ یہ کتابیں اس وجہ سے مقدس ہیں کہ ان کے املا میں روح القدس کا تصرف شامل تھا۔ ان کا مصنف خدا ہے اور ربانی تصانیف ہونے کی حیثیت سے وہ کلیسا کے حوالے کی گئی ہیں۔

"اس غرض سے کہ بے چین اور چلبلی طبیعت کے لوگ آیات آسمانی کی غلط تفسیر و تاویل نہ کرنے پائیں بہ تجدید اجتہاد مجلس ٹرنٹ یہ فرمان صادر کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کتب مقدسہ کے معانی ان معانی سے مختلف نہ بیان کرے جو کلیسائے مقدس نے بیان کئے ہیں کہ اسی کو اس قسم کی مفسری سزاوار ہے۔

"ایمان کی حقیقت: چونکہ انسان بندہ ہے اور خدا اس کا آقا ہے اور چونکہ عقل حادث حقیقت ازلی کی کامل طور پر مطیع و منقاد ہے لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ جب کوئی الہام منجانب اللہ صادر ہو تو اس پر ایمان لائے۔ ایمان ایک سعادت ہے جو بزور بازو نہیں حاصل ہوتی بلکہ یہ ایک جوہر ماوراء العادت ہے جسے خدا کی دین سمجھنا چاہئے۔ جو شخص آیات آسمانی کو برحق سمجھتا ہے نہ اس لئے کہ ان میں وہ فطری حقائق پوشیدہ ہیں جن کے سمجھنے پر عقل انسانی قادر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان آیات کی تنزیل کا ماخذ جناب باری ہے اس کے لئے ایمان ذریعہ نجات ہے پھر بھی اس خیال سے کہ عقل اور ایمان میں توافق قائم ہو سکے خدا نے الہام پر معجزوں اور پیشین گوئیوں کا اضافہ فرما دیا جو اس کی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ کے مظاہر ہونے کے لحاظ سے ایسی حجتیں ہیں جن کو عوام و خواص یکساں سمجھ سکتے ہیں۔ ان حجتوں کا اظہار حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیا کے ذریعہ سے عموماً" اور جناب مسیح کے ذریعہ سے خصوصاً" ہوا۔

"کوئی شخص ایمان لائے بغیر اپنی فطرت کے حق سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی شخص تاوقتیکہ مرتے دم تک اس کا ایمان سلامت نہ رہا ہو ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کے ذریعہ سے کلیسا کو اپنی الہامی آیات کا محافظ و معلم قرار دیا۔ کیونکہ صرف کلیسائے کیتھولک ہی ان نشانات آسمانی کا مورد و مہبط ہے جن سے دین مسیحی کا مفید یقین ہونا ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور یہی نہیں خود کلیسا اپنی حیرت انگیز تبلیغ۔ اپنے منیف الشان تقدس۔ اپنی بے پایاں خیروبرکت' اپنے ہمہ گیر اتحاد اور اپنی

غیرمتزلزل استقامت سے اس دعوی کی تائید کر رہا ہے کہ وہ ایمان و ایقا کا حقیقی و اصلی مرکز ہے اور بلاخوف تردید اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ اس کی ماوریت منجانب اللہ ہے۔ اس طور پر کلیسا اپنے بچوں کو بتاتا ہے کہ ان کا ایمان ایک نہایت مستحکم بنیاد پر قائم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت میں جنھوں نے ایمان کی تائید آسمانی کی بدولت کیتھولک مذہب قبول کر لیا ہے اور ان لوگوں کی حالت میں جنھوں نے عقل انسانی کو اپنا پیشوا قرار دے کر ایک جھوٹا مذہب اختیار کر لیا زمین آسمان کا فرق ہے۔

"عقل اور ایمان کی حقیقت: اس کے علاوہ کلیسائے کیتھولک کا ہمیشہ سے عقیدہ ہے اور اب بھی ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں اور ہر قسم باعتبار اپنی اصل اور غایت کے ایک دوسری سے مختلف ہے۔ اختلاف اصلی تو اس لحاظ سے ہے کہ ایک بذریعہ عقل فطری معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا بذریعہ ایمان اور اختلاف غائت اس اعتبار سے ہے کہ علاوہ ان حقیقتوں کے جن کا انکشاف عقل فطری کی وساطت سے ہو سکتا ہے۔ ہمارے ایمان کے ساتھ ان اسرار و غوامض کو پیش نظر کیا جاتا ہے جن کا راز سربستہ خدا ہی کو معلوم ہے اور تاوقتیکہ وہی ان کو بذریعہ الہام ظاہر نہ کرے ان کی حقیقت کا علم ہم کو نہیں ہو سکتا۔

"اس میں شک نہیں کہ اگر عقل ایمان کی روشنی سے منور ہو اور اپنی تلاش و جستجو میں استقامت و رزانت سے کام لے تو وہ خدا کی عنایت سے بتوسط ان اشیاء کے تمثیل کے جو قدرتی طور پر معلوم ہیں اور بتوسل اس تعلق کے جو اسرار و غوامض متذکرہ کو ایک دوسرے کے ساتھ اور انسان کی عاقبت کے ساتھ ہے ان اسرار و غوامض کی کنہ تک ایک محدود مگر بدرجہ غایت مفید پیرایہ میں پہنچ سکتی ہے۔ لیکن محال ہے کہ عقل کبھی بھی ان اسرار و غوامض کو کامل طور پر ان حقائق کی طرح سمجھ سکے جو اس کا موضوع اصلی ہیں اس لئے کہ خدا کے بعید اپنی نوعیت کے اعتبار سے عقل حادث و مخلوق کی رسائی سے اس قدر دور ہیں کہ الہام کی تلقین اور ایمان کی تصدیق کے بعد بھی ان پر ایمان ہی کی نقاب پڑی رہتی ہے جو اس وقت تک نہیں اٹھتی جب تک کہ مرغ روح قفس عنصری سے آزاد نہیں ہو لیتا۔

لیکن اگرچہ ایمان برتراز عقل ہے تاہم ان دونوں میں حقیقی تناقض کبھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو خدا کشاف اسرار اور سرچشمہ ایمان ہے وہی روح انسانی کو عقل کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ خدا اپنی تردید آپ نہیں کر سکتا اور ایک حقیقت دوسری حقیقت کی ضد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر عقل و ایمان میں ظاہر بینوں کو تناقض نظر آئے تو اس کی مثال

بالکل سراب کی سی ہے جو فریب نظر کا کرشمہ ہے۔ ایسے تناقض کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو ایمان کی حقیقت اس طور پر نہیں سمجھی اور سمجھائی گئی جس طرح کلیسا دراصل اسے سمجھتا ہے اور یا بعض لوگوں کے بیہودہ رایوں اور حیلوں کو غلطی سے مقتضیات عقل کا مترادف خیال کر لیا جاتا ہے۔ پس ہم ہر اس ادعا کی نسبت باطل ہونے کا فتوی صادر کرتے ہیں جو ایمان کی روشن حقیقت کی ضد ہے۔ مزید برآں کلیسا کو جو تبلیغ کے رسولی منصب کے علاوہ ایمان کی حفاظت و صیانت کی خدمت پر بھی مامور ہے یہ اقتدار بھی منجانب اللہ حاصل ہے بلکہ یہ بات منجملہ اس کے ربانی فرائض کے ہے کہ علم باطل کو حرام قرار دیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ فلسفہ اور تزویر کے دام میں گرفتار ہو جائیں۔ اسی لئے تمام ایمان والے مسیحیوں کو بہ تقید فہمائش کی جاتی ہے کہ نہ صرف ان آرا کی حمایت سے مطلقاً" ابا کریں جو سائنس کے جائز مسلمات سمجھے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں مغائر الایمان ہیں اور کلیسا نے خصوصیت کے ساتھ انہیں عقائد فاسدہ کی فہرست میں داخل کر دیا ہے بلکہ ان کا یہ فرض ہے کہ ایسی آرا کو منجملہ ان غلطیوں کے تصور کریں جنہوں نے سچائی کی فریب دہ شکل اختیار کر رکھی ہے۔

"نہ صرف یہ بات ناممکن ہے کہ عقل اور ایمان میں تخالف واقع ہو بلکہ وہ اور الٹا ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی ادھر تو عقل سلیم ایمان کی بنیاد قائم کرتی ہے اور ایمان کی مشعل ہاتھ میں لے کر حقائق آسمانی پر روشنی ڈالتی ہے اور ادھر ایمان عقل کو غلطیوں میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے اور انواع و اقسام کے معارف و حقائق سے اس کے سرمایہ ادراک میں اضافہ کرتا ہے۔ پس کلیسا انسانی علوم و فنون کا مخالف نہیں ہے بلکہ ان کا حامی و موید ہے۔ وہ ان فوائد سے بے خبر نہیں ہے جو علوم و فنون کی بدولت انسان کو حاصل ہیں اور نہ وہ ان فوائد کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بخلاف اس کے اس کو اس امر کا اعتراف ہے کہ چونکہ ان علوم و فنون کا ماخذ خدا ہے جو مالک علم ہے لہذا اگر ان سے صحیح صحیح طور پر فائدہ اٹھایا جائے تو ان کا اکتساب تائید ایزدی سے موجب یزداں شناسی ہو گا۔ کلیسا اس بات کی بھی ممانعت نہیں کرتا کہ یہ علوم اپنے اصول اور طریقوں سے اپنی اپنی جائز حدود کے اندر کام نہ لیں لیکن اس واجبی آزادی کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی کلیسا اس احتیاط کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا کہ کہیں یہ علوم تعلیم ربانی کی نفی کرنے سے غلطیوں میں نہ پڑ جائیں اور اپنی جائز حدود سے متجاوز ہو کر ایمان کا شیرازہ نہ بکھیر دیں۔

"ایمان کی ملہم من اللہی کسی فلسفیانہ اکتشاف کی طرح انسانی عقل کے ذریعہ سے حد کمال کو پہنچنے کی محتاج نہیں ہے بلکہ ایمان کو کامل و مکمل شکل میں ودیعت مسیح یعنی کلیسا کے حوالے کر دیا گیا ہے تاکہ جان سپاری کے ساتھ اس کی حفاظت کی جائے اور پاک اور بے لوث صورت میں اس کی اشاعت کی جائے۔ اسی لئے دین مقدس کے کل مسائل کے معانی کلیسا کے مفہوم کے لحاظ سے بیان کئے جانے چاہئیں اور یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ مفسرانہ وضاحت کے بہانہ سے ان معانی میں کوئی ترمیم یا تصرف روا رکھا جائے۔ پس صدیوں کی بساط کے الٹنے اور انسان کی متواتر نسلوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ عقل و فہم اور علم و دانش کی سریع السیر ترقی اشخاص کے لئے منفرداً" اور کلیسا کے لئے مجتمعاً" جائز قرار دی جاتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ ترقی اعتبار قسم اپنی حد سے متجاوز نہ ہو یعنی مسائل ایمان کے مفہوم و معانی و عقیدہ میں کسی قسم کی خارجی آمیزش نہ ہونے پائے۔"

منجملہ دیگر اوامرونواہی کے حسب ذیل امور بھی منہیات میں داخل کئے گئے۔

"لعنت ہو اس پر :

"جس کا یہ ایمان نہیں ہے کہ خدائے برحق ایک ہے جو تمام دیکھی اور ان دیکھی چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔

"جو شوخ چشمی کی راہ سے یہ دعوی کرتا ہے کہ بجز مادہ کے اور کسی شے کا وجود نہیں ہے۔

"جو یہ کہتا ہے کہ ذات باری اور باقی تمام اشیا بلحاظ جوہر ترکیبی واحد العنصر و مشترک الاصل ہیں۔"

"جو یہ کہتا ہے کہ موجودات جسمانی و روحانی جن کی ہستی محدود ہے یا کم از کم موجودات روحانی کا مخرج جو ہر ذات باری ہے یا یہ کہ جوہر ربانی اپنے ہی مظاہر یا اپنی ہی ترقی یافتہ شکل کے ذریعہ سے کائنات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔"

"جس کو اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ خدا نے کون و مکان کو نیست سے ہست کیا۔"

"جس کا یہ قول ہے کہ انسان اپنی ذاتی کوششوں سے بذریعہ ارتقائے جاری بالآخر حق و خیر کو دریافت کر سکتا ہے اور اسے ایسا کرنا چاہیے۔"

"جو کتب مقدسہ کو مٹرنٹ کی مقدس کونسل کی توضیح کے مطابق کلاً" یا جزاً" مقدس

اور مدار حجت شرعیہ ماننے سے انکار کرتا ہے یا ان کے الہامی ہونے سے منکر ہے۔"

"جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ عقل انسانی اس درجہ آزاد و مطلق العنان ہے کہ خدا اس سے پابندی ایمان کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔"

"جس کا یہ قول ہے کہ الہام ربانی خارجی شہادتوں کی بنا پر قرین اعتبار و مفید یقین نہیں ہو سکتا۔"

"جو یہ کہتا ہے کہ معجزے نہیں ظاہر کئے جا سکتے یا یقین کے ساتھ ان کا کبھی علم نہیں ہو سکتا اور مسیحیت کا سماوی الاصل ہونا ان کے ذریعہ سے کبھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔"

"جو یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ الہام ربانی عنصر اسرار سے عاری ہے اور جملہ معتقدات تربیت یافتہ عقل کی مدد سے سمجھ میں آ سکتے اور ثابت کئے جا سکتے ہیں۔"

"جس کا یہ اعتقاد ہے کہ علوم انسانی کی تحصیل میں اس درجہ آزادی سے کام لینا چاہئے کہ ہر شخص ان کے ادعا کو صحیح باور کرنے کا مجاز ہو خواہ ایسے ادعا الہامی تعلیم کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو۔"

"جو اس بات کا قائل ہے کہ ممکن ہے کہ ترقی سائنس کے دور میں ایک زمانہ ایسا آئے جب کہ کلیسا کے معتقدات کا مفہوم اس مفہوم سے بالکل ہی بدل جائے جس کے لحاظ سے کلیسا نے آج تک ان معتقدات کی تاویل کی ہے۔"

یہ فیصلہ جات و فتاویٰ جن عجیب و غریب بلکہ جن بے باکانہ و شوخ چشمانہ دعاوی پر متضمن ہیں انہیں تعلیم یافتہ اور روشن خیال کیتھولک جماعت استحسان و اطمینان کی نظر سے نہ دیکھ سکی۔ جرمن یونیورسٹیوں کی طرف سے تو ان دعاوی کی دل کھول کر مخالفت کی گئی اور جب ختم سال پر "ویٹیکن کونسل" کے احکام عام طور پر تسلیم کر لئے گئے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ احکام مبنی بر صحت و صداقت ہیں بلکہ محض مودبانہ متابعت کے اقتضا سے۔

بہت سے متقی و پرہیزگار کیتھولک علما کو اس تمام کارروائی اور اس کے نتائج پر کمال رنج و افسوس ہوا چنانچہ ایک فرانسیسی پادری ہیاستھ اپنے طبقہ کے مقتدا کو ایک خط ان الفاظ میں لکھتا ہے: "کلیسا کا جو ہمارا مبداء ایمان ہے انیسویں صدی کے تمدن سے جس کی ہم دینوی اولاد ہیں اور جس کے بہت سے فرائض و حقوق ہمارے ذمہ واجب الادا ہیں اس طور پر جدا کر دیا جانا ایک ایسا فعل ہے جس میں معصیت اور حماقت کی مساوی آمیزش پائی جاتی ہے اور میں اس افتراق کو بہت ہی قابل ملامت سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر لاطینی قوم میں عموماً" اور فرانس کی آبادی میں خصوصاً" تمدنی اخلاقی اور مذہبی بغاوت کی

آگ بھڑک اٹھی تو اس کی وجہ کیتھولک مذہب نہ ہو گا بلکہ کیتھولک مذہب کا طریقہ تاویل و طرز عمل ہو گا جس نے ایک مدت سے اس دین کی صورت مسخ کر رکھی ہے۔"

باوجودیکہ جناب پاپائے مقدس کو معصوم ہونے کا ادعا تھا جس کے بالفاظ دیگر یہ معنی تھے کہ آپ ہمہ داں و علام الغیوب ہیں پھر بھی آپ کی روح القدسی بصیرت جنگ فرانس و جرمنی کے نتیجہ کے متعلق پیش بینی نہ کر سکی۔ اگر آپ کو ملکہ نبوت عطا ہوا ہوتا اور غیب شناسی کی قابلیت آپ کے حصہ میں آئی ہوتی تو آپ پر اپنی کونسل کے اجتہادات کی غیرموزونی و موقع ناشناسی کی حقیقت کھل گئی ہوتی لیکن کہاں کی عصمت اور کہاں کی نبوت۔ یہاں تو مطلب سعدی کچھ اور ہی تھا۔ پاپا کی اس درخواست کو کہ اس کے دینوی اقتدار کے برقرار رکھنے کے لئے کچھ فوج بطور کمک بھیجی جائے شاہ جرمنی نے رد کر دیا۔ خارج الکلیسا شاہ اٹلی نے روما پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ پاپا نے جھنجلا کر یکم نومبر ۱۸۷۰ء کو ایک مکتوب عمومی صادر کیا جس کی تلخی اور ترشی آج کل کی بین الاقوامی مراسلت کے مہذب اور شائستہ لہجہ کے ساتھ نسبت تضاد رکھتی ہے۔ اس مکتوب میں جناب تقدس مآب نے دربار پیڈمانٹ کی کارروائی کو ہدف سہام مطاعن و ملاعن بناتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کارروائی کے بانی مبانی اس فریق کے مشورہ پر کاربند ہوئے ہیں جس کے لئے خسران اخروی مقدر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے کہ مابدولت حالت قید میں ہیں اور گروہ اشرار و شیاطین کے ساتھ کسی باب میں اتفاق نہیں کر سکتے۔ پھر اپنی مخالفین پر اخراج اکبر یعنی عدم شرکت کنیسہ کی حد اخیر جاری کرتے ہوئے سب و شتم اور تاوان و سزا کا انتہائی فتوی بھی صادر کیا ہے اور دوشیزہ مریم مادر خدا اور مرسلین مقدس پطرس و پولوس کی شفاعت کے خواستگار ہوئے ہیں۔

مختلف پراٹسٹنٹ فرقوں میں سے بعض نے مجلس اتحاد انجیلی کے نام سے ایک انجمن بغرض صلاح و مشورہ قائم کر لی تھی۔ اس مجلس کا آخری اجلاس ۱۸۷۳ء کے موسم خزاں میں بمقام نیویارک ہوا۔ اگرچہ اس موقع پر یورپ اور امریکہ کے پراٹسٹنٹ کلیساؤں کے بہت سے زاہد و متقی وکلا جمع ہوئے تھے لیکن وقعت وسطوت کے اعتبار سے اس مجلس کو اس عظیم الشان مجلس سے کوئی نسبت نہ تھی جس کا اجلاس کلیسائے سینٹ پیٹر واقع روما میں اس سے کچھ ہی دن پہلے منعقد ہو چکا تھا۔ مجلس اتحاد انجیلی اپنے ہزار سالہ شجرہ نسب کے مقدس تسلسل کا حوالہ نہ دے سکتی تھی اور اس حیثیت سے اپنے دعاوی نہ پیش کر سکتی تھی کہ گویا وہ تاجداروں اور تخت نشینوں کی سہیم و عدیل بلکہ ان سے بھی بالا و برتر ہے۔

ویٹیکن کونسل کی کارروائی کے ہر پہلو میں دانشمندانہ تدبر اور دنیوی حکمت عملی کی شان نظر آتی تھی لیکن مجلس اتحاد انجیلی کے پیش نظر جو مقاصد تھے وہ وضاحت اور تعین سے معرا تھے اور کوئی خاص غایت اس کے انعقاد کا نصب العین نہ تھی۔ اگرچہ اس مجلس کی خواہش یہ تو ضرور تھی کہ مختلف پراٹسٹنٹ کلیساؤں کا اتحاد زیادہ کامل و مکمل ہو جائے لیکن اسے قوی امید نہ تھی کہ یہ دل پذیر خواہش پوری ہو سکے گی۔ پراٹسٹنٹ کلیساؤں کے وجود میں آنے کا باعث نااتفاقی اور ان کے قیام کا مدار اختراق پر تھا۔ اس مجلس نے اسی اصول کو عملی طور پر ثابت کر کے دکھا دیا۔

پھر بھی مجلس اتحاد انجیلی کی کارروائی میں بعض نکتہ آموز و معنی خیز واقعات شامل ہیں یعنی اس نے اپنے اس دیرینہ حریف کو جس نے ابھی حال ہی میں واقعہ اصلاح کو مورد مطاعن ناروا و ملاعن ناسزا بنایا تھا نظرانداز کر کے ویٹیکن کونسل کی طرح اپنی نگاہ سائنس پر جما دی۔ سائنس کے ہیبت ناک نام کی آڑ میں اس کے سامنے گویا ایک ایسا مجہول الہیت دیو کھڑا تھا جو ہر ساعت بڑھ رہا تھا اور جس کی شکل نہایت ہی ڈراؤنی تھی۔ اس عظیم الجثہ و قوی ہیکل دیو سے خطاب کرتے وقت مجلس اتحاد انجیلی نے بعض دفعہ تو ایسے الفاظ استعمال کیئے جن سے تعلق و رواداری کی بو آتی تھی اور بعض دفعہ ایسا لہجہ اختیار کیا جو سراپا تعریض و تشنیع تھا۔

مجلس اتحاد کو یہ نظر نہ آیا کہ موجودہ سائنس اور اصلاح کیسے حقیقی ہی نہیں بلکہ توام بہنیں ہیں۔ بطن ارتقا میں ان کا ظہور ایک ہی وقت میں ہوا اور ان کی پیدائش کی ساعت بھی ایک ہی ہے۔ مجلس اتحاد نے یہ نہ دیکھا کہ اگرچہ متعارض و متخالف فرقوں کا متحد ہونا محال ہے لیکن سائنس ایک ایسا نقطہ اتصال ہے جہاں یہ سب جمع ہو سکتے ہیں اور ان کا اصلی و حقیقی فائدہ اسی میں ہے کہ سائنس کو بے اعتباری کی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے ساتھ مخلصانہ اتحاد قائم کریں۔

اب ہم کیتھولک مسیحیت کے دستور العقائد پر جس حیثیت سے کہ ویٹیکن کونسل نے ان عقائد کی تعریف و توضیح کی ہے کچھ خیالات ظاہر کرتے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک شے مختلف اشخاص کو ایک ہی حیثیت سے دکھائی دے تو ضرور ہے کہ اس پر ایک ہی پہلو سے نظر ڈالی جائے۔ جو مثال اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اہل مذہب اور اہل سائنس کے مقامات مشاہدہ بالکل الگ الگ ہیں۔ ایسی حالت میں دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ فریق

ثانی سے یہ خواہش ظاہر کرے کہ واقعات کی جو قطاریں صف بستہ اسے نظر آ رہی ہیں دوسرا فریق بھی ان کو ویسا ہی تسلیم کرے۔

دستور العقائد کو اس اصول موضوعہ کے اعتراف پر اصرار ہے کہ کلیسائے روما مامور من اللہ ہے اور مامور من الٰہی کا یہ خلعت بلامساہمت و مشارکت احدے خاص طور پر اسی کو عطا ہوا ہے۔ اس ربانی اقتدار کی بنا پر اس کی یہ خواہش ہے کہ تمام لوگ معقولات میں اس کی متابعت اختیار کر لیں اور تمام اقوام اپنی ملکی حکومت کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دیں۔

لیکن ایسے زبردست اور پرشکوہ دعوے کے لئے دلیل بھی ایسی ہی زبردست اور پرشکوہ ہونی چاہئے اور ثبوت ایسا ہونا چاہئے جس کے ماخذ کی صحت پر کسی کو اعتراض کی مجال نہ ہو سکے اور یہ ثبوت ضمنی و بالواسطہ و غیر متعلق نہ ہو بلکہ صریحی و موجہ و قاطع ہو۔ غرض یہ ثبوت ایسا ہو جس کی تردید ناممکن ہو اور جس کا توڑ نہ ہو سکے۔

لیکن کلیسا کا قول ہے کہ وہ اس بات کو جائز نہیں رکھ سکتا کہ اس کا دعوی عقل انسانی کی کسوٹی پر پرکھا جائے بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ دعوے بلاچوں و چرا و بے حیلہ و حجت فوراً" بطور اصول ایمان تسلیم کر لیا جائے۔

اگر یہ دعوی تسلیم کر لیا جائے تو اس کے باقی کے مطالبات بھی خواہ وہ کیسے ہی بے اندازہ کیوں نہ ہوں لامحالہ ماننے پڑیں گے۔

دستور العقائد نے عقل کا تخلیہ اور منقصت کرنے میں عجب خودفراموشی سے کام لیا ہے یعنی اول تو یہ دعوی کیا ہے کہ عقل امور مابہ البحث کا تصفیہ کرنے سے قاصر ہے اور اس کے بعد خود ہی ان امور کی تائید میں براہین و دلائل پیش کر کے عقل سے فیصلہ طلب کیا ہے۔ غرض دستور العقائد کیا ہے۔ ایک التجا نامہ ہے جس میں عقل سے بہ لجاجت یہ تمنا کی گئی ہے کہ اپنی تغلیط و تحمیق کر کے کسی طرح رومائی نصرانیت کو سچا ثابت کر دے۔

جب مذہب اور سائنس کے اختلافی پہلو اس درجہ متبائن و متغائر ہیں تو ناممکن ہے کہ دونوں میں حقیقت اشیا کے اظہار کے متعلق تطابق و توافق پیدا ہو سکے اور نہ اس وقت تک کوئی مشترک نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے جب تک کہ ان دونوں کا حکم عقل کو نہ قرار دیا جائے اور اس کا قول فیصل نہ سمجھا جائے۔

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں جن میں سے بعض رومائی نصرانیت سے زیادہ قدیم ہیں اور بعض کے پیرووں کی تعداد اس کے پیرووں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں

بجز اس کے کہ عقل سے استصواب کیا جائے ان میں سے ایک کو دوسرے پر کس طرح ترجیح دی جا سکتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں اپنا اپنا دعوے عقل کے دربار میں پیش کریں اور جو کچھ عقل فیصلہ کرے اسے صحیح تسلیم کریں۔

لیکن پاپا کی کونسل کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ وہ ایمان بالغیب کو عقل پر ترجیح دیتی ہے اور کہتی ہے کہ عقل و ایمان علم کی دو علیحدہ علیحدہ شاخیں ہیں۔ ایمان کا موضوع اسرار و غوامض ہیں اور عقل کا واقعات و حقائق۔ اس کا دعوے ہے کہ ایمان کو عقل پر فضیلت حاصل ہے اور جو طبیعتیں متذبذب متشکی ہیں ان کی تسکین وہ معجزوں اور پیشین گوئیوں کے ذریعہ سے کرنا چاہتی ہے۔

بخلاف اس کے سائنس ناقابل فہم امور سے روگردانی کر کے وکلف کے اس قول پر تکیہ کرتا ہے کہ "خدا انسان کو ان باتوں پر ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں کرتا جنہیں وہ سمجھ نہ سکے۔" اور چونکہ اس کا حریف کوئی قابل اطمینان صداقت نامہ جس سے اس کا اعتبار قائم ہو سکے نہیں پیش کر سکا لہٰذا سائنس یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا پاپائیت کی تاریخ یا پاپاؤں کے حالات زندگی سے کوئی ایسی کیفیت مترشح ہوتی ہے جس سے معقول طور پر اس امر کی تصدیق ہو سکے کہ پاپا مامور من اللہ ہیں یا معصوم ہیں یا آنکھیں بند کر کے ان کے کہے پر اس حیثیت سے عمل کرنا واجب ہے کہ وہ نائب خدا ہیں۔

دستور العقائد میں ایک نہایت ہی نمایاں لیکن ساتھ ہی متناقض خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اس نے عقل انسانی کے آگے طوعاً" و کرہاً" سر تسلیم خم کیا ہے۔ اس میں کیتھولک مذہب پر جہاں من حیث التثلیث نظر ڈال کر اس کا مبنی بر عقل ہونا ظاہر کیا گیا ہے وہاں عام مبتذل مذہب کی مکروہ شکل پر پردہ بھی ڈال دیا گیا ہے۔ اس پر الوہنندہ کون و مکان جناب باری کی صفات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں جن سے خدا کی شان جلالی و جمالی موزوں طور پر آشکارا ہوتی ہے لیکن اس قول کے اعادہ سے احتراز کیا گیا ہے کہ یہ خدائے قہار و قیوم جس کا رعب کائنات پر چھایا ہوا ہے ایک مادر خاکی کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو ایک یہودی نجار کی بیاہتا بی بی تھی اور اس کے بعد آسمان کی ملک ہو گئی۔ جس خدا کی تصویر اس میں کھینچی گئی ہے وہ قرون متوسط کا خدا نہیں ہے جو ملائکہ کے ایک گروہ سے گھرا ہوا اپنے سونے کے تخت پر جلوہ گستر ہے بلکہ فلسفہ کا خدا ہے۔ دستور العقائد میں نہ اقانیم ثلثہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ نہ مریم عذرا کے اس استحقاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسے معبود ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے بلکہ ضمناً" وکنایتہ اس استحقاق کی سختی سے نفی

کی گئی ہے۔ نہ عشائے ربانی یعنی پادری کے کیمیاوی عمل سے شراب اور روٹی کو خدا کے خون اور گوشت کی شکل میں بدلنے کا حوالہ دیا گیا ہے اور نہ اولیاؤں سے مرادیں مانگنے کے وجوب و حقیقت پر زور دیا گیا ہے۔ غرض اس کے ماتھے پر زمانہ موجودہ کے تخیل کی تقلید اور عقل انسانی کی ترقی کے آثار کا ٹیکا لگا ہوا ہے۔

ذات و صفات باری کی اس تشریح کے بعد دستور العقائد نے اس مسئلہ کی تلقین کی ہے کہ انتظام کائنات کیونکر چل رہا ہے۔ کلیسا کا دعویٰ ہے کہ اسے تمام مادی و اخلاقی حوادث پر ماوراء الطبیعی دسترس حاصل ہے۔ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے پادری یا تو اس قسیسی قوت کے زور سے جو ان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے اور یا آسمانی طاقتوں کو دعاؤں کے ذریعہ سے اپنا مددگار بنا کر واقعات آئندہ کو اپنی خواہش اور ارادہ کے سانچہ میں ڈھال سکتے ہیں۔ پاپائے اعظم کا ارادہ مصدر بست و کشاد ہے اور اسے حل و عقد کی پوری قدرت حاصل ہے۔ اس کا فیصلہ ناطق اور اس کا فرمان قضا تو اماں ہے۔ اس فیصلہ کی ناراضی سے کسی مجلس عمومیہ میں اپیل دائر کرنا اور اس طور پر گویا یہ ظاہر کرنا کہ کوئی دنیوی طاقت پاپا سے بھی اعلیٰ و ارفع ہو سکتی ہے بالکل ناجائز ہے۔ اس قسم کے اقتدارات پر ایک مطلق العنان اور غیر آئینی حکومت میں تو شاید اعتراض نہ ہو لیکن جس حکومت کا نظم و نسق قانون غیرمتغیر پر مبنی ہو اس میں ان کو مطلق دخل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دستور العقائد نہایت زور سے یہ دعویٰ پیش کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے نظم عالم میں مسلسل دست اندازیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کو ہرگز اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ واقعات قدرت میں ایک غیرممکن الاندفاع تواتر اور معاملات انسانی میں ایک ناقابل تغیر تسلسل پایا جاتا ہے۔

لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کے ہر حصہ میں نظام تمدن کی ترتیب یکساں نہیں پائی جاتی رہی؟ کیا انسانی جماعتوں کا نشوونما افراد کے نشوونما کے مشابہ نہیں ہے؟ کیا دونوں کو شباب بلوغ اور انحطاط کے مدارج نہیں طے کرنے پڑتے؟ کیا وہ شخص جس نے دنیا کے مختلف ممالک کی آبادیوں کی رفتار تمدن پر غور کیا ہے اور ان ایک سی حالتوں کو مشاہدہ کیا ہے جو اس تمدن کی ترقی کا باعث ہوئی ہیں صاف نہیں معلوم کر سکتا کہ یہ ارتقا پابند قانون ہے؟ پیرو کی قوم انکا اور فرماں روایان میکسیکو کے مذہبی خیالات اور ان فرماں رواؤں کے آداب و مراسم دربار وہی تھے جو ایک زمانہ میں یورپ میں پائے گئے۔ وہی تھے جو ایشیا میں پائے گئے۔ یعنی ان سب کا رجحان خیال ایک ہی طرف تھا۔ اور ان سب کی ترقی کے

دہارے کا رخ ایک ہی جانب تھا۔ شہد کی مکھیوں کے ایک انبوہ کو اگر ان کے وطن سے کسی دور دراز سرزمین میں منتقل کیا جائے تو ان کے چھتے کی ساخت اور ان کا طرز معاشرت اسی ایک طریقے کا پابند ہو گا جس کو مکھیوں کے دوسرے نامعلوم انبوہ اختیار کریں گے۔ یہی حال بے تعلق اور دور افتادہ انسانی جماعتوں کا ہے۔ خیال اور فعل کا یہ تعلق و تواتر اس درجہ غیر متغیر ہے کہ بعض فلاسفہ تاریخ ایشیا کی مثالوں کو یورپ پر منطبق کر کے بلا تامل یہ دعوی پیش کرنے کو تیار ہوں گے کہ اگر اسقف روما ہو اور چند صدیاں ہوں تو ایک غیر خاطی پاپا خودبخود پیدا ہو جائے گا اور اگر ایک غیر خاطی پاپا پر کچھ اور مدت مستزاد کی جائے تو لامائیت نمودار ہو گی وہ لامائیت جسے ایشیا کبھی کا حاصل کر چکا ہے۔

موجودات روحانی و جسمانی کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے دستور العقائد نے اپنے اقوال کو ان لوگوں پر تبرا کرنے سے شان تاکید و تاسیس عطا کی ہے جو مسئلہ انفصال کے قائل ہوں یعنی یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ مظاہر قدرت محض ذات باری کے ہیں۔ دستور العقائد کا مسودہ مرتب کرنے والوں نے ان عقائد کی تکفیر کرنے کو تو کر دی لیکن جو مشکل اس مرحلہ میں انہیں درپیش تھی وہ ایسی نہ تھی جس کا باسانی مقابلہ کیا جا سکے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ ان پرانے یا نئے زبردست خیالات کی صفیں ان کے مقابل معرکہ آرا نہ ہوتیں جو موجودہ زمانہ میں ارباب فکر و دانش پر اپنا قوی اثر ڈال رہے ہیں۔ اصول بقا و تناسب قوت کا منطقی نتیجہ مشرق کے فرسودہ و پیش پا افتادہ مسئلہ انفصال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور مسئلہ ارتقا و مسئلہ نشوونما علی سبیل التدرج اس عقیدے کی بیخ کنی کر رہے ہیں کہ موالید کی پیدائش وقتاً" فوقتاً" عمل میں آئی۔ مسئلہ اول الذکر اس اصولی نکتہ پر مبنی ہے کہ کائنات میں قوت کی مقدار غیر متغیر ہے۔ اگرچہ یہ مقدار گھٹ بڑھ نہیں سکتی لیکن ان اشکال کا جن کے ذریعہ سے یہ قوت اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے ایک دوسری میں استحالہ ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اس نظریہ کو سائنس نے کامل اور بدیہی طور پر ثابت نہیں کیا لیکن جو دلائل اس کی تائید میں پیش کئے گئے ہیں وہ کثیر التعداد ہونے کے علاوہ اس درجہ قوی ہیں کہ اس کے مستحکم و مستند ہونے کا خواہی نخواہی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر ایشیائی مسئلہ انفصال و انجذاب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو اس مہتم بالشان نظریہ کے ساتھ توافق ہے۔ اس مسئلہ کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ جب انسانی ہستی صلب سے بطن میں منتقل ہوتی ہے تو خدا ایک نئی روح کو عدم سے وجود میں لا کر اس میں پھونک دیتا ہے بلکہ وہ اس بات کے معتقد ہیں کہ عقل ربانی یا عقل کل پہلے سے موجود ہے اس کا ایک حصہ انسان کے جسم میں ڈال دیا جاتا ہے اور جب اس کی زندگی کے دن

پورے ہو جاتے ہیں تو یہ حصہ اسی سرچشمہ حیات میں واپس جا کر مل جاتا ہے جس سے نکلا تھا۔ دستور العقائد کے مصنفین کے نزدیک یہ عقائد فاسد ہیں اور وہ ان کی پیروی کی یہ کہہ کر ممانعت کرتے ہیں کہ ایسے عقائد رکھنے والا شخص جتلائے عذاب ابدی ہو گا۔

علی ہذا القیاس انہوں نے ارتقا اور نشوونمائے جاری کے مسائل کی بہ یک کشش قلم یہ کہہ کر تردید کر دی ہے کہ کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ موالید کی پیدائش وقتاً" فوقتاً" ہوئی۔ یہ مسئلہ کہ ہر جاندار شکل کسی شکل سابقہ کا ماحصل ہے سائنس کی رو سے قوت والے مسئلہ کی بہ نسبت زیادہ مدلل و مبرہن ہے اور جو اضافے حال میں اس پر ہوئے ہیں ان کا خواہ کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو لیکن غالباً" اصولی طور پر اس کی صحت اور درستی میں کوئی کلام نہیں۔

واقعہ اصلاح پر سب دشتم کی بوچھاڑ کرنے سے کلیسا نے اپنے ان خیالات کو گویا عملی لباس پہنا دیا ہے کہ عقل تابع ایمان ہے۔ اس کی نظروں میں اصلاح ایک ملحدانہ بدعت ہے جس نے لوگوں کے لئے ہمہ اوست دہریت اور مادیت کا دام خسران بچھا رکھا ہے اور جو اس بنیاد ہی کو ڈھا رہی ہے جس پر تمدن کا دارومدار ہے۔ اسی لئے اس نے ان شوخ اور بے چین طبیعت کے لوگوں" کی بے راہ روی کا سدباب کرنا چاہا جنہوں نے بہ تقلید لوتھر یہ رائے قائم کی ہے کہ "ہر شخص کو کتب مقدسہ کی تفسیر و تاویل کا ذاتی حق حاصل ہے۔" اس کا یہ دعویٰ ہے کہ پراٹسٹنٹوں کو کیتھولکوں کے برابر پولیٹکل حقوق نہ ملنے چاہئیں اور جو شخص اس مساوات کا ادعا کرتا ہے وہ خبیث اور گمراہ ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ پراٹسٹنٹوں سے بہ جبر و تشدد پیش آنا اور ان کا استیصال کرنا ایک مقدس فرض ہے اور انہیں مدارس قائم کرنے کی اجازت دینا ایک قابل نفرین فعل ہے۔ پاپائے گریگوری شانزدہم نے آزادی ایمان کو ایک مجنونانہ حماقت سے تعبیر کیا اور اخبارات کی آزادی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ اس سے بڑھ کر نابکار اور ناشدنی حرکت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

لیکن دریائے ٹائبر کے کنارے جو تقدس مآب بزرگوار غیب دانی کی کرسی پر جلوہ افروز ہیں ان کی ملہم من اللہی و عصمت عن الخطا کا قائل وہ شخص ہو تو کیوں کر ہو جس کو معلوم ہے کہ پاپاؤں نے ہمیشہ ایک دوسرے کی تغلیط و تکذیب کی ہے اور پاپا اگر مجالس عمومیہ کے منہ آئے ہیں تو مجالس عمومیہ نے پاپاؤں کی خبر لی ہے اور جس سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے پاپائے سکسٹس خامس کی بائبل میں اتنی مسلمہ غلطیاں تھیں (کوئی دو ہزار کے قریب ہوں گی) کہ اس نسخہ کے مرتب کرنے والوں کو اس کی اشاعت خود روک دینی پڑی؟ کس طرح ممکن ہے کہ ارباب کلیسا ان حقائق کو "فریب وہ غلطیاں" قرار دیں کہ زمین

کروی الشکل ہے۔ نظام شمسی کا ایک رکن ہے اپنے محور پر گھومتی ہے اور آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے؟ وہ اس واقعہ سے کیوں کر انکار کر سکتے ہیں کہ زمین کے حصہ متقابل پر بھی انسان آباد ہیں اور ہماری دنیا کے علاوہ اور بھی دنیائیں موجود ہیں؟ ان دعاوی کو وہ کن دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا عدم سے وجود میں لائی گئی اور ایک ہفتہ کی مدت میں اس مکمل شکل میں جو ہمارے پیش نظر ہے بنائی گئی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس کے اجزا ایسے ناقص العقل ہیں کہ خدا کو ان نقائص کی تلافی و اصلاح کے لئے مسلسل دست اندازی و مداخلت کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔

جب پادری سائنس کو حکم دیتے ہیں کہ اپنے عقلی معتقدات کی سپر پھینک دے تو کیا سائنس کو ان سے ان الفاظ میں مخاطب ہونے کا حق نہیں ہے کہ ذرا اپنے تاریخی گریبان میں حافظہ کا منہ ڈال کر تو دیکھیں؟ جب زمین کی شکل اور بہشت و دوزخ کے مواقع کی بحث چھڑی تو پادریوں ہی کو نیچا دیکھنا پڑا۔ ان کا دعوی تھا کہ زمین ایک مسطح میدان ہے اور آسمان بہشت کا صحن ہے جس کی راہ سے انسان بہشت میں داخل ہوتے ہوئے بکرات و مرات دیکھے گئے ہیں لیکن دعوی غلط اور باطل ثابت ہوا۔ زمین کا کروی الشکل ہونا علم ہیئت کے واقعات اور میگیلن کے جہاز کے سفر سے بہ دلائل قاطع ثابت ہو گیا۔ اس کے بعد پادریوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین کائنات کا مرکزی جسم ہے۔ تمام اجرام سماوی اس کے تابع ہیں اور یہ خدا کی عنایات و افضال کی مورد خاص ہے۔ جب اس خیال کی بھی قلعی کھل گئی تو انہوں نے اس ادعا کی آڑ میں جا پناہ لی کی زمین غیر متحرک ہے اور آفتاب و ثوابت جو بظاہر اس کے گرد حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حقیقت میں بھی گردش کرتے ہیں۔ لیکن جب دوربین کی ایجاد نے اس بوسیدہ طلسم کو بھی توڑ دیا تو پادریوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نظام شمسی کی حرکات کا دارومدار مداخلت ربانی پر ہے اس قول کو نیوٹن کی کتاب "پر نسپیا" نے یہ ثبوت دے کر جھٹلایا کہ نظام شمسی کے ارکان کی حرکتیں قانون غیر ممکن التغییر کی تابع ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ دعوی پیش کیا کہ زمین اور تمام اجرام سماوی آج سے کوئی چھ ہزار سال پہلے پیدا کئے گئے اور چھ دن میں نظام قدرت مرتب کر دیا گیا اور نباتات و حیوانات اور ان کی مختلف نوعیں روئے زمین پر آباد کر دی گئیں۔

جب شہادت مخالف کی گٹھڑی کا وزن اس قدر بڑھ گیا کہ پادریوں کی منطق کی کمر دہری ہو گئی تو انہوں نے بدرجہ مجبوری تاویل کا پہلو اختیار کیا اور دنوں کو قرنوں میں تحویل کر دیا لیکن یہ حیلہ بھی کارگر نہ ہوا۔ چھ قرنوں اور چھ خاص پیدائشوں کا خیال اس اکتشاف کے سامنے نہ ٹھہر سکا کہ حیوانات کی نوعین بتدریج ایک دور میں نمودار ہو کر دوسرے دور میں

منتہائے بلوغ کو پہنچیں اور تیسرے دور میں رفتہ رفتہ فنا ہو گئیں۔ اس انطباق قرون وادوار کا تواتر نہ صرف پیدائش بلکہ پیدائش مکرر کا متقاضی ہے۔ پادریوں کو اس قول پر اصرار تھا کہ دنیا میں ایک ہمہ گیر طوفان آیا تھا جس کی موجیں اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چھا گئی تھیں اور یہ پانی ایک تند ہوا کے چلنے سے خشک ہوا تھا۔ جب کرہ ہوا اور سمندر کے عمق کے صحیح حالات معلوم ہوئے اور عمل تبخیر کا بھی ٹھیک اندازہ ہو گیا تو طوفان والا بیان بھی ڈھکوسلا ثابت ہوا۔ نسل انسانی کے اولین مورثوں کے متعلق پادریوں کا یہ بیان تھا کہ خدا نے انہیں جسمانی و دماغی ہر اعتبار سے کامل بنایا لیکن بعد میں وہ اس ذوق کمال سے نیچے گر پڑے۔ اس بیان کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسرے بیانات کا ہوا تھا۔ چنانچہ اب پادریوں کو یہ فکر پڑی ہوئی ہے کہ زمانہ قبل تاریخ کے انسان کی وحشیانہ حالت کے ثبوت میں شہادت کا جو روزافزوں انبار جمع ہو رہا ہے اس سے عہدہ برا ہونے کی کیا سبیل اختیار کی جائے۔

جب حالت یہ ہو تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہے کہ ان لوگوں کی تعداد جو کلیسا کے معتقدات کو ہزلیات و شطحیات سمجھنے لگے ہیں روز بروز بڑھتی جائے؟ کیوں کر ممکن ہے کہ اس مذہب کو جو دیکھی اور بوجھی ہوئی چیزوں کے متعلق ایسی فاش غلطیوں میں مبتلا ہے ان دیکھی اور ان بوجھی حقیقتوں کا نکتہ آموز تسلیم کر لیا جائے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب جو جسمانیات میں ناکامیاب ہوا ہے اخلاقیات اور روحانیات میں کامیابی کے ساتھ مقتدا و پیشوا ہو سکے؟ کلیسا نے سائنس اور مذہب کے ان اختلافات کا تخلیہ ازراہ استحقار یہ کہہ کر کرنا چاہا ہے کہ "انہیں فریب نظر سمجھنا چاہئے"۔ "یہ بیہودہ حیلے ہیں۔" "یہ جہل علم نما کے مصنوعی کرشمے ہیں۔" (یہ غلطیاں ہیں جنھوں نے اپنے چہرے پر حقیقت کا نظر فریب غازہ مل رکھا ہے۔" لیکن کہیں اس قسم کے جلے کٹے فقروں سے بھی کام چلا ہے۔ سائنس کے حقائق وہ نڈر اور عادل گواہ ہیں جو قسیسیت کے دعوے عصمت کا بلاخوف تردید ابطال کر رہے ہیں اور پادریوں کی آنکھوں کے سامنے ان کی جہالت اور کو رسوادی کا مجسمہ پیش کر رہے ہیں۔

اتنی بہت سی خطاؤں اور لغزشوں کے ارتکاب کی قصوروار ٹھہر کر اب پاپائیت میں اتنا دم نہیں کہ بیان صفائی پیش کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے اب یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ جہاں سائنس کا نام آیا اور وہ ایسی انجان بنی کہ گویا اس سے کبھی کی جان پہچان ہی نہ تھی اور طرہ یہ ہے کہ اس پر بھی دیدہ دلیری کی شان اسی آن بان کے ساتھ قائم ہے۔ باوجودیکہ واقعات کی قطاریں اس کی تغلیط۔ تسفید۔ تکذیب و تحمیق کرنے کے لئے مقابل

میں صف بستہ کھڑی ہیں پھر بھی وہ برابر اپنی ضد پر قائم ہے اور معصوم ہونے کی وہی ایک بڑ ہانکے جاتی ہے۔

لیکن پاپا کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسے بجز ان حقوق کے جنہیں وہ ازروئے عقل ثابت کر سکے اور کوئی حقوق نہیں عطا کئے جا سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مذہبی معاملات میں تو معصوم ہونے کا دعوی کرے اور علمی امور میں جب عصمت کا ذکر آئے تو ہاتھ کانوں پر دھرے۔ عصمت عن الخطا جملہ امور پر حاوی ہے۔ اس سے مراد ہمہ دانی و ہمہ شناسی ہے۔ اگر دینیات و الہیات پر اس کا اطلاق صحت کے ساتھ ہو سکتا ہے تو سائنس پر بھی ہونا چاہئے۔ مگر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ پاپائیت کی مسلمہ اجتہادی خطاؤں کو اس کے دعوائے عصمت کے ساتھ تطبیق دی جا سکے۔

جب پاپا کا معصوم اور خطا سے مبرا ہونا ایک دعوائے بلا دلیل و قیاس بے بنیاد ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کے اس مطالبہ کو رد نہ کر دیا جائے کہ پاپائی عقائد کی اشاعت و نفاذ میں جبر کا استعمال روا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس قول کی سختی کے ساتھ تردید نہ کی جائے کہ بوجہ بداعتقادی کے جس کی زمانہ میں عام ہوا چل رہی ہے محکمہ احتساب عقائد کا قیام لازمی و ضروری ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ فطرت انسانی کی دہائی دے کر اس محکمہ کی وحشیانہ سفاکی اور جابرانہ تخویف سے علی روس الاشہاد بیزاری کا اظہار نہ کیا جائے؟ کیا ایمان یا ضمیر یا ممیزہ کو تمام دنیا کے مقابلہ میں ناقابل انتقال حقوق حاصل نہیں ہیں؟

کیتھولک مذہب اور زمانہ کے رجحان خیال کے درمیان ایک ایسا ناقابل عبور دریا حائل ہو گیا ہے جس کا پاٹ لحظہ بلحظہ زیادہ چوڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس مذہب کو اس امر پر اصرار ہے کہ کورانہ ایمان عقل پر ترجیح رکھتا ہے اور واقعات کے مقابلہ میں اسرار و اوہام زیادہ وقعت کے قابل ہیں۔ اس کو یہ دعوی ہے کہ حقائق فطرت کے کشاف اور حقائق الہامی کے معتبر ہونے کا حق بجز اس کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ وہ کتب مقدسہ کے متعلق اس رائے کے تسلیم کرنے سے اعراض کرتا ہے جو موجودہ فن تنقید کے اصول کی رو سے ظاہر کی گئی ہو اور حکم دیتا ہے کہ بائبل کی آیات کے وہی معانی صحیح سمجھے جائیں جو مفسرین ٹرنٹ نے بیان کئے ہیں۔ وہ آزادی ذہنیت اور دستور و آئین کی نسبت اپنی نفرت کا اظہار علانیہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان شخصوں کی خطا ناقابل درگزر ہے جو پاپا اور تمدن جدید کی باہمی مصالحت کو قرین امکان یا قرین صواب تصور کرتے ہیں۔

لیکن عقل جو آج کل کے تمدن کی علم بردار ہے پوچھتی ہے کہ اسے دقیانوسی پادریوں کی متبدیانہ خامہ فرسائی کا پابند کیوں بنایا جاتا ہے اور ان جاہل اور نکتہ ناشناس لوگوں کی

بادخوانی کے صحیح تسلیم کرنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے جن کے انجیلی کارنامے کلیسا کے قرون اولی سے تعلق رکھتے ہیں؟ عقل کہتی ہے کہ اسے تقلید جامد اور اندھا دھند ایمان میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی بلکہ وہ ایسے ایمان کو بنظر اشتباہ دیکھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ سچ اور جھوٹ کے امتیاز کے لئے قرین وثوق ہونے کا جو عام قاعدہ اس وقت مروج ہے اس میں اور زیادہ اصلاح ہو جائے۔ وہ ان مصنوعی روایتوں اور فرضی حکایتوں کو صحیح مان لینا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتی جو محض پادریوں کی مقصد برآری کے لئے تصنیف کر لی گئی ہیں۔ وہ اس دلیل کو کہ چونکہ یہ قصص و روایات زمانہ قدیم سے چلے آتے ہیں لہٰذا ضرور صحیح ہیں باور کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں پاتی اس لئے کہ اگر قدامت ہی معیار صحت ہو تو کلیسا کی روایات کے مقابلہ میں بت پرستی کی روایات بہت زیادہ قدیم ہیں۔ خود کلیسا کی درازی عمر کی وجہ ربانی حفاظت یا سماوی تائید نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے موم کی ناک بن کر اپنے آپ کو زمانہ کے ہاتھ کے حوالے کر دیا اور جدھر کی ہوا چلتی دیکھی ادھر کا رخ اختیار کر لیا۔ بدھ مذہب نصرانیت سے بھی بقدر کئی صدیوں کے زیادہ قائم ہے۔ تو کیا اس قدامت سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ اس کی روایات بمقابلہ نصرانیت کی روایات کے زیادہ صحیح اور زیادہ معتبر ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ کلیسا اس الزام سے اپنے آپ کو کسی طرح بری نہیں کر سکتا کہ اس نے اکثر موقعوں پر تاریخ میں دیدہ و دانستہ تدقین و تصرف سے کام لیا اور تاریخی واقعات کا اخفا عمداً" روا رکھا۔ اگرچہ کلیسا کا اخلاق اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد اگر مقدس ہو تو اس کی تکمیل کے ذرائع بھی خواہ وہ فی الحقیقت کیسے ہی ناروا ہوں پاک ہو جاتے ہیں لیکن جو صورت یہاں بیان کی گئی ہے اس پر یہ اخلاقی مقولہ صادق نہیں آتا۔

غرض نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ رومائی نصرانیت اور سائنس کے پیروان دونوں کے اجتماع کو اجتماع ضدین سمجھنے لگے ہیں۔ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں یہ ضرور ہے کہ ایک کی جگہ دوسرا لے لے۔ بنی نوع انسان کو چاہئے کہ دونوں میں سے جس کو چاہیں پسند کر لیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں اس پر متولی ہوں۔

کیتھولک نصرانیت اور سائنس کو اس جانفرسا زور آزمائی میں مصروف چھوڑ کر جب ہم پراٹسٹنٹ نصرانیت اور سائنس کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مصالحت نہ صرف ممکن ہے بلکہ آسانی سے ہو سکتی ہے بشرطیکہ پراٹسٹنٹ کلیساؤں کو اس اصول پر عمل کرنے کی توفیق ہو جو ان کو لوتھر سے ترکہ میں ملا ہے اور جسے کئی سال کی جنگ و جدل نے موسس و مرصوص کر دیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ

ہر شخص کتب مقدسہ کے مفسر ہونے کے اعتبار سے اپنا مجتہد آپ ہے۔ یہ اصول حریت عقلی کا سنگ بنیاد تھا۔ لیکن اگر آیات الہامی میں اجتہاد شخصی کو دخل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ صحیفہ فطرت کے معانی سمجھنے میں اس حق سے کام نہ لیا جا سکے۔ جو غلط فہمیاں اب تک واقع ہوئی ہیں ان میں فطرت انسانی کی کمزوری کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ واقعہ اصلاح کنیسہ کے بعد سالہا سال تک اگر لوگوں نے اس علت غائی کو جو محرک اصلاح ہوئی تھی پوری طرح نہ سمجھا اور ہمیشہ اس پر عمل نہیں کیا تو وہ قابل درگزر ہیں۔ کیلون نے جب سرویٹس کو زندہ آگ میں جلوا دیا تو وہ اصول جنہوں نے اس وحشیانہ کارروائی پر اسے آمادہ کیا اصلاح کے سکھائے ہوئے نہ تھے بلکہ کیتھولک نصرانیت سے اسے ترکہ میں پہنچے تھے اور وہ ان کی قید سے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد نہ کر سکا تھا۔ علی ہذا القیاس ان ذی اثر پراٹسٹنٹ پادریوں پر بھی یہی قول صادق آتا ہے جنہوں نے علمائے طبیعین کو کافر و زندیق ٹھہرایا۔ کیتھولک نصرانیت اگر سائنس کے ساتھ صلح کرنی چاہے تو اس کے رستہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں موجود ہیں جو شاید رفع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن پراٹسٹنٹ نصرانیت کا ملاپ سائنس کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ایک کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کینہ و عناد اور دشمنی و عداوت کی منازل ہفت خواں طے کرنی پڑیں گی۔ دوسرے کو صرف وہ دوستی تازہ کرنی پڑے گی جس میں غلط فہمی کی وجہ سے فرق آ گیا ہے۔[1]

لیکن وہ عقلی خطرہ جو مسیحی دنیا میں بہت جلد نمودار ہوا چاہتا ہے خواہ ابتدا میں کیسے ہی نتائج کیوں نہ پیدا کرے لیکن اس میں تو شک نہیں کہ موجودہ نسل کا اس خطرناک طور پر چپکے چپکے مذہب سے قطع تعلق کرتے جانا ایک دن پولیٹکل رنگ لا کر رہے گا۔ فرانس اپنی رعایا کے طبقہ سافل کے رومائی عقائد میں زیارات کی سرپرستی معجزات و کرامات کے صدور اور آسمانی نشانات کی نمائش کے ذریعہ سے ازسرنو جان ڈال رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ طرز عمل بے معنی نہیں ہے۔ اس کے مقدر کا لکھا ان مہملات میں حصہ لینے پر اسے مجبور کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی جبین عقل عرق انفعال سے تر ہو جاتی ہے۔ جرمنی نے قصد کر لیا ہے کہ اطالوی عنصر کو خارج کر کے وہ عملی حکومت کی قید سے آزاد ہو جائے اور اس اصلاح کو جسے تین سو سال قبل اس نے ناتمام چھوڑا تھا تکمیل کے درجہ کو پہنچائے۔ یہ قصد بھی ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ وہ وقت قریب آ گیا ہے کہ انسان جامد و غیر متحرک مذہب اور متحرک و متزائد سائنس میں سے جس کو چاہے اختیار کرے۔ یا تو مذہب کا دامن پکڑ لے جو سرمایہ تسکین ہونے کے اعتبار سے محض قرون متوسطہ کے اوہام کا مجموعہ رہ گیا ہے اور یا سائنس کے پیچھے ہو لے جو راہ زندگی کے قدم قدم پر برکتوں اور رحمتوں کے

موتی برساتا جاتا ہے انسان کو معاش کی معراج پر پہنچا رہا ہے اور بنی نوع انسان میں اتحاد کی روح پھونک رہا ہے اس کی فتوحات محکم و دیرپا ہیں۔ لیکن اس کامیابی کا نور جو کیتھولک نصرانیت کے ماتھے پر فلسفہ کے ٹکرانے کے بعد چمک سکتا ہے زیادہ سے زیادہ اس شہاب ثاقب کے آنی و عارضی اور بے سود دیے معرف نور کے مشابہ ہے جو آسمان سے زمین پر آ گرتا ہے۔

اگرچہ گائیزو کا یہ قول کہ کلیسا نے ہمیشہ جبر اور مطلق العنانی کا ساتھ دیا ہے بالکل سچ ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی حکمت عملی کی باگ سیاسی ضرورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ کلیسا جو کچھ کرتا ہے انیس صدیوں کے متفقہ دباؤ سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔ اس کے افعال میں تو شان مجبوری نظر آتی ہے ہی لیکن اس کی زندگی میں بھی اس قانون کی جھلک دکھائی دے رہی ہے جس کا عمل آج تک نہ ٹلا ہے نہ ٹلے گا یعنی پاپائیت کا بھی وہی حشر ہو رہا ہے جو ہر متنفس کا ہوتا ہے۔ اس نے اول شیر خوارگی و طفولیت کا مرحلہ طے کیا۔ اس کے بعد سن رشدہ و بلوغ کی منزل میں قدم رکھا اور جب جوش شباب کے ساتھ اس کی زندگی کا مقصد بھی ختم ہو چکا تو ضرور ہوا کہ یہ بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو اور سال خوردہ و ناتواں بڈھوں کی طرح اس کا مزاج چڑچڑا ہو جائے۔ اس کی جوانی تو پلٹ کر آنے سے رہی۔ باقی رہا اس کی یادگاروں کا اثر سو وہ البتہ قائم رہے گا۔ جس طرح بت پرست روما نے اپنا رخصتی سایہ سلطنت روما پر ڈال کر اس کی تخیل کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا اسی طرح مسیحی روما اپنا آخری سایہ یورپ پر ڈال کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

کیا تمدن جدید اس ترقی کے عہد سے دست بردار اور کنارہ کش ہونے کے لئے رضامند ہو گا جس نے اس کی قوتوں اور خوشیوں میں اتنا بڑا اضافہ کیا ہے؟ کیا تمدن جدید رجعت قہقری کر کے قرون متوسطہ کی نیم وحشیانہ جہالت و اوہام پرستی کے دور کی طرف عود کرنے پر آمادہ ہو گا؟ کیا تمدن جدید اس طاقت کا حلقہ بگوش بننا پسند کرے گا جو اگرچہ ملہم من اللہ ہونے کی مدعی ہے لیکن کوئی صداقت نامہ ایسا نہیں پیش کر سکتی جس سے اس کا دعوی لائق اعتبار سمجھا جا سکے۔ وہ طاقت جس نے صدہا سال تک یورپ کو جمود کی زنجیروں میں جکڑے رکھا ہے اور ہر اس کوشش کو جو ترقی کے لئے کی گئی ہے یا تو آب آہن آہن میں ڈبو دیا ہے یا شعلہ آتش میں جلا دیا ہے۔ وہ طاقت جو عقل و تمیز اور فہم و شعور سے اپنا مرتبہ اونچا سمجھتی ہے وہ طاقت جو حریت خیال اور آزادی تمدن سے متنفر ہونے کا اعلان علی روس الاشہاد کرتی ہے۔ وہ طاقت جو اپنے اس ارادہ کو نہیں چھپاتی کہ موقع پاتے ہی ان میں سے

ایک کا گلا گھونٹ ڈالے گی اور دوسرے کو سولی پر لٹکا دے گی۔ وہ طاقت جس کے نزدیک یہ عقیدہ مہلک اور مجنونانہ ہے کہ آزادی ایمان و آزادی عبادت کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ وہ طاقت جو مہذب و متمدن سلطنتوں میں قانون کے ذریعہ سے اس حق کے نافذ کئے جانے کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ وہ طاقت جو ازراہ غایت استحقار اس اصول کی نفی کرتی ہے کہ زبان خلق کو جو نقارہ خدا ہے ضرور ہے کہ قانون کی شکل اختیار کرے۔ وہ طاقت جو مذہبی معاملات میں ذاتی رائے کا حق ہر شخص سے چھیننے پر تلی ہوئی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ لوگوں کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ جو کچھ کلیسا کہہ دے اس پر ایمان لے آئیں اور جو حکم دے اس کی تعمیل بلاچون و چرا کریں۔ وہ طاقت جو کسی دنیوی حکومت کو کلیسا کے اقتدارات کی تحدید اور اس کے حقوق کی تعیین کا مجاز نہیں سمجھتی۔ وہ طاقت جو صاف الفاظ میں کہتی ہے کہ نافرمانبرداروں کو تعمیل حکم پر طوعاً" و کرہاً" مجبور کرنا اس کے لئے نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ ایسا ضرور کرے گی۔ وہ طاقت جو گھر کی پاک چاردیواری کا بھی ادب نہیں کرتی اور جو شخص اس کی نظروں میں مشتبہ ہو اس کی بی بی بیٹوں اور نوکروں چاکروں کو بذریعہ اعتراف سری اس کا جاسوس و مخبر بناتی ہے۔ وہ طاقت جو بلا الزام لگانے والے کے مواجہ کے اس پر مقدمہ چلاتی ہے اور اسے شکنجہ میں کھینچ کر خود اپنے ہی خلاف شہادت دینے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ طاقت جو والدین کے اس حق کو غصب کرتی ہے کہ وہ اس کے کلیسا سے باہر اپنی اولاد کو تعلیم دلا سکتے ہیں اور بر سبیل اصرار کہتی ہے کہ لوگوں کی خانگی زندگی کی نگرانی اور معاملات نکاح و طلاق کا انضباط اسی سے متعلق ہے۔ وہ طاقت جو ان لوگوں کو ڈھیٹھ اور دیدہ دلیر کہہ کر پکارتی ہے جو کلیسا کے اقتدار کو حکومت کے اقتدار کے تابع کرنا چاہیں یا جو کلیسا کو حکومت سے علیحدہ کرنے کی خواہشمند ہوں۔ وہ طاقت جس کو رواداری و مسالمت کے نام سے چڑ ہے اور جس کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر ملک میں عبادت کے دوسرے طریقوں کو موقوف کر کے صرف کیتھولک مذہب ہی کو ملکی مذہب ہونے کا حق حاصل ہے۔ وہ طاقت جو یہ مطالبہ کرتی ہے کہ تمام وہ قوانین جو اس کے اغراض و مقاصد کی راہ میں حائل ہوں منسوخ کر دیئے جائیں اور جب یہ مطالبہ منظور نہیں ہوتا تو تمام اپنے پیروؤں کو ان قوانین کی خلاف ورزی کا حکم دیتی ہے؟

چونکہ اس طاقت کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ کوئی کرامت یا معجزہ جس سے اس کی مطلب برآری ہو سکے اس سے صادر نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ بلا تامل حکومتوں کے خلاف سازشیں کر کے محرک نقض امن ہوتی ہے اور اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے جبروتشدد کی

قوتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرتی ہے۔

اس قسم کے دعاوی اور اس طرح کے مطالبات کے معنی یہ ہیں کہ تمدن جدید کے خرمن میں سرکشی و بغاوت کی چنگاری ڈال دی جائے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ تہذیب و شائستگی کا قصر منہدم کر دیا جائے خواہ اس کے نیچے کتنی ہی قومیں کیوں نہ دب جائیں اور کیسا ہی بڑا نقصان دنیا کو کیوں نہ پہنچ جائے۔ اگر لوگ ان مطالبات کو بلاچون و چرا تسلیم کرلیں تو ہم سمجھیں گے کہ وہ حقیقت میں غلام ہیں۔

جو معرکہ پیش آنے والا ہے اس کا نتیجہ ارباب عقل سلیم سے مخفی نہیں۔ ہر وہ قوت جس کا دارومدار جھوٹ اور دھوکے پر ہے مغلوب ہو جائے گی۔ ہر اس نظام کو جو تلبیس کا مرکز اور فریب دہی کا مصدر ہے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ اسے قائم رہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ ایمان کو عقل کے دربار میں حاضر ہو کر جوابدہی کرنی پڑی گی۔ اوہام و اسرار کو اپنی مسند واقعات و حقائق کے لئے خالی کرنی ہو گی۔ مذہب کو اس خودمختارانہ و تحکمانہ حیثیت سے دست کش ہونا پڑے گا جو اس نے ایک مدت مدید سے بمقابلہ سائنس اختیار کئے رکھی ہے۔ آزادی خیال کا علم بلند ہو کر رہے گا۔ پادریوں کو ان حدود کے اندر رہنے کا سبق سیکھنا ہو گا جو انہوں نے اپنے لئے اختیار کی ہیں اور فلاسفہ پر ظلم و تعدی کرنے سے باز آنا ہو گا اس لئے کہ فلاسفہ اپنی روز افزوں قوت کے بھروسے اور اپنی نیک نیتی کے بل پر آئندہ اپنے حریفوں کی مزاحمت اور دست اندازی کے روادار نہ ہوں گے۔ آج سے دو ہزار تین سو سال پہلے عزرا نے بابل کی بید مجنوں سے چھائی ہوئی ندیوں کے کنارے بیٹھ کر جو جملہ لکھا تھا اس کی صداقت میں آج بھی کلام نہیں: "حق ہمیشہ برقرار رہتا ہے اور اس کی قوت قائم رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور فتح اس کا ساتھ دیتی ہے۔"

ئے غالباً" مصنف کی مراد ہندوؤں سے ہے مسلمان بیچارے تو سات ہی کروڑ ہیں یا شاید ۱۸۷۳ء میں جب کہ یہ کتاب اول اول شائع ہوئی ہندوستان کی مردم شماری کا اس درجہ ناقص ہو کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ سمجھی جاتی ہو۔ مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ۱۸۷۲ء میں گورنمنٹ ہندوستان کی طرف سے جو رپورٹ مردم شماری شائع ہوئی تھی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل آبادی ہندوستان کی اس وقت ۲۴۰۷۲۷۴۳ تھی جس میں ۲ر۱ ۷۳ فیصد ہندو تھے ۲ر۱ ۲۱ فی صدی مسلمان اور پانچ فی صدی باقی تمام قومیں۔ اس پانچ فیصدی میں ۳۱۸۳۶۳ پراٹسٹنٹ اور ۵۸۱۶۳۷ رومن کیتھولک یعنی کل نو لاکھ عیسائی شامل تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو مسلمانان ہندوستان کی تعداد کے متعلق دھوکا ہوا۔ مترجم

[1] جنوبی اٹلی کا ایک شہر ہے جو لب ساحل روما سے ۶۷ میل جانب جنوب و مشرق اور نیپلز سے پینتالیس میل جانب شمال مغرب واقع ہے۔ یہ شہر نہایت قدیم ہے اور رومن سلطنت کے زمانہ سے لے کر آج تک اس نے بہت سے تاریخی انقلاب دیکھے ہیں۔ مسلمانوں نے نویں صدی میں اس کا محاصرہ کیا تھا۔ ۱۷۳۴ء میں اس پر اسپین کا قبضہ ہوا۔ ان سے ۱۷۹۹ء میں فرانسیسیوں نے چھینا۔ پاپائے پائس تاسع جن کا ذکر متن میں ہے روما سے نکال دیئے گئے تھے اور گیٹا میں انہوں نے پناہ لی تھی۔ ۱۸۴۸ء میں فرانسیسیوں کی مدد سے انہوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کیا اور مراجعت فرمائے روما ہوئے۔ مترجم

[2] دو سال ہوئے کہ فرانس بھی اس دو عملی حکومت کی قید سے آزاد ہو گیا۔ مذہب حکومت سے بالکل بے دخل کر دیا گیا اور اب فرانسیسی گورنمنٹ کا شاہی مذہب نام کو نصرانیت لیکن فی الحقیقت مادیت ہے۔ مترجم

[3] اٹلی کا شمالی صوبہ جس کے شمال کی طرف سوئٹزرلینڈ اور مغرب کی طرف فرانس واقع ہے۔ رقبہ ۱۱۹۸ مربع میل اور آبادی ۱۹۰۱ء میں ۳۴۲۴۳۱ نفوس تھی۔ مترجم

[4] یعنی قرآن مجید کا خدا ہے۔ مترجم

[5] دوستی ہوئی ہی کب تھی جو تازہ ہو۔ کیا مصنف کو وہ جامع و مانع گالیاں یاد نہیں ہیں جو تحریک "اصلاح کنیسہ" کے بانی مبانی مارٹن لوتھر نے فلاسفہ و اہل علم کی شان میں عموماً" اور ارسطو کی شان میں خصوصاً" تصنیف کی تھیں؟ کیا ڈریپر کو خود اپنا ہی فقرہ بھول گیا ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ واقعہ "اصلاح" کا سائنس کے سر پر ذرا سا بھی احسان نہیں ہے؟" کیا ڈریپر کو اپنی یہ عبارت فراموش ہو گئی ہے کہ "کلیسائے مسیحی کی دو حریف جماعتیں یعنی پراٹسنٹ و کیتھولک باوجود باہمی رقابت کے اس امر میں متفق و متحد تھیں کہ بجز ان علوم کے جو ان کی رائے میں کتب مقدسہ کے نقیض نہ ہوں اور کسی علم کو مسالمت اور رواداری کی نظر سے نہ دیکھا جائے؟"

ہمارے جن ناظرین نے اس کتاب کو بامعان نظر پڑھا ہے وہ باسانی اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں گے کہ نصرانیت اور سائنس کا اجتماع ضدین کا اجتماع ہے۔ یورپ نے علوم و فنون اور تمدن میں جو ترقی کی ہے وہ مذہب سے آزاد ہو کر کی ہے اور جوں جوں یہ ترقی بڑھتی جائے گی مغرب میں بے دینی' بداعتقادی اور دہریت کا زور بھی بڑھتا جائے گا۔ یورپین اہل سائنس میں سے آج دو فیصدی بھی ایسے نہ ملیں گے جو مسیحیت کی تعلیم کی صحت کے تو درکنار خدا کی ہستی کے بھی قائل ہوں۔

صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ایمان کے قوسین میں عقل کو جگہ دی ہے۔ جس نے روایت میں شان درایت پیدا کر دی ہے جس نے سائنس کی شروع ہی سے سرپرستی کی ہے۔ اسلام کو المامون غزالی اور ابن رشد پر فخر و ناز ہو سکتا ہے لیکن مسیحیت کے لئے فریڈرک ثانی والٹیئر اور ہکسلے باعث ننگ و عار ہیں۔ مترجم

[6] ایک بہت بڑا فرانسیسی مدبر اور مورخ (۱۸۷۴-۱۷۸۷ء) مترجم